ہفت روزہ **الجمعیۃ** نئی دہلی

کا

مولانا ریاست علی ظفر بجنوریؒ نمبر

بیادگار:

استاذ الاساتذہ حضرت مولانا ریاست علی ظفر بجنوری قدس سرہٗ

استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند و نائب صدر جمعیۃ علماء ہند

المتوفی: ۲۰؍ مئی ۲۰۱۷ء مطابق ۲۳؍ شعبان المعظم ۱۴۳۸ھ

ترتیب و پیشکش

محمد سالم جامعی

خادم ادارۂ تحریر ہفت روزہ الجمعیۃ نئی دہلی

اکتوبر ۲۰۱۷ء —— صفر المظفر ۱۴۳۹ھ

شائع کردہ: ہفت روزہ **الجمعیۃ** مدنی ہال، ۱- بہادر شاہ ظفر مارگ، نئی دہلی-۲

قیمت: -/150₹

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حضرت مولانا ریاست علی ظفرؔ بجنوری قدس سرہٗ

ایک نظر میں

مرتبہ: **مولانا محمد مرتضیٰ اسعدی** (ناظم شعبۂ اوقاف دارالعلوم دیوبند)

نام : ریاست علی

والد کا نام : منشی فراست علی

وطن : قصبہ حبیب والا، ضلع بجنور، یوپی

ولادت : ۹؍مارچ ۱۹۴۰ء مطابق ۲۸؍محرم ۱۳۵۹ھ شنبہ بمقام محلّہ حکیم سرائے، علی گڑھ

ابتدائی تعلیم : حبیب والا میں ہی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۵۴ء میں حبیب والا کے پرائمری اسکول سے درجہ چہارم پاس کیا۔

دارالعلوم میں آمد : ۱۹۵۴ء مطابق ۱۳۷۳ھ بعمرہ چودہ سال

فراغت : ۱۹۵۸ء مطابق ۱۳۷۸ھ

ممتاز اساتذۂ کرام : حضرت مولانا فخرالدین صاحب مرادآبادیؒ، علامہ محمد ابراہیم بلیاویؒ، حضرت مولانا سیّد فخرالحسن صاحب امروہیؒ، مولانا بشیر احمد خاں صاحب بلندشہریؒ، حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیبؒ، حضرت مولانا ظہور احمد صاحبؒ، حضرت مولانا سیّد حسن صاحب دیوبند قدس سرہم وغیرہ

دارالعلوم میں تقرر : ۱۹۷۱ء مطابق ۱۳۹۱ھ میں درجۂ ابتدائی میں تقرر ہوا۔ ۱۹۷۶ء مطابق ۱۳۹۶ھ میں وسطیٰ ب میں ترقی ملی، ۱۹۸۲ء مطابق ۱۴۰۲ھ میں وسطیٰ الف میں ترقی پائی، ۱۹۸۳ء مطابق ۱۴۰۳ھ میں درجہ علیا میں ترقی دی گئی۔

مناصب : منیجر الجمعیۃ پریس دہلی، ماہنامہ 'دارالعلوم' دیوبند کی ادارت، نائب ناظم مجلس تعلیمی پھر ناظم مجلس تعلیمی، ڈائریکٹر شیخ الہند اکیڈمی، نیابتِ اہتمام، رکن مجلس عاملہ جمعیۃ علماء ہند، نائب صدر جمعیۃ علماء ہند

تصانیف و تالیفات : ایضاح البخاری، شوریٰ کی شرعی حیثیت، نغمۂ سحر (مجموعۂ کلام)

وفات : ۲۰؍مئی ۲۰۱۷ء مطابق ۲۳؍شعبان ۱۴۳۸ھ شنبہ

تدفین : قبرستان قاسمی میں تدفین عمل میں آئی

پسماندگان : تین صاحبزادگان (۱) مولانا محمد سفیان قاسمی (۲) مولانا محمد عدنان قاسمی (۳) مولانا محمد سعدان قاسمی

❑❑

فہرست مضامین

مضامین و مقالات

❑❑

Phone: 23311455, 23317729
Jamiat Ulama-i-Hind
1-Bahadur Shah Zafar Marg, New Delhi-110 002
E-mail : juh.org2010@gmail.com

جمعیۃ علماء الہند

امیر الہند حضرت مولانا قاری سیّد محمد عثمان صاحب
صدر جمعیۃ علماء ہند

کا

مجھے یہ معلوم ہوکر خوشی ہورہی ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے موقر استاذ حضرت مولانا ریاست علی ظفؔر بجنوریؒ کی حیات وخدمات اوران کی قومی و ملّی سرگرمیوں سے ملت اسلامیہ کو روشناس کرانے کے لیے ہفت روزہ الجمعیۃ 'مولانا ریاست علی ظفؔر بجنوریؒ نمبر' کے عنوان سے ایک خاص نمبر شائع کررہا ہے۔ مولانا مرحوم ایک جامع صفات شخصیت کے حامل تھے۔ علمی صلاحیت واستعداد، حسن اخلاق، فراستِ ایمانی اورقومی وملّی مسائل کا ادراک مولانا مرحوم کی زندگی کے وہ عنوانات ہیں جو ایسی جامعیت کے ساتھ کم ہی لوگوں میں پائے جاتے ہیں۔

اس خاص نمبر کی اشاعت پر میں اپنی طرف سے اورتمام جماعتی احباب و کارکنان کی طرف سے نیک خواہشات پیش کرتا ہوں اور دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم سے منسوب اس خصوصی اشاعت کو قبولیت عام سے نوازے اورہم سب کواپنی مرضیات پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

(حضرت مولانا) محمد عثمان (صاحب)
صدر جمعیۃ علماء ہند

Phone: 23311455, 23317729
Jamiat Ulama-i-Hind
1-Bahadur Shah Zafar Marg, New Delhi-110 002
E-mail : juh.org2010@gmail.com

جمعیۃ علماء الہند

جانشینِ فدائے ملت حضرت مولانا سید محمود اسعد مدنی مدظلہ
ناظم عمومی صدر جمعیۃ علماء ہند

کا

یہ بات بے حد باعث مسرت ہے کہ ہفت روزہ 'الجمعیۃ' ترانۂ دارالعلوم کے خالق، جمعیۃ علماء ہند کے نائب صدر اور دارالعلوم دیوبند کے مؤقر استاذ حضرت مولانا ریاست علی ظفر بجنوریؒ کے حالاتِ زندگی اور خدمات پر 'مولانا ریاست علی ظفر بجنوریؒ نمبر' شائع کر رہا ہے۔ مولانا مرحوم کا حسن تدبر، معاملہ فہمی اور گہری بصیرت کا زمانہ قائل رہا ہے۔ ان میں اپنا فرض ادا کرنے کی صلاحیت پوری طرح موجود تھی۔ وہ ایک فرض شناس استاذ اور مربی کی حیثیت سے پورے حلقہ دارالعلوم میں معروف تھے۔ انھوں نے حضرت فدائے ملتؒ کے زمانے سے ہی جمعیۃ علماء ہند کے پلیٹ فارم سے قومی وملّی خدمات کا آغاز کردیا تھا۔ ایک طویل عرصہ سے جمعیۃ علماء ہند کے نائب صدر کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے تھے جو تادم واپسیں جاری رہیں۔ دارالعلوم دیوبند میں مختلف تعلیمی و انتظامی ذمہ داریوں کو سرانجام دیتے ہوئے انھوں نے جس فہم وفراست کا ثبوت دیا وہ تاریخ دارالعلوم کا ایک روشن باب ہے۔ بلا شبہ حضرتؒ کی شخصیت اور کردار اس قابل ہے کہ ہم اس سے رہنمائی اور روشنی حاصل کر کے اپنی زندگی کو روشن کر سکتے ہیں۔ ہفت روزہ 'الجمعیۃ' اپنے بزرگوں اور اہم شخصیتوں کے کردار و اخلاق اور ان کی قومی وملّی خدمات کو ریکارڈ بنانے کا اہم کام انجام دے رہا ہے۔ خاکسار اپنی اور جماعتی احباب و رفقاء کی طرف سے اس خصوصی اشاعت پر ہفت روزہ الجمعیۃ کو مبارکباد پیش کرتا ہے

(مولانا) محمود مدنی
ناظم عمومی جمعیۃ علماء ہند

افتتاحیہ **محمد سالم جامعی**

جمعیۃ علماء ہند کے نائب صدر، دارالعلوم دیوبند کے مؤقر استاذ اور ترانۂ دارالعلوم دیوبند کے خالق حضرت مولانا ریاست علی ظفرؔ بجنوری قدس سرہٗ کی وفات حسرت آیات کے بعد ان کے حالات، خدمات اور ان کی قومی وملّی سرگرمیوں کے تعلق سے ہفت روزہ 'الجمعیۃ' کی یہ خصوصی اشاعت بعنوان 'مولانا ریاست علی ظفرؔ بجنوریؒ نمبر' آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔

حضرت مولانا ریاست علی ظفرؔ بجنوریؒ کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے اور نہ ہی یہ خاص اشاعت اس مقصد کی تکمیل کرسکتی ہے۔ اس خصوصی اشاعت کا مقصد تو صرف یہ ہے کہ حضرتؒ کے سانحۂ ارتحال کے بعد ملت اسلامیہ بالخصوص حلقۂ دارالعوم دیوبند کے قلوب جس غم واندوہ میں ڈوب کر پژمردہ اور مایوس نظر آنے لگے ہیں وہ حضرتؒ کے دینی، علمی اور عملی کارناموں سے روشنی حاصل کرکے کچھ سکون حاصل کرسکیں۔

مولانا مرحوم نے تقریباً نصف صدی تک مسلسل ازہرِ ہند دارالعلوم دیوبند میں جس عزم واستقلال کے ساتھ دینی، علمی اور انتظامی خدمات انجام دیں وہ روزِ روشن کی طرح عیاں ہیں۔ آپ کی زندگی علم وعمل، اخلاص و تقویٰ، دیانت وامانت، ذہنی وقلبی پاکیزگی، اتباعِ سنت، صبر وتحمل، استقلال واستقامت، فکری بالیدگی، قوتِ جہد وعمل اور وضعداری وسادگی کا نمونہ تھی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تصنیف وتالیف اور جمع وترتیب کی جو عظیم الشان صلاحیت عطا فرمائی تھی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ آپ کی نصف صدی سے زائد دینی، علمی و تصنیفی خدمات اور آپ کے اوصافِ جمیلہ بلاشبہ آنے والی نسلوں کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ اس لیے آپ کے پاکیزہ خیالات وافکار اور آپ کی حیات وخدمات کے نقوش کو عام کرنا اور آنے والی نسلوں کو ان سے روشناس کرانا آج ہماری سب کی ذمہ داری ہے۔ حضرت مرحوم آج ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن ان کے اہداف اور ان کا مشن ہمارے سامنے ہیں جنھیں پورا کرکے ہم حضرتؒ کی روح کو تسکین پہنچاسکتے ہیں اور یہی ہماری طرف سے حضرتؒ کے لیے سب سے بڑا خراجِ عقیدت ہے۔

ہم یہاں حضرتؒ کی زندگی پر کچھ لکھنا نہیں چاہتے۔ اس خصوصی اشاعت کے مضمون نگار حضرات نے جو کچھ لکھا وہ زیرِ نظر نمبر میں موجود ہے۔ اس نمبر میں بتوفیق خداوندی اتنے واقعات اور حالات آگئے ہیں جن کا ہمیں

گمان بھی نہیں تھا اور جن کو اگر پھیلا دیا جائے تو ضخیم ضخیم کتابیں تیار ہوسکتی ہیں۔ مضامین میں گہرائی اور گیرائی کے علاوہ تنوع بھی بڑی حد تک موجود ہے۔ اس خصوصی اشاعت کے مضمون نگاروں کی اکثریت ان حضرات پر مشتمل ہے جنھوں نے کسی نہ کسی طرح حضرتؒ کے فیوض و برکات کو بچشم خود ملاحظہ کیا ہے اور یا پھر آپ کے فیض کرم سے انھیں اکتساب کا موقع ملا ہے۔ یہ ہی وجہ ہے کہ مضامین میں تنوع کے باوجود یہ بات بطور قدر مشترک موجود ہے کہ ہر مضمون کی ہر سطر اور ہر سطر کا ہر لفظ خلوص ومحبت اور عقیدت و وارفتگی کے جذبہ سے بھرا ہوا ہے۔

ہمیں احساس ہے اور شرمندگی بھی کہ اس خصوصی اشاعت کو حضرتؒ کے چاہنے والوں تک پہنچانے میں کافی تاخیر ہوگئی ہے۔ حضرتؒ کے ساتھ عوام وخواص کو جو عقیدت ومحبت تھی وہ آپ کے وصال کے بعد سیلاب بن کر اُمڈ پڑی اور نہ صرف ہندوستان بلکہ پورے عالم اسلام تک پھیل گئی۔ عالم اسلام نے آپ کی رحلت کو ملتِ اسلامیہ کا سب سے بڑا المیہ سمجھا اور یکبارگی سب کی آنکھیں اشکبار ہوگئیں، اس کا تقاضہ تھا کہ ہم جلد سے جلد اس خصوصی اشاعت کے اعلان کو عملی جامہ پہنا کر حضرتؒ کے متوسلین منتسبین اور ملت اسلامیہ کی اشکبار آنکھوں کے لیے سامان تسکین مہیا کرتے مگر **کل امر مرهون باوقاتها** کے مصداق چونکہ اس کے لیے یہ ہی وقت مقدر تھا اس لیے ہم اس تاخیر کے لیے صرف معذرت ہی کر سکتے ہیں اور اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ خدا کی یہ ہی مشیت تھی

'مولانا ریاست علی ظفر بجنوریؒ نمبر' کی یہ اشاعت ہمارے خوابوں کی مکمل تعبیر نہیں ہے ہم اپنی اس کارکردگی پر مطمئن اور مسرور بھی نہیں ہیں مگر استاذ الاساتذہ حضرت مولانا ریاست علی صاحبؒ کی ذات گرامی سے منسوب اس خصوصی اشاعت کو ہم ہفت روزہ الجمعیۃ اور اپنی زندگی کا ایک اہم باب ضرور تصور کرتے ہیں اور اس کے لیے ہم اپنے پروردگار کے بے پایاں شکرگزار ہیں۔

بہرحال یہ خصوصی اشاعت آپ کے ہاتھوں میں ہے ہم اپنی کوششوں میں کس حد تک کامیاب رہے ہیں یہ تو آپ ہی بتاسکیں گے مگر ہم بطور تحدیث نعمت اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ اس خصوصی اشاعت کی ترتیب میں ہم نے اپنے خدا کی عطا کی ہوئی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر اس اشاعت کو مفید سے مفید تر بنانے کی ضرور کوشش کی ہے۔

آخر میں ہم اپنے قارئین سے درخواست کرتے ہیں کہ تاخیر کے لیے وہ ہماری معذرت قبول فرمائیں اور جن جن حضرات نے اس ضخیم اشاعت میں کسی بھی طرح کا کوئی تعاون دیا ہے انھیں اپنی پُرخلوص اور مستجاب دعاؤں میں یاد رکھیں راقم الحروف بھی ان تمام حضرات کا بیحد شکرگزار ہے جنھوں نے اس خصوصی اشاعت میں تعاون کیا اور کسی نہ کسی حیثیت سے نمبر کی تیاری میں حصّہ لیا ہے۔

خدائے بزرگ وبرتر ان کے خلوص اور سعی کو قبول فرمائے اور دین ودنیا میں اس کا بہتر صلہ عطا فرمائے۔ آمین۔

❑❑

حضرت مولانا ریاست علی ظفؔر بجنوریؒ کے سانحۂ ارتحال پر ملک کی اہم شخصیات کی طرف سے خراجِ عقیدت موصول ہوا، ان میں سے چند ایک بالخصوص ذمہ دارانِ دارالعلوم کے تاثرات پیش کیے جارہے ہیں۔

حضرت مولانا ریاست علی بجنوری رحمۃ اللہ علیہ

ایک جامع کمالات شخصیت

حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم نعمانی (مہتمم دارالعلوم دیوبند)

حضرت مولانا ریاست علی صاحب بجنوری رحمۃ اللہ علیہ کی مختلف خصوصیات اور ان کے اوصاف وکمالات کو مختلف حضرات نے تحریراً یا تقریراً اپنے اپنے انداز سے بیان کیا ہے اور کررہے ہیں۔ ان سب کا اعتراف کرتے ہوئے، میں نے جو خصوصیات اپنے طور پر محسوس کی ہیں وہ کچھ اس طرح ہیں۔

حضرت مولانا مجھ سے سینئر تھے؛ مگر ہم استاذ تھے یعنی حضرت مولانا سید فخرالدین احمد مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ سے ان کو شرفِ تلمذ اور خصوصی تعلق حاصل تھا اور حضرت ان کے اوپر بہت اعتماد فرماتے تھے اور 'ایضاح البخاری' کی ترتیب اسی اعتماد کا نتیجہ تھی، اور اس ناکارہ کو بھی حضرت مولانا فخرالدین احمد مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ سے شاگردی کا تعلق رہا اور حضرت کا اعتماد بھی حاصل رہا اور بندے نے بھی مکمل بخاری شریف کی تقریر حرف بحرف لکھنے کی کوشش کی جو محفوظ ہے، میں نے محسوس کیا کہ حضرت مولانا ریاست علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جو کئی سال تک مسلسل درس کی سماعت کی ہے اور بار بار اسباق کو نوٹ کیا ہے پھر مرتب کرنے کے بعد حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو سنایا ہے تو درحقیقت حضرت مولانا فخرالدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے درسِ بخاری کی جو خصوصیات تھیں، ان سب کو اس کے اندر منتقل کرنے کی کوشش کی ہے۔

عام علماء کے لیے عمومی طور پر اور حضرت مولانا فخرالدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے تلامذہ جن کو آج کہیں درسِ بخاری یا درسِ حدیث کی سعادت حاصل ہے، ان کے لیے خاص طور پر 'ایضاح البخاری' ایک بہت بڑا سرمایہ ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ حضرت مولانا ریاست علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے علمی کارناموں میں اگر کوئی اور چیز نہ ہوتی تو تنہا ایضاح البخاری کی ترتیب ان کو بقائے دوام دینے کے لیے کافی تھی۔ اللہ کا شکر ہے کہ ابھی وہ سلسلہ جاری ہے، دس جلدیں اس کی مکمل ہوچکی ہیں اور یہ

سفرِ اتمام کی جانب رواں دواں ہے، اللہ تعالیٰ اس کی تکمیل کی شکلیں پیدا فرمائے۔

علمی کمالات وخصوصیات کے علاوہ، مزاج اور اخلاق کے اعتبار سے مولانا کی زندہ دلی اور خوش مزاجی ایک نمایاں خصوصیت تھی، جس سے ان کا ہر ملنے والا واقف ہے، مجھے رسمی طالب علمی کے بعد سے اس ذمہ داری کے آنے تک اور اس کے بعد مجلسِ تعلیمی میں بار بار ملاقات کا موقع ملا؛ لیکن مولانا کو کبھی عَبُوسًا قمطریرًا نہیں دیکھا، کہ چہرے پر مُردنی چھائی ہوئی ہو، پیشانی پر بل پڑا ہوا ہو، چہرہ سرخ ہو رہا ہو، کبھی ایسی حالت میں نہیں دیکھا، ہمیشہ مسکراتے ہوئے پایا، ان کی جامع مختصر گفتگو زندہ دلی اور خوش مزاجی کا پورا پورا مظہر ہوتی تھی۔ اسی کے ساتھ گفتگو میں برجستگی ہوتی تھی، کوئی بات ہوئی فوراً دو لفظوں میں اس کا جواب اور جس طرح پھلجھڑی چھوٹ جاتی ہے، مجلس کے اندر مولانا کی وہ مختصر سی بات سب کے اوپر بھاری ہو جاتی تھی، گفتگو میں بھی سادگی اور مزاج میں بھی سادگی ان کا امتیاز تھی۔

غور وفکر کے بعد جو رائے قائم کر لیتے اس کے اوپر پختہ رہتے، فوراً رائے بھی نہیں دیتے تھے، اگر کوئی مسئلہ مجلسِ تعلیمی میں یا اساتذہ کے مشورے میں زیرِ غور ہوتا، حضرت سب کی باتیں خاموشی سے سنتے رہتے اور غور کرتے رہتے تھے، اگر کوئی بات سمجھنے کی ہوتی تو سوال کر لیتے؛ لیکن رائے اخیر میں دیتے تھے، جب پوچھا جاتا کہ حضرت آپ کی کیا رائے ہے؟ کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ پورے مجمع کی رائے ایک طرف رہ گئی ہے اور مولانا ریاست علی صاحب نے جو رائے اخیر میں پیش کی وہ سب کے اوپر حاوی ہو گئی اور اسی کے مطابق فیصلہ ہوا۔

ایک خاص بات یہ تھی کہ اختلافِ رائے میں بھی حدود پر قائم رہتے تھے، یہ بڑی اہم بات تھی۔ علماء کے درمیان مسائل میں اختلاف کوئی اہم بات نہیں ہے، ائمہ کے درمیان بے شمار مسائل میں اختلاف ہے، یہاں تک کہ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تو صرف نماز میں تکبیرِ تحریمہ سے سلام تک ائمہ کے اختلافی مسائل شمار کیے تو وہ دو سو کے قریب تھے۔ تو نفسِ اختلاف کوئی بری چیز نہیں ہے، ہاں اختلاف اخلاص کے ساتھ اور دلائل کی بنیاد پر ہونا چاہیے اور اس کی حدود ملحوظ رہنی چاہئیں، نفسانیت نہیں آنی چاہیے۔ اس مضمون کو حضرت شیخ الحدیثؒ کی کتاب 'الاعتدال فی مراتب الرجال' اور حضرت فقیہ الامت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہیؒ کی کتاب 'حدودِ اختلاف' میں دیکھنا چاہیے۔ مدارس میں علماء کے درمیان اختلاف ہو سکتا ہے؛ لیکن وہ اس وقت زحمت بن جاتا ہے، جب اس کو حدود میں نہ رکھا جائے اور اس کا جو طریقہ ہے اسے نظر انداز کر دیا جائے۔ مولانا کے یہاں بھی اختلافِ رائے ہوتا تھا؛ لیکن بڑی سنجیدگی کے ساتھ۔

مولانا کی ایک خاص صفت، چھوٹوں سے کام لینا اور ان کی ہمت افزائی کرنا تھا، اپنے تلامذہ اور اہلِ تعلق کو 'بیٹے' کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ اگر ان کے پاس کوئی اپنا کام لے کر گیا اور اس میں کچھ کمی کوتاہی بھی ہے تو فوراً نکیر نہیں؛ بلکہ بہت اچھا ماشاء اللہ اچھا کام کیا؛ لیکن اس کو ایسے کر لو تو بہتر ہے۔ اس طرح اس کی اصلاح بھی ہو جاتی اور حوصلہ افزائی بھی۔ مولانا کی یہ شفقت ومحبت اور خوش مزاجی زندگی کی آخری رات تک برقرار رہی؛ بلا شبہ ان کی یہ صفات قابلِ تقلید ہیں جنھیں اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ مولانا کی مغفرت فرمائے اور دار العلوم کو اُن کا نعم البدل عطا فرمائے! □□

یہ مضمون ۲۸؍شعبان ۱۴۳۸ھ مطابق ۲۵؍مئی ۲۰۱۷ء بروز جمعرات، جمعیۃ علماء ہند کی جانب سے مسجد عبد النبی، نئی دہلی میں منعقدہ تعزیتی اجلاس کی صدارتی تقریر پر مبنی ہے۔

صاف دل انسان چل بسا

مولانا مفتی سعید احمد پالن پوری (شیخ الحدیث وصدرالمدرسین دارالعلوم دیوبند)

انسانوں میں دُرِ نایاب کی کمی ہمیشہ محسوس کی گئی اور انسانی امتیازات متنوع ہیں، ہر امتیاز اپنے اندر کوئی خوبی رکھتا ہے، حضرت مولانا ریاست علی ظفرؔ بجنوری قدس سرہٗ بہت سی خوبیوں اور امتیازات کے مالک تھے، لکھنے والے اُن پر لکھیں گے۔ مجھے شخصیات پر لکھنا نہیں آتا؛ میرے حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب قدس سرہٗ سے بھی جب کوئی کسی شخصیت کی سوانح لکھنے کے لیے اصرار کرتا تو حضرت یہی فرماتے تھے کہ مجھے شخصیات پر لکھنا نہیں آتا۔

میری حضرت مولانا ریاست علی صاحب رحمہ اللہ سے لمبی رفاقت رہی ہے، وہ میرے ہم عمر تھے؛ مگر مجھ سے پانچ سال پہلے فارغ ہوگئے تھے؛ اس لیے کہ وہ بہت ذہین تھے اور بہت تیزی سے پڑھا تھا اور میں ہدایہ اولین سے پہلے مظاہر علوم سہارن پور میں علومِ عقلیہ اور فنون کی بہت سی کتابیں پڑھنے میں لگ گیا تھا؛ اس لیے میں پیچھے رہا تھا؛ حالاں کہ ہم دونوں کی پیدائش ایک سال (۱۹۴۰ء) کی ہے۔ میں نے جب دارالعلوم میں آکر ہدایہ اولین میں داخلہ لیا تو وہ فارغ ہوگئے تھے اور ''گل کدہ'' (دیوبند میں کمال شاہ مسجد کے پاس) میں کمرہ کرایہ پر لے کر رہتے تھے اور 'ایضاح البخاری' لکھتے تھے، میں نے بھی 'گل کدہ' میں کمرہ کرایے پر لیا تھا، مجھے دارالعلوم میں سیٹ نہیں ملی تھی، اس وقت سے حضرت مولانا کے ساتھ دید وشنید تھی، پھر زمانے نے کروٹ لی، میں فارغ ہوکر راندیر چلا گیا اور وہ جمعیۃ علمائے ہند میں ملازم ہوکر چلے گئے، وہاں سے وہ دارالعلوم میں مجھ سے پہلے مدرس ہوکر آگئے، میں ان سے دو تین سال بعد آیا، پھر تقریباً چالیس سال تک ہم دارالعلوم کی خدمت کرتے رہے، حضرت مولانا قدس سرہ نے متعدد عہدے سنبھالے، میں نے کوئی عہدہ قبول نہیں کیا، میں صرف پڑھاتا رہا؛ مگر میں مولانا کے ساتھ اُن کے کاموں میں شریک رہا، جب وہ شیخ الہند اکیڈمی کے ڈائرکٹر بنے تو میں نے اپنے برادر حضرت مولانا مفتی محمد امین صاحب پالن پوری کے ساتھ مل کر، حضرت شیخ الہند قدس سرہ کی 'ادلۂ کاملہ' کی تسہیل کی، جسے مولانا نے شیخ الہند اکیڈمی سے شائع کیا، پھر مولانا کے اشارے پر میں نے اپنے بھائی کے ساتھ مل کر حضرت شیخ الہند کی 'ایضاح الادلۃ' تیار کی، وہ بھی اکیڈمی سے شائع ہوئی، یہ دونوں کتابیں اکیڈمی کا اہم کارنامہ قرار پائیں۔ پھر جب دارالعلوم میں انقلاب آیا تو حضرت مولانا رسالہ 'دارالعلوم' کے ایڈیٹر بنائے گئے، اس میں میرا کوئی حصہ نہیں تھا؛ کیوں کہ وہ خود بڑے ادیب تھے، میری معاونت کی ضرورت نہیں تھی؛ مگر جب وہ ناظمِ تعلیمات بنائے گئے تو میں نے قدم قدم پر اُن کا ساتھ دیا؛ اس لیے ان کو قریب سے پڑھنے کا موقع ملا، میرے نزدیک ان کا امتیازی وصف اخلاص اور صاف دلی تھا، ان کے دل میں کسی سے بیر نہیں تھا، وہ کسی کو نقصان پہنچانا نہیں چاہتے تھے، ہر ایک کے حق میں وہ خیر چاہتے تھے اور اسی وصف کی وجہ سے اُن کو جو کام دارالعلوم سپرد کرتا تھا بحسن وخوبی انجام دیتے تھے، چیئرمین حضرت مولانا محمد عثمان صاحب (نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند) ان کے حق میں فرمایا کرتے تھے: ''ریاست ایسا پرزہ ہے، جس کو جہاں فٹ کردو فٹ ہوجاتا ہے۔''

حالانکہ منتظم سے عام طور سے لوگوں کو شکایت ہوتی ہے؛ مگر حضرت مولانا قدس سرہ سے کسی کو شکایت نہیں ہوتی تھی۔ میرے خیال میں اس کی وجہ ان کی صاف دلی تھی، ہزار خوبیوں سے بڑھ کر یہ خوبی تھی۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرتِ عامہ تامہ فرمائیں اور ان کو بلند درجات عطا فرمائیں! ◻◻

حضرت مولانا ریاست علی ظفرؔ بجنوریؒ
دارالعلوم کے لیے مفید تر شخصیت

مولانا عبدالخالق صاحب مدراسی (نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند)

حضرت مولانا ریاست علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ، دنیا سے اچانک رخصت ہو گئے اور ایسے وقت میں جب کہ دارالعلوم کو ان کی ضرورت تھی اور ان کی بیماری کے باوجود بہ ظاہر ایسا اندیشہ نہیں تھا کہ وہ اس طرح چلے جائیں گے۔ اُن کی وفات سے طبیعت آج تک متاثر ہے، ایسا اثر شاید ہی کسی اور حادثے کا ہوا ہو اور اس کی سب سے اہم وجہ یہ ہے کہ وہ دارالعلوم کے لیے مفید تر شخصیت تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہم نے، انتظامیہ کی تبدیلی کے بعد دارالعلوم کے لیے ان سے زیادہ مفید کسی کو نہیں پایا، وہ کسی بھی ذاتی مفاد سے بالاتر ہو کر دارالعلوم کے حق میں سوچتے تھے؛ بلکہ اپنی ذات کو نقصان پہنچا کر دارالعلوم کے مفاد میں مشورہ دیتے تھے۔ گذشتہ پینتیس چالیس سال کے عرصہ پر نظر ڈال کر سوچا جائے تو یاد آتا ہے کہ ہر آڑے وقت میں، دارالعلوم کے سب سے زیادہ وہی کام آئے اور سہارا بنے۔

ان کی ایک عجیب خصوصیت یہ تھی کہ اگر ان سے کسی شخص کی شکایت کی جاتی تو وہ اس شخص کو اس طرح افہام و تفہیم کرتے کہ نہ اس کو شکایت کرنے والے سے بدگمان ہونے کا موقع ملتا اور نہ اپنی غلطی سے انکار کی مجال ہوتی۔ اس طرح بہت آسانی سے غلطی کی اصلاح بھی ہو جاتی اور ماحول میں کسی بدگمانی اور دوری پیدا ہونے کا امکان بھی نہ رہتا۔

یہ تو دارالعلوم کے معاملات میں ان کے مثالی طرزِ عمل کا خلاصہ ہے، اس کے علاوہ ذاتی اوصاف میں ان کی خوش اخلاقی، وسعتِ ظرفی، مہمان نوازی اور غریب پروری سے تو ہر خاص و عام واقف ہے۔ جو شخص بھی اُن کے پاس آ جائے اس کی پریشانی دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے تھے۔ اگر ضرورت ہو تو سفارش کر دیتے تھے، اگر کوئی اور پریشانی یا مالی ضرورت ہو تو ہر حال میں مدد کرتے تھے، اُن کی اور ان کی اہلیہ مرحومہ کی داد و دہش اور غریب پروری سے، دیوبند کے مرد و زن اور خاص و عام سب واقف اور اس کے معترف ہیں (اہلیہ مرحومہ شاید اس وصفِ خاص میں اور فائق تھیں) بسا اوقات کسی کی ضرورت پوری کرنے کے لیے قرض بھی لیا کرتے تھے، خود مجھے بعض مرتبہ فون کر کے فرمایا کہ فلاں آدمی کو اتنی رقم قرض چاہیے اور امید یہ ہے کہ ادا کر دے گا اور اگر آپ کو اس پر اعتماد نہ ہو تو آپ مجھے قرض دے دیں، میں اس کو دے دوں گا اور ادائیگی میرے ذمہ ہوگی۔

مولانا مرحوم کے ان اوصافِ حسنہ کا یہ اثر ہے کہ ان کے جانے کے بعد ہر شخص ان کا ذکرِ خیر کر رہا ہے اور ان کو تعریف کے ساتھ ہی یاد کرتا ہے۔ اور ان کے انھی اوصاف اور خاص طور پر دارالعلوم کے لیے ان کی افادیت و اخلاص کا نتیجہ ہے کہ ہماری طبیعت ان کے حادثۂ وفات سے بہت متاثر ہے۔ اللہ رب العزت ان کی حسنات قبول فرمائے اور اپنے قربِ خاص سے نوازے۔ آمین! ❑❑

حضرت مولانا ریاست علی ظفرؔ بجنوریؒ ایک مخلص ومہربان شخصیت

مولانا عبدالخالق صاحب سنبھلی (نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند)

حضرت مولانا ریاست علی صاحب بجنوری نوراللہ مرقدہ ہمارے استاذ تو نہیں تھے؛ لیکن درحقیقت ہمارے اساتذہ ہی کے صف کے آدمی تھے؛ اس لیے کہ ان کا دارالعلوم میں تقرر، ہماری طالب علمی کے آخری سال میں ہوگیا تھا، اُسی وقت سے ان کو دیکھا، خاص طور سے جب کبھی حضرت الاستاذ شیخ الحدیث حضرت مولانا فخرالدین احمد مرادآبادی نوراللہ مرقدہ کے یہاں اس زمانے میں (جو حضرت کی حیاتِ طیبہ کا بھی آخری سال تھا) جانا ہوا تو حضرت مولاناؒ کو وہاں ضرور پایا، اس طرح طالبِ علمی ہی کے زمانے سے ان کی شخصیت سے واقف ہونے کا موقع ملا۔

اس کے بعد جب ۱۴۰۲ھ میں ہمارا دارالعلوم میں تقرر ہوگیا تو حضرت مولانا کو زیادہ قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، اس دور میں وہ ابتداءً نائب ناظم اور کچھ ہی عرصہ بعد ناظمِ مجلس تعلیمی کی حیثیت سے دارالعلوم کی تعلیمی سرگرمیوں کے روحِ رواں تھے۔ اس حیثیت سے ان کی شفقت ومحبت کا خوب تجربہ ہوا؛ حالانکہ وہ انتظامی منصب پر فائز تھے؛ لیکن ان کا طرزِ عمل اتنا متوازن ہوتا تھا کہ کسی کو ان سے شکایت کا موقع نہیں ملتا تھا۔ ہر ایک کے لیے اخلاص و ہمدردی ان کا خصوصی وصف تھا، ذاتی طور پر راقمِ سطور کے ساتھ اُن کا طرزِ عمل ایک مشفق ومخلص سرپرست کا سا تھا، ہمیشہ محبت کا اظہار فرماتے اور مفید مشوروں سے نوازتے تھے۔

ان کے مخلصانہ مشوروں اور شفقت ومحبت کا اس وقت سے اور زیادہ تجربہ ہوا جب راقم کے کاندھوں پر موجودہ ذمہ داری آئی، اس زمانے میں ان کے مشورے اور رہنمائی سے خوب مستفید ہونے کا موقع ملا۔ مشورہ کی مجالس میں بھی اُن کی اصابتِ رائے سامنے آتی رہی، وہ جو بھی رائے پیش فرماتے تھے وہ تدبر و دوراندیشی کا مظہر ہوتی تھی، پھر رائے پیش کرنے کا اُن کا طریقہ بھی قابلِ تقلید تھا، وہ اپنی بات نہایت سلیقہ سے، مناسب الفاظ اور خوشگوار لہجہ میں پیش فرماتے اور ان کو اپنی رائے پر اصرار نہیں ہوتا تھا؛ جب کہ عام طور پر ان کی رائے، سب سے زیادہ باوزن ہوتی تھی۔

ذاتی طور پر راقم کے ساتھ یہ معاملہ بھی تھا کہ اگر میری کوئی تحریر ان کی نظر سے گذرتی اور اس میں کوئی بات ان کو قابلِ اصلاح محسوس ہوتی تو پوری ہمدردی کے ساتھ اس کی نشاندہی فرماتے اور اس میں حوصلہ افزائی کا پہلو بھی ہاتھ سے نہ جاتا، یہ ان کی محبت واخلاص کی واضح دلیل تھی۔ مجموعی اعتبار سے وہ دارالعلوم کے ماحول میں ایک انتہائی مشفق مخلص اور مہربان سرپرست کی حیثیت رکھتے تھے؛ اسی لیے ان کے حادثۂ وفات سے ہر شخص متاثر ہوا ہے۔

اللہ رب العزت حضرت کی مغفرت فرمائے اور ان کی حسنات کا بہترین بدلہ عطا فرمائے! ◻◻

سراپائے عظیم اخلاق ۲۰۱۷ء

اشک غم و الم ۱۴۳۸ھ

یادِ استاذِ دوراں ۱۴۳۸ھ

بروفات استاذ العلماء حضرت مولانا محمد ریاست علی صاحب بجنوریؒ

از : اسرار نجیب آبادی (خادم مسجد اسٹیشن والی، نجیب آباد)

قطعۂ تاریخ وفات

رخصت ہوئے جہاں سے اِک ذی ہوش، ذی ہنر — فرقت میں ان کی آج ہے ہر ایک چشم تر
لیں گرداب سے نام تو نکلے سنِ وفات — کیا نام ہے "جناب ریاست علی ظفر"
ے ا ۰ ۲ ء

اپنی بے نوری پہ نرگس دھن کے سر روتی ہے کیوں — ہر کسی کی آج غم میں آنکھ تر ہوتی ہے کیوں
آنسوؤں سے اپنا منہ روحِ بشر دھوتی ہے کیوں — چشم طوفاں خیز تھی جو پر اثر سوتی ہے کیوں
گلستاں سے کیا کوئی گلفام رخصت ہوگیا
کیا وہ جس کا تھا ریاستؔ نام رخصت ہوگیا

کیا وہی جو دیوبند میں تھا ادب کا تاجدار — علم و فن شعر و سخن کا ایک گویا شاہکار
مادرِ علمی کا جس نے یوں چکایا کچھ اُدھار — لَے سے اپنی خوب کردی اس کی دوبالا پھوار
ہند میں بجنور کا جس سے ہے سر اعلیٰ ہوا
اور حبیب والا کا رتبہ بھی دوبالا ہوا

گلستانِ قاسمی میں تھا جو فخرِ گلستاں — علمی دُنیا میں تھا فخرالدین احمد کا نشاں
ایک اُبلتا گویا شیریں آبشار، اس کی زباں — نام تھا جس کا ریاست اس کے جیسا اب کہاں
ان کے جیسا ہے اگر کوئی تو پھر دِکھلایئے
اولیک آبائی دعویٰ ہے مرا، جھٹلایئے

سادگی اور عجز ہو جس کی طبیعت ہے کہیں — جس میں پاکیزہ سیاست ہو ودیعت ہے کہیں
رند ہو اور ہو مثالی پاک طینت ہے کہیں — ایسا کوئی ساقیِ جامِ شریعت ہے کہیں
خوش ادا بے مثل تھا وہ ساقیِ دارالعلوم
اس کے طرزِ خوش ادا کی ہے مچی ہر سمت دھوم

اے شہِ علم و ادب یادِ سلف عالی مقام — فخرِ قوم و ملک و ملت خوش لقائے خوش کلام
یاد رکھیں گے زمین و آسماں تجھ کو مدام — روح کو پہنچے تری اے کاش دانش کا سلام
ہے دعا مرقد ترا جنت کا اِک گلزار ہو
حشر تک ہوں رحمتیں تجھ پر خدا کا پیار ہو

۱۴۳۸ھ- گنج ہائے گرانمایہ سے محرومی کا سال

اداریہ ہفت روزہ 'الجمعیۃ' نئی دہلی —— از: **محمد سالم جامعی**

یہ اداریہ سال ۱۴۳۸ھ میں اساطینِ علم وعمل کے فیوض وبرکات سے محرومی کے تناظر میں سپردِ قلم کیا گیا تھا جس میں اسی کا ایک حصہ استاذ الاساتذہ اورترانۂ دارالعلوم کے خالق مولانا ریاست علی ظفرؔ بجنوریؒ کے ذکر خیر میں بھی ہے اوراسی مناسبت سے اسے شاملِ اشاعت کیا جارہا ہے۔(م.س.ج)

سن دس نبوی میں جب ایک ہفتہ کے اندر ہی حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت ونصرت اور حوصلہ افزائی کے لیے اپنا سب کچھ قربان کردینے والی دو عظیم شخصیتوں، آپ کے مشفق ومربی چچا ابوطالب اور پھر چند دن بعد آپ پر اپنی جان ومال نچھاور کرنے والی آپ کی ہمساز ودمساز بیوی حضرت خدیجہؓ کا انتقال ہوا تو اس سال کو اسلامی تاریخ میں ''عام الحزن'' سے تعبیر کیا گیا تھا۔ بلاشبہ کمزوری اور بے کسی کے اس دور میں بیک وقت دو ظاہری سہاروں کا ختم ہوجانا بے حد رنج وملال کا سبب تھا تاہم اس دورِ نبوت کی فکری وعملی پختگی اطمینان کا ایک ذریعہ تھی جبکہ آج چودہ سواڑتیس کا سال امت مسلمہ کے فکری، عملی اور دینی زوال کا سال ہے، ایسے میں کسی بھی ایک ایسی شخصیت کا جو علم وعمل میں پختہ ہو اور ایمان وایقان کی فضاؤں کے وجود میں آنے کا ذریعہ بن رہی ہو، وصال بلاشبہ امتِ مسلمہ کی زبوں حالی کا ایک اشارہ ہی ہوسکتا ہے چہ جائیکہ ایک سال کے اندر عالمی سطح پر نہیں بلکہ محض برصغیر میں درجنوں شخصیتیں ہمیں داغِ مفارقت دے جائیں تو ہمیں یہ کہنا بجا ہی ہوگا کہ ۱۴۳۸ھ امت مسلمہ کے لیے حزن والم کا سال ثابت ہورہا ہے۔

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ یہ دنیا کا تقریباً آخری دور ہے اوراسی لیے شاید اس کی رفتار میں بڑی حد تک تیزی آگئی ہے۔ صبح ہوتی نہیں کہ سورج ڈھلنے کے آثار نظر آنے لگتے ہیں۔ پھر جو دن آتا ہے صدموں کا ذخیرہ لے کر نمودار ہوتا ہے۔ شاید کوئی ہفتہ اور مہینہ ایسا گزرتا ہوگا کہ اصحاب علم، اربابِ درس وتدریس اور بزرگانِ امت میں سے کسی کے حادثۂ وفات کی خبر نہ آتی ہو۔ سال ۱۴۳۸ھ تو امت مسلمہ کے لیے ایک طرح سے عام الحزن کی حیثیت اختیار کرچکا ہے۔ اسی سال کے شروع میں حضرت مولانا عبدالحق اعظمی شیخ الحدیث ثانی دارالعلوم دیوبند کی وفات کے حادثۂ جانکاہ کو برداشت کرنا پڑا تھا، پھر ترانۂ دارالعلوم دیوبند کے خالق اور جمعیۃ علماء ہند کے نائب صدر حضرت مولانا ریاست علی ظفرؔ بجنوری نیز جمعیۃ علماء ہند کے دوسرے نائب صدر حضرت مولانا محمد ازہر رانچوی خلیفہ مجاز حضرت شیخ الاسلامؒ کی وفات کے صدمہ سے دوچار ہونا پڑا۔ ابھی یہ زخم مندمل بھی نہ ہو پایا تھا کہ جامع الہدیٰ مرادآباد کے شیخ الحدیث حضرت مولانا نسیم احمد غازی بجنوریؒ امت کو روتا بلکتا چھوڑ کر اپنے معبودِ حقیقی کے دربار میں چلے گئے۔ ہمارے پڑوسی ملک پاکستان میں بھی شیخ الحدیث حضرت مولانا سلیم اللہ خاں صاحبؒ اور مولانا عبدالحفیظ مکی قدس سرہما ملت کو داغِ مفارقت دے گئے۔ ابھی امت اور ہندوپاک کے علمی ودینی حلقے ان پیہم حادثات سے جانبر بھی نہ ہو پائے تھے کہ استاذ المحدثین رئیس العلماء حضرت مولانا محمد یونس صاحب قدس سرہٗ شیخ الحدیث جامعہ مظاہر علوم سہارنپور کے حادثہ وفات نے پہلے سے ہی شکستہ اور مجروح دلوں کو مزید شکستہ اور مجروح کرڈالا۔

حضرت الشیخ مولانا عبدالحق اعظمی شیخ الحدیث ثانی دارالعلوم دیوبند اپنی

ذات میں ایک انجمن تھے۔اللہ تعالیٰ نے علم وعمل، زہد وتقویٰ، فراست ایمانی اور وضعداری وسادگی سے خوب نوازا تھا۔ وہ اعلیٰ درجہ کے واعظ وخطیب تھے حالانکہ ان کا وعظ بالکل سادہ ہوتا مگر چونکہ دل کی آواز ہوتا تھا اس لیے سیدھا دل پر ہی اثر انداز ہوتا تھا۔ حضرتؒ جلالتِ شان ،علوِ مرتبت ،عظمت وعبقریت اور علم وعمل کا مجسم پیکر تھے۔ جو آپ سے ایک مرتبہ مل لیتا آپ کا گرویدہ ہوجاتا۔ بہت سے دینی مدارس کو آپ کی سرپرستی کا شرف حاصل تھا۔ ۲۰۰۶ء میں جب والدِ محترم نمونۂ اسلاف حضرت مولانا محمد اصغر صاحب نوراللہ مرقدہٗ شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ ریڑھی تاجپورہ کی ایماء پر احقر کے چھوٹے بھائی مولانا عبدالخالق صاحب مظاہری نے ''معہدِ اصغر'' ناظر پورہ سہارنپور کے قیام کا ارادہ کیا تو حضرت والد محترمؒ کے حکم پر اس کے سنگ بنیاد کے لیے خصوصیت کے ساتھ حضرت مولانا مرحوم کا انتخاب کیا گیا۔ حضرتؒ کو دعوت دی گئی ،تشریف لائے ، سنگِ بنیاد کی تقریب میں شرکت کی اور بہ صمیم قلب دعاؤں سے نوازا۔ پھر تاحیات معہد کے جلسوں اور تقریبات میں سرپرستانہ شرکت فرماتے رہے۔ احقر سے جب بھی کہیں ملاقات ہوجاتی مدرسہ کے بارے میں معلومات فرماتے رہتے تھے۔

غیر مسلموں میں دعوتی کام انتہائی خاموشی کے ساتھ فرماتے ۔آپ کے دستِ حق پرست پر اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد پچاس کے قریب ہے۔کوئی مشورہ مانگتا بے حد صائب مشورہ دیتے اور اسے امانت سمجھتے۔ مسلسل چونسٹھ برسوں تک بخاری شریف کا درس آپ کی ایسی خصوصیت ہے جس میں شاید آپ کا کوئی شریک وسہیم نہیں ہے۔

یہ ایک تلخ سچائی ہے کہ زندگی کا سفر خواہ کتنا ہی طویل کیوں نہ ہو ہر ایک کو موت کا ذائقہ چکھنا ہی پڑتا ہے اور آپ بھی زبانِ حال سے یہ کہتے ہوئے اس دنیائے فانی سے رخصت ہوگئے:

جان کر من جملہ خاصانِ میخانہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

ابھی ۱۶؍شوال المکرم ۱۴۳۸ھ کو اپنے وقت کے عظیم محدث اور علم وعمل کے امام، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد یونس صاحب رحمہ اللہ علیہ بھی ہندستان کے علمی ودینی حلقوں کو ویرانی کے حوالے کرکے اپنے پروردگار کے حضور چلے گئے۔

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد یونس صاحبؒ کی مال و دولت سے بے رغبتی، زہد وقناعت ، آخرت کا استحضار، اتباعِ سنت کا جذبہ واہتمام دیکھ کر گزرے ہوئے علماء، صلحاء اور اتقیاء کے واقعات پر یقین کرنا آسان نظر آنے لگتا تھا۔ انہیں صفات نے ان میں زہد واتقاء اور غیرت وحمیت کی ایک عظیم شان پیدا کردی تھی۔ ان کی نظر میں امیر وغریب کا کوئی فرق نہیں تھا۔ مجھ جیسا ناکارہ بھی کبھی ملاقات کے لیے چلا جاتا تو بڑی محبت سے پیش آتے۔ بڑے بڑے تجار اور افسران حاضر خدمت ہوتے مگر ان کی یہ حاضری محض دعاء ونصیحت تک محدود رہتی تھی۔ آج کے علماء اور داعیانِ دین کے لیے اللہ والوں کی یہ شان بلاشبہ لائقِ تقلید ہے۔ راقم الحروف ایک مرتبہ حاضرِ خدمت تھا۔ ایک بڑے افسر ایک نوجوان عالم کے ہمراہ آئے ۔نوجوان عالم نے ان کا حضرت شیخ رحمہ اللہ سے تعارف کرایا۔ آپ خاموشی کے ساتھ سنتے رہے۔ پھر نوجوان عالم صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا اچھا تشریف لے جایئے اور ان سے کہہ دیجیے کہ لوگوں سے متعلق جو خدمت ان کے سپرد ہے اسے انصاف کے ساتھ انجام دیں۔ میں نے حضرتؒ کی جوانی کو بھی بچشم خود دیکھا ہے۔ اس وقت بھی خوف و خشیتِ الٰہی کا وہی غلبہ تھا جو آخر وقت تک دیکھا جاتا رہا ہے۔ انتقال کے بعد اہل علم حلقوں کی زبان پر آپ کے لیے امیر المومنین فی الحدیث کا لقب جاری ہے۔ یہ وہی لقب ہے جو قرن اول میں حضرت سفیان ثوریؒ اور حضرت امام بخاریؒ وغیرہم حضرات محدثین کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ تعلق مع اللہ اور خشیت الٰہی کے ساتھ سلوک وطریقت میں بھی اعلیٰ مقام کے حامل تھے۔ علم وعمل کی یہی جامعیت تھی جس نے انھیں ایک امتیازی مقام عطا کردیا تھا۔ اللہ تعالی حضرت مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت الفردوس عطا فرمائے اور امت کو آپ کے نعم البدل سے نوازے۔

اے عشق نہ مل سکیں گے ہم جیسے سر پھرے
برسوں چراغ لے کے زمانہ اگر پھرے

یہ ایک تاریخی سچائی ہے کہ ہر شخص میں کچھ ایسی خصوصیات ہوتی ہیں جو اسے اس کے معاصرین سے ممتاز کرتی ہیں۔ استاذ الاساتذہ حضرت مولانا ریاست علی ظفر بجنوریؒ کو بھی پروردگارِ عالم نے علم وعمل کے ساتھ سنجیدگی اور متانت سے نوازا تھا۔ ان کا وجود مسندِ تدریس کے لیے ایک زینت تھا۔ وہ سادگی، انکساری اور خاکساری کا نمونہ تھے۔ وہ صرف مدرس ہی نہیں مربی بھی تھے اور استاذ کامل، مزاج شناس بھی۔ انھوں نے اپنے تلامذہ کو تعلیم کے ساتھ ساتھ آدابِ زندگی سے بھی روشناس کرایا۔ تلامذہ کی نفسیات پر ان کی گہری نظر تھی ۔سنگریزوں کے ڈھیر سے گوہرِ آبدار نکالنے میں انھیں کمال حاصل تھا۔ وہ خاک آلود ہیروں کو تراشنے اور چمکانے کے فن سے خوب واقف تھے۔ مولانا مرحوم کا مطالعہ بڑا وسیع تھا۔ ہر موضوع پر معلومات کا ذخیرہ ان کے دماغ کے کمپیوٹر میں بڑی مقدار میں موجود تھا۔ اس طرح آپ بلند نظری، ذوقِ مطالعہ اور حسنِ انتخاب کا قطب مینار تھے۔

مولانا مرحوم صاحبِ طرز ادیب کے ساتھ قادر الکلام شاعر بھی تھے۔ اُردو، عربی اور فارسی زبان میں شعر کہنے پر پوری قدرت تھی۔ دارالعلوم دیوبند کا

مشہور ترانہ آپ کی ہی شاہکار تخلیق ہے۔ تصنیف و تالیف اور تربیت کے بھی مردِ میدان تھے۔ 'شوریٰ کی شرعی حیثیت' اور 'ایضاح البخاری' آپ کی تصنیفات و تالیفات میں اہم مقام رکھتی ہیں۔ اپنے چھوٹوں کے ساتھ وضع داری اور خورد نوازی کا ان کا اپنا ایک خاص مزاج تھا۔ انتقال سے چند ماہ قبل راقم الحروف کا دیوبند جانا ہوا۔ احقر کو ایک جگہ ملاقات کی غرض سے جانا تھا۔ راستہ حضرتؒ کے دولت کدہ کے سامنے سے گزرتا تھا۔ احقر جیسے ہی دولت کدہ کے دروازے کے سامنے پہنچا مولانا مرحوم دارالعلوم جانے کے لیے دروازہ سے باہر نکلے۔ راقم الحروف کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ اصرار کے ساتھ اندر لے گئے اور اپنے صاحبزادے کے ذریعہ اس وقت کی رخصت کی درخواست دفتر تعلیمات کو بھیج دی۔ احقر نے عرض بھی کیا۔ حضرت بس ملاقات ہوگئی ہے، مجھے بھی کہیں جانا ہے۔ آپ بھی درس کے لیے تشریف لے جائیں مگر حضرتؒ نے درخواست مسترد کرتے ہوئے فرمایا بھائی آج تو آپ قابو میں آئے ہیں، اتنی آسانی سے کیسے چھوڑا جاسکتا ہے۔ پھر آپ نے اپنی روایتی خورد نوازی کا بھرپور مظاہرہ فرمایا۔ مولانا مرحوم جمعیۃ علماء ہند کے رکن رکین بلکہ اس کے نائب صدر بھی تھے۔ دارالعلوم دیوبند اور جمعیۃ علماء ہند کے تعلق سے خوب باتیں ہوئیں۔ تقریباً ایک گھنٹہ بعد احقر کو اجازت کا پروانہ ملا۔ آج جب حضرتؒ ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں اور اپنے اعمالِ حسنہ کا صلہ پانے کے لیے اپنے پاک پروردگار کے جوارِ رحمت میں پہنچ چکے ہیں۔ راقم الحروف کو اس آخری ملاقات کا ایک ایک لمحہ اور حضرتؒ کی گفتگو کا ایک ایک لفظ یاد آ رہا ہے اور دل کو تڑپا رہا ہے۔ اب اس ملاقات کی صرف یادیں اور حسرتیں ہی باقی رہ گئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ حضرتؒ کو اپنی خصوصی عنایات سے سرفراز فرمائے، آمین۔

ملت اسلامیہ کے لیے غم و حزن کے اس سال نے ایک اور مسندِ تدریس کو بھی ویران کردیا۔ معروف صاحبِ علم و عمل شخصیت حضرت مولانا نسیم احمد غازی بجنوریؒ بھی، جو ایک طویل عرصہ سے مرادآباد کی معروف علمی درسگاہ جامع الہدیٰ میں مشیخت حدیث کے عہدہ پر فائز تھے، اسی عام الحزن میں ہندوستان کے علمی، دینی اور درسی حلقوں کو داغِ مفارقت دے گئے۔ مرحوم کا علم بڑا پختہ تھا۔ درس و تدریس میں کمال حاصل تھا۔ اعلیٰ درجہ کے خطیب و مقرر بھی تھے اور درس میں بھی اسی کی جھلک نظر آتی تھی۔ قوتِ حافظہ خوب تھی۔ بروقت تمثیلات سے بات کو طلباء کے ذہن نشین کرانے کے فن میں ماہر تھے۔ قادرالکلام شاعر بھی تھے۔ بر وقت اور برجستہ اشعار سے محفل لوٹنے کا فن بھی خوب جانتے تھے۔ مولانا مرحوم اچھا عالمانہ ذوق رکھتے تھے۔ وہ ایک کامیاب اور مقبول استاذ ہی نہیں بلکہ استاذ گر بھی کہے جاتے تھے۔ ہمیشہ اپنے تلامذہ کو نصائح سے نوازتے جس سے ان کے دلوں میں علم و عمل اور درس و تدریس کی اہمیت، ضرورت اور افادیت جاگزیں ہوجاتی۔ تدریسی زندگی کے رہنما اصولوں پر بھی ان کی گہری نظر تھی اور وہ اکثر اپنے رفقائے تدریس اور تلامذہ کو ان پر متوجہ کرتے رہتے تھے۔

اسی سلسلۂ حزن و ملال کی ایک کڑی حضرت مولانا محمد ازہر رانچوی قدس سرہٗ کا سانحۂ ارتحال بھی ہے۔ مولانا مرحوم نہایت متقی و پرہیزگار شخصیت کے حامل تھے۔ جامعہ حسینیہ رانچی کے مہتمم اور جمعیۃ علماء جھارکھنڈ کے عہدۂ صدارت پر فائز تھے۔ حضرت فدائے ملتؒ کے دور سے ہی جمعیۃ علماء ہند کے نائب صدر تھے۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنی قدس سرہٗ سے مجاز بیعت و ارشاد تھے۔ جھارکھنڈ اور بہار میں ہزاروں متوسلین کا حلقہ موجود ہے جو آج حضرتؒ کی وفات کے بعد احساسِ محرومی میں مبتلا ہے۔ خشیتِ الٰہی آپ کا خاص وصف تھا۔ حضرتؒ کی وفات سے جو خلا پیدا ہوا ہے بظاہر اس کا پر ہونا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمارے ان تمام مرحومین کو ان کی حسنات کے صلہ میں جنت الفردوس کے اعلیٰ درجات سے نواز کر اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور ان کی حسنات کو ہمارے لیے بھی ذخیرۂ آخرت فرمائے، آمین۔

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے یہ گنج ہائے گرنمایہ کیا کیے

□□

مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

اداریہ ماہنامہ دارالعلوم دیوبند —— از: **مولانا محمد سلمان بجنوری**

۲۳؍شعبان ۱۴۳۸ھ مطابق ۲۰؍مئی ۲۰۱۷ء سنیچر کی صبح، اذانِ فجر کے وقت وہ حادثہ پیش آیا جس نے دارالعلوم دیوبند اور مدارس کی دنیا، نیز ملک و بیرون ملک پھیلے ہوئے فضلائے دیوبند اور اہل حق کے تمام حلقوں میں غم واندوہ کی لہر دوڑادی۔ یعنی دارالعلوم دیوبند کے ۴۵ سال قدیم استاذ حدیث اور فضلائے دیوبند کی کئی نسلوں کے مربی و رہنما حضرت مولانا ریاست علی صاحب ظفر بجنوری، اس دار فانی سے رخصت ہوگئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت الاستاذ قدس سرہٗ کا حادثۂ وفات ان کی طویل علالت کے باوجود اچانک سا محسوس کیا گیا؛ اس لیے کہ گذشتہ تعلیمی سال کے آغاز ہی سے گردے اور دل متاثر ہونے کے باوجود، اللہ رب العزت کی عطا کردہ ہمت اور توفیق سے انھوں نے نہ صرف یہ کہ اپنے اسباق پوری پابندی سے پڑھائے اور دونوں متعلقہ کتب (ترمذی شریف اور البلاغۃ الواضحۃ) کی تکمیل بروقت کرائی؛ بلکہ وفات سے چار دن قبل (۱۹؍شعبان بروز منگل) ختم ہونے والے امتحان سالانہ میں بھی آخری دن تک امتحان ہال تشریف لاتے رہے، اس کے بعد کے ایام بھی معمول کے مطابق گذارے، یہاں تک کہ زندگی کی آخر شب میں، عشاء کے بعد آنے والے ایک مہمان محترم کو ناشتہ کی دعوت دی اور اہل خانہ سے ناشتہ کے نظم کی بابت معلوم کرکے اطمینان حاصل کیا، گویا آخری رات تک معمول کی زندگی گذاری۔

رات کے آخری حصہ میں (ساڑھے تین بجے صبح) دوسرے کمرے میں سوئے ہوئے اپنے بڑے صاحبزادہ مولانا محمد سفیان صاحب کو فون کیا، وہ تیزی سے پہنچے تو فرمایا کہ سانس میں بہت گھٹن ہے۔ انھوں نے وہاں جو منظر دیکھا اس سے اندازہ ہوا کہ حسب معمول تین بجے بیدار ہوکر ضروریات اور وضو سے فارغ ہوکر نماز تہجد بھی پڑھ چکے تھے؛ کیوں کہ مصلیٰ بچھا ہوا ملا۔ اس کے بعد گھٹن بڑھنے کا احساس ہونے پر صاحبزادہ کو بلایا، انھوں نے سانس کو معمول پر لانے کے لیے کوئی تدبیر کی؛ لیکن فائدہ نہ ہونے پر وہ ڈاکٹر کو بلانے چلے گئے اور ان کے بیٹے اور دیگر اہلِ خانہ وہاں آگئے، اس دوران بے چینی بڑھ گئی بار بار اٹھنے بیٹھنے لگے، پیشانی پر پسینہ آگیا، ساتھ ہی کلمۂ طیبہ پڑھنا شروع کردیا۔ پوتے مولوی حمدان سلّمہٗ نے سورہ یٰسین شریف کی تلاوت شروع کردی اور اسی دوران ڈاکٹر کے آنے سے پہلے ہی جان، جانِ آفریں کے سپرد کردی:

جان دے ہی دی جگر نے آج پائے یار پر
عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

حضرت مولانا ریاست علی صاحب نوراللہ مرقدہٗ کی وفات دارالعلوم دیوبند میں ایک عہد کا خاتمہ ہے، ان کی ذات میں اللہ تعالیٰ نے ایسے گوناگوں اوصاف جمع کردیے تھے جو کسی ایک فرد میں کم ہی جمع ہوتے ہیں، جس سے ان کی شخصیت میں جامعیت کی شان پیدا ہوگئی تھی۔ اگر آپ، رسوخ فی العلم، قوتِ استنباط، دقتِ نظر، سلاستِ بیان، فکر وتدبر، اصابتِ رائے، سلامتیِ فکر، صبر وقناعت، زہد واستغناء، تقویٰ و پاک دامنی، جود وسخا، غریب پروری ومہمان نوازی، ادائے حقوق، عالی حوصلگی وسیر چشمی، خوش گفتاری ونرم خوئی، شفقت ومحبت، احساسِ ذمہ داری، ذہانت وظرافت، بھرپور خود اعتمادی کے ساتھ کامل تواضع، قوتِ فیصلہ، دور بینی، دیانت وامانت، اعلیٰ تدریس وخطابت، بے مثال نظم ونثر پر مثالی قدرت، سلیقۂ زندگی، آدابِ مجلس کی رعایت اور سادگی بے تکلفی کا مجسم نمونہ دیکھنا چاہیں تو وہ حضرت مولانا کی شخصیت تھی اور یقین فرمائیں کہ ان اوصاف میں سے کسی کا تذکرہ بھرتی کے لیے نہیں کیا گیا؛ بلکہ ان کی شخصیت کے طویل مطالعہ پر مبنی ہے۔ ان کو دیکھنے والا محسوس کرتا تھا کہ وہ اسلاف واکابر کے رنگ میں رنگے ہوئے کسی انسان سے مل رہا ہے۔

ان کی تربیت بنیادی طور پر ان کے پھوپھا حضرت مولانا سلطان الحق فاروقی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھوں ہوئی اور انھیں کی برکت سے، شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنی نوراللہ مرقدہٗ سے قرب کا موقع ملا جن سے باقاعدہ پڑھنے کا تو اتفاق نہیں ہوا؛ لیکن بہت قریب سے دیکھنے اور شخصیت کو پہچاننے کے مواقع بہت حاصل ہوئے۔ حضرتؒ کی

وفات کے اگلے ہی سال ان کوفخر الاسلام حضرت مولانا سیدفخر الدین احمد نوراللہ مرقدہٗ سے بخاری شریف پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی اور حضرت کی شخصیت اُن کی محبت وعقیدت کا مرکز بن گئی جس کی چھاپ اُن کی پوری زندگی پرنمایاں رہی اوراسی کی برکت سے 'ایضاح البخاری' جیسا علمی کارنامہ وجود میں آیا جواردو زبان میں اپنی نوعیت کی ایک منفرد کتاب ہے، جس میں علمائے احناف اور اکابر دیوبند کے علوم ومعارف اورمتوازن موقف کی ترجمانی پوری قوت کے ساتھ کی گئی ہے۔

حضرت الاستاذ رحمہ اللہ کا ایک علمی کارنامہ 'شوریٰ کی شرعی حیثیت' ہے جوان کی قوتِ استدلال اور صلاحیتِ استنتاج کا بہترین نمونہ ہے اور اپنے موضوع پرحرف آخر سمجھی جاتی ہے۔

ان کی شخصیت کا ادبی پہلوبھی بہت زیادہ معروف ومعتبر ہے، جس کا سب سے بڑا ثبوت ان کے قلم سے صادر ہونے والا شاہکار 'ترانۂ دارالعلوم' ہے جو ساری دنیا میں مشہور ومقبول ہے اسی طرح ان کا مجموعۂ کلام 'نغمۂ سحر' ان کے بلند ترین ادبی مقام کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ آخر میں 'ایضاح البخاری' کے ساتھ ایک اوراہم علمی خدمت انجام دی، یعنی قاضی محمد اعلیٰ تھانویؒ کی مشہورِ زمانہ کتاب 'کشاف اصطلاحاتِ الفنون' کی تحقیق ومراجعت اورتصحیح وتنقیح کا کام جناب مولانا محمد عارف جمیل صاحب مبارکپوری استاذ دارالعلوم دیوبند کے تعاون سے انجام دیا، جس کے لیے چار پانچ سال تک روزانہ پابندی سے کام کرتے تھے۔ اب وہ الحمدللہ اشاعت کے لیے تیار ہے، اس کا مقدمہ اورعرضِ ناشربھی زندگی کے آخری ایام میں تحریر فرما چکے تھے۔

اسی طرح حضرت علامہ فتح محمد لکھنوی رحمہ اللہ کی بے مثال تفسیر 'خلاصۃ التفاسیر' کی خدمت کا بیڑا اٹھایا اورایک دوسرے فاضل مولانا عبدالرزاق صاحب امروہوی کے حوالے کیا، جوتکمیل پذیر ہے۔

جہاں تک دارالعلوم دیوبند کی خدمات کا معاملہ ہے تو یہ اُن کی حیات کاعنوانِ جلی ہے، پینتالیس سال مسلسل تدریس کے علاوہ بے شمار خدمات اُن کے نام ہیں، بالخصوص ۱۹۸۲ء میں انتظامیہ کی تبدیلی کے بعد تو دارالعلوم کی کشتی سنبھالنے والوں میں حضرت مولانا ریاست علی صاحب نوراللہ مرقدہٗ کا نام نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ سب سے پہلے تعلیمات کے نائب ناظم اور پھر ناظم کی حیثیت سے انھوں نے تعلیمات کا نظام نہایت مستحکم بنیادوں پر استوار کیا، اس کے ساتھ اور بعد تک بھی شیخ الہند اکیڈمی کے ڈائرکٹر (ناظم اعلیٰ) رہ کر اس سے علمی کتب کی اشاعت کا کام کرایا، اس کے علاوہ تمام اہم انتظامی معاملات میں کلیدی کردار ادا کیا، مجلسِ شوریٰ کی جانب سے نیابت اہتمام کی ذمہ داری بھی تفویض کی گئی جس کے قبول کرنے سے انھوں نے معذرت کرلی؛ لیکن اپنے مدبرانہ مشوروں سے انتظامیہ کا تعاون کرنے میں کبھی دریغ نہیں کیا اوراس میں ہمیشہ دارالعلوم کے مفاد کو ملحوظ رکھا۔

حضرت مولانا ریاست علی صاحب نوراللہ مرقدہٗ کی وفات دارالعلوم دیوبند میں ایک عہد کا خاتمہ ہے، ان کی ذات میں اللہ تعالیٰ نے ایسے گوناگوں اوصاف جمع کردیے تھے جو کسی ایک فرد میں کم ہی جمع ہوتے ہیں، جس سے ان کی شخصیت میں جامعیت کی شان پیدا ہوگئی تھی۔ ان کو دیکھنے والا محسوس کرتا تھا کہ وہ اسلاف واکابر کے رنگ میں رنگے ہوئے کسی انسان سے مل رہا ہے۔

خلاصہ یہ کہ حضرت الاستاذؒ کی شخصیت قدرت کی عطا کردہ بے مثال صلاحیتوں اور اکابر واسلاف کے فیضانِ نظر سے تیار شدہ ایک مثالی شخصیت تھی جس کے بارے میں، خود انھیں کے قلم سے اپنے استاذ گرامی کے لیے نکلا ہوا شعر، بے تکلف پیش کیا جاسکتا ہے:

پروردۂ صد فصل بہاراں جسے کہیے
اسلاف کے گلشن کا وہ ایسا گل تر تھا

اُن کی وفات کے بعد ان کے مجموعۂ کلام 'نغمۂ سحر' پرنظر ڈالی تو اس میں ان کے قلم سے اپنے ایک خاندانی بزرگ کا مرثیہ نظر سے گذرا جس کا ہر شعر خود حضرت الاستاذؒ پر پوری طرح منطبق ہے، بالخصوص ایک شعر تو نقل کیے بغیر رہا نہیں جاتا:

دم بخود ہیں موت پر تیری روایاتِ سلف
کون اقدارِ سلف کی اب نگہبانی کرے

اللہ رب العزت حضرتؒ کو مغفرت سے سرفراز فرما کر اپنے قربِ خاص کی دولت عطا فرمائے، آمین! □□

حضرت مولانا ریاست علی بجنوری رحمۃ اللہ علیہ

ادار یہ ماہنامہ 'البلاغ' کراچی —— از: **حضرمولانا مفتی محمد تقی عثمانی**

حمد وستائش اس ذات کے لیے ہے جس نے اس کارخانۂ عالم کو وجود بخشا اور درود وسلام اس کے آخری پیغمبر پر جنھوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا۔

اس رمضان المبارک سے کچھ پہلے قافلۂ دار العلوم دیوبند کے ایک عظیم رکن حضرت مولانا ریاست علی صاحب بجنوریؒ کے حادثۂ وفات کی خبر نے اہلِ علم و دین کی صفوں میں رنج وغم کی لہر دوڑادی، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے مجھنا کارہ کو شرفِ ملاقات تو دو تین بار سے زیادہ حاصل نہیں ہوا، لیکن ان کی تحریریں، ان کے ترانۂ دار العلوم اور ان کی دوسری خدمات کی بنا پر وہ دل سے ہمیشہ قریب رہے۔ جس سال انھوں نے دار العلوم دیوبند میں داخل ہوکر تعلیم کے سلسلے کا آغاز کیا یعنی ۱۹۵۱ء اسی سال میں نے اور میرے بڑے بھائی حضرت مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب نے دار العلوم کراچی میں تعلیم شروع کی اور جس سال یعنی ۱۹۵۸ء میں وہ دورۂ حدیث سے فارغ ہوئے، اس سے اگلے سال ہم نے دار العلوم کراچی میں دورۂ حدیث کی تکمیل کی، وہ حضرت مولانا فخر الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ سابق شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند کے خصوصی شاگردوں میں سے تھے، انھوں نے ہی موصوف کے درسی افادات کو قلمبند کیا تھا، اور 'ایضاح البخاری' کے نام سے ان کو ترتیب دے رہے تھے، جس کی دس جلدیں شائع ہوکر مقبول ہو چکی ہیں۔

دار العلوم دیوبند کا ماہانہ رسالہ 'دار العلوم' بھی ایک عرصے تک آپ کی ادارت میں شائع ہوتا رہا، اور ۱۹۷۲ء سے آخری لمحات تک وہ دار العلوم دیوبند کے قابل اور مقبول اساتذۂ کرام میں شمار ہوتے تھے، جہاں آپ نے ابتدائی درجات سے لے کر تخصصات تک کی کتابیں کامیابی کے ساتھ پڑھائیں اور چند سال سے جامع ترمذی جلد اوّل سے کتاب النکاح تک آپ ہی کے زیر تدریس تھی، اور امسال بھی انھوں نے ترمذی شریف مذکورہ مقام تک پڑھائی۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے انھیں علمی و ادبی ذوق کا وافر حصہ عطا فرمایا تھا، ان کی اسی خصوصیت کی بنا پر انھیں 'شیخ الہند اکیڈمی' کے نگراں کی ذمہ داری سونپی گئی تھی، اور ان کے ادبی مقام کا شاہد صدق اُن کا وہ ترانۂ دار العلوم ہے جو انھوں نے دار العلوم دیوبند کے اجلاسِ صد سالہ کے موقع پر کہا تھا، اور اس کے بعد اس کے دلکش، پُرجوش اور دل سے نکلے ہوئے اشعار کی گونج پورے برصغیر میں پھیل گئی، اور اب دینی مدارس کے جلسوں میں عموماً یہ ترانہ بڑے ذوق وشوق سے پڑھا جاتا ہے، اور اس مضمون کے آخر میں، میں اسے مکمل نقل کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔

میں ایک مرتبہ اپنے شیخ ثانی حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب قدس سرہٗ کی صحبت میں چند روز گزارنے کے لیے ہندوستان گیا تھا، اس موقع پر چند روز دیوبند میں بھی گزارنے کی نوبت آئی، اس موقع پر حضرت مولانا بجنوری رحمۃ اللہ علیہ نے غایتِ محبت وشفقت سے بندہ کے اعزاز میں 'شیخ الہند اکیڈمی' کی طرف سے ایک تقریب منعقد فرمائی جس میں علماء کرام کو بطورِ خاص مدعو کیا گیا تھا، اس موقع پر انھوں نے مجھ ناکارہ کی جس طرح ہمت افزائی فرمائی، وہ بندہ کے استحقاق سے بہت زیادہ تھی۔

ان کی طبیعت میں سادگی، تواضع اور بے تکلفی ایسے اوصاف تھے کہ بندہ کو ان سے خاص مناسبت معلوم ہوتی تھی۔ اب آخری بار جب دار العلوم دیوبند میں میری مختصر حاضری ہوئی، اور اہلِ دار العلوم نے جامع الرشید میں مجھ سے خطاب کی فرمائش کی، تو اس موقع پر تعارفی کلمات بھی حضرت مولانا ریاست علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمائے۔ اور ان کا یہ جملہ، جو ان کی انتہائی تواضع اور خوردنوازی کا مظہر ہے اور بندہ کے لیے ایک فالِ نیک، مجھے بھولتا نہیں ہے، انھوں نے فرمایا تھا کہ جب دار العلوم میں کوئی مہمان آتا ہے تو ہم اس کے سامنے دار العلوم دیوبند کا تعارف پیش کرتے ہیں، لیکن آج ہمارے یہاں ایک ایسے مہمان آئے ہیں جن سے ہمیں پوچھنا ہے کہ دار العلوم دیوبند کیا ہے؟ بات تو میری حیثیت سے بہت اونچی تھی، لیکن ایک فالِ نیک کے طور پر بندہ کے ذہن میں محفوظ ہوگئی۔ مولاناؒ کی پیدائش ۹ رمارچ ۱۹۴۰ء کو ہوئی تھی، اور ۱۹-۲۰ رمئی ۲۰۱۷ء (۲۲-۲۳ رشعبان ۱۴۳۸ھ) کی درمیانی رات میں بہ عمر ۷۷ سال وہ اپنے مالک حقیقی سے جاملے۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون. اللّٰهم اکرم نزله ووسع مدخله وأبدله دارا خيرا من داره واهلا خيرا من اهله و نقه من الخطايا كما ينقى الثوب الأبيض من الدنس!

اللہ تعالیٰ ان کو درجاتِ عالیہ سے سرفراز فرماکر ان کے صاحبزادگان

---

[1] حضرت مولانا کے بارے میں ان معلومات کے لیے بندہ حضرت مولانا عبدالرؤف صاحب غزنوی زیدت مکارمہم، استاذِ حدیث جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن وخطیب جامع مسجد طوبیٰ، کا ممنون ہے جو حضرت کے خصوصی شاگرد ہیں، اور اپنے اساتذہ کی روایات کے امین ہیں۔

مولانا محمد سفیان، مولانا محمد عدنان، اور مولانا محمد سعدان صاحبان کو ان کا خلفِ صدق بنا کر ان کے مآثر کو زندہ رکھنے اور ان کے کام کو آگے بڑھانے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین۔

ترانۂ دارالعلوم دیوبند

یہ علم و ہنر کا گہوارہ تاریخ کا وہ شہ پارہ ہے
ہر پھول یہاں اِک شعلہ ہے ہر سرو یہاں مینارہ ہے

خود ساقیِ کوثر نے رکھی مے خانے کی بنیاد یہاں
تاریخ مرتب کرتی ہے دیوانوں کی روداد یہاں

جو وادیِ فاراں سے اٹھی گونجی ہے وہی تکبیر یہاں
ہستی کے صنم خانوں کے لیے ہوتا ہے حرم تعمیر یہاں

برسا ہے یہاں وہ ابرِ کرم اُٹھا تھا جو سوئے یثرب سے
اس وادی کا سارا دامن سیراب ہے جوئے یثرب سے

کہسار یہاں چھپ جاتے ہیں طوفان یہاں رُک جاتے ہیں
اس کاخِ فقیری کے آگے شاہوں کے محل جھک جاتے ہیں

ہر بوند ہے جس کی امرت جل یہ بادل ایسا بادل ہے
سو ساگر جس سے بھر جائیں یہ چھاگل ایسا چھاگل ہے

مہتاب یہاں کے ذرّوں کو ہر رات منانے آتا ہے
خورشید یہاں کے غنچوں کو ہر صبح جگانے آتا ہے

یہ صحنِ چمن ہے برکھا رت ہر موسم ہے برسات یہاں
گلبانگ سحر بن جاتی ہے ساون کی اندھیری رات یہاں

اسلام کے اس مرکز سے ہوئی تقدیس عیاں آزادی کی
اس بامِ حرم سے گونجی ہے سو بار اذاں آزادی کی

اس وادیِ گل کا ہر غنچہ خورشید جہاں کہلایا ہے
جو رند یہاں سے اُٹھا ہے وہ پیرِ مغاں کہلایا ہے

جو شمع یقیں کی روشن ہے وہ شمعِ حرم کا پرتو ہے
اس بزم ولی اللہ میں تنویرِ نبوت کی ضوء ہے

یہ مجلسِ مئے وہ مجلس ہے خود فطرت جس کی قاسم ہے
اس بزم کا ساقی کیا کہیے جو صبحِ ازل سے قائم ہے

جس وقت کسی یعقوب کی لے اس گلشن میں بڑھ جاتی ہے
دھاڑوں کی ضیا خورشید جہاں کو ایسے میں شرماتی ہے

عابد کے یقیں سے روشن ہے سادات کا سچا صاف عمل
آنکھوں نے کہاں دیکھا ہوگا اخلاص کا ایسا تاج محل

یہ ایک صنم خانہ ہے جہاں محمود بہت تیار ہوئے
اس خاک کے ذرّے ذرّے سے کس درجہ شرر بیدار ہوئے

ہے عزم حسین احمدؒ سے بپا ہنگامۂ گیر و دار یہاں
شاخوں کی لچک بن جاتی ہے باطل کے لیے تلوار یہاں

رومی کی غزل رازیؒ کی نظر غزّالی کی تلقین یہاں
روشن ہے جمالِ انورؒ سے پیمانۂ فخر الدین یہاں

ہر رند ہے ابراہیمؒ یہاں ہر میکش ہے اعجازؒ یہاں
رندان ہدیٰ پر کھلتے ہیں تقدیس طلب کے راز یہاں

ہیں کتنے عزیز اس محفل کے انفاس حیات افروز ہمیں
اس ساز معانی کے نغمے دیتے ہیں یقیں کا سوز ہمیں

طیبہ کی مئے مرغوب یہاں دیتے ہیں سفالِ ہندی میں
روشن ہے چراغ نعمانی اس بزم کمالِ ہندی میں

خالق نے یہاں ایک تازہ حرم اس درجہ حسیں بنوایا ہے
دل صاف گواہی دیتا ہے یہ خلد بریں کا سایہ ہے

اس بزم جنوں کے دیوانے ہر راہ سے پہنچے یزداں تک
ہیں عام ہمارے افسانے دیوارِ چمن سے زنداں تک

سو بار سنوارا ہے ہم نے اس ملک کے گیسوئے برہم کو
یہ اہلِ جنوں بتلائیں گے کیا ہم نے دیا ہے عالم کو

جو صبحِ ازل میں گونجی تھی فطرت کی وہی آواز ہیں ہم
پروردۂ خوشبو غنچے ہیں گلشن کے لیے اعجاز ہیں ہم

اس برقِ تجلی نے سمجھا پروانۂ شمعِ نور ہمیں
یہ وادیِ ایمن دیتی ہے تعلیم کلیمِ طور ہمیں

دریائے طلب ہو جاتا ہے ہر مے کش کا پایاب یہاں
ہر تشنہ لبوں نے سیکھے ہیں مے نوشی کے آداب یہاں

بلبل کی دعا جب گلشن میں فطرت کی زباں ہو جاتی ہے
انوارِ حرم کی تابانی ہر سمت عیاں ہو جاتی ہے

امدادؒ و رشیدؒ و اشرفؒ کا یہ قلزمِ عرفاں پھیلے گا
یہ شجرۂ طیبؒ پھیلا ہے تا وسعتِ امکاں پھیلے گا

خورشید یہ دین احمدؐ کا عالم کے اُفق پر چمکے گا
یہ نور ہمیشہ چمکا ہے یہ نور برابر چمکے گا

یوں سینۂ گیتی پر روشن اسلاف کا یہ کردار رہے
آنکھوں میں رہیں انوارِ حرم سینہ میں دلِ بیدار رہے □□

اُستاذ الاساتذہ حضرت مولانا ریاست علی ظفرؔ بجنوریؒ

اداریہ ماہنامہ ’ندائے شاہی‘ مرادآباد —— از: مفتی سلمان منصورپوری

دارالعلوم دیوبند کے مایۂ ناز اُستاذ، ’ایضاح البخاری‘ شرح بخاری شریف کے مرتب وجامع، ترانۂ دارالعلوم اور ترانۂ جمعیۃ علماء ہند کے تخلیق کار، صاحبِ طرز ادیب، مشفق ومہربان کامیاب مدرس حضرت الاستاذ مولانا ریاست علی ظفر بجنوری نوراللہ مرقدہٗ نے مؤرخہ ۲۰؍مئی ۲۰۱۷ء مطابق ۲۳؍شعبان المعظم ۱۴۳۸ھ بروز ہفتہ بوقت سحر داعیِ اجل کو لبیک کہا، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

اُسی دن بعد نماز ظہر احاطہ مولسری دارالعلوم دیوبند میں امیر الہند حضرت مولانا قاری سیّد محمد عثمان صاحب منصورپوری اُستاذ حدیث دارالعلوم دیوبند کی اقتداء میں آپ کی نماز جنازہ پڑھی گئی، اور مزارِ قاسمی میں تدفین عمل میں آئی، علماء اور عوام کا بڑا مجمع جنازہ میں شرک تھا۔

حضرت والا گونا گوں اوصاف وخصوصیات سے متصف تھے، بالخصوص سادگی، انسانی ہمدردی، حلم وبردباری، وقار وخودداری میں اپنے ہم عصروں میں خاص امتیاز کے حامل تھے۔ اور تواضع تو آپ کی طبیعت میں ایسی رچ اور بس گئی تھی کہ آپ سے ملنے والا آپ سے پہلی ہی ملاقات میں بآسانی محسوس کرلیتا تھا، کسی بھی معاملہ میں اپنا امتیاز آپ کو طبعاً پسند نہ تھا، بلکہ اس سے بڑی کوفت ہوتی تھی، قادرالکلام خطیب ہونے کے باوجود آپ وعظ وخطابت سے حتیٰ الامکان گریز فرماتے تھے۔ کوئی شاگرد بہت ہی تقاضا کرتا تو اُس کی دل داری کی خاطر پروگرام میں شرکت منظور فرمالتے تھے، لیکن گفتگو مختصر، پرمغز اور جامع فرماتے تھے، جو حشو وزوائد سے پاک ہوتی تھی۔ یہی حال آپ کے درس کا بھی تھا، آپ جو بھی کتاب پڑھاتے، اُس کا پورا حق ادا کرنے کی کوشش فرماتے تھے، اور درس کا انداز ایسا پیارا اور دل موہ لینے والا ہوتا تھا کہ ہر طالب علم آپ سے قریب اور مانوس ہوجاتا، اور آپ کی گفتگو سے محظوظ ہوتا تھا۔

عصر کے بعد آپ کے یہاں عام مجلس لگتی تھی، جس میں ہر شخص کو شرکت کی اجازت تھی، حاضرین کی چائے سے تواضع کی جاتی، ہلکی پھلکی ظرافت سے آپ کی مجلس زعفران زار بنی رہتی تھی، حالاتِ حاضرہ پر آپ کے برمحل اور بروقت بے تکلف تبصروں سے حاضرین خوب لطف اندوز ہوتے۔

فہم وفراست اور ذکاوت آپ کے چہرے بشرے سے عیاں تھی، اِصابت رائے اور فکر کی پختگی ایسی تھی کہ کوئی شخص کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو، وہ آپ کو مرعوب نہ کرسکتا تھا۔ مردشناسی بھی بلا کی تھی، کسی آدمی کے صرف ظاہر کو دیکھ کر آپ کبھی متاثر نہ ہوتے، خوشامد اور چاپلوسی کا آپ کی زندگی میں گزر نہ تھا، محض مال کی وجہ سے بڑے سے بڑے سرمایہ دار کا خاص اکرام کرتے ہوئے آپ کو نہیں دیکھا گیا۔ اس کے برخلاف اہل صلاح اور اہل علم کی تعظیم اور قدردانی میں کوئی کمی نہ فرماتے، بلکہ اُن کی خدمت میں نیازمندانہ حاضر ہوتے تھے۔

حضرت والا کا خاص کر اپنے چھوٹوں اور شاگردوں کے ساتھ عجیب وغریب شفقت کا معاملہ تھا، اُن کی دینی خدمات اور سرگرمیوں پر دل کھول کر شاباشی دیتے اور بالکل ایک حقیقی باپ کی طرح مسرت کا اظہار فرماتے تھے۔ اکثر آپ کے شاگرد اپنی تالیفات پر آپ سے تقریظ لکھوانے کے متمنی رہتے تھے، چنانچہ آپ حوصلہ افزائی کی خاطر کسی شاگرد کی درخواست کو رد نہ فرماتے، اور نہایت نپے تلے انداز میں تقریظ تحریر فرماکر ہمّت افزائی کرتے تھے۔ بلا شبہ سیکڑوں کتابوں اور رسائل میں آپ کی تقریظات شائع شدہ ہیں۔

آپ کی پیدائش ۹؍مارچ ۱۹۴۰ء کو علی گڑھ میں ہوئی، جہاں آپ کے والد منشی فراست علی صاحب بسلسلہ ملازمت مقیم تھے، آپ کا اصل وطن قصبہ ’حبیب والا‘ ضلع بجنور ہے، اور سلسلہ نسب میز بانِ رسول سیّدنا حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ ابھی آپ کی عمر کل پانچ سال کی تھی کہ والد ماجد کا انتقال ہوگیا، آپ نے شروع میں وطن ہی میں پرائمری اسکول میں تعلیم حاصل کی، لیکن والد محترم کی وفات کی وجہ سے گزر بسر کا معقول انتظام نہ تھا، اس مایوسی کے عالم میں آپ کے پھوپھا حضرت مولانا سلطان الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ سابق ناظم کتب خانہ دارالعلوم دیوبند نے ۱۹۵۱ء میں اللہ کی توفیق سے آپ کی پرورش اور تربیت کی ذمہ داری لی، اور آپ کو اپنے ساتھ دیوبند لے آئے۔ اور دیوبند میں گھر پر رکھ کر آپ کی بالکل سگی اولاد کی طرح مکمل کفالت فرمائی، تا آنکہ آپ نے

۱۹۵۸ء میں دارالعلوم دیوبند سے اوّل نمبر سے تعلیم مکمل فرمائی، بعد میں ۱۹۶۴ء میں حضرت مولانا سلطان الحق صاحبؒ نے اپنی لختِ جگر سے آپ کا نکاح بھی کردیا۔ حضرت والا، مولانا سلطان الحق صاحب مرحوم کے احسانات کو ہمیشہ یاد رکھتے تھے، اور اُن کی بڑی قدر فرماتے تھے۔

دارالعلوم سے فراغت کے بعد بھی آپ نے اپنے خاص اُستاذ اور مربی فخرالمحدثین حضرت مولانا سیّد فخرالدین احمد صاحب نوراللہ مرقدہٗ شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند کی مجالس اور دروس میں شرکت اور استفادہ کا سلسلہ جاری رکھا، اور حضرت کے درسی افادات کو 'ایضاح البخاری' کے نام سے شائع کرنا شروع فرمایا، جس کی اب تک الحمدللہ ۹ ضخیم جلدیں شائع ہوچکی ہیں اور مقبول ہیں۔ بخاری شریف کی اُردو شروحات میں اس شرح کو ممتاز مقام حاصل ہے۔ حضرت الاستاذ نے اس کی تکمیل کے لیے بطور معاون دارالعلوم کے جواں سال اُستاذ فاضل گرامی حضرت مولانا مفتی فہیم الدین صاحب بجنوری زید علمی کو ذمہ داری سپرد کی تھی، جسے موصوف بخوشی انجام دے رہے ہیں، اور اُمید ہے کہ جلد ہی اس شرح کی مکمل اشاعت ہوجائے گی، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

دارالعلوم سے فارغ ہونے کے بعد چونکہ معاش کا کوئی بظاہر ذریعہ نہ تھا، اس لیے کچھ دن دہلی میں الجمعیۃ پریس اور بک ڈپو میں ملازمت کی، پھر دیوبند آکر کتابت کو ذریعہ معاش بنایا، اور اپنے ہاتھوں سے 'ایضاح البخاری' کے ابتدائی اجزاء اور 'تاریخ اسلام' (نجیب آبادی) کی کتابت کرکے اُنھیں خود ہی شائع کیا، اور اس سے کسی طرح گزر بسر ہوتا رہا۔ پھر حروفِ مقطعات والی چاندی کی انگوٹھی کا کام شروع کیا، اس میں اللہ نے خوب برکت دی، اور کچھ فراوانی ہوئی۔ آپ نے زندگی کا بڑا حصہ محلّہ لال مسجد کے ایک تنگ مکان میں گزارا، جو 'کاشانۂ رحمت' کہلاتا تھا، تاہم آپ کے حسن انتظام اور کفایت شعاری کی بدولت اخیر میں محلّہ 'خانقاہ' میں اللہ تعالیٰ نے وسیع مکان کا انتظام فرمادیا۔ احقر سے کئی مرتبہ بڑے تاثر سے فرمایا کہ: ''بیٹا! کام کرو تمھارے لیے راستے کھلے ہوئے ہیں، ہم تو جن حالات سے گزرے ہیں اُن کی وجہ سے کتنے ارادے دل ہی میں رہ گئے۔''

۱۹۷۲ء میں دارالعلوم میں درجہ عربی ابتدائی میں آپ کا تقرر ہوا، پھر ۱۹۷۶ء میں درجۂ وسطیٰ میں ترقی ہوئی، ۱۹۸۲ء میں درجہ وسطیٰ الف کا گریڈ ملا، اور ۱۹۸۴ء میں باقاعدہ ناظم مجلس تعلیمی مقرر کیے گئے۔ آپ کے دور نظامت میں تعلیمات کے شعبہ میں کافی سدھار ہوا، بالخصوص امتحانات کا صاف شفاف نظام قائم کیا گیا جو اَب تک جاری ہے۔ اسی دوران آپ نے دو سال تک ماہنامہ 'دارالعلوم' کی ادارت کی ذمہ داری بھی نبھائی، اور بعد میں 'شیخ الہند اکیڈمی' کے نگراں کے عہدہ پر بھی فائز رہے۔ آپ نے 'شوریٰ کی شرعی حیثیت' کے نام سے ایک مدلل تالیف بھی فرمائی، جو اپنے موضوع پر ایک معتبر کتاب سمجھی جاتی ہے۔ اجتماعی معاملات میں آپ ہمیشہ ادارے کا مفاد مقدم رکھ کر مشورے دیا کرتے تھے، چنانچہ حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب بجنوری نوراللہ مرقدہٗ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند اہم معاملات میں آپ سے مشورے لیتے تھے، اور آپ کی رائے کو وقعت دیتے تھے۔ موجودہ انتظامیہ کے ساتھ بھی آپ کا رویہ ناصحانہ اور خیرخواہانہ تھا۔ اکابر واسلاف کے فکر پر آپ مضبوطی سے قائم تھے، اور جادۂ حق سے معمولی انحراف بھی آپ کو پسند نہ تھا۔ جمعیۃ علماء ہند اور اُس کی فکر سے آپ بچپن سے وابستہ رہے، تا آں کہ عمر کے آخری دس سالوں میں جمعیۃ علماء ہند کے مرکزی نائب صدر کے منصب پر بھی فائز رہے۔ اور جب 'مباحثہ فقہیہ جمعیۃ علماء ہند' کے فقہی اجتماعات کا سلسلہ شروع ہوا، تو جب تک صحت رہی اُن کی نظامت کی ذمہ داری آپ کے سپرد ہوتی تھی، جسے آپ پوری کامیابی سے انجام دیتے تھے۔

آپ کو شعر وادب کا صاف ستھرا ذوق بھی عطا ہوا تھا، جو آپ کی فطری ذہانت وذکاوت سے ہم آہنگ تھا، جس کو اُستاذ الشعراء حضرت مولانا محمد عثمان کاشف الہاشمیؒ کی رفاقت نے دوآتشہ بنادیا تھا، چنانچہ آپ کے قلم سے ایسے بلند پایہ پاکیزہ اشعار صادر ہوئے جو زباں زدِ خاص وعام ہوگئے۔ بالخصوص دارالعلوم دیوبند اور جمعیۃ علماء ہند کا بہترین ترانہ آپ کی یادگار ہے، اُن کے علاوہ آپ نے جو نعتیں یا غزلیں لکھیں، اُن سے آپ کی فکری لطافت اور حسن ذوق کا بآسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یہ سب تخلیقات 'نغمۂ سحر' کے نام سے ۱۴۴ صفحات پر مشتمل کتاب میں شائع کردی گئی ہیں۔ باذوق حضرات اُس سے محظوظ ہوسکتے ہیں۔

آپ کے تین صاحب زادے ہیں: مولانا محمد سفیان صاحب قاسمی، مولانا قاری محمد عدنان صاحب قاسمی مقیم حال دارالعلوم شگاگو امریکہ اور مولانا مفتی محمد سعدان صاحب قاسمی اُستاذ معہد انور دیوبند۔ ماشاء اللہ تینوں دارالعلوم سے فارغ ہیں، اور خدمات میں لگے ہوئے ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت الاستاذ کے درجات بلند فرمائیں، متعلقین کو صبر جمیل سے نوازیں، اور ہم سب کو آپ کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین۔ □□

مولانا ریاست علی ظفر بجنوریؒ — مایۂ ناز استاد اور قادر الکلام شاعر

اداریہ ماہنامہ 'براہین' دہلی —— از: **مولانا عطاء الرحمٰن قاسمی**

دار العلوم دیوبند کے نامور علماء وفضلا میں (قطع نظر علوم قرآن وحدیث) اُردو وزبان وادب، تاریخ وثقافت کے حوالے سے شہرت وناموری کی بلندیوں پر فائز ممتاز شخصیات میں مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا تاجور نجیب آبادی، مولانا سعید احمد اکبر آبادی، عامر عثمانی، مولانا حامد الانصاری غازی، مولانا ازہر شاہ قیصر اور مولانا ریاست علی ظفر بجنوری اہم نام ہیں جو آسمان اُردو زبان و ادب کے آفتاب ومہتاب کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مولانا ریاست علی ظفر بجنوری دار العلوم دیوبند کے مایہ ناز استاد حدیث وتفسیر ہونے کے ساتھ اُردو زبان وادب کے قادر الکلام شاعر وادیب تھے، عربی و فارسی زبان و ادب سے بھی آپ کا گہرا تعلق تھا، وہ فن عروض وقوافی کے بھی ماہر تھے، علم معانی وبیان پر بھی ان کی گہری وعمیق نظر تھی، وہ علم ومعانی و بیان کے رموز و اسرار کا محض واقف و جانکار ہی نہیں بلکہ علم معانی وبیان کو پڑھاتے بھی تھے، ان کا درس بڑا مقبول تھا وہ اپنی فصاحت وبلاغت کے ذریعہ طلبا کے دلوں اور ان کے قلوب کو موہ لیتے تھے۔ ان کا تخلص ظفر تھا، وہ قدرت کی طرف سے شعر وشاعری کا بڑا صاف وستھرا اور نکھرا ہوا ذوق و مذاق لے کر آئے تھے، شاعر تو دراصل تلمیذ الرحمٰن ہوا کرتا ہے، مناظر فطرت کی ترجمانی اس کے مقصد زندگی اور وظیفہ حیات ہوتی ہے۔ مولانا ظفر بجنوری کو اسی زمرہ میں شمار کیا جاسکتا ہے، لیکن ان کی اعلیٰ ظرفی اور بلند کرداری تھی کہ ایک گمنام شاعر مولانا محمد عثمان کاشف الہاشمی کو شعر وشاعری میں اپنا استاد مانتے تھے اور ان سے اصلاح سخن لینے کا اقرار کرتے تھے۔ مولانا کاشف الہاشمی دیوبند کے اطراف کے ایک گاؤں راجوپور کے رہنے والے تھے، اور کچھ دن دیوبند میں بھی رہے ہیں لیکن تھے بڑے غضب کے آدمی، حضرت جگر مرادآبادی کے بعض اشعار پر بھی تنقید کرتے تھے، خود مولانا ریاست علی ظفر بجنوری کے شعر کا پایہ کوئی کم بلند نہ تھا، وہ قدیم اساتذہ کی سوچ وفکر کے شاعر تھے، اُردو زبان و بیان اور محاورات پر استادانہ عبور وکمال رکھتے تھے بلکہ بعض اساتذہ کے کلام کے بھی ناقد تھے، اور ان سے بڑھ کر نہ سہی لیکن ان کے ہم پلہ ضرور تھے، مولانا ریاست علی ظفر بجنوریؒ کا شاہ کار ادبی کارنامہ ان کا تخلیق کردہ ترانہ دار العلوم دیوبند ہے۔

ہندستان کے دو قومی وملی ادارے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور دار العلوم دیوبند اسلامیان ہند کے دِلوں کی دھڑکن کی حیثیت رکھتے ہیں، اوّل الذکر کے قومی ترانہ کا خالق اسرار الحق مجاز لکھنوی اور آخر الذکر کے ملی ترانہ کا تخلیق کار مولانا ریاست علی ظفر بجنوریؒ تھے، ان دونوں کو اپنی اپنی مادر علمی سے محبت ہی نہیں بلکہ عشق تھا، ان دونوں مایہ ناز سپوتوں نے اپنی اپنی دانش گاہوں اور درسگاہوں کی محبت وعشق میں ڈوب کر ترانہ گنگنایا ہے اور نونہالان امت کو نعمت لازوال سے مالا مال کیا ہے۔ مجاز لکھنوی نے مسلم یونیورسٹی کے ترانہ کا آغاز اپنے اس شعر سے کیا ہے:

یہ میرا چمن ہے، میرا چمن، میں اپنے چمن کا بلبل ہوں
سرشاز نگاہ نرگس ہوں، پابستہ گیسوئے سنبل ہوں

مولانا ریاست علی ظفر بجنوریؒ نے ترانہ دار العلوم دیوبند کی ابتداء اس شعر سے کیا ہے:

یہ علم و ہنر کا گہوارا، تاریخ کا وہ شہ پارہ ہے
ہر پھول یہاں اِک شعلہ ہے، ہر سرو یہاں مینارہ ہے

پھر مجاز لکھنوی نے مسلم یونیورسٹی کی تاریخ اور ابناء یونیورسٹی کے جذبات و کردار کو سامنے رکھتے ہوئے یہ شعر کہا ہے:

ذرات کا بوسہ لینے کو سو بار جھکا آکاش یہاں
خود آنکھ سے ہم نے دیکھی ہے باطل کی شکست فاش یہاں

مولانا ریاست علی ظفر بجنوریؒ بھی دار العلوم دیوبند کی روشن وتابناک تاریخ اور اس کے بانیان و موسسان اور اس کے ابناء کے سرفروشانہ اور مجاہدانہ کردار کو مدنظر رکھتے ہوئے نعرہ توحید بلند کیا ہے اور طالبان علم نبوت کو پیغام دیا ہے:

کہسار یہاں دَب جاتے ہیں، طوفان یہاں رک جاتے ہیں
اس کاخ فقیری کے آگے شاہوں کے محل جھک جاتے ہیں

مجاز لکھنوی نے علی گڑھ کا ترانہ، دیوبند کے ترانہ سے بہت پہلے کہا تھا، گرچہ دار العلوم دیوبند کے مقابلے میں مسلم یونیورسٹی کا ترانہ مختصر ہے، دار العلوم دیوبند کا ترانہ ذرا طویل ہے، جس میں ۳۱ را شعار ہیں، مولانا محمد قاسم نانوتوی اور ان کے رفقاء کے ساتھ نامور فضلاء دار العلوم دیوبند کے ناموں کا بھی ذکر ہے، لیکن مجاز لکھنوی کا کہا ہوا یہ ترانہ ہے۔ جس کا اسلوب نرالا ہے، جس کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ مجاز نے اپنے مخصوص رنگ وآہنگ میں کہا ہے، جس کا وہ موجد اور خاتم ہے، مجاز لکھنوی اور ظفر بجنوری کے ترانوں میں موازنہ و

مقابلہ سے قطع نظر دونوں ترانے اُردو زبان و ادب کے شاہکار نمونے ہیں، جب یہ ترانے پڑھے جاتے ہیں تو طلباء اور سامعین کے اندر بڑا جوش وولولہ پیدا ہوتا ہے، کہتے ہیں کہ یونیورسٹی کے ترانہ کو موسیقار اعظم نوشاد نے دھن دیا ہے، لیکن ترانہ دارالعلوم دیوبند بلا دھن ہی گایا جاتا ہے، تو مجمع پر خاص کیفیت طاری ہوجاتی ہے:

مولانا ریاست علی ظفؔر بجنوریؒ تمام اصناف سخن پر قادر تھے، تغزل میں ان کا خاص مقام حاصل تھا، نعت گوئی میں طاق تھے، عشق نبوی میں ڈوب کر نعت کہتے تھے، آپ نے طبع زاد نعتیں کہی ہیں اور قدیم فارسی نعتوں کے منظوم ترجمے بھی رقم کئے ہیں۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی نے فارسی زبان میں معرکۃ الآراء نعت کہی ہے یہ نعت بہت ہی اہم ہے، مولانا ریاست علی ظفر بجنوریؒ نے اس کا اُردو زبان میں منظوم ترجمہ کیا ہے، مولانا نانوتوی کی فارسی نعت اور مولانا ریاست ظفر بجنوریؒ کا منظوم ترجمہ ملاحظہ فرمائیں۔ فارسی نعت:

ساقیا سیرم زمے ، خاک درمیخانہ ام
ازلب شیریں بدہ لذت بیک پیمانہ ام
جان یا جاناں ، بگوخوانم ترایا جان جاں
اصطلاح شوق بسیار است ومن دیوانہ ام
آتش عشق تو افتاد است درجان وتنم
سوختی یکسر فدایت جانِ من کاشانہ ام
ازمن خستہ چہ می پرسی کہ قاسم کیستی
گر گلے من بلبلم ور شمع من پروانہ ام

ترجمہ اُردو:

یہ فریب مے نہ دے، اے روح میخانہ مجھے
چاہیے صہبائے لب سے شغلہ پیمانہ مجھے
جان یا جاناں کہیں اس کو کہ جانِ جاں لکھیں
کردیا تعبیر کی کثرت نے دیوانہ مجھے
پھونک ڈالا جان وتن کو شعلہ ہائے عشق نے
اے میں قرباں! بس ہے یہ تقدیس کا شانہ مجھے
یاد ہیں قاسم کو پائے گل پہ بلبل کے سجود
شمع محفل جانتی ہے اپنا پروانہ مجھے

مولانا ریاست علی ظفؔر بجنوریؒ کے نعتیہ اشعار کے اسلوب بیان پر تفصیلی گفتگو کا موقع نہیں ہے، لیکن اجمالی طور پر اس کا ذکر نا بے محل بھی نہیں ہے کہ وہ ذات اقدس سے عشق ہی نہیں کرتے بلکہ ارض مقدس سے بھی محبت کرتے نظر آتے ہیں، ان کا ایک نعتیہ شعر ہے، جس سے میرے دعوے کی تائید ہوسکتی ہے۔ مولانا ظفر بجنوریؒ کا نعتیہ خوبصورت شعر ہے:

چلا ہوں سوئے حرم اور کہکشاں بردوش
فریب زیست نے رکھا تھا زیر دام مجھے

مولانا ریاست علی ظفؔر بجنوریؒ کو متقدمین ومتاخرین کے شعری سرمائے اور ان کے ادبی اثاثے پر عمیق نظر تھی اور ان کے اشعار کے محاسن ومعائب سے بھی کماحقہٗ باخبر تھے، انھوں نے قدیم اساتذہ کے بعض ضرب الامثال قسم کے شعروں کے مضامین کو باندھا ہے اور ابتدائی دور میں ان مضامین میں کچھ عمدہ اشعار بھی رقم کیے ہیں، جن سے ان کی وسعت نظر اور وسعت مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے، مرزا اسداللہ غالب کا مشہور شعر ہے، جو ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے، اور زبان زد خاص وعام ہے:

وہ آئیں گھر میں ہمارے ، خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو ، کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

مرزا غالبؔ کا جو شعری مرتبہ ومقام ہے، اس کا تقابل وموازنہ مقصود ومطلوب نہیں ہے، اور نہ ہی یہ ممکن ہے، محض ایک کوشش وکاوش کا ذکر مقصود ہے، اور فیصلہ باذوق قارئین کے سپرد ہے، اسلام میں اکرام ضیف اور ضیافت کی بڑی اہمیت ہے، جس کی وضاحت غیر ضروری ہے، مولانا ریاست علی ظفؔر بجنوریؒ اسی مفہوم کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک خوبصورت شعر کہا ہے، اور ندرت خیال کا اظہار کیا ہے، اور غالب کی زمین میں کچھ کہنے کی کوشش اور جسارت کی ہے باالفاظ دیگر بڑی حد تک سادگی و برجستگی میں پیروی غالب کی ہے، مولانا کا شعر ہے:

نادم ہوں واقعی کرم بےحساب سے
خوش آمدید آپ کہاں میرا گھر کہاں

حکیم مومن خاں مومؔن غالبؔ کے معاصر اور غالبؔ کی سطح کے شاعر ہیں لیکن مومن خاں مومؔن کو ان کی مومنانہ شان اور مزاج استغناء کی بنا پر وہ جائز مقام نہ مل سکا، جس کے وہ بجا طور پر مستحق تھے، زندگی میں انھیں مذہبی ہونے کی وجہ سے وہابیت کا طعنہ بھی سننا پڑا، حالانکہ ان کا جرم بس اتنا تھا کہ وہ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے مرید تھے اور انگریزوں کے مخالف تھے، انھوں نے ایک اچھوتا اور آبدار شعر کہا ہے، جس کو سن کر مرزا غالب بھی پھڑک گئے تھے اور جس کے عوض میں اپنا دیوان بھی دینے کی پیشکش کرڈالی تھی، حکیم مومن خاں مومؔن نے کہا تھا:

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

مولانا ریاست علی ظفؔر بجنوریؒ نے حکیم مومن خاں مومؔن کی تتبع میں یہ

شعر کہا ہے:

تب کھلا آپ ہیں شریک سفر
میرے ہم راہ کوئی جب نہ ہوا

مولانا ریاست علی ظفر بجنوریؒ کا مجموعہ کلام 'نغمہ سحر' نام سے شائع ہو چکا ہے جو آج بھی دیوبند کے مکتبوں میں دستیاب ہے، مولانا کی دوسری کتابیں بھی ملتی ہیں، آپ نے امام بخاری کی کتاب صحیح البخاری کی شرح 'ایضاح البخاریؒ' کے نام سے متعدد جلدیں مرتب کی ہیں، یہ شرحیں دراصل آپ کے استاد مولانا سیّد فخر الدین سابق صدر مدرسین دارالعلوم دیوبند کی درسی تقریریں ہیں، جنھیں مولانا ریاست علی ظفرؔ بجنوریؒ نے دوران درس قلم بند کیا ہے، اور انھیں تقریروں کو کتابی شکل میں طلبہ دورہ حدیث کے لیے ایک نایاب تحفہ کی صورت میں پیش کیا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ مولانا کا یہ علمی کام انھیں برابر زندہ وتابندہ رکھے گا اور ذخیرہ آخرت بھی ثابت ہوگا، مولانا نے ان کے علاوہ بھی گرانقدر علمی کام کیا ہے، جن کا احاطہ اس مختصر مضمون میں ممکن نہیں ہے، لیکن سچ بات یہ ہے کہ مولانا ریاست علی ظفرؔ بجنوریؒ جن صلاحیتوں اور قابلیتوں کے حامل تھے، ان کی ان غیر معمولی صلاحیتوں اور قابلیتوں کے مطابق علمی کام نہ ہوسکا ہے، جس کے اسباب کچھ بھی ہوسکتے ہیں، مولانا ریاست علی ظفرؔ بجنوریؒ کا شمار دارالعلوم دیوبند کے ان اساتذہ میں ہوتا ہے، جنھوں نے اپنی تمام صلاحیتوں اور قابلیتوں کو اپنے طلبہ کے لیے وقف کر رکھا تھا، مولانا مرحوم کی کوشش ہوتی تھی کہ ہر سطح کا طالب علم آپ کی بات سمجھ جائے، جس کے لیے وہ مختلف پیرائے اور مختلف اسلوب میں اپنی باتیں کہتے تھے، دوران درس کوئی طالب علم کوئی سوال کرتا تھا تو آپ بڑی سنجیدگی ومتانت سے سوال سنتے تھے، پھر بڑے باوقار طریقہ سے افہام وتفہیم کے انداز میں جواب دیتے تھے، اور جواب بھی کچھ ایسے نرم لہجے میں دیتے تھے کہ سائل کا حوصلہ پست ہونے کے بجائے حوصلہ بلند ہو جاتا تھا، اور سائل کو اپنی صلاحیت کا احساس ہونے لگتا تھا، وہ بعض معاصر اساتذہ کے تفوق مزاجی پر طنز کرتے تھے، اور اپنی سادگی اور حلم و بردباری سے اپنی قابلیت وصلاحیت کو چھپانے اور مستور رکھنے کا جتن بھی کرتے تھے، مجھے یہ سعادت حاصل ہے کہ میں ان کا شاگرد رہا ہوں، ان سے متعدد کتابیں پڑھی ہیں اور ان سے برابر استفادہ کرتا رہا ہوں وہ مجھے بھی عزیز رکھتے تھے، کبھی کبھی مجھے ناصحانہ کلمات سے بھی نوازتے تھے، ایک دفعہ دارالعلوم وقف دیوبند میں فقہ کے موضوع پر ایک پروگرام تھا، اتفاق سے میں بھی مدعو تھا، مجھے آپ کی موجودگی میں اظہارِ خیال کرنا پڑا جو میرے لیے اعزاز کی بات ہے، طلبہ دارالعلوم وقف دیوبند کا بڑا مجمع تھا، میں نے سوچا کہ مجھے اس مجمع میں حضرت شاہ ولی اللہ محدثؒ کے حوالے سے کچھ کہنا چاہیے، میں نے کہا کہ شاہ صاحب نے فروز شاہ کوٹلہ میں دوران ختم بخاری کے ایک تحریر رقم کی تھی، جس میں اپنے مسلک کو بیان کیا تھا، یہ نسخہ بخاری خدا بخش لائبریری پٹنہ میں موجود ہے، یہ نسخہ برسوں شاہ صاحب کے درس میں رہا ہے، شاہ صاحب خود اپنے ہاتھ سے اپنا مسلک تحریر فرمایا ہے: ''**كتب بيده الفقير الى رحمة الله الكريم الودود، ولى الله بن عبدالرحيم بن وجيه الدين العمرى نسبا.**''

میں نے مذکورہ عبارت کا حوالہ دیتے ہوئے عرض کیا تھا کہ ہمیں بھی شاہ صاحب کے مسلک پر عمل کرتے ہوئے دورانِ درس غیر جانبدار رہنا چاہیے اور حدیث کی کتاب کو فقہ کی کتاب نہیں بنانا چاہیے، شاہ صاحب کی توسع پسندی اور وسعت نظری کو اپنانا چاہیے، چونکہ ہم سبھی لوگ شاہ صاحب کے پیروکار اور متبع ہیں۔

مولانا ریاست علی ظفرؔ بجنوریؒ مرحوم میری بات غور سے سنتے رہے، کسی نے مجھ سے کچھ نہیں کہا حالانکہ اسٹیج پر موقر علماء اور اساتذہ دارالعلوم دیوبند اور دارالعلوم وقف بھی موجود تھے، حضرت مولانا محمد سالم قاسمی صاحب اور مولانا قاری محمد عثمان منصوری صاحب بھی تشریف فرما تھے، جب میں اسٹیج سے اتر کر بیٹھا تو حضرت مولانا ریاست علی بجنوریؒ صاحب نے مسکراتے ہوئے فرمایا، مولوی عطاء الرحمٰن آپ نے اپنی تقریر میں کچھ زیادہ ہی توسع پسندی کی ترغیب دلا دی ہے، میں مسکراتا رہا۔

مولانا ریاست ظفر علی بجنوریؒ کی ایک ایک امتیازی خصوصیت کا ذکر خالی از دلچسپی نہ ہوگا، بالخصوص اس مادی دور میں جبکہ ہر سطح پر استحصال کیا جاتا ہے، استاد اور شاگرد کا پاکیزہ رشتہ بھی مفاد پر مبنی ہونے لگا ہے، بے رحم استاد شاگرد سے محنت ومشقت کرانے کے ساتھ اسے زیر بار کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے ہیں، اور شاگرد کو منفعت کا ذریعہ تصور کر بیٹھتے ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، اور بہت پرانی بات ہے جب میں دارالعلوم دیوبند میں زیر تعلیم تھا، رمضان المبارک کی چھٹیاں ہو رہی تھیں، میں حضرت مولانا ریاست علی صاحب سے ملنے ان کے پرانے گھر پر گیا، اور عرض کیا کہ حضرت میں وطن جا رہا ہوں، مولانا فرمانے لگے، مولوی عطاء الرحمٰن سنا ہے کہ مظفر پور کی لیچی بہت مشہور ہے ہوسکے تو واپسی میں مظفر پور سے لیچی کے دو چار پودے لیتے آنا، میں نے محلّہ خانقاہ کے نزدیک تھوڑی زمین لے لی ہے، میرا جی چاہتا ہے کہ میں اس میں چند پودے لگا دوں، جب میں رمضان المبارک کی چھٹیاں گزار کر دیوبند آیا تو لیچی کے پودے بھی لیتے آیا، حضرت مولانا لیچی کے پودوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور فرمانے لگے مولوی عطاء الرحمٰن

بڑے خوبصورت پودے لائے ہو، پھر مجھ سے فرمایا کہ کتنے میں پودے ملے ہیں میں نے کہا کہ حضرت قیمت مت پوچھئے آپ کی خدمت میں یہ ہدیہ ہے، لیکن حضرت مولانا نے مجھے باصرار قیمت عنایت فرمائی، اور ڈھیر ساری دعاؤں سے نوازا، دہلی آنے کے بعد دیوبند کم ہی جانا ہوتا ہے اتفاق سے دو سال قبل دیوبند جانا ہوا، میں ان کے پرانے گھر پہنچ گیا، معلوم ہوا کہ حضرت مولانا نے اپنی رہائش تبدیل کردی ہے، اور محلّہ خانقاہ کے قریب رہائش اختیار کر لی ہے، پھر مجھے پیچھلی کے پودے یاد آئے جنھیں میں بڑے پیار سے لایا تھا اور سوچا کہ محلّہ خانقاہ چلتا ہوں، حضرت سے ملاقات کروں گا اور ان پودوں کو بھی دیکھ لوں گا جواب شجر سایہ دار اور شجر مثمر ہوگئے ہوں گے، میں نئی آبادی میں گھر پوچھتے پوچھتے حضرت کے در دولت پر حاضر ہوا، اور دروازہ بہت دیر تک کھٹکھٹاتا رہا لیکن اندر سے کوئی آواز نہ آسکی، مایوس ہوکر واپس آ گیا، اس کے بعد پھر اس دنیائے آب وگل میں حضرت مولانا ریاست علی ظفر بجنوریؒ صاحب سے ملاقات نہ ہوسکی، سنا کہ وہ کبھی کبھی جمعیت کی میٹنگوں میں دہلی بھی آتے جاتے تھے لیکن دہلی میں بھی ملاقات کی شکل پیدا نہ ہوسکی تھی۔

بالآخر ۲۰ رمئی ۲۰۱۷ء کو صبح خبر ملی کہ حضرت مولانا ریاست علی ظفر بجنوریؒ کا انتقال ہوگیا ہے یہ خبر سن کر میں سکتہ میں آ گیا، کچھ سنبھلنے کے بعد برادر محترم مولانا محمد یوسف قاسمی صاحب کو فون کیا تو انھوں نے (جوان کے معتقد خاص اور میرے دیرینہ کرم فرما ہیں غالباً، ۱۹۷۷ء میں حضرت مولانا ریاست علی ظفر بجنوریؒ کی مجلس میں ان سے میری پہلی مرتبہ ملاقات ہوئی تھی) بتایا کہ آج صبح ۴ بجے شوگر کی کمی کی وجہ سے انتقال ہوا ہے، میں تدفین میں شرکت کے لیے دیوبند آیا ہوں، حضرت مولانا کی تدفین مزار قاسمی میں ہوگی میں نے کہا کہ مجھے پہلے سے اطلاع ہوتی تو میں بھی تدفین میں شریک ہوجاتا بلاشبہ حضرت مولانا کے انتقال سے ایک دور کا خاتمہ ہوگیا اور میرے ذہن میں یہ شعر بہت دیر تک گونجتا رہا:

جان کر منجملہ خاصان میخانہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

آہ! حضرت مولانا ریاست علی ظفر بجنوری

از: ڈاکٹر انظار الحق ساجد فاروقی صاحب علی گڑھ

وہ بزم آرزو کا نگہباں چلا گیا
اورنگ جستجو کا سلیماں چلا گیا

جس پھول کی مہک میں چھپا تھا سکونِ دل
وہ گل مہک غزل کا گلستاں چلا گیا

اب آنسوؤں کو جذب کریں تو کہاں کریں
پھیلا ہوا خلوص کا داماں چلا گیا

آواز دیں تو کون سی محفل میں دشت میں؟
اپنوں کی عظمتوں کا ثنا خواں چلا گیا

پائیں گے کس سے داد زبان و بیان کی
بزمِ سخن سے آج سخن داں چلا گیا

وہ راہِ ترمذی و بخاری کا سنگِ میل
دینِ محمدی کا دبستاں چلا گیا

جن بے کسوں کے واسطے تھا وہ سکونِ زیست
اُن بے کسوں کے درد کا درماں چلا گیا

شکوہ کسی کو تھا نہ شکایت کسی سے تھی
اِک ایسا درمیان سے انساں چلا گیا

تارِ نفس سے توڑ کر اَب رشتۂ حیات
دنیا سے ہائے غیرتِ ایماں چلا گیا

اُس کی سرشتِ پاک، شریعت کا آئینہ
سرتاپا جشن فکرِ فروزاں چلا گیا

قائم تھا اُس کے دم سے جو محفل میں ارتباط
ساجدؔ وہ ارتباطِ دل و جاں چلا گیا

نذرانۂ عقیدت

بروفات صدیق محترم حضرت مولانا ریاست علی صاحب نوراللہ مرقدہٗ

استاذ حدیث و سابق ناظم تعلیمات دارالعلوم دیوبند

نتیجۂ فکر:

حضرت مولانا مفتی قاری محمد اصغر صاحب (شیخ الحدیث وناظم تعلیمات جامعہ عربیہ خادم الاسلام ہاپوڑ)

ریاست علی ہر ایک کے دل دار چل بسے ۔۔۔ بے کس کے مفلسوں کے غمخوار چل بسے

سونی ہوئی ہے مسندِ درسِ حدیث آج ۔۔۔ دارالعلوم کے سرِ اخیار چل بسے

مرجھا گیا ہے ہر گلِ تر چمن میں آج ۔۔۔ وجہِ بہار و رونق گلزار چل بسے

ڈھونڈیں کہاں پہ مخزنِ علم و ہنر کو ہم ۔۔۔ چمکے سے شب میں مشعلِ انوار چل بسے

سلجھائی جس نے گتھیاں الجھے مقام کی ۔۔۔ افسوس ایسے زیرک و ہشیار چل بسے

فیضانِ علم اُن کا پہنچا جہان میں ۔۔۔ وہ راہبر وہ عالمِ بیدار چل بسے

ہوتا تھا ان سے مشورہ مشکل امور میں ۔۔۔ وہ صاحبِ بصیرت و ابصار چل بسے

ہے اب کہاں وہ مجمعِ احباب و اصدقاء ۔۔۔ کرکے اُداس مجلس و دربار چل بسے

لبیک کہہ کے قاصدِ رب کے قریں ہوئے ۔۔۔ اِک آن ہی میں چھوڑ کر گھر بار چل بسے

باقی رہے گا شاہکار 'نغمۂ سحر' ۔۔۔ وقتِ سحر وہ شاعرِ دُربار چل بسے

'ایضاح' بھی یقیناً لاثانی یادگار ۔۔۔ کرکے مرادِ شیخ کا اظہار چل بسے

روئیں گے یاد کرکے انھیں رہروانِ علم ۔۔۔ بحرِ علوم و شستۂ گفتار چل بسے

سنسان میکدہ ہے مئے خوار منتظر ۔۔۔ ساقی تو رب کے پاس پری وار چل بسے

مغموم و غمزدہ ہیں احباب و اقرباء ۔۔۔ وہ خود قرینِ رب پئے دیدار چل بسے

سفیان کیا عدنا ان بھی غرقابِ غم ہوئے ۔۔۔ سعداں کو کرکے غم کا بیمار چل بسے

کس کس ادا کو ذکر کرے اصغرِ حزیں ۔۔۔ دنیا سے ایک صاحبِ انوار چل بسے

رب کی رضا و جنتِ فردوس ہو عطا ۔۔۔ خوش خلق و خوب روخوش اطوار چل بسے

شستہ زبان وگفتگو ونرم وحسین تھے
شیریں مثال وصاحبِ کردار چل بسے

دارالعلوم دیوبند کا ایک مردِ ذکی — حضرت مولانا ریاست علی ظفرؔ بجنوری رحؒ

تحریر: مولانا نور عالم خلیل امینی
چیف ایڈیٹر 'الداعی' عربی واستاذ ادبِ عربی دارالعلوم دیوبند

یاد سے تیری، دلِ دردآشنا معمور ہے
جیسے کعبے میں دعاؤں سے فَضا معمور ہے

شنبہ: ۲۳رشعبان ۱۴۳۸ھ-۲۰رمئی ۲۰۱۷ء کو یہ راقم اپنے معالجین کے مشورے کے مطابق، اپنی رہایش گاہ افریقی منزل قدیم، نزد چھتّہ مسجد کے صحن میں نماز فجر کے بعد چہل قدمی کررہا تھا کہ دارالعلوم کی مسجدِ قدیم کے مناروں سے بلند ہونے والے اِس اِعلان نے انتہائی حزن وملال کے ساتھ بے پایاں حیرت میں ڈال دیا کہ دارالعلوم کے استاذ حدیث حضرت مولانا ریاست علی بجنوری کا ابھی ذرا دیر پہلے انتقال ہوگیا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ راقم کے تجسس کے بعد اس کو معلوم ہوا کہ اذانِ فجر سے قبل، اُن کو سانس لینے میں تکلیف محسوس ہوئی تو اُنھوں نے فرزندِ اکبر مولانا سفیان سلّمہٗ کو فون کیا، وہ کسی قریب کے ڈاکٹر کو بلانے گئے کہ اتنے میں اُن کی روح پرواز کرگئی۔ وقت کوئی ساڑے چار بجے صبح کا تھا۔

مرحوم کی وفات کے اعلان پر حیرت اِس لیے ہوئی کہ اُن کے متعلق معلوم تھا کہ وہ حالیہ دنوں میں کسی تشویش ناک عارضے میں مبتلا نہ تھے؛ بلکہ معمول کی زندگی گزار رہے تھے، ہرچند کہ وہ عرصۂ دراز سے شکر کے موذی مرض کا شکار تھے، اس کی وجہ سے انھیں دل اور گردے وغیرہ کی تکلیف رہتی تھی، وہ چند ماہ قبل بھی اِسی سلسلے میں دیوبند کے مشہور ڈاکٹر ڈی، کے، جین کے ہسپتال میں بہ غرضِ علاج کئی روز داخل رہے، اس وقت قدرے تشویش کی صورتِ حال پیدا ہوگئی تھی؛ لیکن الحمدللہ وہ اس سے صحت یاب ہوکر اپنے گھر آگئے۔ یہ راقم ہسپتال تو اُن کی عیادت کو اپنی کم زوری اور امراض کی وجہ سے نہ جاسکا؛ لیکن ہسپتال سے اُن کی گھر واپسی کے ایک آدھ روز کے بعد اُن کے دولت کدے پر اُن کی عیادت کو پہنچا تو جسمانی کم زوری — جس کا اثر اُن کی آواز پر بھی تھا — کے باوجود وہ چست تھے، مزاج پرسی پر ایسے الفاظ کہے جیسے اُن کو کوئی بڑی تکلیف نہ تھی اور نہ ہے۔ یہ اُن کی افتاد تھی کہ وہ کسی مسئلے کو زیادہ اوڑھتے نہ تھے، صبر وتحمل اور توکل سے اُن کا خمیر اٹھا تھا۔ وہ بڑے سے بڑے مسئلے سے گھبراتے نہ پریشان ہوتے، اعصاب پر ایسا قابو رکھنے والا اور مشکل اوقات میں بھی متبسم رہنے والا راقم نے اُن کے ایسے کم لوگوں کو پایا ہے۔

حزن وملال کی وجہ ظاہر ہے کہ وہ دارالعلوم کے مدرسین کے خاندان کے بہت سی وجوہات کی وجہ سے ممتاز فرد تھے، اُن کی وفات کی خبر سے ایسا لگا کہ کوئی لاثانی گوہر کھوگیا ہے، وہ دارالعلوم کے نمایاں معاصر فضلا میں تھے، دورۂ حدیث میں اپنے سارے رفقاے درس سے فائق رہے، وہ علمی پختگی اور ٹھوس لیاقت کے ساتھ ساتھ ذہانت وِ اِصابتِ رائے، معاملہ فہمی، دوربینی، ظرافتِ طبعی، حاضر جوابی، شریں کلامی، سخن وری، طلاقتِ لسانی، سلاستِ قلمی، تقریری شستگی اور خوش خطی میں طاق تھے۔ اکثر طلبہ ومدرسین وملازمین اُن سے اپنے مسائل میں مشورہ کرنے اور رائے لینے اُن کے پاس جاتے، وہ ہر ایک کو اُس کے متعلقہ مسئلے میں ایسا مشورہ دیتے، جس سے وہ مسئلہ بہ حسن وخوبی ضرور حل ہوجاتا تھا۔ دارالعلوم کے اعلیٰ ذمے داروں؛ بالخصوص سابق مہتمم حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن قدس سرہٗ (۱۳۳۲ھ/۱۹۱۴ء-۱۴۳۲ھ/۲۰۱۰ء) کے تو وہ دارالعلوم کے پیش آمدہ پیچیدہ معاملات میں خصوصی مشیر ومعتمد تھے۔ حق یہ ہے کہ ۱۹۸۰ء کے بعد دارالعلوم کو جو حالات ومعاملات مسلسل پیش آئے، اُن میں سے بہت سے معاملے اُنھی کے مشورے سے حل ہوے یا اُن کے حل ہونے کی راہ ہم وار ہوئی۔ وہ جس دَور میں دارالعلوم سے فارغ ہوے، وہ اور اس سے قبل کے ادوار ایسا لگتا ہے کہ دارالعلوم کا تخلیقی دورِ بہار تھے، اس زمانے کا ہر فاضل ہمہ جہت علمی صلاحیت، انتظامی لیاقت اور مردم گری کی غیر معمولی اہلیت کا حامل

نظر آتا ہے اور مولانا ریاست علی جیسے نام ور فضلا کا تو پوچھنا ہی کیا۔

شنبہ: ۲۳ر شعبان/ ۲۰ر مئی ہی کو نمازِ ظہر کے بعد اُن کی نماز جنازہ، دار العلوم کے احاطہ مولسری میں، دار العلوم کے استاذِ حدیث اور جمعیۃ علماء ہند کے صدر حضرت مولانا قاری سید محمد عثمان منصور پوری مدظلہٗ نے پڑھائی۔ دار العلوم اور دیگر سارے مدرسوں میں رمضان کی تعطیلِ کلاں کا زمانہ تھا جو عموماً ۱۵ر شعبان یا اس سے پہلے سے شروع ہوجاتا ہے، اس کے باوجود دیوبند کے عمائدین وعوام کے علاوہ علما وطلبہ کے جم غفیر نے مرحوم کے جنازے اور تدفین میں شرکت کی۔ افسوس ہے کہ دل کی بائی پاس سرجری کی وجہ سے، جس پر چند ہی روز گزرے تھے اور ڈاکٹروں نے زینہ چڑھنے اترنے نیز نشیب وفراز عبور کرنے سے منع کر رکھا تھا، یہ راقم مرحوم کی، دیوبند میں رہتے ہوئے، آخری دید کرسکا نہ نمازِ جنازہ اور تدفین میں شرکت کی سعادت حاصل کرسکا، جس کا ہمیشہ قلق رہے گا۔ فون ہی سے مرحوم کے فرزند خرد مولانا سعدان سلّمہٗ سے تعزیتی کلمات کہے تو آواز اتنی رندھ گئی کہ وہ الفاظ صحیح طور پر ادا نہ ہوسکے اور بہ مشکل غیر مربوط طور پر ادا کردیے گئے۔

کئی روز تک ایسا رہا کہ جو اساتذہ وطلبہ راقم کی عیادت کو آتے رہے، اُن سے زیادہ تر مولانا مرحوم ہی کا تذکرہ ہوتا رہا۔ اُن کی یاد کے ساتھ ہی اکثر آواز گلوگیر ہوجاتی اور جذبات پر قابو رکھنا مشکل ہوجاتا، اندازہ نہ تھا کہ مرحوم سے راقم کو ایسا دلی تعلق ہے؛ لیکن انسان کی فطرت ہے کہ وہ کسی شے یا شخص کی قدر اس کے فوت ہوجانے کے بعد ہی کرتا ہے۔ مرحوم کی وفات سے دار العلوم میں جو خلا پیدا ہوا ہے، اس کا پر ہونا بہ ظاہر احوال مشکل معلوم ہوتا ہے، گو خدائے قادر ووہاب ہر چیز پر ہر وقت قادر ہے۔ اِعجازِ اِلٰہی ہے کہ وہ اہلِ کمال کو بھی کمالات کے الگ الگ گوشوں کا حامل بناتا ہے؛ اِس لیے کسی بھی اہلِ کمال کے اُٹھ جانے کے بعد ایسا خلا ہوجاتا ہے جو دیگر سارے زندہ اہلِ کمال مل کر بھی پورا نہیں کرپاتے؛ کیونکہ فوت شدہ باکمال ایسا ہیرا ہوتا ہے جو تنہا حالات کے بہت سے ناگزیر تقاضوں کے نگینے میں صحیح طور پر فٹ ہوتا ہے؛ اس لیے مسائل کی زلفِ گرہ گیر کو سنوارنے کی جب جب ضرورت پڑتی ہے اور حالات و واقعات کا جب جب اپنا خاص تقاضا ہوتا ہے، وہی اہلِ کمال یاد آتا ہے اور یہ یاد بہت کچوکے لگاتی ہے کہ کیوں نہ ہم نے اسے کسی جتن کے ذریعے فوت ہونے سے بچائے رکھا؟

مولانا مرحوم جہاں تک میرے علم میں ہے دار العلوم کے اساتذۂ گرامی کے درمیان تنہا مجلسی روایت کے امین رہ گئے تھے، عصر کی نماز کے بعد اُن کے پاس دسیوں اساتذہ وطلبہ اور بعض دفعہ بعض اہلِ شہر آجاتے، مرحوم ہر ایک کی چائے سے تواضع فرماتے، کوئی بھی کسی موضوع کو چھیڑ دیتا خواہ دینی ہو یا دنیوی، علمی ہو یا ادبی، عام حالاتِ حاضرہ سے اس کا تعلق ہو یا خاص دار العلوم کے کسی تازہ معاملے سے؛ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی نکتہ آفرینی، شگفتہ گوئی اور بذلہ سنجی مجلس کو زعفران زار بنادیتی، جس سے لوگ تادیر؛ بلکہ بعض دفعہ کئی دنوں تک اور ہفتوں ومہینوں تک محظوظ ہوتے رہتے۔ یہ رنگ اُن کی خاص مجلس ہی کا نہ تھا؛ بل کہ کوئی مجلس ہو اگر مولانا ریاست علی بجنوری اس میں موجود ہوتے تو مجلس کی خشکی اُن کے پرکیف ظریفانہ جملوں سے ضرور کافور ہوتی رہتی؛ حتی کہ دار العلوم میں جو میٹنگیں دار العلوم کے ذمے داراعلیٰ کی طرف سے بلائی جاتیں وہ بھی مولاناؒ کی نشاط انگیز اور روح افزا معنی آفرینیوں سے بہرہ یاب ہونے سے کبھی محروم نہ رہتیں، لوگ مجلس سے نکلتے تو اُنھیں اُن نکتوں سے اس طرح لطف لیتے ہوئے پایا جاتا، جیسے لوگ کسی تازہ دم کردینے والے بے مثال نشاط انگیز مشروب کو لینے کے بعد، تادیر مزے لیتے رہتے ہیں۔ اُن کا ایک ظریفانہ جملہ تو مثل اور کہاوت کی طرح زبان زدِ خاص وعام ہے جو اُنھوں نے دار العلوم کے ایک استاذ کو جو اُن کے ہم سبق ہیں، اُس وقت کہا تھا، جب اُنھوں نے ایک مجلس میں اُن سے یہ کہا کہ تم دار العلوم میں میرے بعد مدرس ہوے تھے؛ اس لیے تم جونیئر ہو اور میں تم سے سینئر ہوں، مولاناؒ نے برجستہ اُن سے فرمایا: ''دار العلوم نے کسی نامعلوم حکمت کے تحت مجھے اُس وقت تک تدریسی خدمت کے لیے نہیں چنا؛ جب تک میری صلاحیت گھٹتے گھٹتے تمھارے برابر نہیں ہوگئی۔'' اس جملے کی چستی اور برجستگی پر لوگوں کا ہنستے ہنستے برا حال ہوگیا۔ مولاناؒ کے جملے اور تعبیرات کا انداز 'بیانیہ' نہیں ہوتا تھا؛ بل کہ عموماً اُن میں تہ داری اور معنویت ہوتی تھی۔

مولانا کی ایک بہت بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ معاشرتی زندگی جینے کے فن میں بڑے ماہر تھے۔ کوئی آدمی اُن سے کوئی معاملہ کرکے کبھی بے مزہ نہ ہوتا تھا؛ کیوں کہ وہ کسی بات پر خواہ وہ کتنا ہی غصہ دلانے والی ہو زبان سے یا چہرے مہرے کی کسی ادا سے خفگی کا اظہار کرتے نہ برا مانانے کی کیفیت نمایاں ہونے دیتے، وہ اشتعال انگیز صورتِ حال میں بھی شگفتہ رو اور خندہ جبیں رہتے۔ آج بعد از مرگ بھی، اُن کی شبیہ جب بھی میرے خانۂ خیال میں آتی ہے تو وہ شاداب نظر آتی ہے۔ بہت کم لوگوں کو یہ اندازہ ہوتا رہا ہوگا کہ وہ اُن سے ناخوش ہیں؛ کیوں کہ اُن کی خندہ روئی اور معنویت وظرافت سے پُر اُن کے جملے مخاطب کو اُن کے متعلق کسی منفی سوچ پر کبھی آمادہ نہ ہونے دیتے تھے؛ اِسی لیے اُن کے دشمنوں کی تعداد شاید و باید اور دوستوں کی تعداد بے شمار تھی۔ اُنھوں نے لوگوں کو اپنی ادائے زندگی سے خوشی ہی دی، رنج وغم سے اُنھیں ہمیشہ دور رکھا۔ اُن سے ملنے والوں کو سکون واطمینان کا سرمایہ ملا، انتشار وتشویش کی کسی صورتِ حال سے کبھی واسطہ نہ ہوا۔ اِس طرح کا آدمی پسِ مرگ اپنے بعد کے لوگوں کو بہت یاد آتا ہے جو اُن کا صرف ذکرِ خیر کرتے اور بے پناہ دعاؤں سے نوازتے ہیں؛ اِسی لیے اُن کی وفات کے بعد جتنے لوگوں سے راقم کی ملاقات

ہوئی سب ہی بہت رنجیدہ اور متاثر نظر آئے، ہر ایک کو اُن کی خوش اخلاقی وحسنِ معاملہ ودل جوئی بار بار یاد آتی اور دیدۂ ودل کو متاثر کر جاتی ہے۔

درس گاہ میں بھی وہ شگفتہ خاطر رہتے۔ اُن کے درس میں اسی لیے طلبہ کا بہت جی لگتا تھا، وہ درسی مسائل کو اپنی مرتب ومربوط اور سلیس وشستہ زبان میں اس طرح بیان کرتے کہ وہ دورانِ درس ہی طلبہ کے ذہنوں میں اتر جاتے۔ اس سلسلے میں دو باتیں اُنھیں بہت کام دیتی تھیں: ایک تو یہ کہ اُنھیں اُن مضامین پر مکمل عبور تھا جنھیں وہ پڑھاتے تھے؛ کیوں کہ طبعی ذہانت اور اپنی محنت سے اُنھوں نے اپنی طالب علمی ہی میں تمام علوم وفنون میں کمال حاصل کر لیا تھا، اسی کے ساتھ وہ سابقہ تیاری اور مطالعہ کے بغیر کبھی درس گاہ میں نہ آتے تھے، نیز عرصۂ دراز سے درس وتدریس کے مشغلے نے اُن کی تدریسی صلاحیت کو چار چاند لگا دیے تھے۔ دوسری بات یہ کہ اُن کی فصاحتِ لسانی اور شگفتہ بیانی ہمہ وقت اُن کا ساتھ دیتی تھی۔ وہ سال ہا سال سے شکر کی تکلیف دہ بیماری میں مبتلا تھے، دبلے پتلے اور منحنی جسم کے تو وہ تھے ہی؛ لیکن درس گاہ اور مجلس میں وہ کبھی ناحاضر دماغ نظر نہیں آئے؛ بلکہ ہمیشہ وہ فی البدیہہ گو اور حاضر جواب وبرجستہ بیاں رہے، تاحیات اُن کی یہ خوبی قائم رہی اور بیماری یا بڑھاپے سے متاثر نہیں ہوئی۔ اُن کی نکتہ سنجی ومعنی آفرینی اِس پر مستزاد ہوتی۔ اُن کے درس کی مقبولیت کی ایک اہم وجہ یہ تھی کہ وہ دیگر تدریسی خصوصیات کے ساتھ ساتھ زبردست ترسیلی وتفہیمی قوت کے مالک تھے، تدریس اور تقریر ہی نہیں عام مجلسی گفتگو کے لیے بھی یہ قوت خدا کی بہت بڑی نعمت ہے۔ بہت سے لوگ علم وفضل سے بہرہ ور تو ہوتے ہیں؛ لیکن ترسیلی ملکہ سے بے بہرہ ہوتے ہیں؛ اِس لیے وہ نہ صرف اِفادیت کے لائق نہیں ہوتے؛ بل کہ روز مرہ کی زندگی میں بھی اپنی باتوں کی تفہیم سے عاجز رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے گفتگو کرکے تفہیمی صلاحیت کے حامل لوگوں کو بڑی کوفت ہوتی ہے۔

مولاناؒ اپنی اِن خوبیوں کی وجہ سے انتہائی بارآور مدرس کی طرح، زبردست مقرر بھی تھے، اُن کی تقریریں دلچسپ اور کیف آور ہوتی تھیں، اُنھیں اپنی بات کو سمیٹ کر الفاظ کے خوب صورت سانچے میں ڈھالنے میں مہارت تھی۔ وہ لفظ ومعنی میں توازن وہم آہنگی کا خاص خیال رکھتے تھے اور دونوں کی قدر وقیمت اور جاے استعمال کی اہمیت سے خوب واقف تھے، اِس لیے اپنے مطلب کو ادا کرنے کے ہنر میں بھی فرد تھے۔ ہم ایسے لوگوں کو اُن سے بات کرکے اِتنا مزا آتا تھا کہ اسے بیان کرنے کے لیے راقم کے پاس موزوں الفاظ نہیں۔ ہم نے اپنی زندگی میں اُن کے ایسے چند ہی لوگ دیکھے ہیں، جو اِس صفت میں اُن کے شریک تھے، اُن کی جدائی سے شدید رنج ہوا اور ایسے ہی مولاناؒ کی وفات سے؛ کیوں کہ سخن وری اور الفاظ وتعبیرات کی نزاکت کی معرفت کی صفت جن لوگوں میں ہوتی ہے، وہ اپنے ایسے دیگر لوگوں کی بھی بے حد قدر کرتے ہیں اور اُن سے مخاطب ہوکر جی اِتنا خوش ہوتا ہے کہ تادیر وہ خوشی قائم رہتی ہے۔ اُن کے برعکس لوگوں سے بات کرکے بہت افسوس ہوتا ہے؛ کیوں کہ یہ لوگ گھوڑے اور گدھے کے فرق کو ذرا بھی درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے۔ افغانستان اور پھر عراق پر امریکہ کے سراسر ظالمانہ وصلیبی وصہیونی حملے کے دوران راقم نے عربی کے علاوہ اردو میں بھی بہت سے مضامین لکھے جن میں صلیبیت وصہیونیت کے مکروفریب سے دلائل کی روشنی میں پردہ اٹھایا گیا تھا، اخبارات میں مولاناؒ کی نظر اُن میں سے بعض پر پڑی تو اُنھوں نے فون پر بعض تعبیرات کی پسندیدگی کا بہ طورِ خاص راقم سے تذکرہ کیا اور اُن کی خوبیوں کی نشان دہی کرتے ہوئے اُنھیں سراہا اور یہ فرما کر حوصلہ افزائی کی کہ اِن میں جدت طرازی کے ساتھ برجستگی بھی ہے۔ اُن کے سوا کسی اور عالم یار فیقِ تدریس نے کبھی اس طرح کی بات نہیں کہی؛ کیوں کہ ہمارے حلقے میں بالعموم زبان کی لذت سے ناآشنائی بھی ہے اور درسیات کے سوا کسی اور کام کی چیز کو پڑھنے سے شدید 'پرہیز' بھی۔ مولانا کی تحریری نثر میں بلا کی چاشنی اور ایجاز وجامعیت ونفاست ہوتی تھی؛ اِسی لیے حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دورِ اہتمام میں دارالعلوم کی اکثر اہم تحریریں اُنھی سے لکھوائی گئیں۔ بعض دفعہ شوریٰ کی کارروائیوں کے مسودے بھی اُنھی نے ترتیب دیے، مختلف جلسوں کے لیے مہتمم صاحبؒ کی طرف سے خطبۂ صدارت یا خطبۂ استقبالیہ لکھنے کی ذمہ داری اُنھی کے سپرد کی گئی۔

اُن کی نثر کی حلاوت وسلاست کا ایک مختصر سا نمونہ نذرِ قارئین ہے۔ وہ مولانا کاشف الہاشمیؒ کی خصائل نگاری کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "ان ادبی کمالات کے علاوہ، وہ اخلاقِ حسنہ کا پیکرِ جمیل تھے، جس نے اُن کی ذات کو دل آویز شخصیت بنا دیا تھا، گویا وہ فطرت کا تراشیدہ ایسا ہیرا تھے جس کا ہر پہلو حسن وجمال اور رنگ ونور کا جاذبِ نظر منظر پیش کرتا تھا۔ اُن کی ذات میں علم کے ساتھ عمل، حسب ونسب کی بلندی کے ساتھ تواضع، نظافت کے ساتھ سلیقہ، اِصابتِ راے کے ساتھ خود اعتمادی، فقر کے ساتھ توکل، غناے نفس اور سیر چشمی، سخاوت، شجاعت اور شمع کی طرح اپنا نقصان کرکے دوسروں کے لیے ماحول کو منور کرنے جیسے اوصاف تھے۔" (کلیات کاشف، ص ۲۸-۲۹)

اُن کی سراپا نگاری کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "تمھیں شعر وسخن کا ذوق ہے، چلو تمھیں ایک باکمال شاعر سے ملا دیں۔ یہ شاعر ہیں حضرت کاشف الہاشمی، نکھرا ہوا رنگ، بلند پیشانی، سنہرے چشمے کے اِحسانات سے گراں بار بڑی بڑی آنکھیں، نکلتا ہوا قد، ذہانت کا پیکرِ جمیل، بیٹھیں تو کوہِ گراں کی نشست، چلیں تو ڈھال سے اُترتے ہوئے محسوس ہوں، یہی ہیں مملکتِ شعر وسخن کے خاموش تاج دار، اس فن میں تلمذ کسی سے نہیں، مگر ذرّوں کو ہاتھ لگا دیں تو وہ ستارے بن کر چمکنے لگیں، اُن کو ترتیب سے رکھ دیں تو کہکشاں کی تصویر ابھر آئے، مضامین اُن

کے سامنے خودگرفتاری کی پیش کش کریں اورالفاظ موتیوں کی لڑی بن کراُن کے قلم سے بکھرنے میں فخر سمجھیں۔'' (پیش لفظ'واردات'از مولانا عبدالجلیل راغبی،ص ۸)

مولاناؒ کونثر ہی کی طرح نظم میں بھی زبردست قدرت تھی، وہ نہ صرف خوش گوشاعر تھے؛ بل کہ اُن کی شاعری میں استادانہ پختگی اور اَصالت تھی۔ اس فن میں اُن کے استاذ مولانا محمد عثمان کاشف الہاشمی (۱۳۵۱ھ/۱۹۳۳ء-۱۴۱۷ھ/ ۱۹۹۶ء) تھے، جو دیوبند کے پڑوس میں واقع گاؤں 'راجوپور' کے باسی تھے اور جن کے تفسیری سلسلے 'ہدایت القرآن' کو بڑی شہرت و پذیرائی حاصل ہوئی۔ مولانا کاشفؒ صاحبِ بصیرت عالم، صاحبِ طرز نثر نگار اور صاحبِ اِدراک شاعر تھے۔ اُن کے کلام میں علامہ اقبالؒ (۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء-۱۳۵۷ھ/ ۱۹۳۸ء) کا سا رنگ وآہنگ پایا جاتا ہے، اُنھی کی طرح کائنات کو اصلاً مومن کی میراث سمجھتے تھے اور خودی اور فقرِ غیور کی پرورش پر توجّہ کی مسلمانوں کودعوت دیتے تھے۔

مولانا ریاست علی ظفرؔ بجنوری کی شاعری میں اپنے استاذ کا گہرا رنگ پایا جاتا ہے۔اُنھوں نے حمد ونعت بھی کہی ہے اورنظم وغزل بھی،قطعات ومراثی بھی اور مدحیہ قصیدے بھی۔ اُن کی شاعری میں عالمانہ وقار، استادانہ شکوہ، ماہرانہ نکتہ آفرینی، کے ساتھ ساتھ مومنانہ سنجیدگی پائی جاتی ہے۔غزل گوئی میں انھوں نے اصغرؔ گونڈوی (۱۳۰۱ھ/۱۸۸۴ء-۱۳۵۵ھ/ ۱۹۳۶ء) کا تتبع بھی کیا ہے،ایک آدھ غزل میں میرتقی میرؔ (۱۱۳۶ھ/۱۷۲۳ء-۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء) کا انداز بھی نظر آتا ہے، جگرؔ مرادآبادی (۱۳۰۷ھ/۱۸۹۰ء-۱۳۸۰ھ/۱۹۶۰ء) تو ہرشعر وادب کا مذاقِ لطیف رکھنے والے کے محبوب رہے ہیں، تو مولاناؒ جیسے زبان کے اداشناس کے کیوں نہ ہوتے۔

ظفرؔ بجنوری کے یہاں بہت سے ان مضامین میں بھی ندرت کا رنگ بہت شوخ ہے،جنھیں اساتذۂ سخن نے بھی اپنے رنگ میں اپنی شاعری کا حصہ بنایا ہے۔مثلاًغم کوانگیز کرنا؛ بل کہ اس کو متاعِ زیست خیال کرنے کے مضمون کو بہت سے شعرا نے اپنے شعر میں نظم کیا ہے۔ غالبؔ (۱۲۱۲ھ/ ۱۷۹۷ء-۱۲۸۵/ ۱۸۶۹ء) کا شعر تو ضرب المثل ہے:

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

اور

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

شاعرِ دردکلیم عاجزؔ پٹنویؒ (۱۳۴۵ھ/ ۱۹۲۶ء-۱۴۳۶ھ/۲۰۱۵ء) نے غالبؔ سے بہت آگے کی بات کہہ دی ہے،جس سے عیاں ہوتا ہے کہ غم کے بغیر زندگی جینی دشوار ہے:

غم تو متاعِ زیست ہے، اُس سے گریز کیا
جس سے ملے، جہاں سے ملے، جس قدر ملے

ظفرؔ بجنوری کے یہاں یہ مضمون اورخوبی و بانکپن سے اِس طرح ادا ہوا ہے کہ اس سے غم کے نہ صرف قیمتی اثاثہ ہونے کا تصور جاگزیں ہوتا ہے؛ بل کہ اس کے مقدس وپاکیزہ پونجی ہونے کا اعتقاد راسخ ہوتا ہے اور یہ ایمان پیدا ہوتا ہے کہ یہ ایسا عطائے الٰہی ہے، جس سے باری تعالیٰ اپنے خاص بندوں ہی کونوازتا ہے:

متاعِ غم، عطائے خاص ہے، سجدے کے دیوانے!
یہ دولت اُس کو دیتے ہیں جسے اپنا سمجھتے ہیں

انسان خطا کار ہے، بہت احتیاط کے باوجود، اس سے بہت سے صغیرہ اور کبیرہ گناہ سرزد ہوتے رہتے ہیں؛ لیکن بہت سے خدا کے بندے بڑی رجائیت پسند ہوتے ہیں، وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ اللہ غفوررحیم ہے، وہ ہمارے اور دیگر بندوں کے سارے گناہ معاف کردے گا۔ بہت سے خدا کے بندے یہ خیال کرتے ہیں کہ سرکارِدوعالمؐ شافعِ محشر ہیں، اس لیے ہمارے گناہ کے انبار ان شاءاللہ آپ کی شفاعت سے بخش دیے جائیں گے۔ اِس مضمون کو عربی زبان میں علامہ بوصیریؒ (ابوعبداللہ شرف الدین محمد بن سعید بن حماد بن عبداللہ صنہاجی بوصیری مصری ۶۰۹ھ/۱۲۱۲ء-۶۹۶ھ/ ۱۲۹۵ء) نے قصیدۂ بردہ کے ایک شعر میں بہت البیلے اوررقت آمیز انداز میں بیان کیا ہے، ہر باشعور مسلمان اس کو پڑھتے وقت بےطرح جذبات سے سرشار ہوجاتا ہے۔شعر یہ ہے:

لَعَلَّ رَحْمَةَ رَبِّي حِينَ يَقْسِمُهَا
تَأْتِي عَلَىٰ حَسَبِ الْعِصْيَانِ فِيْ الْقِسَمِ

(امید ہے کہ میرے پروردگار کی رحمت، جب وہ اُس کو اپنے بندوں میں تقسیم کرے گا، بہ قدر گناہ حصوں میں آئے گی) یعنی جتنے گناہ زائد ہوں گے، اُسی قدر رحمتِ الٰہی زائد ہوگی۔

فارسی کے ایک شاعر نے اِسی مضمون کو اِس طرح ادا کیا ہے،جس میں نازوانداز کا رنگ غالب تو ہے؛ لیکن علامہ بوصیری والی رقت انگیزی اور جگر سوزی نہیں ہے:

پیشِ عفوش قلتِ تقصیرِ ماست
عفوِ بےاندازہ می خواہد گناہِ بےحساب

(اُس کے درگزر کے سامنے میرا گناہ معمولی ہے، حق تعالیٰ کی بےانتہا مغفرت ہمارے بےشمار گناہ کی متقاضی ہے)

دوسرے فارسی شاعر نے رجائیت کی حدوں کو عبور کرتے ہوئے یہ تک کہہ دیا ہے:

نصیب ماست بہشت اے خداشناس برو
کہ مستحق کرامت گناہ گارانند

(اے خدا شناس چلو ہٹو! ہماری قسمت میں جنت ہے؛ کیوں کہ خدا کے کرم کا استحقاق گنہ گاروں کو ہے، ہم چوں کہ گنہ گار ہیں؛ اس لیے ہمیں جنت ضرور ملے گی، تمھارا کیا حال ہوگا وہ خدا ہی کو معلوم ہے)

اصغؔر گونڈویؒ نے اس مضمون کو اردو زبان کے خوب صورت پیرایے میں اس طرح پرویا ہے:

سنا ہے حشر میں شانِ کرم بے تاب نکلے گی
لگا رکھا ہے سینے سے متاعِ ذوقِ عصیاں کو

اصغؔر نے 'متاعِ ذوقِ عصیاں' کی انوکھی ترکیب سے اس شعر کو غیر معمولی جاذبیت عطا کی ہے؛ لیکن اس میں ایک بڑی کمی یہ درآئی ہے کہ 'بے تابی' کی نسبت خدائے بے نیاز کی طرف ہوگئی ہے، بے تابی اضطرار کا نتیجہ ہوتی ہے، جس سے خدائے ذوالجلال منزہ ہے۔

مولانا ریاست علی ظفؔر بجنوری نے اِس مضمون کو اِس خوبی سے ادا کیا ہے کہ اس میں اسلامی عقیدے کے اعتبار سے کوئی نقص ہے نہ زبان و بیان کی سلاست و نزاکت کے لحاظ سے:

کرم کے ساتھ لامحدود رکھیں لغزشیں ہم نے
بہ قدرِ ظرف کیا رکھتے متاعِ ذوقِ عصیاں کو

شاعرِ باشعور نے یہاں 'لغزشیں' کا لفظ بہت برمحل استعمال کیا ہے؛ کیوں کہ 'لغزش' اُس خطا کو کہتے ہیں جو سہواً ہو جاتی ہے یا بے شعوری میں انسان سے سرزد ہوا کرتی ہے۔ گویا شاعر نے اللہ تعالیٰ کی شانِ کریمی سے امید کے ساتھ اور خدا کی رحمت و مغفرت کے یقین کے باوجود بالقصد گناہوں سے بچنے کی تلقین بھی کی ہے اور اللہ کی رحمت کے بھروسے ڈھٹائی اور اصرار کے ساتھ معاصی کے بالارادہ ارتکاب سے احتراز کا درس بھی دیا ہے۔

بہ ہر کیف یہ شان دار مضمون ہے جسے مسلمان شعرا نے ہر زبان میں نظم کیا ہے۔ بانی دارالعلوم دیوبند حجۃ الاسلام الامام مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہٗ (۱۲۴۸ھ/۱۸۳۲ء - ۱۲۹۷ھ/ ۱۸۸۰ء) نے اپنے نعتیہ اردو قصیدے میں کثرتِ گناہ کے باوجود مغفرت سے بہرہ وری کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کا ثمرہ باور کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

یہ سن کے آپؐ شفیع گناہ گاراں ہیں
کیے ہیں میں نے اِکھٹے گناہ کے انبار

ظفؔر بجنوری کے کلام میں ایک ندرت یہ بھی ہے کہ شعر کی کوئی بھی صنف ہو، رنگ تغزل کبھی اُن کا ساتھ نہیں چھوڑتا۔ ترانۂ دارالعلوم میں بھی (جو اُن کی شاعرانہ فن کاری، بلند آہنگی اور الہامِ شعری کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے اور جس میں اُنھوں نے دارالعلوم کی تاسیس کے پس منظر، تاریخ، کارناموں کے تذکرے ساتھ ساتھ اُن اشخاص کے ناموں کی تلمیحات کو سبک روی کے ساتھ استعمال کیا ہے، جو دارالعلوم کے تاریخی کردار کی حیثیت رکھتے ہیں) تغزل کا رنگ خاصا شوخ اور نکھرا ہوا ہے، مثلاً یہ اشعار پڑھیے:

خود ساقیِ کوثر نے رکھی، مئے خانے کی بنیاد یہاں
تاریخ مرتب کرتی ہے، دیوانوں کی رُوداد یہاں
برسا ہے یہاں وہ ابرِ کرم، اٹھا تھا جو سوئے یثرب سے
اِس وادی کا سارا دامن سیراب ہے، جوئے یثرب سے
کہسار یہاں دب جاتے ہیں، طوفان یہاں رک جاتے ہیں
اِس کاخِ فقیری کے آگے شاہوں کے محل جھک جاتے ہیں
مہتاب یہاں کے ذرّوں کو، ہر رات منانے آتا ہے
خورشید یہاں کے غنچوں کو، ہر صبح جگانے آتا ہے
یہ صحنِ چمن ہے برکھا رُت، ہر موسم ہے برسات یہاں
گل بانگ سحر بن جاتی ہے، ساون کی اندھیری رات یہاں
اسلام کے اِس مرکز سے ہوئی، تقدیس عیاں آزادی کی
اِس بامِ حرم سے گونجی ہے، سوبار اذاں آزادی کی
جو شمعِ یقیں روشن ہے یہاں، وہ شمعِ حرم کا پرتو ہے
اس بزمِ ولی اللٰہی میں، تنویرِ نبوت کی ضَو ہے
یہ مجلسِ مئے وہ مجلس ہے، خود فطرت جس کی قاسؔم ہے
اِس بزم کا ساقی کیا کہیے، جو صبحِ ازل سے قائم ہے
رومؔی کی غزل، رازؔی کی نظر، غزاؔلی کی تلقین یہاں
روشن ہے جمالِ انوؔر سے، پیمانۂ فخرالدیؔن یہاں
اِس بزمِ جنوں کے دیوانے، ہر راہ سے پہنچے یزداں تک
ہیں عام ہمارے افسانے، دیوارِ چمن سے زنداں تک
سو بار سنوارا ہے ہم نے، اس ملک کے گیسوئے برہم کو
یہ اہلِ جنوں بتلائیں گے، کیا ہم نے دیا ہے عالم کو
جو صبحِ ازل میں گونجی تھی، فطرت کی وہی آواز ہیں ہم
پروردۂ خوشبو غنچے ہیں، گلشن کے لیے اِعجاز ہیں ہم

مولانا ریاست علی ظفؔر بجنوریؒ کے کلام کا مجموعہ 'نغمۂ سحر' کے نام سے پہلی بار ۱۳۹۶ھ/ ۱۹۷۶ء میں اور دوسری مرتبہ ۱۴۲۲ھ/ ۲۰۰۱ء میں شائع ہوا۔ کتاب کے شروع میں، اُن کے برادر نسبتی مولانا لقمان الحق فاروقی مرحوم کا مفصل مبصرانہ، ادیبانہ اور محققانہ مقدمہ ہے، جس میں شرح وبسط کے ساتھ، اُن کی شاعری کا مطالعہ کیا گیا ہے اور اُن کے شعر کی روح کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، ساتھ ہی ان کا مختصر سوانحی خاکہ بھی نذر قارئین کیا گیا ہے۔ ۱۴۲۲ھ/ ۲۰۰۱ء کے ایڈیشن میں اُن کے دوسرے برادر نسبتی مولانا برہان الحق صاحب فاروقی زید مجدہ کے قلم سے ضمیمۂ احوال کا اِضافہ ہے، جس میں اُن کا مزید احوال درج

کیا گیا ہے۔ اس کے بعد مولانا ظفرؔ بجنوریؒ نے اپنے قلم اِعجاز رقم سے اپنے شفیق ومربی بھائی اور شعر وسخن کے باب میں اپنے استاذ مولانا محمد عثمان متخلص بہ 'کاشفؔ' کی 'حضرت کاشف الہاشمی' کے عنوان سے سوانح لکھی ہے، جس میں اُن کے ضروری حالات وواقعات کے ساتھ ساتھ اُن کے شعری محاسن، تخیلات کی بلندی اور قلندرانہ زندگی پر روشنی ڈالی ہے، جو چشم کشا بھی ہے اور بصیرت افروز بھی اور جس سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ ہماری گدڑیوں میں کیسے کیسے لعل چھپے رہے ہیں، جن کی ہماری کم نگاہی کی وجہ سے وقت رہتے ہوے قدر نہ کی جاسکی اور وقت کے بعد سوائے حسرت ویاس کے کچھ ہاتھ نہ آیا۔

اس کے بعد دیوان کی ابتدا دعا سے کی گئی ہے، اس کے بعد تین نعتیں درج ہوئی ہیں، پھر 'عازم بیت اللہ کے نام' کے عنوان سے ایک نظم پیش کی گئی ہے جو قدرے طویل ہے، پھر حضرت نانوتوی نوراللہ مرقدہ کی نعتِ فارسی کا اردو ترجمہ شعر میں صاحبِ دیوان نے پیش کیا ہے، پھر غزلوں کا سلسلہ شروع ہوا ہے جو ص ۵۵ سے شروع ہوکر ص ۱۰۰ پر ختم ہوا ہے، غزلوں کے آخر میں ایک غزل میرؔ کے تتبع میں اور چار غزلیں اصغرؔ کے تتبع میں کہی گئی، شائع کی گئی ہیں۔ ص ۱۰۱ سے نظموں اور مراثی وقطعات کا سلسلہ ہے جو ترانۂ دارالعلوم ص ۱۰۲ سے شروع ہوکر، ص ۱۳۳ پر شیخ الادب مولانا محمد اعزاز علیؒ (۱۳۰۰ھ/ ۱۸۸۲ء-۱۳۷۴ھ/۱۹۵۴ء) کے مرثیے پر ختم ہوا ہے۔ اس کے بعد مسک الختام کے طور پر کاشفؔ الہاشمی صاحب کی بعض نظمیں شائع کی گئی ہیں، جن میں 'فرشتہ اور انسان' اور 'رنگا رنگ: زندگی کی مختلف تعبیریں' اور 'حسن وعشق' شامل ہیں۔ غالب نے کہا تھا:

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروے شیوۂ اہلِ نظر گئی

اس وقت ہر کس وناکس شاعری کرنے یعنی اس کی آبرو کو پامال کرنے لگا ہے؛ اِس لیے حضرت ظفرؔ بجنوری کے دیوان 'نغمۂ سحر' اور اُن کے عظیم استاذ کاشف الہاشمیؔ کے دیوان 'کلیاتِ کاشفؔ' (جو ظفر بجنوری کی نگرانی میں مولانا اشتیاق احمد قاسمی دربھنگوی استاذ دارالعلوم دیوبند نے حواشی سے مزین کرکے ترتیب دے کر ابھی حال ہی میں، یعنی ۱۴۳۷ھ مطابق ۲۰۱۶ء میں شائع کیا ہے) کا مطالعہ زبان وبیان کا مذاق رکھنے والے، ہر انسان کو کرتے رہنا چاہیے؛ تاکہ وہ نسلِ نو کو یہ بتاسکے کہ:

بہت جی خوش ہوا حالؔی سے مل کر
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

مولاناؒ کا ایک نمایاں وصف اُن کی سخاوت وفیاضی اور مہمان نوازی تھا۔ وہ تقریباً ۲۲-۲۳ برس تک ہمارے پڑوسی رہے۔ افریقی منزل قدیم نزد چھتہ مسجد میں وہ زیریں منزل کے مکین تھے اور راقم بالائی منزل کا، وہ اکثر راقم کے متعلق مجلسوں میں مزاحاً فرماتے کہ ''مولانا نورعالم میرے سرپرست ہیں، یعنی میرے سر پر رہتے ہیں، میں اِن کی سرپرستی میں رہتا ہوں، خواہ یہ سرپرستی قبول کریں یا نہ کریں۔''

راقم دیکھتا تھا کہ اُن کے یہاں روزانہ خواہ ناشتے میں، خواہ دوپہر یا رات کے کھانے میں ایک دو یا چند مہمان ضرور ہوتے تھے، عصر بعد کی مجلس میں دس بیس آدمی یا اس سے زائد بندے آ شریک ہوتے اور وہ ہر ایک کو چائے اور کبھی اُس کے ساتھ وائے ضرور پیش فرماتے۔ رمضان کے دنوں میں یہ سلسلہ اور بڑھ جاتا تھا، مولاناؒ کے یہاں سے ہم سارے پڑوسیوں کے یہاں انواع واقسام کی افطاریوں سے سجا ہوا خوانِ یغما مہینے میں کئی بار ضرور آتا۔ ۲۰-۲۲ برس کی مُجاوَرَت کے بعد جب وہ اپنے نئے تعمیر شدہ مکان واقع محلّہ خانقاہ منتقل ہوگئے، تب بھی کئی سال تک اُنھوں نے اِس سلسلے کو باقی رکھا۔ پھر ہم ہی لوگوں کے دباؤ میں کہ اب جائے وقوع کی قدرے دوری ہوگئی ہے اور جو بچے ما کولاتی ہدیوں کی ترسیل کا کام کرتے تھے وہ بڑے ہوکر اب بہت مشغول ہوگئے ہیں؛ اِس لیے اب یہ سلسلہ موقوف کردیا جائے تو ہم لوگوں کو بے حد خوشی ہوگی، مولاناؒ بہ مشکل تمام اس کو موقوف کرنے پر راضی ہوے؛ لیکن اُنھوں نے ہم پڑوسیوں کو اور ہم پڑوسیوں نے اُنھیں ہمیشہ رشتہ دار اور عزیز ہی باور کیا اور خوشی وغم میں ہم ایک دوسرے کے برابر شریک رہے۔ مولاناؒ کے یہاں یا ہمارے ہاں کوئی تقریب ہوتی تو ہم ایک دوسرے کو ضرور مدعو کرتے؛ لیکن مولانا اور اُن کی اہلیہ (صفیہ شاہانہ ۱۳۶۱ھ/۱۹۴۲ء-۱۴۳۲ھ/۲۰۱۱ء) کی طرف سے ہمارے ساتھ جود وکرم کا معاملہ ہم سے سوا ہوتا۔

مولاناؒ مفلوک الحال کی مدد کرتے اور دردمندوں کا درد بانٹتے تھے، کسی کو کسی بات پر سرزنش کرتے تو بڑے پیار سے اِس انداز میں کرتے کہ کبھی مخاطب کو بُرا نہ لگتا۔ وہ کسی کو سخت بات بھی کہتے تو استعارہ اور رمزیت کا ایسا خوب صورت پیرایۂ بیان اور دل کش گفتگو کا ایسا انداز اختیار کرتے کہ بات کی تلخی نہ صرف کافور ہوجاتی؛ بل کہ وہ قندِ مکرر بن جاتی۔

وہ اسلاف اور اکابر کے مسلک ومشرب کی سختی سے پیروی کرتے، اس سے ذرہ برابر انحراف کو ناروا تصور کرتے۔ نماز باجماعت کے بہت پابند تھے۔ اُن کی کبھی کوئی نماز قضا ہوئی نہ روزہ۔ قرآنِ پاک کی تلاوت کا خاص اہتمام فرماتے۔ مسائل کے باب میں جمہور علماے احناف کی رائے اور فتویٰ پر عمل کرتے، بہت سے علما کی طرح اس سلسلے میں وہ کسی تفرد کے قائل نہ تھے۔ بالعموم مشورے کی پابندی کرتے، پھر جو رائے قائم کرتے اُس پر کوہِ گراں کی طرح جمے رہتے۔ اُن کی زندگی میں تذبذب اور انتشار کا کوئی گزر نہ تھا۔ اعتدال، تواضع، سادگی، اتباعِ سنت، یک رنگی، فکری پختگی، یقینِ محکم؛ معرکۂ حیات میں اُن کی کارگر شمشیریں تھیں۔

مولاناؒ علمی لیاقت کے بہ قدر متنوع مشاغلِ زندگانی کی وجہ سے، تصنیف وتالیف کی طرف کماحقہ توجہ نہ دے سکے؛ ورنہ وہ ایک بڑے مؤلف اور اہلِ قلم ہوتے؛ لیکن جو تالیفی وتحریری کام اُنھوں نے کیے وہ بہت گراں مایہ ہیں، جن میں سرِفہرست اُن کی صحیح بخاری کی شرح 'ایضاح البخاری' ہے، جس کی اب تک دس جلدیں آچکی ہیں۔ اِس کتاب میں اصلاً تو اُنھوں نے اپنے جلیل القدر استاذ ودارالعلوم دیوبند کے سابق شیخ الحدیث حضرت مولانا سید فخرالدین احمد قدس سرہٗ (۱۳۰۷ھ/ ۱۸۸۹ء- ۱۳۹۲ھ/۱۹۷۲ء) کے اِفادات کو جمع کیا ہے، جنھیں اُنھوں نے زمانۂ طالب علمی میں پابندی سے نوٹ کیا تھا؛ لیکن اُنھوں نے بخاری کی اِس شرح کو مفید تر اور دیگر شرحوں سے ممتاز تر بنانے کے لیے خود بھی سابقہ شرحوں اور علماے دیوبند کے افادات کا مطالعہ کرنے کا التزام کیا، اِسی لیے کام خاص تحقیقی اور دراز نفس ہوگیا، اس کی وجہ سے اُن کے مشغول اوقات کا بڑا سرمایہ اس میں صرف ہوگیا۔

اُن کا مزاج بہت سے اہلِ علم ونظر کی طرح یہ تھا کہ کوئی کام یا تو کیا نہ جائے اور اگر کیا جائے تو ایسا ہو کہ وہ ہر اعتبار سے بہتر سے بہتر ہو کہ لوگ اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں اور یہ کہیں کہ کام اِسے کہتے ہیں؛ اِسی لیے وہ اپنے فکر ونظر کا بہت بڑا اثاثہ خرچ کر کے کتاب کی صرف پانچ جلدیں ہی تیار اور شائع کرسکے، اس دوران بڑھاپا اور اُس کے بڑھتے ہوئے عوارض اور طرح طرح کی بیماریوں کی وجہ سے وہ بہت ٹوٹ چکے تھے اور اُن کو اندازہ تھا کہ اب یہ کام اُن سے موجودہ ضعفِ جسمانی اور فکری ناتوانی کے ساتھ اُن کے قائم کردہ معیار پر نہیں ہوسکتا تو اُنھوں نے چند سال قبل ہی اِس سلسلے میں اپنے ذی استعداد تلمیذ رشید مولانا فہیم الدین بجنوری قاسمی استاذ دارالعلوم دیوبند کو اس کام میں اپنا معاون بنالیا اور اُنھیں منہج کار بتا کر اپنی بہ راہ راست نگرانی میں اِس کام کو جاری رکھا؛ چناں چہ اُن کی حیات ہی میں اس کتاب کی دسویں جلد زیورِ طبع سے آراستہ ہوکر بازار میں آچکی تھی۔ ان شاء اللہ اُن کے بعد بھی یہ کام حسبِ سابق اُن کے نقشۂ راہ کے مطابق جاری رہے گا اور کتاب تقریباً ۲۲ جلدوں میں اِن شاء اللہ مکمل ہوجائے گی۔

اِس کتاب کی خصوصیت- جو اس کو بخاری شریف کی ساری شرحوں سے ممتاز کرتی ہے- یہ ہے کہ اِس میں اِفاداتِ اکابر کا اِحاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے، یعنی اگر بخاری کی حدیثوں کے حوالے سے کوئی بات اُنھوں نے کہی ہے تو اُس کو اپنی جگہ درج کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے، اِس سے استفادے میں بے انتہا آسانی پیدا ہوگئی ہے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ امام بخاری کے تراجم کی گہرائیوں میں اتر کر اُن کی قدر وقیمت اجاگر کی گئی ہے اور اُن کی اصل حقیقت ومراد کو واضح کیا گیا ہے؛ کیوں کہ مولانا مرحوم کے استاذِ کبیر حضرت مولانا سید فخرالدین احمد صاحب نور اللہ مرقدہٗ جن کے اِفادات کو 'ایضاح البخاری' میں جمع کیا گیا ہے، بخاری کے تراجم کے اصل مطالب تک پہنچنے میں فرد تھے۔ بہت سے دقیق النظر علما اُنھیں اِس حوالے سے حافظ ابن حجر عسقلانیؒ (احمد بن علی ابوالفضل متوفی ۸۵۲ھ/ ۱۴۴۹ء) صاحب 'فتح الباری' سے فائق قرار دیتے ہیں۔ تیسری خصوصیت یہ ہے کہ امام بخاری (محمد بن اسماعیل جعفی ۱۹۴ھ/۸۱۰ء ۲۵۶ھ/۸۷۰ء) نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ (نعمان بن ثابت ۸۰ھ/ ۶۹۹ء- ۱۵۰ھ/ ۷۶۷ء) پر جتنے اعتراضات کیے ہیں، اُن کا مدلل اور بھرپور جواب دیا گیا ہے اور ایسے مواقع کی بحثوں کو سارے گوشوں کے ساتھ لکھنے کی کوشش کی گئی ہے؛ تاکہ ان اعتراضات سے پیدا شدہ الجھن کے شکار علما وطلبہ کو مکمل تشفی ہوجائے، اُنھیں کسی طرح کی تشنگی محسوس نہ ہو۔

اُن کی دوسری اہم کتاب 'شوریٰ کی شرعی حیثیت' ہے، جو اُنھی کی نگرانی میں 'شیخ الہند اکیڈمی' دارالعلوم دیوبند سے شائع ہوئی، جس کے وہ ۱۴۰۸ھ/ ۱۹۸۷ء سے مدیر مقرر ہوے اور کئی سال تک یہ ذمّے داری بہ حسن وخوبی انجام دی، اُن کی اِدارت اور نگرانی میں اکیڈمی سے کئی اہم کتابیں شائع ہوئیں۔ 'شوریٰ کی شرعی حیثیت' کی تالیف کی وجہ یہ ہوئی کہ ۱۴۰۰-۱۴۰۲ھ/ ۱۹۸۰-۱۹۸۲ء کے دوران دارالعلوم میں جو انتشار کی حالت پیدا ہوئی، جس میں شوریٰ کی حیثیت کو کم زور کرنے کی کوشش کی گئی، اس پس منظر میں حضرت مولانا مسیح اللہ خاں صاحب جلال آبادی قدس سرہٗ (۱۳۱۹ھ/ ۱۹۱۱ء -۱۴۱۳ھ/۱۹۹۲ء) کا ایک رسالہ 'رسالۂ اہتمام وشوریٰ' منظرِعام پر آیا، جس میں مہتمم کو اصل اور شوریٰ کو فرع قرار دیا گیا اور دارالعلوم کے دستورِ اساسی کو غیر شرعی بتایا گیا تھا۔ حضرت مولانا چوں کہ حضرت اقدس حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہٗ (۱۲۸۰ھ/۱۸۶۳ء-۱۳۶۲ھ/ ۱۹۴۳ء) کے خلیفۂ مجاز اور علم وعرفان کے حوالے سے بڑے مقام کے آدمی تھے؛ اِس لیے اُن کی طرف سے دارالعلوم کے دستورِ اساسی پر اعتراض کو علمی حلقوں میں باوزن گردانا گیا۔ اِس صورتِ حال کی نزاکت کے پیش نظر دارالعلوم کے صدرالمدرسین حضرت مولانا معراج الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ (۱۳۲۸ھ/ ۱۹۱۰ء-۱۴۱۲ھ/۱۹۹۱ء) نے شوریٰ کے موضوع کی تحقیق وتنقیح کے لیے مولانا ریاست علی مرحوم کو مکلّف فرمایا، مولاناؒ نے موضوع کے سارے مصادر ومراجع کا مطالعہ کیا اور 'شوریٰ کی شرعی حیثیت' میں اپنے مطالعہ کا نچوڑ پیش فرمایا اور دارالعلوم کے دستور اساسی کے غیر شرعی ہونے کے شبہے کی تردید مضبوط دلائل کی روشنی میں کی۔

اِدھر چند سالوں سے وہ صحت کی ناسازی کے باوجود کئی ایک گراں مایہ علمی وتحقیقی کاموں میں لگے رہے؛ جن میں قاضی محمد اعلیٰ تھانویؒ (متوفی بعد ۱۱۵۸ھ/ ۱۷۴۵ء) کی کتاب 'کشاف اصطلاحات الفنون' کی تحقیق اور اصل نسخے یعنی مصنف کے قلم سے لکھے ہوئے اصل مخطوطہ مسودے سے مقابلہ اور انتہائی تدقیق کے بعد کتاب کے صحیح اور محقق نسخے کی تیاری بھی ہے۔ اُنھوں

نے اس زبردست تحقیقی کام میں اپنے کئی ایک فاضل تلامذہ سے بھی مدد لی اور اپنی زندگی ہی میں وفات سے کچھ مدت پہلے کتاب کو کمپیوٹر سے ٹائپ کروا کر مبیضے کی تصحیح وغیرہ سے فارغ ہو گئے تھے اور اب صرف اس کتاب کی اشاعت رہ گئی ہے جو ہونے کو ہے۔

خوش قسمتی سے مولاناؒ کو اس کتاب کے مصنف کے ہاتھ کے لکھے ہوئے قلمی مخطوطے کا عکس، مسلم یونیورسٹی کی مولانا آزاد لائبریری سے مل گیا، نیز کتاب کے قدیم ایڈیشن مطبوعہ کلکتہ (جو ۱۸۵۲ء تا ۱۸۶۲ء قسط وار شائع ہوا تھا اور جس کا عکس سہیل اکیڈمی لاہور نے ۱۹۹۳ء میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ (۱۳۳۳ھ/۱۹۱۴ء-۱۴۲۰ھ/۱۹۹۹ء) کی ہدایت کے مطابق طبع کیا تھا جس کے نسخے بازار میں دست یاب ہیں) کا نسخہ اُنھیں بہ آسانی مل گیا، نیز عالم عربی سے طبع شدہ کتاب کا وہ ایڈیشن بھی مل گیا جو الف بائی ترتیب سے شائع ہوا ہے؛ کیوں کہ مصنفؒ کے یہاں الف بائی ترتیب نہ تھی؛ بل کہ اُنھوں نے پہلے حرف کو باب اور تیسرے حرف کو فصل قرار دے کر الفاظ اور اصطلاحات لکھے تھے، مثلاً 'ادب' کا لفظ باب الألف فصل الباء میں تھا۔ مولاناؒ نے اِن تینوں نسخوں کو بنیاد بنا کر کتاب کا ممکنہ حد تک صحیح ترین اور مکمل نسخہ تیار کیا ہے اور کتاب کو عصرِ جدید کے مذاق کے مطابق مدون کر کے اس کو مفید تر بنا دیا ہے۔ اُنھوں نے مندرجۂ ذیل اہم کام کیے ہیں:

(۱) مصنفؒ نے جن اصطلاحات کی تعریف میں فارسی زبان کا استعمال کیا ہے، اس کو کتاب کے متن میں اُسی طرح باقی رکھنے کا التزام کیا گیا ہے؛ تاکہ فارسی جاننے والے اہلِ علم براہ راست استفادہ کر سکیں۔

(۲) فارسی متن کے نیچے عربی ترجمہ بھی درج کیا گیا ہے، اگر ترجمے میں کوئی غلطی در آئی تھی تو حتی الإمکان اُس کی تصحیح کر دی گئی ہے؛ تاکہ فارسی سے ناواقف لوگ عربی ترجمے سے فائدہ اُٹھا سکیں۔

(۳) اگر مصنفؒ نے کسی فارسی متن کا عربی ترجمہ نہیں کیا تھا تو اِس محقق نسخے میں فحص وتدقیق کے ساتھ عربی ترجمے کا اِضافہ کیا گیا ہے۔

(۴) متن کی عبارت کو، عصرِ حاضر میں رائج رموزِ املا اور علاماتِ ترقیم کے مطابق لکھا گیا ہے؛ تاکہ موجودہ زمانے کے قاری کو کتاب سے استفادے میں کوئی تکلف نہ ہو۔

(۵) آیاتِ قرآنی اور احادیث کی تخریج کی گئی ہے۔

(۶) ضروری الفاظ کو با اعراب لکھا گیا ہے۔

(۷) پوری کتاب کی عبارت کی دقتِ نظری کے ساتھ تصحیح کی گئی ہے؛ کیوں کہ اِس طرح کی خالص علمی وفنی کتاب میں ذرا سی غلطی بھی، بڑی علمی گم راہی پر منتج ہوتی ہے۔

دوسرا اہم علمی وتحقیقی کارنامہ مولانا نے یہ انجام دیا کہ مولانا فتح محمد تائب لکھنوی (متوفی ۱۳۴۲ھ/۱۹۲۳ء) کی 'خلاصۃ التفاسیر' کی تدوین وتحقیق کی اور اس سلسلے میں اپنے بعض ہونہار شاگردوں سے مدد لی۔ اِس تفسیر کے انتخاب کی وجہ یہ ہے کہ اس کی زبان میں سادگی اور ایجاز ہے اور اپنے نام کے مطابق واقعتاً بہت سی تفسیروں کی روح ہے۔ ترجمے میں امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ (۱۱۱۴ھ/۱۷۰۳ء-۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء) اور شاہ عبدالقادر دہلویؒ (۱۱۶۷ھ/۱۷۵۳ء-۱۲۳۰ھ/۱۸۱۴ء) کے تراجم سے استفادے کا اہتمام کیا ہے، ترجمے میں محاورہ اور لفظ دونوں کا خیال رکھا گیا ہے، احکام کے باب میں مشہور ومقبول روایات درج کرنے کی پابندی کی گئی ہے؛ جب کہ ترغیب وترہیب کے سلسلے میں وہ روایات لی گئی ہیں جو کسی معتبر کتاب میں وارد ہوئی تھیں اور اُن کا مضمون کسی امر ثابت اور خبرِ صحیح کے مخالف نہ تھا، آیاتِ قرآنی سے دقیق لطائف بھی اخذ کیے ہیں، اصحابِ تزکیۂ واحسان کا بھی جامعیت کے ساتھ تذکرہ کیا ہے، اسرائیلیات میں سے صرف وہ روایات لی ہیں جو انبیا کی عصمت، عقلِ صحیح، اخبارِ صحیحہ اور اصولِ اسلامی کے مخالف نہ تھیں، مسائلِ فقہیہ کو احناف کی قابلِ اعتماد کتابوں اور مصادر سے نقل کرنے کی کوشش کی ہے، تفسیر میں بھی حنفی اصول کو ہی ملحوظِ خاطر رکھا ہے۔

حضرت مولانا عبدالماجد دریا آبادی رحمۃ اللہ علیہ (۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲ء-۱۳۹۹ھ/۱۹۷۸ء) کو بھی یہ تفسیر بہت پسند تھی۔ وہ فرماتے تھے کہ تفسیر ہٰذا 'بہ قامت کہتر بہ قیمت بہتر' کی مصداق ہے۔ یہ تفسیر سب سے پہلے لکھنؤ کے مطبع انوارِ محمدی سے ۱۳۰۹ھ/۱۸۹۱ء سے ۱۳۱۱ھ/۱۸۹۳ء کے درمیان شائع ہوئی، جو چار جلدوں پر مشتمل تھی، صفحات کی تعداد ۲۶۴۰ تھی۔ بعد میں یہ نایاب اور غیر متداول ہو گئی تھی۔

مولاناؒ کو اِس کا ایک مطبوعہ بوسیدہ نسخہ دارالعلوم دیوبند کے کتب خانے سے ملا؛ چوں کہ وہ اس تفسیر کی مذکورالصدر خوبیوں سے واقف تھے؛ اِس لیے اُنھوں نے تدوین وتحقیق کے بعد اِس کی اِشاعتِ نو کا ارادہ فرمایا؛ تاکہ طلبہ وعلما کو اِس مختصر اور غیر معمولی تفسیر سے استفادے کا موقع ملے اور دسیوں کتابوں کا خلاصہ اُنھیں اسی ایک کتاب میں مل جائے۔

اِس کتاب کی تدوینِ نو اور تحقیق میں مولاناؒ نے مندرجۂ ذیل کام کیے اور کرائے ہیں:

(۱) احادیثِ مرفوعہ کی تخریج صحیحین سے کی گئی ہے، اگر کوئی روایت صحیحین میں نہیں ملی تو دیگر کتبِ سنن ومسانید کا حوالہ دیا گیا ہے۔

(۲) حوالے میں احادیث کے نمبروں کے علاوہ کتاب، باب اور مطبع کی بھی نشان دہی کی گئی ہے۔

(۳) اقوالِ صحابہ کا حوالہ کتبِ حدیث سے تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے،

کتبِ حدیث میں اگر حوالہ نہیں ملا تو کتبِ تفسیر کے حوالے پر اکتفا کیا گیا ہے۔
(۴) مصنفؒ نے حوالوں کے لیے جن کتابوں کو بنیاد بنایا ہے، اُن سے بہ راہِ راست مراجعت کی گئی ہے اور عصری انداز میں حوالوں کی تجدید کر دی گئی ہے۔
(۵) مصنف کی عبارتوں میں ضروری جگہوں پر عناوین کا اضافہ کیا گیا ہے۔
(۶) تدوینِ نو میں عصری انداز میں رموزِ اِملا کا استعمال کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے۔
(۷) صفحات کے نیچے جو حواشی اور حوالے مصنف کے ہیں، اُن کے آخر میں "منہ" لکھ دیا گیا ہے، جب کہ محقق نے اپنے حواشی کو مطلق رہنے دیا ہے۔

سوانحی خاکہ

مولانا ریاست علی ظفرؔ بجنوری ۹؍مارچ ۱۹۴۰ء (شنبہ: ۲۸؍محرم ۱۳۵۹ھ) کو شہر علی گڑھ کے محلّہ حکیم سرائے میں پیدا ہوے۔ یہاں اُن کے والد ماجد جناب منشی فراست علیؒ (متوفی ۱۳۶۳ھ/۱۹۴۴ء) درس وتدریس کے مشغلے کی وجہ سے مقیم تھے۔ آبائی وطن موضع حبیب والا ضلع بجنور ہے۔ حبیب والا ضلع بجنور کی قدیم آبادیوں میں سے ایک ہے، اس کی تاریخ تاسیس ۹۸۰ھ/۱۵۷۲ء ہے جو 'حبیب والہ' کے لفظ سے نکلتی ہے، گویا یہ نام اُس بستی کا تاریخی نام ہے۔ یہ بستی اُن تین بستیوں میں سے ایک ہے جو مغل شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر (۹۴۹ھ/۱۵۴۲ء-۱۰۱۴ھ/۱۶۰۵ء) نے میز بانِ رسول حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ (خالد بن زید خزرجی متوفی ۵۲ھ/۶۷۲ء) کی ایک پشتینی اولاد حبیب اللہ (متوفی ۱۰۲۴ھ/۱۶۱۵ء) کو عطا کی تھیں، جن میں سے ایک فیض پور ہے جو قصبہ نہٹور کے قریب ہے، دوسری حبیب والا ہے اور تیسری سرائے شیخ حبیب ہے جو قصبہ چاند پور کے پاس ہے۔

مولانا کا سلسلۂ نسب ۳۵ویں پشت پر سیدنا ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے جاملتا ہے۔ شجرۂ نسب اِس طرح ہے:

ریاست علی بن فراست علی بن مشرف علی بن صادق علی بن اصغر علی بن کمال علی بن مولوی احسان علی بن مولوی محمد امین بن محمد وارث بن عبدالحق بن شیخ سعد اللہ بن شیخ عبدالحمید بن شیخ حبیب اللہ بن شیخ خان بن برخوردار بن عبدالکریم بن عبدالخالق بن عبدالرؤف بن شیخ اسعد بن ابوطاہر بن عبدالما لک بن شیخ صادق بن غازی سعد اللہ بن خواجہ جلال الدین بن خواجہ سلیم بن خواجہ اسماعیل بن شیخ الاسلام حضرت خواجہ عبداللہ بن خواجہ ابی منصور بن ابی معاذ بن محمد بن احمد بن علی بن جعفر بن منصور بن سیدنا ابوایوب الانصاری رضی اللہ عنہ۔

مولاناؒ کوئی چار سال کے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ مولاناؒ سے بڑے ایک بھائی تھے وراثت علی، متوفی ۱۳۷۳ھ/۱۹۵۴ء وہ سولہ سال کی عمر میں ہائی اسکول کا امتحان فرسٹ ڈویژن سے پاس کر کے کم عمری ہی میں اللہ کو پیارے ہوگئے۔ مولاناؒ نے ابتدائی تعلیم اپنے قصبہ حبیب والا ہی میں حاصل کی۔ ۱۳۷۳ھ/۱۹۵۴ء میں پرائمری اسکول حبیب والا سے درجۂ چہارم کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد اُن کے پھوپا مولانا سلطان الحق صاحبؒ (۱۳۲۵ھ/۱۹۰۷ء-۱۴۰۷ھ/۱۹۸۷ء) ناظم کتب خانہ دارالعلوم دیوبند اُنھیں دینی تعلیم میں لگانے کے لیے دیوبند لے آئے۔ مولانا سلطان الحقؒ بڑے دانا مربی اور سیاسی واجتماعی فہم وفراست کے حامل آدمی تھے، کتب خانے میں اُن کے پاس ہمہ وقت دارالعلوم کے اہم اساتذہ وملازمین کی مجلس لگی رہتی تھی، جن اساتذہ وملازمین کو اپنے کاموں سے ذرا فرصت ملتی، مولانا سلطان الحقؒ کی مدبرانہ وتجربہ کارانہ باتوں سے فائدہ اٹھانے کے لیے وہ اُن کے پاس ضرور پہنچ جاتے۔ مولانا سلطان الحق دارالعلوم کے باکمال فضلا میں تھے، حبیب والا ضلع بجنور ہی کے باسی تھے۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ (۱۲۹۵ھ/۱۸۷۹ء-۱۳۷۷ھ/۱۹۵۷ء) سے بیعت تھے اور بے حد عقیدت رکھتے تھے۔ مولانا سلطان الحقؒ نے مولانا ریاست علیؒ کی مکمل تعلیم وتربیت کا معقول انتظام اپنی سرپرستی میں کیا، جس کی وجہ سے اُن کی طالب علمانہ زندگی کا ہر لمحہ اپنے صحیح مصرف میں صرف ہوا۔ دارالعلوم ہی میں مولانا ریاست علیؒ نے فارسی کی تعلیم حاصل کی اور عربی کی ابتدائی کتابیں دارالعلوم کے مختلف اساتذہ سے دارالعلوم میں داخلے کے بغیر پڑھیں۔

۱۸؍شوال ۱۳۷۳ھ ۱۵؍مئی ۱۹۵۴ء کو بہ عمر ۱۴؍سال دارالعلوم میں شرحِ جامی بحث فعل، کنزالدقائق، اصول الشاشی، قطبی اور نفحۃ العرب کی جماعت میں داخل ہوے۔ محنت، اپنی ذہانت اور اپنے پھوپا مولانا سلطان الحقؒ کی حکیمانہ تربیت کی وجہ سے وہ ہمیشہ اپنے درجوں میں ممتاز رہے۔ ۱۳۷۸ھ/ ۱۹۵۸ء میں اُنھوں نے دورۂ حدیث شریف کے امتحان میں فرسٹ ڈویژن اور فرسٹ پوزیشن حاصل کی۔ لائق ذکر ہے کہ اُس وقت دارالعلوم میں ۵۰ نمبرات آخری نمبرات ہوا کرتے تھے؛ لیکن مولاناؒ کو اُن کے اساتذۂ گرامی نے حد درجہ خوش ہو کر کسی کتاب میں ۵۵، کسی میں ۵۴، کسی میں ۵۳ اور کسی میں ۵۲ نمبر دیے، صرف ایک کتاب میں ۵۰ نمبر ملے۔ سالانہ امتحان میں ہر کتاب میں نمبروں کی تفصیل اِس طرح ہے:

بخاری شریف ۵۵، مسلم شریف ۵۲، ترمذی شریف ۵۲، ابوداؤد شریف ۵۳، نسائی شریف ۵۵، ابن ماجہ شریف ۵۲، طحاوی شریف ۵۳، مؤطّا امام مالک ۵۴، مؤطا امام محمد ۵۳۔ گویا اُنھیں کل ۵۰۰ نمبرات کی بہ جائے ۵۲۹ نمبرات ملے جو غیر معمولی بات ہے۔

دورۂ حدیث شریف کے سال اُنھوں نے بخاری شریف حضرت مولانا سید فخر الدین احمد نوراللہ مرقدہٗ (۱۳۰۷ھ/ ۱۸۸۹ء-۱۳۹۲ھ/۱۹۷۲ء) سے پڑھی، جب کہ مسلم شریف اور ترمذی شریف حضرت علاّمہ محمد ابراہیم بلیاوی رحمۃ اللہ علیہ (۱۳۰۴ھ/۱۸۸۶ء-۱۳۸۷ھ/ ۱۹۶۷ء) سے پڑھیں، ابوداؤد

شریف حضرت مولانا سید فخر الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ (۱۳۲۳ھ/ ۱۹۰۵ء- ۱۴۰۰ھ/۱۹۸۰ء) سے، نسائی شریف وابن ماجہ شریف حضرت مولانا بشیر احمد خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۳۸۶ھ/ ۱۹۶۶ء) سے، طحاوی شریف حضرت مولانا ظہور احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ (۱۳۱۸ھ/۱۹۰۰ء- ۱۳۸۳ھ/۱۹۶۳ء) سے، شمائل ترمذی حضرت مولانا سید حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۳۸۱ھ/ ۱۹۶۱ء) سے، مُوَطّا امام مالک حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند (متوفی ۱۳۱۵ھ/ ۱۸۹۷ء- ۱۴۰۳ھ/۱۹۸۳ء) سے اور مُوَطّا امام محمد حضرت مولانا محمد جلیل کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۳۸۸ھ/ ۱۹۶۸ء) اور حضرت مولانا سید حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے مشترکہ طور پر پڑھی۔

طالب علمی کے زمانے میں اُنھوں نے جامعہ اردو علی گڑھ سے ادیبِ کامل کا امتحان فرسٹ پوزیشن سے پاس کیا؛ چناں چہ ''سرسید گولڈ میڈل'' سے سرفراز کیے گئے۔

دارالعلوم سے فراغت کے بعد ہی اُنھوں نے 'ایضاح البخاری' کی ترتیب کا کام شروع کر دیا، ذریعۂ معاش کے لیے خوش خطی سیکھی، اس کے لیے اُنھوں نے دارالعلوم دیوبند کے شعبۂ خوش خطی کے صدر مولانا اشتیاق احمد دیوبندیؒ (متوفی ۱۳۹۵ھ/ ۱۹۷۵ء) کے سامنے زانوئے تلمّذ تہہ کیا۔ مولانا ریاست علیؒ جلی اور خفی دونوں طرح کی کتابت بہت نفیس کرتے تھے۔ فاؤنٹن پن سے بھی وہ تیز لکھنے کے باوجود ایسا لکھتے تھے کہ اُن کی تحریر موتیوں کی لڑی معلوم ہوتی تھی۔ اِس سلسلے میں بھی دارالعلوم کے اساتذہ میں امتیازی شان کے حامل تھے۔ جو لوگ اہلِ قلم، مصنف اور مضمون نگار ہوتے ہیں، بالعموم اُن کی تحریریں خوب صورت اور جاذب نظر نہیں ہوتیں؛ لیکن کچھ لوگ مولانا ریاست علیؒ جیسے بھی ہوتے ہیں، جو بولتے ہیں تو موتیاں رولتے ہیں، لکھتے ہیں تو تحریر کے ظاہر و باطن سے قاری کو اسیرِ بے دام بنا لیتے ہیں۔

تقریباً تین ساڑھے تین سال دہلی میں جمعیۃ علمائے ہند میں برسرِ عمل رہے۔ آدھی مدت تک الجمعیۃ پریس گلی قاسم جان دہلی کے منیجر رہے اور آدھی مدت الجمعیۃ بک ڈپو واقع جمعیۃ بلڈنگ گلی قاسم جان کے منیجر کی حیثیت سے کام کیا۔

اس کے بعد اُنھوں نے دیوبند میں کتابت اور دینی کتابوں کی اِشاعت کی خدمت شروع کی۔ 'کاشانۂ رحمت' اور 'مکتبہ مجلس قاسم المعارف' کے نام سے اشاعتی اِدارے قائم کیے، جن سے دیوبند میں پہلی مرتبہ مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی (۱۲۷۳ھ/۱۸۵۷ء-۱۳۵۷ھ/۱۹۳۸ء) کی 'تاریخ اسلام' اور قاضی محمد سلیمان منصور پوری (متوفی ۱۳۴۹ھ/ ۱۹۳۰ء) کی ''رحمۃ للعالمین'' شائع کی۔ وہ اس زمانے میں لال مسجد دیوبند کے قریب ایک کرایے کے مکان میں رہتے تھے، اسی دور میں راقم کی اُن سے پہلی ملاقات طالب علمی کے زمانے میں، اُن کے ایک قابلِ رشک ہم درس مولانا محمد اُویس القاسمی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ساڑھے نو بجے صبح جمعہ: ۳/ جمادی الاخری ۱۴۱۹ھ - ۲۵ ستمبر ۱۹۹۸ء) کے برادرِ خُرد مولوی عُمیس اختر قاسمی کی معیت میں ہوئی، جو اُن کے پاس اکثر آیا جایا کرتے تھے۔ مولانا کی خوش اخلاقی اور شیریں کلامی سے بہت محظوظ ہوا۔ اُنھوں نے اِس موقع سے یہ نصیحت بھی کی کہ عزیزم اگر محنت اور لگن سے پڑھنے کا ارادہ ہے تو شہر کے طلبہ سے راہ و رسم نہ بڑھانا؛ ورنہ دارالعلوم کی علمی فضا سے کما حقہ فائدہ نہ اٹھا سکو گے۔ مولانا ریاست علیؒ اپنے رفیق درس مولانا اویس القاسمی سے دلی تعلق رکھتے تھے؛ بل کہ بعض حیثیتوں سے اُنھیں اپنے سے فائق سمجھتے تھے اور اُن کی بڑی تعریف کرتے تھے۔ اُن کے انتقال کے موقع سے وہ خود زیریں منزل افریقی منزل قدیم سے، جہاں اُس وقت اُن کی رہائش تھی، راقم کے پاس بالائی منزل پر تشریف لائے جہاں ہماری اب بھی رہائش ہے اور تعزیت فرمائی کہ وہ میرے پیارے دوست تھے اور بہت سی باتوں میں مجھ سے برتر تھے، چوں کہ وہ تمھارے بھائی ہوتے تھے کہ اُن کے پردادا اور تمھارے پردادا سگے بھائی تھے، اِس لیے میں تم سے دلی تعزیت کرتا ہوں، اللہ اُنھیں غریقِ رحمت کرے اور جنت الفردوس میں ہم سبھوں کو ایک دوسرے سے ملائے۔

اِن ساری مصروفیات کے ساتھ خواہش مند طلبہ کو تطوعاً کتابیں پڑھاتے رہے، کچھ عرصہ مدرسہ اصغریہ دیوبند میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ اس زمانے میں وہ شاعری بھی کرتے تھے، بہت سے اشعار دوسروں کو لکھ کر دے دیے، کلام کا بہت منتخب حصہ ۱۳۹۶ھ/ ۱۹۷۶ء میں 'نغمۂ سحر' کے نام سے شائع ہوا۔

۱۳۸۳ھ/۱۹۶۴ء میں مولانا سلطان الحقؒ کی صاحب زادی 'صفیہ شاہانہ' سے اُن کا عقدِ نکاح ہوا، جن کے بطن سے اُن کے تین صاحب زادے مولانا سفیان قاسمی، مولانا قاری محمد عدنان قاسمی اور مولانا محمد سعدان قاسمی ہیں۔ الحمدللہ ساری اولاد بھی صاحبِ اولاد ہے اور علمی و عملی دنیا میں سرگرم کار ہے۔

۱۳۹۱ھ/۱۹۷۱ء میں دارالعلوم دیوبند میں درجۂ ابتدائی میں تقرر ہوا، ۱۳۹۶ھ/۱۹۷۶ء میں وسطی ب میں ترقی دی گئی، ۱۴۰۲ھ/۱۹۸۲ء میں وسطی الف میں ترقی دی گئی۔ اِن ترقیات کے لیے اُنھوں نے کوئی درخواست نہیں دی؛ بل کہ مجلس شوریٰ نے ازخود لیاقت کی بنیاد پر اُنھیں ترقیات سے نوازا۔

۱۴۰۲ھ/۱۹۸۲ء میں رسالہ 'دارالعلوم' کا مدیرِ مسئول مقرر کیا گیا، اُنھوں نے مختلف تدریسی وغیر تدریسی ذمے داریوں کے ساتھ دو سال تک یہ اہم خدمت بہ حسن وخوبی انجام دی۔

۱۴۰۳ھ/۱۹۸۳ء میں اُنھیں درجۂ وسطیٰ الف سے درجۂ علیا میں ترقی ملی۔ مولاناؒ میں جو طبعی انکساری تھی اور شہرت و نام وری سے احتراز کی جو خو تھی،

اس کی وجہ سے اُنھوں نے درجۂ علیا میں ترقی سے معذرت کی کہ بندہ اِس کا اہل نہیں ہے؛ لیکن مجلسِ شوریٰ اُن کی اہلیت اور کارکردگیوں سے بہ خوبی واقف تھی؛ اِس لیے اُس نے اُنھیں بالاتفاق درجۂ علیا میں ترقی دی۔ اسی کے ساتھ اُنھیں نائب ناظم مجلس تعلیمی مقرر کیا گیا۔

۱۴۰۵ھ/۱۹۸۴ء میں ناظمِ مجلس تعلیمی مقرر ہوے، اس وقت اُنھوں نے محسوس کیا کہ نظامتِ مجلس تعلیمی کی ذمے داری کے ساتھ رسالہ 'دارالعلوم' کی ذمے داری کو کما حقہ انجام دینا مشکل ہے، تو اُنھوں نے ثانی الذکر خدمت سے سبک دوشی حاصل کرلی۔ یہ زمانہ دارالعلوم میں ہنگامی حالات کا زمانہ تھا؛ لیکن مولاناؒ کی اپنی انتظامی صلاحیت اور قدرتی فہم وفراست کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ اُن کا دورِ نظامت بہ خیر وخوبی گزرا؛ بلکہ اُنھوں نے صدر مدرس اور مجلس تعلیمی کے ارکان کے مشورے سے بہت سی مطلوبہ اِصلاحات کیں جن سے دفتری امور میں آسانیاں پیدا ہوئیں، امتحانِ داخلہ کو تحریری طور پر منظّم کیا، امتحانِ شش ماہی کو سالانہ کی طرح باقاعدہ تحریری اور باوقار بنایا، تمام امتحانات میں امیدواروں کے نام کی بہ جائے کوڈ نمبر ڈالنے کا سلسلہ قائم کیا۔

۱۴۰۸ھ/ ۱۹۸۷ء میں اُنھیں 'شیخ الہند اکیڈمی' کا ڈائرکٹر مقرر کیا گیا، اُن کے دور میں بہت سی علمی کتابیں اشاعت پذیر ہوئیں اور اکیڈمی کے ماتحت منتخب طلبہ کو تصنیف وتالیف کے لیے تیار کرنے کے نظام کو باقاعدگی ملی۔

۱۴۱۲ھ/ ۱۹۹۱ء میں مجلسِ شوریٰ نے اُنھیں نائب مہتمم مقرر کرنے کی تجویز منظور کی، گو کہ وہ اس سے قبل اور اس کے بعد بھی بار بار عارضی طور پر قائم مقام مہتمم اور نائب مہتمم کی ذمّے داری انجام دیتے رہے؛ لیکن اب ان کی صحت اور ہمت پہلے جیسی نہیں رہ گئی تھی؛ اِس لیے اِس منصب کی باقاعدہ ذمے داری کے تحمل سے اُنھوں نے معذرت کردی؛ حال آں کہ صدر جمعیۃ علماے ہند ورکن رکین مجلسِ شوریٰ دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا سید اسعد مدنی نوَّرَ اللہ مرقدہ (۱۳۴۶ھ/ ۱۹۲۸ء – ۱۴۲۷ھ/ ۲۰۰۶ء) گھر آ کر اس ذمے داری کو قبول کرلینے کے لیے اُن کو تیار کرنے کی کوشش کی؛ لیکن مولاناؒ شدت کے ساتھ اپنی معذرت پر قائم رہے۔ چند سال بعد مجلس تعلیمی اور اکیڈمی کی ذمے داریوں سے بھی سبک دوشی اختیار کرلی اور صرف 'اِیضاح البخاری' کے کاموں کے لیے اپنے کو فارغ کرلیا۔

اُنھوں نے دارالعلوم دیوبند میں اوّل عربی سے دورۂ حدیث شریف تک کی تمام کتابیں پڑھائیں؛ چناں چہ تقرر والے سالِ تعلیمی ۹۲-۱۳۹۱ھ/ ۷۲-۱۹۷۱ء میں علم الصرف، نحومیر، شرح مأۃ عامل، اِنشاے عربی، روضۃ الادب، نفحۃ العرب اور مشکٰوۃ الآثار پڑھائیں۔ سال تعلیمی ۹۳-۱۳۹۲ھ/ ۷۳-۱۹۷۲ء میں مختارات، شرح وقایہ، ہدایۃ النحو، کافیہ، صف ابتدائی (برائے تدریس عربی زبان) اور صفِ ثانوی، کے اسباق اُن سے متعلق رہے۔ سال تعلیمی ۹۴-۱۳۹۳ھ/ ۷۴-۱۹۷۳ء میں مختارات، مقامات حریری، نورالانوار، ملاحسن، تمرین عربی اور الفیۃ الحدیث وغیرہ کتابیں آپ نے پڑھائیں۔ سالِ تعلیمی ۹۵-۱۳۹۴ھ/ ۷۵-۱۹۷۴ء میں بھی مذکورالصدر کتابیں ہی زیر تدریس رہیں۔ سالِ تعلیمی ۹۶-۱۳۹۵ھ/ ۷۶-۱۹۷۵ء میں البلاغۃ الواضحہ، ہدایہ ثانی، الاشباہ والنظائر، حسامی، تمرین النحو اور کتاب النحو، آپ سے متعلق رہیں۔ سال تعلیمی ۹۷-۱۳۹۶ھ/ ۷۷-۱۹۷۶ء میں النحو الواضح، البلاغۃ الواضحہ اور ہدایہ ثانی نیز دیگر مذکورہ بالا کتابیں آپ نے پڑھائیں۔ سال تعلیمی ۹۸-۱۳۹۷ھ/ ۷۷-۱۹۷۶ء میں ملاحسن، حسامی، اُصول الشاشی، نورالانوار، ہدایہ اوّل اور البلاغۃ الواضحہ کے اسباق آپ نے پڑھائے۔ سال تعلیمی ۹۹-۱۳۹۸ھ/ ۷۸-۱۹۷۷ء میں تفسیر ابن کثیر (سورۂ بقرہ وآل عمران) البلاغۃ الواضحۃ، ہدایہ ثانی اور دیوان متنبّی، آپ کے زیر تدریس رہیں۔ سالِ تعلیمی ۱۴۰۰-۱۳۹۹ھ/ ۷۹-۱۹۷۸ء میں تفسیر ابن کثیر، شرحِ عقائد، ہدایہ ثانی اور البلاغۃ الواضحہ آپ سے متعلق رہیں۔ سال تعلیمی ۱۴۰۱-۱۴۰۰ھ/ ۸۰-۱۹۷۹ء میں مشکٰوۃ شریف، نخبۃ الفکر، البلاغۃ الواضحہ، دیوانِ حماسہ اور سبعہ معلقہ کے اسباق آپ کے ذمّے رہے۔ سال تعلیمی ۱۴۰۲-۱۴۰۱ھ/ ۸۱-۱۹۸۰ء میں مشکاۃ، نخبۃ الفکر، البلاغۃ الواضحہ، دیوانِ حماسہ، ابن ماجہ شریف اور ہدایہ ثانی، آپ سے متعلق رہیں۔

سال ہاے تعلیمی ۱۴۰۳-۱۴۰۲ھ/ ۸۲-۱۹۸۱ء اور ۱۴۰۴-۱۴۰۳ھ/ ۸۳-۱۹۸۲ء اور ۱۴۰۵-۱۴۰۴ھ/ ۸۴-۱۹۸۳ء میں مشکاۃ شریف مع نخبہ، البلاغۃ الواضحہ اور ابن ماجہ شریف پڑھائیں؛ البتہ آخرالذکر سال میں حجۃ اللہ البالغہ کی تدریس بھی آپ سے متعلق رہی۔

سال ہاے تعلیمی ۱۴۰۶-۱۴۰۵ھ/ ۸۵-۱۹۸۴ء اور ۱۴۰۷-۱۴۰۶ھ/ ۸۶-۱۹۸۵ء میں مشکاۃ شریف مع نخبۃ الفکر اور ابن ماجہ شریف ہی کے اسباق آپ کے ذمے رہے۔

سال ہاے تعلیمی ۱۴۰۸-۱۴۰۷ھ/ ۸۷-۱۹۸۶ء تا ۱۴۳۰-۱۴۲۹ھ/ ۸۸-۱۹۸۷ تا ۲۰۰۸-۲۰۰۸ء میں مشکاۃ شریف مع نخبۃ الفکر، البلاغۃ الواضحہ اور ابن ماجہ شریف کے اسباق آپ سے متعلق رہے؛ البتہ دو تعلیمی سالوں: ۱۴۱۳-۱۴۱۲ھ/۹۲-۱۹۹۱ء اور ۱۴۱۴-۱۴۱۳ھ/۹۳-۱۹۹۲ء میں دیوانِ حماسہ اور سبعہ معلقہ کے اسباق بھی آپ کے ذمّے رہے؛ جب کہ سال ہاے تعلیمی ۱۴۱۵-۱۴۱۴ھ/ ۹۴-۱۹۹۳ء و ۱۴۱۶-۱۴۱۵ھ/۹۵-۱۹۹۴ء میں دونوں دیوانوں کی جگہ ''مواقف المسترشدین'' آپ سے متعلق رہی۔

زندگی کے آخری آٹھ نو سالوں یعنی ۱۴۳۰ھ تا ۱۴۳۸ھ/ ۲۰۰۹-۲۰۱۷ء ترمذی شریف اوّل اور البلاغۃ الواضحہ کے اسباق ہی آپ نے اپنے ذمے رکھے؛ کیوں کہ آپ نے تحریری مشاغل کے لیے اپنے کو فارغ کرلیا تھا اور ضعف عمری بھی اسباق کے زیادہ بار سے سبک دوش ہو جانے کا متقاضی ہوئی۔ □□

علم وادب کی ریاست کا بادشاہ
حضرت مولانا ریاست علی بجنوریؒ

تحریر: مولانا خالد سیف اللہ رحمانی (المعہد العالی الاسلامی، حیدرآباد)

کچھ ادارے تاریخ کا حصہ ہوتے ہیں اور جو کچھ خدمات ان کے لیے مقدر ہیں، انھیں انجام دے کر تاریخ کے خاکستر میں دب جاتے ہیں، اور کچھ اللہ کی طرف سے تاریخ ساز بن جاتے ہیں، جو صرف پھل نہیں دیتے؛ بلکہ ان درختوں کو جنم دیتے ہیں، جن سے پھل پیدا ہوں، جو صرف پھول نہیں دیتے؛ بلکہ ایک پھلواری کو وجود میں لاتے ہیں، جو صرف روشنی نہیں دیتے؛ بلکہ ایسے چراغ وجود میں لاتے ہیں، جن کی لَو سے ہزاروں چراغ جلائے جاتے ہیں، ایسے ہی بافیض اداروں میں ایک دارالعلوم دیوبند ہے، یقیناً دارالعلوم ایک سمندر ہے، جس سے علم کی نہریں پھوٹتی ہیں، وہ ایک آفتاب جہاں تاب ہے، جس سے ہزاروں ستاروں کو روشنی ملتی ہے اور وہ ایک شجر طوبیٰ ہے؛ جس کی سایہ دار ٹہنیاں مشرق سے مغرب تک سایہ فگن ہیں: ''اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا، كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ، اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ. (ابراہیم:۲۴)

دارالعلوم نے اپنے قیام سے لے کر آج تک ہر عہد میں بڑے بڑے اہلِ علم کو جنم دیا ہے، بیسویں صدی میں جو علماء، اصحابِ فکر اور اہلِ نظر اس دانش گاہ سے پیدا ہوئے، ان میں ایک قابل ذکر شخصیت استاذ الاساتذہ حضرت مولانا ریاست علی ظفؔر بجنوریؒ کی تھی، اس حقیر کو ۱۳۹۶ھ میں اس عظیم درسگاہ میں حاضری کا اور یہاں سے کسبِ فیض کا موقع ملا، اس وقت مولانا موصوف وسطیٰ کے استاذ تھے اور غالباً ششم عربی تک کی کتابیں آپ سے متعلق تھیں، میرے عم محترم حضرت مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ اور ان کے درمیان بڑے اچھے مراسم تھے، قاضی صاحب ابتدائے سال ہی میں کسی مناسبت سے تشریف لائے اور مولانا موصوف نے اپنے پھوپھا حضرت مولانا سلطان الحق صاحب (ناظم کتب خانہ) کے یہاں ان کی پرتکلف ضیافت کا اہتمام کیا، مجھے بھی قاضی صاحبؒ کے ساتھ اس میں شرکت کا موقع مل گیا تھا، اس وقت پہلی بار قریب سے مولانا کو دیکھنے کا موقع ملا، مولانا کے سراپا اور مزاج واخلاق کی تصویر اسی وقت سے ذہن میں نقش ہے، کھلا ہوا رنگ، درمیانہ قد وقامت، سیاہ داڑھی، جس کے چند بال سفید تھے، کشادہ پیشانی، دو پلی ٹوپی، کرتا اور شلوار، سر سے پاؤں تک سفید پوش، سنجیدہ ومتین لیکن خوش مزاج، زبان ایسی کہ جیسے الفاظ سنگ مر مر سے تراشے گئے ہوں، بے تکلف اور مہربان، احباب اور شاگردوں کے ساتھ گفتگو میں ظرافت کی آمیزش اور محبت آمیز طنز، حاضر جواب، برموقت اساتذۂ شعر وسخن کے کلام کا استعمال کچھ اس برجستگی سے کرتے کہ گویا یہ شعر اسی موقع کے لیے کہا گیا ہو، مہمان نواز، طلبہ کے ہمدرد، بزرگوں کے نیازمند اور معاصرین کے قدر داں۔ ان کا نسب میزبانِ رسول حضرت ابوایوب انصاریؓ سے ملتا ہے، اور سلسلۂ نسب میں شیخ الاسلام عبداللہ انصاری ہروی (متوفی ۳۶۶ھ) اور ہندوستان کے معروف صاحبِ علم، استاذ الاساتذہ قطب الدین سہالویؒ (متوفی:۱۱۳۰ھ) کے اسمائے گرامی بھی ملتے ہیں؛ جس سے اس خاندان کے علمی مقام کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، اسی خاندان کی ایک نیک سیرت شخصیت منشی فراست علی مرحوم اپنے آبائی مقام موضع حبیب والا، ضلع بجنور سے علی گڑھ منتقل ہوگئے تھے، جو مولانا کے والد ماجد تھے اور پیشۂ تدریس سے تعلق رکھتے تھے، یہیں ۹/مارچ ۱۹۴۰ء کو محلّہ حکیم سرائے میں آپ پیدا ہوئے، ۱۹۵۱ء میں مقامی پرائمری اسکول سے چوتھی جماعت کی تکمیل کی، پھر ان کے پھوپا اور کتب خانہ دارالعلوم دیوبند کے ناظم مولانا محمد سلطان الحق صاحبؒ کی جوہر شناس شخصیت نے اپنے ساتھ لیا اور آپ دیوبند لائے گئے، ابتداء سے انتہاء تک دارالعلوم ہی سے کسبِ فیض کیا، یہاں تک کہ ۱۹۵۸ء میں فراغت حاصل کی اور اول درجہ سے کامیاب ہوئے۔

اس وقت شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی کے تلمیذ رشید حضرت مولانا فخر الدین احمد صاحبؒ دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث تھے، ان کا درس علم وتحقیق، موضوع کے احاطہ اور زبان وبیان کی خوبصورتی کے لحاظ سے ایک بے مثال درس تھا، شاید یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان کے بعد دارالعلوم کی مشیختِ حدیث کو اس درجہ کا کوئی اور شخص نہیں ملا، ''وَلَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ أَمْرًا'' حضرت مولانا ریاست علی صاحبؒ کچھ اس طرح ان کے دامنِ تربیت سے وابستہ ہوئے کہ جب تک وہ زندہ رہے، ہمیشہ فیضیاب ہوتے رہے، ۱۳۹۱ھ میں دارالعلوم دیوبند میں درجۂ ابتدائی میں مدرس مقرر ہوئے اور ترقی کرتے ہوئے ۱۴۰۳ھ میں درجۂ علیاء کے استاذ ہوگئے، پھر تادمِ وفات تدریس سے اپنا تعلق برقرار رکھا، اخیر زمانہ میں سننِ ترمذی جیسی حدیث کی اہم کتاب جس کو دارالعلوم دیوبند اور اس کے ہم مزاج اداروں میں خصوصی اہمیت کے ساتھ پڑھایا جاتا ہے اور لائق ترین استاذ سے اس کی تدریس متعلق کی جاتی ہے، آپ سے متعلق رہی۔

جس وقت یہ حقیر دارالعلوم دیوبند پہنچا تھا، اس وقت دورہ حدیث کی

کتابیں بہت ہی سینئر اساتذہ سے متعلق تھیں، جن میں سوائے حضرت مولانا محمد سالم قاسمی صاحب دامت برکاتہم کے اب کوئی شخصیت باقی نہیں رہی، اللہ تعالیٰ ان تمام بزرگوں کو شایانِ شان اجرعطا فرمائے اور ان کے درجات بلند کرے؛ لیکن اس وقت درجۂ وسطیٰ کے دو تین اساتذہ کا درس بہت مقبول تھا، طلبہ ان سے بہت خوش رہتے تھے اور ان کے ثناء خواں تھے، ان میں ایک نام حضرت مولانا ریاست علی ظفرؔ بجنوری صاحبؒ کا بھی تھا۔ ان میں چونکہ شفقت کا رنگ غالب تھا، مزاج میں بے تکلفی اور شائستہ ظرافت تھی، ہٹو بچو کا مزاج نہیں تھا؛ اس لیے طلبہ ان سے قریب رہتے تھے، وہ طلبہ بھی جو اُن سے پڑھتے ہوئے تھے، وہ بھی جن کے اسباق اُن سے متعلق نہیں تھے اور وہ بھی جو اُن سے پڑھ کر فارغ ہو چکے تھے؛ اس لیے مولانا کے پاس طلبہ کی کافی آمدورفت رہتی تھی، ان کا ادبی ذوق بھی بہت اونچا تھا؛ اس لیے طلبہ ان سے اپنی تحریروں کی اصلاح کے لیے بھی رُجوع ہوا کرتے تھے اور وہ بڑی فراخ دلی کے ساتھ رہنمائی کرتے تھے۔

ان کی صلاحیت ہمہ جہت تھی، شاعر تو وہ تھے ہی، نثر کا ذوق بھی بڑا اونچا تھا، اسی نسبت سے ۱۴۰۲ھ میں 'ماہ نامہ دارالعلوم' کے مدیر مسئول مقرر ہوئے، نیز ان کے علمی و تحقیقی مزاج کو سامنے رکھتے ہوئے ۱۴۰۸ھ میں انھیں 'شیخ الہند اکیڈمی' کا نگراں مقرر کیا گیا، عام طور پر جو لوگ علمی میدان کے شہسوار ہوتے ہیں، ان میں انتظام و انصرام کا سلیقہ نہیں ہوتا؛ لیکن مولانا کو اللہ نے اس صلاحیت سے بھی نوازا تھا، وہ اُصولوں پر قائم رہتے ہوئے لوگوں کو خوش رکھنے کا فن جانتے تھے، اسی نسبت سے انھیں پہلے ''مجلسِ تعلیمی'' کا نائب ناظم پھر ناظم مقرر کیا گیا، کئی بار عارضی طور پر نائب مہتمم اور کارگذار مہتمم کی ذمہ داری بھی متعلق کی گئی، پھر مستقل طور پر نائب مہتمم مقرر کرنے کا بھی فیصلہ ہوا؛ لیکن آپ نے معذرت کر دی؛ بلکہ عمر کے اخیر حصہ میں تمام انتظامی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو کر تدریس اور ایضاح البخاری کی ترتیب کے لیے یکسو ہو گئے۔

ان کا خط بھی بڑا پاکیزہ ہوا کرتا تھا، ایسا لگتا تھا کہ الفاظ کے موتی کاغذ پر بکھیر دیئے ہیں، میرے ایک استاذ حضرت مولانا فضل الرحمٰن قاسمی صاحبؒ ان کے ہم درس تھے اور دونوں میں دوستانہ تعلق تھا، وہ ان کا بڑا ذکرِ خیر کیا کرتے تھے اور اپنے دو ساتھیوں کے حسنِ تحریر کا ذکر کرتے تھے، ایک: مولانا موصوف کا، دوسرے: حضرت مولانا محمد حنیف ملیؒ (مالیگاوں) کا، اور کہتے تھے کہ مولانا حنیف ملی خوش رقم تھے اور مولانا ریاست علی صاحب خوش رقم بھی تھے اور زود رقم بھی، شاید اسی لیے وہ مولانا فخر الدین صاحب کے درس کے بہتے دریا کو لوح و قرطاس پر لانے میں کامیاب ہوئے۔

تدریسی، تربیتی اور انتظامی مصروفیات کی وجہ سے مولانا کو تصنیف و تالیف کی طرف زیادہ توجہ دینے کا موقع نہیں ملا؛ حالاں کہ اگر وہ اس جانب توجہ دیتے تو ان کا شمار ان کے دور کے بڑے مصنّفین میں ہوتا؛ لیکن ان کی دو تحریری یادگاریں ہمارے سامنے ہیں، ایک: ''شوریٰ کی شرعی حیثیت''، جس میں انھوں نے شورائی نظام کی اہمیت اور اس کے اختیارات پر بڑی فاضلانہ گفتگو کی ہے؛ اگر چہ ایک خاص پس منظر میں استاذ گرامی حضرت مولانا معراج الحق صاحبؒ کے ایماء پر انھوں نے یہ کتاب تالیف کی ہے؛ لیکن نفسِ موضوع کے اعتبار سے بھی یہ بڑی اہم کتاب ہے اور اُردو زبان میں شاید اس مسئلہ پر اتنی تفصیل کے ساتھ قلم نہیں اُٹھایا گیا ہے۔

دوسرا کام؛ بلکہ کارنامہ 'ایضاح البخاری' کی ترتیب ہے، یہ کام میری نظر میں اس لیے بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ اس کتاب نے مولانا فخر الدین احمد صاحبؒ کو علمی و درسی دنیا میں زندہ رکھا ہے، امام شافعیؒ سے منقول ہے کہ لیث ابن سعد امام مالکؒ سے زیادہ فقیہ تھے؛ لیکن ان کے شاگردوں نے ان کو ضائع کر دیا؛ چنانچہ یہ ایک حقیقت ہے کہ علمی شخصیتیں اکثر اپنے تصنیفی و تالیفی کارناموں سے زندہ رہتی ہیں، اور اگر کسی شخص کو تصنیف و تالیف سے اشتغال کا موقع نہیں ملا، یا ان کا علمی سرمایہ محفوظ نہیں رہا تو اگر شاگردوں نے ان کے افادات کو جمع کیا تو یہ ان کی زندگی کو باقی رکھتا ہے، ورنہ آہستہ آہستہ ان شخصیت لوگوں کے ذہن سے محو ہو جاتی ہے، اس کی سب سے بڑی مثال خود امام ابو حنیفہؒ ہیں کہ آپ کی براہ راست تصنیفات محفوظ نہیں رہ سکیں اور جو چیزیں باقی ہیں اور آپ کی طرف منسوب ہیں، اہل علم کے نزدیک ان کی نسبت مشکوک ہے؛ لیکن آپ کے باکمال شاگردوں، خاص کر امام محمدؒ کے ذریعہ آپ کا علمی وفقہی سرمایہ محفوظ ہو گیا، جو آج اہلِ علم کی آنکھوں کا سرمہ بنا ہوا ہے اور اہل السنۃ والجماعت کی غالب تعداد آپ ہی کے فقہی اجتہادات کی متبع ہے۔

یہ صورت حال ہر دور میں پیش آئی ہے، بزرگانِ دیوبند میں استاذ الاساتذہ علامہ محمد ابراہیم بلیاویؒ ایک امتیازی شان کے استاذ تھے، میں نے حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحبؒ سے ان کے بارے میں سنا کہ وہ ایسے عالم تھے کہ بڑے سے بڑا عالم بھی اگر ان کے سامنے بیٹھتا تو اس پر اس کا جہل واضح ہو جاتا؛ لیکن علامہ بلیاویؒ کا کوئی قابلِ ذکر تالیفی سرمایہ محفوظ نہیں رہ سکا اور نہ شاگردوں نے ان کے افادات مرتب کیے؛ اس لیے موجودہ دور کے نوجوان علماء کے یہاں شاذ و نادر ہی ان کا ذکر ملتا ہے، اگر مولانا ریاست علی ظفرؔ بجنوری صاحبؒ نے اپنے محبوب استاذ مولانا فخر الدین احمد صاحبؒ کے درس بخاری کو مرتب نہیں کیا ہوتا تو ان کے تمام تر علمی و درسی کمالات کے باوجود آج ان کا حال علامہ بلیاویؒ سے مختلف نہیں ہوتا اور صرف تاریخ دارالعلوم میں ان کا نام پڑھنے کو ملتا؛ اس لیے مولانا ریاست علی صاحبؒ نے اپنے استاذ کے افادات کو مرتب کر کے ان کی شخصیت کو زندہ جاوید بنا دیا۔

میرا خیال ہے کہ گہرے مضامین کو خوبصورت تعبیر میں بیان کرنے اور

دقیق فنی مسائل کو زبان و بیان کے محاسن کے ساتھ پیش کرنے کے اعتبار سے درسی شروح کی دنیا میں 'ایضاح البخاری' ایک منفرد کتاب ہے، جس کا اپنا رنگ و آہنگ ہے؛ حالاں کہ گاہے گاہے طولِ کلام بھی ہے؛ لیکن پڑھنے والوں کی طبیعت اُکتاتی نہیں ہے اور مضمون دو پہر کی دھوپ کی طرح واضح ہو جاتا ہے، میں پہلے اس کتاب کی حسنِ تعبیر کو دیکھ کر سمجھتا تھا کہ شاید مولانا فخر الدین صاحبؒ کے مفہوم کو مولانا ریاست علی صاحبؒ نے اپنے الفاظ کا پیرہن دیا ہے؛ کیوں کہ سنجیدہ اور دقیق مضامین کو اتنی خوبصورت تعبیر میں برجستہ پیش کرنا بظاہر ممکن نہیں ہوتا؛ لیکن میں نے خود مولانا ریاست علی صاحب سے اس بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے فرمایا کہ حضرت کی تقریر ہوتی ہی ایسی تھی اور اس میں الفاظ بھی ان ہی کے ہیں، پھر حضرت مولانا فخر الدین صاحبؒ کے بعض اور شاگردوں نے بھی بتایا کہ مولانا کے درس کی زبان بڑی خوبصورت اور مرتب ہوا کرتی تھی؛ لیکن بہر حال اتنے تفصیلی درس کو اخذ کرنا اور ان کی نقل و ترتیب کا کام انجام دینا بھی کوئی معمولی کام نہیں ہے، اس کے علاوہ حسبِ ضرورت مراجع سے رُجوع کرنے، عنوانات قائم کرنے، کہیں کوئی خلاء رہ گیا ہو تو اسے پُر کرنے کا کام فاضل مرتب ہی کے ذریعہ ہوا ہے، پھر تقریر و تحریر کی زبان میں فرق ہوتا ہے، تقریر کتنی ہی عمدہ کیوں نہ ہو، جب اس کو تحریر کا پیکر دیا جاتا ہے تو بہت کچھ حک و اضافہ کرنا پڑتا ہے اور یہ سب کام آپ ہی نے انجام دیا ہے۔ میں نے خاصا عرصہ پہلے ذکر کیا تھا کہ اگر یہ کام آپ کے ہاتھوں مکمل ہو جاتا تو بڑا اچھا ہوتا اور یہ کتاب استاذ و شاگرد دونوں کی یادگار بن جاتی، مولانا نے بتلایا کہ اب میں واقعی یکسو ہو کر اس کام کو مکمل کرنا چاہتا ہوں؛ لیکن حضرت کی زیادہ تر بحث جلد اول میں کتاب الایمان، کتاب العلم اور ابتدائی ابواب اور جلد دوم میں مغازی و تفسیر میں ہوا کرتی تھی، چاہتا ہوں کہ پہلے اس کو مکمل کرلوں، 'ایضاح البخاری' کی اب تک دس جلدیں منظر عام پر آ گئی ہیں، اللہ کرے کہ یہ کام مکمل ہو جائے۔

انھوں نے دارالعلوم میں طالب علمی کے آغاز سے اپنی وفات تک ایک دو سال چھوڑ کر دارالعلوم ہی کے احاطہ میں پوری زندگی گذاری، وہ دینی جلسوں اور علمی مجلسوں میں کبھی کبھی چلے جایا کرتے تھے؛ لیکن اس کا معمول بہت کم تھا، وہ ایک باکمال اور فرض شناس مدرس کی شان کے مطابق اپنا زیادہ سے زیادہ وقت دارالعلوم میں گذارتے تھے، وہ نہ صرف مسلک دیوبند پر ثابت قدم تھے؛ بلکہ تعلیمی اور تربیتی منہج میں بھی دیوبند کے موجودہ تعلیمی منہج اور نصابِ تعلیم کو ہی مدارسِ اسلامیہ کے لیے سب سے بہتر تصور کرتے تھے، چند سال پہلے دارالعلوم وقف دیوبند میں دینی مدارس کے نصابِ تعلیم اور نظامِ تعلیم پر 'اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا' نے ایک دو روزہ سیمینار رکھا تھا، اس میں دیوبند ہی کے رہنے والے ایک نوجوان فاضل نے تیز و تند مقالہ پیش کیا، جس میں تبدیلیوں کے مشورہ کے ساتھ ساتھ موجودہ نظام پر تیکھی تنقید بھی کی گئی تھی، راقم الحروف اگرچہ درسِ نظامی کے مروجہ نصاب و نظام میں جزوی تبدیلی کا قائل ہے؛ لیکن اس مقالہ میں دیے گئے مشورے اور خاص کر ان مشوروں کا لب ولہجہ ناگوارِ خاطر ہی ہوا، حضرت مولانا ریاست علی صاحبؒ نے اس موقع پر اپنے خطاب میں اس پر رد کرنے کا فریضہ انجام دیا، **فجزاہ اللہ خیر الجزاء**۔

مولانا کی زندگی کا ایک اہم پہلو شعر و سخن کا اعلیٰ ذوق ہے، یوں تو ہندوستان کے بڑے بڑے علماء و مشائخ نے اس میدان میں طبع آزمائی کی ہے؛ لیکن زیادہ تر ان کے کلام میں نصح و موعظت اور تصوف کے معارف کو سادہ طریقہ پر پیش کیا گیا ہے، ایسے لوگ کم ہیں؛ جن کے یہاں شعری لطافت، تخیل کی بلند پروازی، دل آویز تشبیہات، اور دل کو چھو لینے والی تعبیرات پائی جاتی ہوں، مولانا ریاست علی صاحبؒ کے اشعار میں یہ خوبیاں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں، وہ ایک عام مضمون کو بھی خوبصورت تشبیہات کے ساتھ پیش کرتے ہیں، جیسے آج کل حکومتیں اور جماعتیں اپنے کارناموں کا ڈھنڈورا پیٹتی رہتی ہیں اور کچھ خوشامدی لوگ ان کی تعریف میں زمین کے قلابے آسمان سے ملا دیتے ہیں، مولانا نے کس خوبصورتی کے ساتھ اس پر طنز کیا ہے:

شہادتِ گل و بلبل بہت ضروری ہے
کوئی ہزار پکارا کرے : بہار آئی

کسی بات کو بیان کرنے کے لیے پروانوں کا ذکر تو خوب ہوتا ہے؛ لیکن اصل قربانی خود شمع کی ہے، جو اپنے آپ کو جلاتی اور گھلاتی ہے، اس بے چاری کا ذکر نہیں ہوتا اور جو ظاہری کردار ہیں، ان کو شہرت دی جاتی ہے، آپ نے اس پس منظر میں کہا ہے:

تاب و تبِ پیہم کی پتنگے کو خبر کیا؟
خود شمع کے جلووں نے بنایا ہے یہ کردار

بعض ایسے مضامین جن کو اُردو شاعری کے اساتذہ شعراء نے اپنے اشعار میں باندھا ہے، مولانا نے اس کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ اپنے اشعار میں پیش کیا ہے، جیسے مرزا اسد اللہ غالبؔ کا یہ شعر زبان زد خاص و عام ہے:

وہ آئیں گھر میں ہمارے، خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو، کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

مولانا نے مہمان کی توقیر اور اس کی آمد پر خوشی و اظہار مسرت کے مضمون کو اس طرح باندھا ہے:

نادم ہوں واقعی کرمِ بے حساب سے
خوش آمدید! آپ کہاں، میرا گھر کہاں؟

اس شعر میں 'کرمِ بے حساب' کے الفاظ سے مہمان کا شکریہ، خوش آمدید سے اس کا استقبال کرنا اور ''آپ کہاں میرا گھر کہاں'' سے مہمان کی توقیر نیز

اپنی طرف سے تواضع کا اظہار ہے، گویا ایک مہمان کی آمد پر جو باتیں ہونی چاہئیں، وہ سب اس میں جمع ہوگئی ہیں۔

اُردو شاعری میں 'مومن' کا جو بلند مقام ہے، وہ محتاجِ بیان نہیں، ان کا یہ شعر نزاکتِ خیال کا اعلیٰ نمونہ ہے اور اسی لیے اُردو دنیا میں اس کو جو قبولیت و پذیرائی حاصل ہوئی ہے، وہ کم اشعار کو حاصل ہوئی ہے:

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

اگرچہ سلاست وروانی میں اب بھی مومن کے شعر کا جواب نہیں؛ لیکن اس خیال کو مولانا نے بھی بڑی خوبصورتی سے شعر کا پیکر دیا ہے، فرماتے ہیں:

تب کھلا! آپ ہیں شریکِ سفر
مرے ہمراہ کوئی جب نہ ہوا

مولانا کے اشعار میں تغزل کا رنگ نمایاں ہوتا ہے اور بات ایسے طور پر کہی جاتی ہے جو مضرابِ احساس کو چھیڑ دے۔

عام طور پر اُردو شاعری میں کچھ تو وہ اساتذہ ہیں، جنھوں نے اپنا خاص اُسلوب قائم کیا ہے، کچھ وہ ہیں جنھوں نے نمائندہ شعراء کی پیروی کرنے اور ان کا رنگ اختیار کرنے کی کوشش کی ہے، اس سلسلہ میں غالبؔ، میرؔ اور اقبالؔ کو خاص مقبولیت حاصل ہوئی اور بہتوں نے ان کی پیروی کی کوشش کی؛ لیکن ایک شخص بیک وقت کئی شعراء کے اُسلوب کو ساتھ لے کر چلے اور مختلف لب و لہجہ میں اپنے اشعار کہے، یہ آسان نہیں ہوتا، مولانا مرحوم کو اللہ نے اس غیر معمولی صلاحیت سے نوازا تھا، جیسے میرؔ کے لب ولہجہ میں کہتے ہیں:

رُت بدلے گی، پھول کھلیں گے، جام مجھے چھلکانے دو
جام مجھے چھلکانے دو، کونین کو وجد آجانے دو
تم بِن رین اندھیری، دُور تلک سناٹا ہے
ایک میرا دل ہے پیاسا اور میرے پیمانے دو
ذرہ ذرہ سینہ کھولے، تیری طرف کیوں لپکے ہے
ہم بیچاروں کی بھی سن لو، ہم کو وہاں تک آنے دو

ان اشعار میں اس خوبی ومہارت کے ساتھ میرؔ کے لب ولہجہ اور ان کی زبان کو اختیار کیا گیا ہے کہ اگر اُردو شاعری کے کسی رمز شناس کو شاعر کا نام معلوم نہ ہو تو عجب نہیں کہ وہ اس کو میرؔ ہی کے اشعار سمجھ لے۔

اسی طرح یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں:

کسے نسبت ہے چشمِ معتبر سے — حذرائے دل! جہانِ کم نظر سے
منور ہے حریمِ زندگانی — گدازِ شام سے، آہِ سحر سے

اگر آپ کو معلوم نہ ہو کہ یہ مولانا ریاست علی بجنوری صاحبؒ کے اشعار ہیں تو کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ اقبالؔ کے اشعار نہیں ہیں، وہی شکوہِ الفاظ، وہی جوش وخروش اور وہی لب ولہجہ میں وقار وتمکنت۔

مولانا کی شعری خدمات کا ایک شاہکار دارالعلوم دیوبند کا ترانہ ہے، جس میں ایک طرح سے دارالعلوم کی پوری تاریخ آگئی ہے، اس میں اس خواب کی طرف بھی لطیف اشارہ کیا گیا ہے، جس کے مطابق رسول اللہؐ نے خواب میں دارالعلوم دیوبند کی بنیادی عمارت نودرہ کی نشاندہی کی تھی:

خود ساقیِ کوثر نے رکھی، میخانے کی بنیاد یہاں
تاریخ مرتب کرتی ہے، دیوانوں کی روداد یہاں

ترانہ کے اشعار میں جو صوتی آہنگ اور شکوہِ الفاظ مطلوب ہے، وہ اس ترانہ میں بھرپور طریقہ پر پایا جاتا ہے اور مجازؔ لکھنوی کے ترانۂ علی گڑھ سے کسی طرح کم نہیں، مولانا نے ظفرؔ تخلص اختیار کیا تھا اور آپ کا مجموعۂ کلام 'نغمۂ سحر' کے نام سے شائع ہو چکا ہے، یادش بخیر، جس سال ہم لوگ دورۂ حدیث میں تھے، اسی سال غالباً اس پر اترپردیش اُردو اکیڈمی سے ایوارڈ بھی ملا تھا، مولانا کا حق ہے کہ کوئی صاحبِ حوصلہ اپنی پی، ایچ، ڈی کے لیے آپ کی ادبی خدمات کا موضوع اختیار کرے، وباللہ التوفیق۔

اس حقیر کا کوئی سبق ان کے پاس نہیں تھا؛ اس لیے براہِ راست ان سے استفادہ کا موقع نہیں ملا اور کم آمیزی کے مزاج کی وجہ سے زمانۂ طالب علمی میں زیادہ آمد ورفت بھی نہیں رہی؛ لیکن بعد میں جب بھی دیوبند جانا ہوتا، آپ کے یہاں حاضری ہوتی، المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد کے قیام کے بعد اس کے پہلے سالانہ جلسہ میں راقم نے حضرت مولانا محمد نعمت اللہ اعظمی دامت برکاتہم اور مولانا ریاست علی بجنوریؒ کو دعوت دی تھی، انھوں نے دعوت قبول کی اور تشریف لائے، اس وقت معہد بالکل ابتدائی حالت میں تھا، راستے نہایت ہی ناہموار تھے، قرب وجوار میں کوئی آبادی نہیں تھی، پڑوس میں ایک عصری تعلیمی ادارہ تھا، وہیں سے بجلی لی جاتی تھی، اتفاق سے اتنی شدید بارش ہوئی کہ راستہ آمد ورفت کے لائق نہیں رہا، دونوں بزرگوں کا قیام میرے غریب خانہ پر میری ذاتی لائبریری کے ہال میں رہا، صرف ایک دفعہ معہد لایا گیا، جس کی اس وقت صرف ایک منزل تھی، اسی کے ایک ہال میں طلبہ کا قیام تھا اور ایک ہال کھانے کے لیے تھا اور ایک ہال میں چھوٹی موٹی لائبریری بھی تھی، لائبریری کے ہال میں دونوں بزرگوں کے محاضرات ہوئے، اگلے دن شہر میں جلسۂ عام ہوا اور ان بزرگوں کے ہاتھوں فارغین میں اسناد تقسیم کی گئیں، جلسہ میں شہر کے پڑھے لکھے لوگوں اور ذمہ دارانِ مدارس کی بڑی تعداد موجود تھی۔

یہ بات ظاہر ہے کہ ان بزرگوں کے استقبال اور قیام کا معقول انتظام نہیں ہوسکا؛ لیکن انھوں نے اپنی خوش اخلاقی اور خورد نوازی سے مجھے اس کا ذرا بھی احساس نہیں ہونے دیا، مولانا ریاست علی صاحبؒ بار بار اس حقیر اور معہد کے اساتذہ وطلبہ کی حوصلہ افزائی کرتے رہے، خاص طور پر فرمایا: مجھے

یہاں کی دو باتیں بہت پسند آئیں، ایک: افراد سازی، دوسرے: سلیقہ شعاری، کہنے لگے: یہاں جو اساتذہ پڑھا رہے ہیں، یا جو طلبہ پڑھ رہے ہیں، وہ بیشتر میرے شاگرد رہ چکے ہیں؛ لیکن یہاں میں نے ان کے جو تحقیقی مقالات دیکھے، وہ غیر معمولی ہیں اور ان کے اندر یہ صلاحیت تربیت کے ذریعہ پیدا ہوئی ہے، سلیقہ شعاری کے بارے میں کہا کہ: میں نے دیکھا کہ لائبریری کے نظام سے لے کر طلبہ کا پروگرام، جلسہ کا دعوت نامہ اور شہر میں منعقد ہونے والا سالانہ جلسہ ساری چیزوں کو ایک خاص سلیقہ سے انجام دیا گیا اور کہیں کوئی بھونڈا پن نظر نہیں آیا، مولانا نے ''کتاب الرائے'' میں بھی اسی تاثر کا اظہار فرمایا۔

خدا کرے مولانا نے جس حسنِ ظن کا اظہار کیا، وہ واقعی ادارہ کے خدام میں موجود ہو؛ لیکن بالکل ابتدائی دور میں ان کی اس حوصلہ افزائی نے ہمارے حوصلوں کو مہمیز کیا؛ اس کے بعد سے مولانا کی شفقت بڑھتی گئی، جہاں بھی ملتے، بڑی محبت سے ملتے، شفقت سے پیش آتے، غائبانہ بھی ذکر خیر کرتے اور دارالعلوم سے فارغ ہونے والا کوئی طالب علم معہد میں داخلہ کے لیے مشورہ کرتا تو اس کی تائید کرتے، یہ ان کی بڑائی اور چھوٹوں کے ساتھ شفقت تھی، جسے سیکھنے کی ضرورت ہے!

علم و ادب کا یہ بلبل خوشِ نوا مورخہ: ۲۰؍مئی ۲۰۱۷ء کو گلشنِ قاسمی کو رنجیدہ و افسردہ چھوڑ کر رُخصت ہوگیا؛ لیکن ہزاروں شاگردوں کے دلوں میں وہ آج بھی زندہ ہے اور سدا زندہ رہے گا۔ □□

غمِ فراق بر وفات حسرت آیات

نتیجۂ فکر: ولی اللّٰہ ولیؔ قاسمی بستوی

حضرتِ شیخِ ریاستؔ ، تاجدارِ علم و فن
یادگارِ رفتگاں تھے نازشِ علمی چمن

شارحِ درسِ بخاری تھے محدث باکمال
تھے ادیبِ عہد حاضر اور شاعر بے مثال

تھے شگفتہ رو ملنسار و مدرس کامیاب
اور استاذوں کی صف میں تھے مثالِ آفتاب

پتلۂ عجز و تواضع اور تھے سادہ مزاج
بے غبار و ضوفشاں تھا آپ کے دل کا زجاج

صدق دل سے کر رہے تھے خدمتِ دارالعلوم
اُن کے دل میں موجزن تھی اُلفتِ دارالعلوم

بلبلانِ علم و فن کے حق میں تھے وہ آشیاں
گلشنِ علم و ہنر کے تھے وہ مخلص باغباں

فضلِ مولیٰ سے رہی ہے عمر ستہتّر برس
اُن کی نظروں میں خدا کافی تھا باقی تھا ہوس

جانبِ عقبیٰ گئے جس دم ہوئی پوری حیات
غم کی لے کے سرخیاں ظاہر ہوا یومِ وفات

دِن سنیچر اور وہ تئیس شعباں کی رہی
غم میں ڈوبی چودہ سو اڑتیس وہ ہجری رہی

تھی مئی کی بیس سن تھا دوہزار و سترہ
وہ خدا کے پاس دنیا سے اکیلا چل بسا

تھا خدا کا ذکر لب پر اور تھا وقتِ سحر
چار بج کر کچھ منٹ پر وہ گیا ہے روٹھ کر

تین بج کرِ دس منٹ پر تھی جنازہ کی نماز
خوب تکبیروں میں تھا رنج و الم کا سوز و ساز

حضرتِ عثمان تھے منصور پوری ہی امام
غمگساروں کا جنازے میں رہا ہے اژدحام

مولسری کا تھا احاطہ مظہرِ رنج و الم
ہر کوئی موجود تھا بن کر وہاں تصویرِ غم

لے چلے تھے لوگ پھر سوئے مزارِ قاسمی
آخری مسکن بنا کوئے مزارِ قاسمی

ہوگئی تدفین جب کہ چار تھے دن کے بجے
بارگاہِ حق میں مصروفِ دعا سب ہو گئے

یہ خبر جس نے سنی وہ محوِ حیرت ہوگیا
اور ہر کوئی اسیرِ رنج و کلفت ہوگیا

کلفت و رنج و الم کا آہ ٹوٹا آسماں
پتلۂ غم ہوگئے سارے ہی اہلِ خانداں

دل پریشاں ہوگیا ہے حضرتِ سفیان کا
لٹ گیا ہے گلستاں عدنان اور سعدان کا

حضرتِ برہان و سلماں کا چمن سونا ہوا
اہلِ خانہ کا الم افسوس کہ دونا ہوا

بن گیا ماتم کدہ ہے گلشنِ دارالعلوم
آہ کہ سونا ہوا ہے دامنِ دارالعلوم

سارے عالم میں ہے پہنچی رنج و غم کی یہ خبر
ہے فضائے بے کراں میں رنج و غم کی ہی لہر

ہیں زمانے میں ریاست کے ہزاروں سوگوار
جو جدائی کی خبر سے ہو گئے ہیں اشکبار

یاد کرتے ہیں برابر لوگ اُن کی خوبیاں
سب دعا گو ہیں کہ ہوں مقبول ساری نیکیاں

ہے ولی کی یہ دعا کہ حق نگہبانی کرے
اُن کی تربت پر کرم کی شبنم افشانی کرے

آہ! اقدارِ سلف کا پاسباں خاموش ہے

تحریر: مولانا محمد سلمان بجنوری

استاذِ محترم حضرت مولانا ریاست علی ظفرؔ بجنوری نور اللہ مرقدہٗ کا سانحۂ ارتحال ذاتی طور پر راقم سطور کے لیے والدین کے بعد بڑا حادثہ ہے۔ والدین ہر شخص کی زندگی میں بے حد اہمیت رکھتے ہیں، پھر میرے والدین تو میرے استاذ بھی تھے۔ میں نے قاعدۂ بغدادی اور پارۂ عم والدہ محترمہ سے پڑھا تھا اور اس کے بعد حفظ قرآن کریم سے لے کر اُردو، فارسی اور عربی جماعت کافیہ سے پہلے (نحو وصرف، فقہ اور منطق) کی تمام کتب والد گرامی حضرت مولانا سعید احمد سہسپوری نور اللہ مرقدہٗ (متوفی ۱۴۰۵ھ مطابق ۱۹۸۵ء) سے پڑھیں جو حضرت شیخ الاسلام قدس اللہ سرہٗ کے شاگرد اور تربیت یافتہ تھے اور بہترین استاذ و مربی اور با فیض عالم دین تھے، پھر اس کے بعد بھی جن اساتذۂ کرام سے شرفِ تلمذ حاصل ہوا، خواہ اُن سے کم پڑھا ہو یا زیادہ، ہر ایک کے لیے دل میں حقیقی محبت واحترام کے جذبات ہیں اور رواں رواں ان میں سے ہر ایک کا احسان مند اور اُن کے لیے دعا گو ہے، لیکن والدِ محترم علیہ الرحمہ کے بعد جس شخصیت نے زندگی پر سب سے گہرا اثر ڈالا، خصوصاً رسمی طالب علمی سے فراغت کے بعد ہر قدم پر رہنمائی فرمائی، وہ حضرت الاستاذ قدس سرہٗ کی ذاتِ گرامی تھی اور اب اُن کی جدائی کے بعد تو اکثر اوقات یہ شعر ذہن و دماغ میں گردش کرتا اور رُلاتا رہتا ہے:

پھر بھی کم تھا گرچہ تیری ذات سے پایا بہت
تو ہوا رخصت تو دل کو یہ خیال آیا بہت

حضرت الاستاذ قدس سرہٗ کو بہت قریب سے دیکھنے اور ان سے استفادہ کا موقع اس ہیچ مداں کو حضرت الاستاذ رحمہ اللہ کے اس گھرانہ سے تعلق کے علاوہ مزید اس وجہ سے حاصل ہو گیا کہ احقر کو حضرت الاستاذ قدس سرہٗ کے برادرِ نسبتی اور رفیقِ درس ورفیقِ کار حضرت مولانا لقمان الحق فاروقی رحمہ اللہ سابق استاذ دارالعلوم دیوبند (متوفی ۱۴۰۸ھ) کا خویش بننے کی سعادت (اُن کی وفات کے برسوں بعد) حضرت الاستاذ ہی کی سرپرستی میں حاصل ہوئی، کیونکہ ہم دونوں ہی کے والد اس وقت وفات پا چکے تھے، اس طرح احقر اور اس کے اہلِ خانہ کے لیے خانگی سرپرست بھی حضرت الاستاذ قدس سرہٗ ہی قرار پائے اور اسی لیے ان کی نجی زندگی کو بھی قریب سے دیکھنے کا بھرپور موقع ملا۔ یہ تفصیل اس لیے بھی عرض کر دی گئی تاکہ قارئین کو اندازہ ہو جائے کہ لکھنے والا جو کچھ لکھ رہا ہے وہ دُور دُور کے تاثرات نہیں بلکہ لگ بھگ تیس سال کی قریب ترین واقفیت کا خلاصہ ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اس خلاصہ کو پیش کرنے کے لیے چند صفحات یا کوئی رسالہ قطعی طور پر ناکافی ہے، اسی لیے احقر نے حضرت الاستاذ قدس سرہٗ کی مفصل سوانح لکھنے کا آغاز کر دیا ہے۔ اللہ ربّ العزت باحسن وجوہ تکمیل آسان فرمائے، آمین۔

اس وقت قائد گرامی حضرت مولانا سیّد محمود مدنی صاحب دامت برکاتہم کے حکم کی تعمیل میں اختصار کے ساتھ چند صفحات میں حضرت الاستاذ قدس سرہٗ کی چند نمایاں صفات وخصوصیات پیشِ خدمت ہیں۔

جامعیت:

حضرت الاستاذ قدس سرہٗ کی اہم ترین خصوصیت ان کی جامعیت ہے، جس کی وضاحت کے لیے احقر ماہنامہ 'دارالعلوم' شمارہ ماہ جولائی ۲۰۱۷ء کے اداریہ میں اپنے ناقص علم سے لکھی گئی چند سطور نقل کر دینا آسان سمجھتا ہے:

''حضرت مولانا ریاست علی صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی وفات دارالعلوم دیوبند میں ایک عہد کا خاتمہ ہے۔ ان کی ذات میں اللہ نے ایسے گوناگوں اوصاف جمع کر دیئے تھے جو کسی ایک فرد میں کم ہی جمع ہوتے ہیں، جس سے ان کی شخصیت میں جامعیت کی شان پیدا ہو گئی تھی۔ اگر آپ رسوخ فی العلم، قوتِ استنباط، دقتِ نظر، سلاستِ بیان، فکر و تدبر، اصابتِ رائے، سلامتیِ فکر، صبر وقناعت، زہد واستغناء، تقویٰ و پاک دامنی، جود وسخا، غریب پروری ومہمان نوازی، ادائے حقوق، عالی حوصلگی وسیر چشمی، خوش گفتاری ونرم خوئی، شفقت ومحبت، احساسِ ذمہ داری، ذہانت وظرافت، بھرپور خود اعتمادی کے ساتھ کامل تواضع، قوتِ فیصلہ، دور بینی، دیانت وامانت، اعلیٰ تدریس وخطابت، بے مثال نظم ونثر پر مثالی قدرت، سلیقۂ زندگی، آدابِ مجلس کی رعایت اور سادگی وبے تکلفی کا مجسم نمونہ دیکھنا چاہیں تو وہ حضرت مولانا کی شخصیت تھی اور یقین فرمائیں کہ ان اوصاف میں سے کسی کا تذکرہ بھرتی کے لیے نہیں کیا گیا بلکہ ان کی شخصیت کے طویل مطالعہ پر مبنی ہے۔'' (ماہنامہ دارالعلوم، جولائی ۲۰۱۷ء، ص ۴)

علمی گہرائی و گیرائی:

حضرت الاستاذ قدس سرہٗ کی جس صفت نے ہمیشہ متاثر کیا وہ اُن کی علمی گہرائی وگیرائی تھی۔ ایک طرف تو اُن کا مطالعہ بہت وسیع تھا، دین وادب

کا شاید ہی کوئی موضوع اُن کے لیے اجنبی رہا ہو، اور علومِ اسلامیہ بالخصوص حدیث اور اصولِ فقہ میں تو ان کی نظر بے حد وسیع تھی۔

راقم نے اُن کو وقت کے نہایت اہم ترین مشاہیر علماء سے گفتگو کرتے ہوئے کبھی بھی ہلکا نہیں پایا، وہ ہر علمی مباحثہ میں برابر کے حصہ دار ہوتے تھے اور پورے اعتماد سے گفتگو فرماتے تھے اور جہاں تک گہرائی اور دقتِ فہم ونظر کا تعلق ہے اُس میں تو سچی بات یہ ہے کہ اُن کی نظیر ملنا ہی مشکل ہے۔ اُن کی نظر مسئلہ کی بنیاد پر ہوتی تھی، مقاصدِ شریعت کا اُن کو زبردست ادراک تھا اور وہ جزئیات پر بات کرتے ہوئے دین اور علوم دین کے کلیات ومسلمات پر نظر رکھتے تھے۔ ایسے علمی موضوعات میں ان کی قوتِ استخراج واستنباط بھی جھلکتی تھی جس کی مدد سے وہ صحیح نتیجہ نکالنے میں کامیاب ہوتے تھے۔

سلف پر بھرپور اعتماد:

یہ ان کی علمی زندگی کا نمایاں اور خوبصورت ترین وصف تھا، ان کو صرف فکر وعقیدہ اور مسلک ومشرب کے معاملات ہی میں نہیں بلکہ علمی آراء میں بھی اسلاف واکابر پر بھرپور اعتماد تھا۔ ایسا نہیں کہ وہ مسائل پر وسیع اور گہری نظر نہ رکھتے ہوں بلکہ ان کی سوچی سمجھی رائے یہ تھی کہ بعد کا آدمی جہاں بھی جمہور سے الگ راہ اختیار کرتا ہے یا سلف سے اختلاف کرتا ہے وہاں عام طور سے اس کی فہم کا قصور ہوتا ہے۔ اس لیے کہ نئی رائے قائم کرنے والا شخص کوئی بھی ہو عموماً وہ قوتِ استنباط، مدارکِ فہم اور وسعتِ نظر نیز اصولِ استنباط کی پابندی میں بڑوں سے فروتر ہی ہوتا ہے۔

تقویٰ:

حضرت الاستاذ قدس سرہٗ کا یہ وصف بھی بڑا امتیاز تھا۔ راقم سطور گواہی دے سکتا ہے کہ بہت سے گناہ تو ایسے تھے جن کا خیال بھی اُن کے دل میں نہیں آتا تھا، کوئی بھی کام کرنا ہوتو وہ باقاعدہ غور کرتے تھے کہ اس میں شرعی قباحت تو نہیں ہے یا یہ فقہی اعتبار سے کیا حکم رکھتا ہے۔ اور اگر معاملہ مالیات سے متعلق ہوتو ان کی احتیاط، ورع تک پہنچ جاتی تھی۔ مشتبہ سے مکمل اجتناب کا اہتمام، جس کے لیے بسا اوقات اپنا جائز حق بھی چھوڑ دیتے تھے۔

> **حضرت الاستاذ قدس سرہٗ کی جس صفت نے ہمیشہ متاثر کیا وہ اُن کی علمی گہرائی و گیرائی تھی۔ ایک طرف تو اُن کا مطالعہ بہت وسیع تھا، دین و ادب کا شاید ہی کوئی موضوع اُن کے لیے اجنبی رہا ہو، اور علومِ اسلامیہ بالخصوص حدیث اور اصولِ فقہ میں تو ان کی نظر بے حد وسیع تھی۔ راقم نے اُن کو وقت کے نہایت اہم ترین مشاہیر علماء سے گفتگو کرتے ہوئے کبھی بھی ہلکا نہیں پایا، وہ ہر علمی مباحثہ میں برابر کے حصہ دار ہوتے تھے۔**

تواضع:

یہ اُن کی شخصیت کا ایسا زیور تھا جس کا مشاہدہ ایک عام آدمی بھی آسانی سے کرسکتا تھا۔ بہت سے لوگوں میں تواضع کا اظہار تو بہت ہوتا ہے لیکن دل میں اپنے لیے امتیاز کی خواہش بھرپور ہوتی ہے۔ حضرت الاستاذؒ کو امتیاز اور خودنمائی سے طبعی نفرت تھی۔ مجلس میں ان کی نشست ایسی ہوتی تھی کہ ناواقف شخص ان کے مقام کا اندازہ ہی نہیں کرسکتا تھا، بلکہ ان کی اپنی مجلس میں تو نئے آدمی کو پہچان ہی نہیں ہوتی تھی کہ میرِ مجلس کون ہیں؟ دو سال قبل سفرِ حج کے موقع پر مدینہ طیبہ سے احقر نے ان کے لیے فرشی نشست والی کرسی خرید لی (جس میں بیٹھنے کے لیے نیچے گدا اور پیچھے سہارا ہوتا ہے) اور لاکر ان کو پیش کی (اور شاید یہ واحد ہدیہ تھا جو باقاعدہ ان کی خدمت میں پیش کرنے کا موقع ملا)، انھوں نے اسے قبول فرمایا، بیٹھ کر دیکھا اور فرمایا کہ چیز تو تم اچھی لائے ہو مگر اس کا استعمال مشکل ہے، اور یہ وہ خطرہ تھا جو میرے دل میں پہلے سے موجود تھا، وجہ ظاہر تھی کہ اس پر بیٹھ کر نشست، دوسروں سے قدرے ممتاز ہوجاتی۔ چنانچہ وہ کرسی مجلس میں کبھی استعمال نہ ہونی تھی نہ ہوئی۔ تواضع کا ایک حصہ یہ بھی تھا کہ جلسوں کی صدارت سے شدت کے ساتھ انکار کردیتے تھے، اور اگر کوئی زیادہ اصرار کرے تو فرمادیتے کہ اگر یہی شرط ہے تو میں جلسے میں آؤں گا ہی نہیں۔ (یوں بھی جلسوں میں شرکت کا معمول بہت کم تھا) صرف ایک بار اس اجلاس کی صدارت فرمائی جو دارالعلوم میں فقیہ العصر حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کی آمد پر مسجد رشید میں منعقد ہوا تھا اور جس کی صدارت کے لیے اُن کے نام کا اعلان اُن سے استصواب کے بغیر حضرت مہتمم صاحب رحمہ اللہ کے حکم پر ناظم جلسہ (اس حقر) نے کردیا تھا۔

ادائے حقوق کا اہتمام:

حضرت الاستاذ قدس سرہٗ کے اوصافِ حسنہ میں ادائے حقوق کا وصف بھی حددرجہ نمایاں ہے۔ احقر اُن کی حیات میں بھی یہ بات کہتا تھا کہ میری معلومات میں کسی کا حق واجب اُن کے ذمہ نہیں ہے۔ ایک آدمی کے ذمہ سب سے بڑا حق اُس کے والدین کا ہوتا ہے، والد کے سائے سے تو وہ بچپن

ہی میں محروم ہوگئے تھے، البتہ والدہ کی وفات اُن کی جوانی میں بلکہ شادی کے بعد ہوئی اور انھوں نے والدہ کی خدمت کا ثواب بھی خوب سمیٹا۔ والدہ کے بعد اُن کے سب سے بڑے محسن، اُن کے مربی اور رشتے میں پھوپھا حضرت مولانا سلطان الحق فاروقی رحمۃ اللہ علیہ تھے جو بعد میں اُن کے خسر بھی ہوگئے۔ ان کی خدمت حضرت الاستاذ قدس سرہٗ نے کسی بھی اولاد سے بڑھ کر کی بلکہ ان کی حق شناسی کے طور پر ان کی ساری اولاد کے ساتھ زندگی بھر مثالی حسن سلوک کا معاملہ رکھا۔ اسی طرح اپنے تمام ہی اساتذۂ کرام، محسنین اور رشتہ داروں کے ساتھ یہی معاملہ رہا، اپنے اساتذہ کی خدمت کی بالخصوص اپنے استاذِ اکبر حضرت مولانا سیّد فخر الدین احمد نور اللہ مرقدہٗ کی خدمت اور ان کے ساتھ محبت میں تو وہ کردار ادا کیا جو استاذ و شاگرد کے رشتے کے لیے نمونہ کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔

ادائے حقوق ہی کا ایک حصہ یہ تھا کہ اپنے حقیقی اور نسبتی والدین اور مرحوم بھائی کے علاوہ حضرت مولانا فخر الدین صاحب قدس سرہٗ، اپنے نسبتی بھائی حضرت مولانا لقمان الحق فاروقی رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر بہت سے رشتہ داروں کی جانب سے ہر سال قربانی کرتے تھے، جو سب مل کر پندرہ بیس حصے ہوجاتے تھے اور اس فہرست کا آغاز سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم مبارک سے ہوتا تھا۔

اسی طرح مریضوں کی عیادت میں بہت مستعد تھے۔ کسی عزیز یا اہل تعلق کا انتقال ہوجائے تو جنازے میں شرکت اور اس کے اہلِ خانہ سے تعزیت کا بڑا اہتمام فرماتے تھے، خوشی کے مواقع بالخصوص عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن، قریبی اعزہ کے یہاں جاکر عیدی دیا کرتے تھے اور اس میں کبھی ناغہ نہیں ہوتا تھا۔ اپنی حیات کی آخری عید (عید الاضحیٰ ۱۴۳۷ھ) پر ضعف زیادہ تھا، اس لیے فون کیا اور گویا آنے کی معذرت کی، ورنہ اس سے پہلے کی عید تک سب گھر والوں کو فجر کے بعد انتظار رہتا تھا کہ اب ابا تشریف لانے والے ہوں گے۔

منصف مزاجی اور اعتدال:

راقم سطور کو اُن کی جو صفات بہت ممتاز محسوس ہوتی تھیں اُن میں ان کا منصفانہ مزاج بھی تھا، اور وہ خانگی امور اور اجتماعی معاملات سب میں کارفرما رہتا تھا۔ یہ ناممکن تھا کہ وہ بے جا طور پر اپنی اولاد کی حمایت کریں یا کسی غیر کی صحیح بات کی تائید نہ کریں۔ جن حضرات سے رائے کا اختلاف ہوتا تھا اُن کے سلسلے میں بھی انصاف سے نہیں ہٹتے تھے اور ہمیشہ حسن ظن سے کام لیتے تھے۔

جس زمانے میں جمعیۃ علماء ہند کا قضیہ عروج پر تھا، اُن دنوں ایک اور معاملے میں استاذِ گرامی مرتبت حضرت مولانا سیّد ارشد مدنی صاحب دامت برکاتہم کے ایک اقدام کا تذکرہ ہوا اور کسی نے اس پر تبصرہ کیا تو حضرت الاستاذ رحمہ اللہ نے پوری صراحت کے ساتھ فرمایا کہ میرے خیال میں مولانا کے اس طرزِ عمل کا محرک کوئی ذاتی معاملہ نہیں ہے بلکہ وہ دیانتاً ہی ایسا سمجھتے ہیں۔

اسی سے ملتی جلتی ایک اور بات یاد آئی، سب جانتے ہیں کہ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قدس سرہٗ کے آخری دور کے معاملات بالخصوص مجلسِ شوریٰ کو کالعدم قرار دینے کے ان کے فیصلہ سے حضرت الاستاذ کو واضح اختلاف تھا اور اس بارے میں اُن کی رائے بڑی پختہ تھی لیکن جب ایک اور ادارے میں اسی نوعیت کا واقعہ پیش آیا تو وہ فرمانے لگے کہ اگر حضرت مہتمم صاحب (حضرت حکیم الاسلام قدس سرہٗ) کو شوریٰ کے سلسلے میں کوئی غلط فہمی ہوئی تو کسی درجہ میں اُس کا امکان بھی ہے کیونکہ وہ اپنی شوریٰ میں سب سے بڑی شخصیت کی حیثیت رکھتے تھے، باقی تمام ارکان ان سے چھوٹے تھے، لیکن فلاں ادارے کے ذمہ دار کو غلط فہمی ہونے کا کوئی تک سمجھ میں نہیں آتا کیونکہ ان کی شوریٰ میں تو اکثر حضرات اُن کے استاذ یا اساتذہ کے درجے کی ممتاز شخصیات ہیں۔

اصابتِ رائے:

اُن کا یہ وصف بھی ایسا نمایاں ہے کہ اُن کا جاننے والا ہر شخص اس وصف سے واقف ہے، اللہ ربّ العزت نے ان کو عجیب قسم کی دوراندیشی، تدبر اور اصابتِ رائے عطا کی تھی، جس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے پاس آنے والوں میں ایک بڑی تعداد صرف مشورہ کے لیے آنے والوں کی ہوتی تھی اور اس میں کسی کی تخصیص نہیں تھی۔ طلبہ، اساتذہ، ذمہ داران، شہر کے حضرات، رشتہ دار اور اہلِ تعلق سبھی اُن سے مشورہ کرتے اور اُن کی اصابتِ رائے سے فائدہ اُٹھاتے تھے۔ بالخصوص حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب نور اللہ مرقدہٗ جو خود بھی مثالی تدبر و دانائی کا نمونہ تھے، تمام اہم معاملات میں حضرت الاستاذ سے مشورہ کا اہتمام فرماتے تھے، اور ان کے دور کی تمام ترقیات میں حضرت الاستاذ کے مشوروں کا بڑا حصہ ہے۔

ضرورت مندوں کی حاجت براری:

یہ اُن کی حسنات کے جلی عنوانات میں سے ہے، ان کے پاس اپنی ضرورت کے لیے ہر قسم کا آدمی آتا تھا۔ امداد کا طالب بھی اور قرض کا طلب گار بھی اور انھوں نے ہر حال میں لوگوں کی ضروریات پوری کرنا اپنے لیے فرض سمجھ رکھا تھا۔ اگر آنے والے کی ضرورت پوری کرنے کی اپنے پاس گنجائش نہ ہوتی تو قرض لے کر دوسروں کی ضرورت پوری کرنا اُن کا معمول تھا اور یہ اُن کے یہاں کوئی انوکھی بات نہ تھی، اور عجیب اتفاق یہ ہوا کہ ہر صفت میں اُن کی اہلیہ محترمہ نور اللہ مرقدہا اُن کی برابر کی شریک تھیں، اس لیے اُن کا گھر غریبوں

اورضرورت مندوں کی آماجگاہ کی حیثیت رکھتا تھا۔اس سلسلے میں بڑے بڑے سبق آموز واقعات اُن کی زندگی میں پیش آئے۔قرض دینے میں اُن کی نیت یہ ہوتی تھی کہ اگر قرض واپس آ گیا تو ٹھیک ورنہ معاف۔اس طرح بے شمار لوگوں کا قرض معاف کیا۔

چستی، ہمت اور مستعدی:

ان کی یہ صفت بھی ہم جیسے لوگوں کے لیے بڑی سبق آموز تھی کہ وہ ہر حال میں مستعدر ہتے تھے۔سستی ان کو چھوکر بھی نہیں گزری تھی، ہر کام وقت پر کرنا ان کی طبیعتِ ثانیہ تھی۔ وقت ضائع نہیں کرتے تھے۔کوئی پریشانی یا بیماری بھی ان کی ہمت وحوصلہ میں کمی آنے کا سبب نہیں بنتی تھی، بلکہ ان سے مل کر اپنے اندر ایک قوتِ عمل زندہ و بیدار ہونے لگتی تھی۔کسی کام کو ٹالنا تو وہ جانتے ہی نہ تھے۔

حسن تعبیر:

حضرت الاستاذ کی ایک اہم صلاحیت اور خصوصیت یہ تھی کہ قدرت نے ان کو مافی الضمیر کی ادائیگی اور اس کو تعبیر کرنے کا عجیب سلیقہ عطا کیا تھا۔وہ لفظ کا برمحل استعال کرتے تھے اور اس بات کی بے مثال پہچان رکھتے تھے کہ کون سے لفظ کا کیا مزاج ہے اور وہ کس مقام کا لفظ ہے۔پھر اپنی بات کا اظہار جس سلیقہ سے کرتے تھے وہ انہی کا حصہ تھا۔مقام و محل کی رعایت اور مجلس کی مناسبت سے گفتگو کرنا ان کا خاص امتیاز تھا، یہی وجہ تھی کہ حددرجہ صاف گوئی کے باوجود اُن کی بات کم ہی کسی کو ناگوار ہوتی تھی۔

تحقیقی مزاج:

حضرت الاستاذ قدس سرہٗ کی علمی خصوصیات میں یہ اہم ترین باب ہے کہ وہ ہر چیز کی تحقیق فرماتے اور ہر مسئلہ کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتے تھے۔بے تحقیق بات کو اُن کا ذہن قبول ہی نہیں کرتا تھا اور اُن کا یہ مزاج تصنیف وتالیف ہی کے ساتھ خاص نہیں تھا بلکہ تدریس اور تقریر میں بھی ہمیشہ تحقیقی اور معتبر بات ہی پیش کرتے تھے اور تصنیف میں تو کسی کی نقل پر بھی اعتماد نہیں کرتے تھے بلکہ جب تک اصل سے مراجعت نہ ہو جائے حوالہ دینا پسند نہیں کرتے تھے، تحقیق کا یہ مزاج 'ایضاح البخاری' میں قدم قدم پر ظاہر ہوتا رہتا تھا۔

مہمان نوازی:

مہمان نوازی یوں تو ہر مسلمان کے مزاج کا حصہ ہونی چاہیے اور عموماً ہوتی بھی ہے اور خاص طور پر طبقۂ علماء میں یہ وصف زیادہ نمایاں ہوتا ہے، لیکن حضرت الاستاذ کی مہمان نوازی کا جو مفہوم تھا وہ انہی کا حصہ تھا۔مہمان کے آنے پر کھانا کھلادینا تو کوئی بڑی بات نہیں لیکن مہمان کی ہر طرح رعایت، اگر پرہیز ہو تو اس کا نظم، مہمان کے آنے میں تاخیر ہو جائے تو انتظار کی زحمت خندہ پیشانی سے برداشت کرنا، مہمان کسی بھی وقت آ جائے یہاں تک کہ عین آرام کے وقت بھی تو اس کو واپس نہ کرنا، ملاقات ہر حال میں کرلینا، اگر کھانے کا وقت یا ضرورت نہیں ہے تو چائے کا اہتمام کرنا، یہ اور اسی طرح کی بے شمار نزاکتیں تھیں جن کو وہ نبھاتے تھے۔ یہاں تک کہ اگر ہم لوگوں نے یا دیگر قریبی متعلقین نے آنے والوں کے لیے وقت مقرر کرنے کا مشورہ دیا تا کہ علمی کاموں کے لیے وقت محفوظ ہو سکے تو ہمیشہ یہی جواب دیا کہ آنے والے کو واپس کرنا اچھا نہیں لگتا اور یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل بھی تو یہی تھا کہ آپؐ آنے والوں سے ہر وقت ملاقات فرمالیتے تھے۔

> **دار العلوم کو اور اس کے استحکام و بلندیٔ معیار کو وہ تمام مدارس کیلئے قوت و استحکام کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک دارالعلوم دیوبند عصرِ حاضر میں دینی خدمات کے میدان میں مرکزی حیثیت رکھتا تھا، جس سے دنیا بھر میں دینی ادارے اور تحریکات غذا پاتے اور قوت و نور حاصل کرتے ہیں۔ اسی لیے وہ یہ چاہتے تھے کہ دارالعلوم اپنے بلندپایہ، صاحبِ نظر اکابر و اسلاف کے رنگ کو حتی الامکان برقرار رکھے تاکہ یہاں سے افراد سازی اور مردم گری کا سلسلہ جاری رہے۔**

اخیر عمر میں جب دو پہر کا آرام ان کے لیے شاید رات کے آرام سے بھی زیادہ ضروری ہو گیا تھا یہاں تک کہ دوپہر کو آرام نہ ملنے سے غیر معمولی تعب ہو جاتا اور بسا اوقات شوگر بھی بڑھ جاتی، تب بھی اگر یہ کہا گیا کہ دو پہر کا آرام گھر کے کسی اندرونی کمرے میں کرلیا کریں کیونکہ بیٹھک میں لیٹنے کی وجہ سے ہر آنے والا براہِ راست اُن تک پہنچ جاتا تھا یا اس کی آہٹ سے آنکھ کھل جاتی تھی، تو فرمایا کہ میں بیٹھک میں لیٹتا ہی اس لیے ہوں تا کہ آنے والوں کو پریشانی نہ ہو۔خلاصہ یہ کہ مہمانوں یا آنے والوں کے لیے اپنی راحت قربان کرنا ان کی طبیعت تھی۔

دارالعلوم سے محبت:

دارالعلوم دیوبند سے بلکہ تمام ہی دینی اداروں سے ان کو محبت تھی لیکن دارالعلوم کو اور اس کے استحکام وبلندیٔ معیار کو وہ تمام مدارس کے لیے قوت و استحکام کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ان کے نزدیک دارالعلوم دیوبند عصرِ حاضر میں دینی

خدمات کے میدان میں مرکزی حیثیت رکھتا تھا، جس سے دنیا بھر میں دینی ادارے اور تحریکات غذا پاتے اور قوت ونور حاصل کرتے ہیں۔ اسی لیے وہ یہ چاہتے تھے کہ دارالعلوم اپنے بلند پایہ، صاحبِ نظر اکابر و اسلاف کے رنگ کو حتیٰ الامکان برقرار رکھے تا کہ یہاں سے افراد سازی اور مردم گری کا سلسلہ جاری رہے اور ملت اسلامیہ کو ولایتِ عشق سے اُٹھنے والی سپاہِ تازہ کی کمک برابر ملتی رہے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے ذمہ دار یا مشیر کار ہر حیثیت میں اپنا بھرپور کردار زندگی بھر ادا کیا۔ اسی لیے استاذِ گرامی مرتبت حضرت مولانا سیّد ارشد مدنی صاحب دامت برکاتہم کی زبانِ مبارک سے ان کے متعلق یہ بامعنی ارشاد صادر ہوا کہ ''اب دارالعلوم کو اُن کی طرح سمجھنے والا کوئی دوسرا نہیں ہے۔ اس جملہ کی معنویت سمجھنے کے لیے ان کا شہرۂ آفاق ترانۂ دارالعلوم غور سے پڑھ لینا کافی ہوگا۔''

جمعیۃ علماء ہند سے تعلق:

دارالعلوم دیوبند کے بعد وہ جمعیۃ علماء ہند کو بھی اس ناتواں ملت کے لیے ناگزیر خیال فرماتے تھے اور اسے حضرات اکابر رحمہم اللہ کا قائم کردہ ایسا پلیٹ فارم سمجھتے تھے جو آج بھی ملت کی آرزوؤں اور اُمنگوں پر پورا اُترنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اُن کی یہ سوچ ان کے قلم سے صادر ہونے والے شاہکار ترانۂ جمعیۃ علماء ہند کے ایک ایک لفظ سے واضح ہوتی ہے۔

حضرت الاستاذ قدس سرہٗ کے بارے میں کسی خاص غور وفکر کے بغیر یہ چند چیزیں نوکِ قلم پر آ گئیں اور خیالات کا سلسلہ اب بھی رکنے کا نام نہیں لے رہا ہے۔ ان کی بہت سی خوبیاں ابھی تذکرہ میں آنے سے رہ گئی ہیں اور جن صفات کا تذکرہ آیا بھی ہے اُن کی حیثیت ایک فہرست کی سی ہے، ورنہ اُن سے متعلق شواہد وواقعات تو مضمون طویل ہوجانے کے خوف سے قصداً نظرانداز کرنا پڑے۔ اب ان تمام تفصیلات، صفات وخصوصیات اور علمی وعملی کمالات کے پورے طور پر سامنے آنے کے لیے دعاء کیجیے کہ اللہ ربّ العزت حقیر راقم سطور کو حضرت الاستاذ کی مفصل سوانح مرتب کرنے کی توفیق ارزانی فرمائے، جس کا آغاز کیا جاچکا ہے، البتہ دو چیزیں ایسی ہیں جن کا اب بھی تذکرہ کردینے کو جی چاہتا ہے۔

ایک وقیع شہادت:

پہلی چیز یہ کہ جس وقت حضرت الاستاذ قدس سرہٗ کا سانحۂ ارتحال پیش آیا تو راقم سطور اپنے رفقاء واحباب کے ساتھ ملیشیا میں اپنے شیخ حضرت اقدس مولانا پیر ذوالفقار احمد صاحب نقشبندی مجددی دامت برکاتہم کی خدمت میں حاضر تھا۔ جب حضرت کو حادثہ کی اطلاع ملی تو فوراً اس حقیر کو یاد فرمایا، میں اس وقت حد درجہ بے تابی کی کیفیت میں تھا اور ایک منٹ کو قرار نہیں آ رہا تھا۔ حضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر طبیعت قدرے سنبھلی تو حضرت کی خدمت میں حضرت الاستاذ قدس سرہٗ کی چند باتیں عرض کیں۔ ایک بات سن کر حضرت دامت برکاتہم نے فرمایا کہ یہ ولایت کا پہلا قدم ہے، پھر ایک دو باتیں اور سن کر فرمایا کہ یہ کاملین کی پہچان ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ آج ہم حضرت مولانا قدس سرہٗ کے ذکرِ خیر کے لیے ایک مستقل مجلس منعقد کریں گے، اس میں ہمت کر کے تم ضرور بیان کرنا تا کہ یہاں مختلف ممالک سے آئے ہوئے لوگوں کو ان کے محاسن کا پتہ چلے۔ چنانچہ حضرت کے حکم کے مطابق ظہر کی نماز کے بعد وہ مجلس منعقد ہوئی جس میں رفیق محترم جناب مولانا خضر محمد صاحب کشمیری زید مجدہم استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند نے آدھا گھنٹہ حضرت الاستاذ کی حیات وکمالات پر روشنی ڈالی، اس کے بعد تعمیل حکم میں کسی طرح ہمت جمع کر کے اس حقیر نے اپنی معروضات پیش کیں۔

ایک عظیم بشارت:

دوسری چیز یہ کہ حضرت الاستاذ کی وفات کے تین چار دن بعد ہمارے ایک قریبی عزیز جناب نسیم الحق فاروقی صاحب (نئی بستی بجنور) نے خواب دیکھا جو انہی کے الفاظ میں اس طرح ہے کہ:

''میں نے خواب میں دیکھا کہ میں بیٹھا ہوا ہوں کہ اچانک مجیب (حضرت الاستاذ کے رشتے میں چچازاد بھائی جناب مولانا عبدالمجیب صاحب حبیب والا ساکن حال بجنور) آئے اور کہنے لگے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھیا کو لینے آئے ہیں۔ (حکیم مجیب صاحب حضرت الاستاذ کو اسی لفظ سے یاد کرتے تھے) یہ سن کر میں تیزی سے نکلا تو دیکھا کہ ایک وسیع ترین میدان ہے جس میں مجھ سے بہت فاصلے پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ریاست بھائی کی گردن میں ہاتھ ڈالے ہوئے تشریف لے جا رہے ہیں اور چونکہ ریاست بھائی کا قد آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے چھوٹا تھا اس لیے آپؐ قدرے جھکے ہوئے چل رہے ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر مجھ پر کپکپی طاری ہوگئی کہ کہاں میں گناہگار اور کہاں آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت! اور اسی گھبراہٹ میں آنکھ کھل گئی اور یہ کیفیت دیر تک قائم رہی۔''

انھوں نے خواب ہی میں کسی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ جسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم لے جاتے ہیں وہ واپس نہیں آتا۔

بس اسی پر اس غیر مرتب تحریر کو ختم کرتا ہوں۔ اللہ ربّ العزت ان کو اپنے قربِ خاص سے نوازے اور ہمارے لیے صبر آسان فرمائے۔ اخیر میں خود انہی کا ایک شعر ان کی نذر کرتا ہوں جو ان کی شخصیت کی بھرپور عکاسی کرتا ہے:

دم بخود ہیں موت پر تیری روایاتِ سلف
کون اقدارِ سلف کی اب نگہبانی کرے

□□

مدتوں رویا کریں گے ..

تحریر: **مولانا مفتی عبداللہ معروفی** (استاذ تخصص فی الحدیث دارالعلوم دیوبند)

موت ہر ایک کو آنی ہے اور آتی ہے، مگر اللہ کے کچھ بندے ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی موت اکیلے کی نہیں؛ بلکہ ایک آباد اور ہری بھری دنیا کو ویران کردیتی ہے، استاذِ محترم شفقتِ مجسم حضرت مولانا ریاست علی ظفرؔ بجنوری رحمہ اللہ، استاذِ حدیث دارالعلوم دیوبند، و نائب صدر جمعیۃ علماء ہند کی وفات حسرت آیات بھی ایسی ہی ایک رحلت ہے، جس کی کسک ہر خاص و عام کو مدتوں رہے گی، جن کو آج مدظلہ العالی اور دامت برکاتہم جیسے الفاظ کے بجائے رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔

وہ ایک ایسے فراغ دل اور سایہ دار درخت تھے جس کی چھاؤں میں اپنا پرایا، چھوٹا بڑا، امیر غریب، استاذ شاگرد، خواندہ و ناخواندہ ہر ایک ہی پناہ لینے کی کوشش کرتا اور آپ بڑی ہی وسعتِ ظرفی سے اپنے سایۂ عاطفت میں جگہ دے بھی دیتے تھے، ایک طویل صحبت میں رہ کر ناچیز راقم الحروف نے جو محسوس کیا وہ یہ کہ دیوبند میں جس کا کوئی عزیز یا سرپرست نہیں ہوتا، ہمارے حضرت اس کے عزیز و سرپرست ہوتے، طلبہ اور فضلائے دارالعلوم کے علاوہ عام باشندگانِ شہر و قرب و جوار کی ایک بڑی تعداد کو میں نے آپ کو ''ابو'' سے خطاب کرتے یا ذکر کرتے سنا، سچ ہے، آپ اپنی صلبی اولاد ہی کے نہیں؛ بلکہ ہمارے جیسے نہ جانے کتنے وابستگان و متوسلین، غریب الدیار و بے سہاروں کے 'ابو' تھے۔

حضرت مولانا رحمہ اللہ کی پیدائش ۹؍ مارچ ۱۹۴۰ء کو علی گڑھ میں ہوئی، آبائی وطن موضع حبیب والا ضلع بجنور ہے۔ ابتدائی تعلیم مکمل کرکے اپنے پھوپھا حضرت مولانا سلطان الحق صاحب بجنوریؒ (ناظم کتب خانہ دارالعلوم دیوبند) کے ہمراہ ۱۹۵۱ء میں دیوبند آگئے اور پھوپھا مرحوم کی سرپرستی میں دارالعلوم میں آپ کی تعلیم ہونے لگی، یہاں تک کہ ۱۹۵۸ء میں دورۂ حدیث شریف سے فراغت حاصل کی، دورانِ تعلیم اور تعلیم سے رسمی فراغت کے بعد بھی خصوصیت سے فخر المحدثین حضرت مولانا سیّد فخر الدین احمد مرادآبادی رحمہ اللہ کی خدمت میں رہ کر درایتِ حدیث کا خصوصی ذوق حاصل کیا، خصوصاً اختلافی مسائل میں حنفیہ کے نقطۂ نظر کا نصوصِ کتاب و سنت سے قریب ترین ہونے کا ادراک جو حضرت فخر المحدثین رحمہ اللہ کا امتیاز تھا ہمارے حضرت مرحوم کا ذوق بن گیا تھا۔ 'ایضاح البخاری' شرح صحیح بخاری اس ذوق کا ایک نمایاں آئینہ دار ہے۔

سنہ ۱۳۹۱ھ/۱۹۷۲ء میں دارالعلوم دیوبند میں بحیثیت مدرس آپ کا تقرر ہوا۔ کچھ برسوں تک تدریس کے ساتھ ساتھ ماہنامہ 'دارالعلوم' کے آپ مدیر بھی رہے، سنہ ۱۴۰۵ھ میں مجلسِ شوریٰ نے آپ کو مجلسِ تعلیمی کی نظامت سپرد کی جو ایک طویل عرصہ تک آپ سے متعلق رہی۔ اسی دوران سنہ ۱۴۰۸ھ میں آپ کو شیخ الہند اکیڈمی کا نگراں بھی مقرر کیا گیا، اس کے علاوہ بھی دارالعلوم کی مختلف ذمہ داریاں آپ سے متعلق رہیں۔ ایک طویل عرصہ تک مجلسِ تعلیمی کے رکن رہنے کے علاوہ موقع بہ موقع آپ قائم مقام مہتمم کی حیثیت سے اہتمام جیسی نازک ذمہ داری بھی انجام دیتے رہے۔

قدرت نے آپ کو زبردست انتظامی صلاحیت کے ساتھ صالحیت سے بھی نوازا تھا، منتظم میں صلاحیت کے ساتھ جب صالحیت بھی ہوتی ہے تو اس کا انتظام پختہ اور مثمر برکات ہوتا ہے اور انتظام سے جڑے ہوئے افراد میں سے ہر ایک اپنی جگہ پر مطمئن ہوتا ہے، مولانا مرحوم کی یہ خوبی تھی کہ لوگ ان سے مطمئن رہتے تھے اور نظام بھی مستحکم طریقہ سے چلتا تھا، مولانا نے اپنے متعلقہ نظام کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش فرمائی، مثلاً دارالعلوم میں امتحانات کا نظم بہت مستحکم نہیں تھا، معیارِ تعلیم بلند کرنے کے لیے آپ نے اساتذۂ کرام کے مشورہ سے ایک ایسا ٹھوس اور مضبوط نظام بنایا جو ہر قسم کے شک اور کمزوری سے محفوظ ہے جس کی وجہ سے معیارِ تعلیم بلند ہونے کے ساتھ ملک میں دارالعلوم کی نئی انتظامیہ پر اعتماد بھی بحال ہوا؛ چنانچہ آج بھی دارالعلوم میں امتحانات مولانا مرحوم ہی کے قائم کردہ خطوط کے مطابق ہو رہے ہیں۔

آپ کا درس طلبہ میں انتہائی مقبول تھا، راقم الحروف کو آپ سے مشکوٰۃ شریف اوّل، شرح نخبۃ الفکر اور ابن ماجہ شریف پڑھنے کا شرف حاصل ہوا ہے، آخر میں دورۂ حدیث شریف کی اہم ترین فنی کتاب جامع ترمذی جلد اوّل کی تدریس آپ سے متعلق تھی، علمی بحثیں بہت مرتب اور منقح ہوتی تھیں، مسلکِ حنفی کی تشفی بخش ترجیحات کے ساتھ ساتھ، عقائد و فروعات میں اہل السنۃ والجماعۃ اور فکرِ دیوبند کی بھرپور ترجمانی اور طلبہ کی اس کے مطابق مثبت ذہن سازی آپ کے درس کا امتیاز تھا، اس پر زبان کی شستگی، محاورات کا برمحل استعمال اور نپے تلے الفاظ کی روانی سونے پر سہاگہ کا کام دیتی تھی۔

آپ اُردو زبان کے ایک قدآور ادیب بھی تھے، ادیبوں کے پاس الفاظ و تعبیرات تو ہوتی ہیں، مگر ذہن رسا، فکرِ سلیم اور سلاست و برجستگی کم دیکھنے کو ملتی

ہے۔ ہمارے حضرت مرحوم میں یہ سب خوبیاں بے تکلف موجود تھیں، آپ کی نظم ونثر دونوں انتہائی معیاری تھیں، نثری ادب کا شاہکار ’ایضاح البخاری‘ اور ’شوریٰ کی شرعی حیثیت‘ وغیرہ ہے، تو منظوم ادب کا نمونہ آپ کے نوکِ قلم کی ایجاد شہرۂ آفاق ترانہ دارالعلوم دیوبند ہے، نیز آپ کے مجموعۂ کلام ’نغمۂ سحر‘ میں ایک جویائے ادب کے لیے بہت کچھ جواہر وگوہر نایاب موجود ہیں۔

ناچیز راقم الحروف کو دورِ طالب علمی ہی سے حضرت مرحوم کی شفقتیں حاصل رہی ہیں، شوال ۱۴۰۱ھ مطابق ۱۹۸۱ء میں بندے کا داخلہ مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند میں ہوا، پنجم عربی کا سال تھا، ’نورالانوار‘ کا سبق حضرت مولانا لقمان الحق صاحب رحمہ اللہ سے متعلق ہوا، جو حضرت مولانا سلطان الحق صاحب (ناظم کتب خانہ) رحمہ اللہ کے بڑے صاحبزادے تھے اور حضرت مولانا ریاست علی صاحب رحمہ اللہ کے برادرِ نسبتی بھی تھے، مولانا لقمان الحق صاحب رحمہ اللہ بھی طلبہ پر انتہائی شفیق تھے، ہم لوگوں کا ان کے گھر پر کثرت سے جانا ہوتا تھا، گاہے گاہے مولانا مرحوم کھانے پر بھی بلا لیتے تھے، حضرت مولانا ریاست علی صاحب رحمہ اللہ سے سب سے پہلے وہیں ملاقات ہوئی۔ وضع داری، غریب پروری اور ملنے جلنے والوں کا پاس ولحاظ مولانا سلطان الحق صاحب رحمہ اللہ کی پہچان تھی اور یہ وصف ان کے دونوں نسبی ونسبتی صاحبزادگان میں بدرجہ اتم منتقل ہوا، حضرت مولانا ریاست علی صاحب رحمہ اللہ اِس غریب طالب علم پر صرف اس لیے شفقت کا برتاؤ کرتے تھے کہ ’’بھائی لقمان‘‘ سے اس کا خصوصی تعلق ہے؛ چنانچہ بارہا اپنے اعزاء اور متعارف لوگوں سے حضرت مرحوم نے احقر کا اسی عنوان سے تعارف بھی کرایا تھا، پھر جب حضرت مرحوم سے براہِ راست استفادہ ہونے لگا تو یہ تعلق بالواسطہ ہونے کے بجائے بلاواسطہ اور مضبوط ہوگیا۔

حضرت مرحوم کو بدلتے حالات میں ملتِ اسلامیہ کے تقاضوں کے مطابق دارالعلوم کی جانب سے عملی اقدامات کی بھی دھن رہتی تھی، چنانچہ آپ نے اپنے دورِ نظامت میں شعبۂ تخصص فی الحدیث کے قیام کی تجویز رکھی اور آپ کی تحریر پر ۱۴۱۱ھ میں مجلس شوریٰ نے اسے منظور بھی کرلیا؛ لیکن کسی وجہ سے اس تجویز کو عملی شکل دینے میں تاخیر ہوتی گئی اور ۱۴۲۰ھ میں حضرت مولانا نعمت اللہ صاحب دامت برکاتہم کو نگراں مقرر کرکے باضابطہ شعبے کا قیام عمل میں آیا۔ ابتدائی خاکہ اور نصاب وطریقۂ کار کے تعین کے سلسلہ میں حضرت مرحوم، حضرت مولانا نعمت اللہ صاحب مدظلہ کے معاون ومشیر رہے اور الحمدللہ ایک جامع ومفید دوسالہ نصاب مرتب ہوکر کام شروع ہوگیا۔

اس شعبہ میں مستقل مدرس کی حیثیت سے احقر کا تقرر عمل میں آیا، جس میں حضرت مرحوم کا انتہائی اہم کردار رہا، شعبۂ تخصص فی الحدیث کے نصاب کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں محدثین اور فقہاء دونوں کے مذاق کا یکساں طور پر خیال رکھا گیا ہے، نہ تو فقہی پہلو کو نظرانداز کرکے صرف قواعدِ محدثین ہی کی تطبیق ومشق میں طلبہ کو لگادیا جاتا ہے کہ فقہائے کرام کی تمام تر کاوشیں ہمارے فاضل کو کمزور اور بے دلیل نظر آنے لگیں اور نہ ہی طریقۂ محدثین کے مطابق حدیثوں کی تصحیح و تضعیف کے اصول کی معرفت اور تطبیق کی مشق میں کوئی کسر چھوڑی جاتی ہے؛ بلکہ ناقدینِ حدیث کے معیارِ تنقید کو باریکی سے پڑھنے کا موقع دیا جاتا ہے؛ تاکہ اس فن میں ہمارے باحث کو مکمل بصیرت حاصل ہو اور فکری آزادی وکج روی سے محفوظ رہتے ہوئے حدیثوں پر حکم لگانے کی ان میں صلاحیت پیدا ہو، ساتھ ہی فقہی ابواب کی اُن احادیث کی ایک معتدبہ مقدار بھی طلبہ کو یاد کرادی جاتی ہے جن سے حضراتِ فقہاء استدلال کرتے ہیں؛ چنانچہ تین سو احادیث کو ان کی اسنادی حیثیت سمیت حفظ کرنے کا ہر طالب علم پابند ہوتا ہے۔ حضرت مولانا ریاست علی صاحب رحمہ اللہ کو اس شعبہ سے اتنی دلچسپی تھی کہ ہر سال حفظِ حدیث کا امتحان شوق سے لیتے تھے؛ چنانچہ وفات سے چند روز قبل بھی دونوں جماعتوں کے امتحانات لیے اور شعبہ کی عمدہ کارکردگی کو سراہا۔

قدرت نے آپ کو زبردست انتظامی صلاحیت کے ساتھ صالحیت سے بھی نوازا تھا، منتظم میں صلاحیت کے ساتھ جب صالحیت بھی ہوتی ہے تو اس کا انتظام پختہ اور مثمر برکات ہوتا ہے اور انتظام سے جڑے ہوئے افراد میں سے ہر ایک اپنی جگہ پر مطمئن ہوتا ہے، مولانا مرحوم کی یہ خوبی تھی کہ لوگ ان سے مطمئن رہتے تھے اور نظام بھی مستحکم طریقہ سے چلتا تھا

حضرت مرحوم اس شعبہ کی افادیت، اس کے نصاب اور طریقۂ کار کے اس قدر قائل تھے کہ آپ نے ملک میں اس طرز پر دیگر اداروں کے قیام یا مدارس وجامعات میں اسی نہج پر تخصصاتی شعبے قائم کرنے کا مخلصانہ مشورہ بھی دیا ہے، ۱۴۲۵ھ میں طلبۂ تخصص کے ذریعہ انجام پانے والے اہم علمی وتحقیقی کام کا ’’الحدیث الحسن فی جامع الترمذی/ دراسة وتطبیق‘‘ پر اپنی تقریظ میں رقم طراز ہیں:

’’وحقًا لو أشار أحد علىٰ معاهد التخصص في علوم الحديث باتباع هذا المنهج القويم في دراساتها، أو أوصى انى الجامعات و دور التعليم بانشاء الأقسام التابعة لها علىٰ هذا المنوال؛ لكان انارته غنما و جديرًا بالقبول و التقدير.‘‘

یعنی علومِ شرعیہ کے دیگر تخصصاتی اداروں، یا یونیورسٹیوں کے تخصصاتی شعبوں کو اسی نصاب اور طریقۂ کار کی اقتداء کرنی چاہیے، اگر یہ مشورہ دیا جائے تو قابلِ قبول اور قابلِ توجہ مشورہ ہوگا۔

کچھ قابلِ تقلید صفات

یوں تو حضرتِ مرحوم گوناگوں خوبیوں کے مالک تھے، ان میں چند قابلِ تقلید خوبیاں حسبِ ذیل ہیں:

۱- تواضع وکسرِ نفسی:

یہ صفت حضرتِ مرحوم میں فطری تھی، لباس اور وضع ایسی اختیار کرتے جس میں کسی قسم کا امتیاز نہ ہو، مجلس میں اپنی نشست اس طرح رکھتے کہ حاضرین کی نشست سے ممتاز نہ ہو، کوئی نو وارد شخص ملنے آتا تو مجلس میں حضرت مرحوم کے تعین وتشخص میں اسے تذبذب ہوتا؛ بلکہ حضرت کے علاوہ مجلس میں شریک کسی صاحب کو حضرت سمجھ کر اپنا مدعا عرض کرنے لگتا۔ کوئی علمی انداز کا سوال کرتا تو فرماتے: بیٹے یہ سوال تو مفتی سعید احمد صاحب یا مولانا نعمت اللہ صاحب سے کرنے کا ہے۔ کوئی اپنے یا اپنے عزیز کے متعلق آسیبی اثرات وغیرہ کی بات کہہ کر تعویذ وغیرہ کا طالب ہوتا تو فرماتے: بھائی تم غلط جگہ آگئے، یہ کام صوفی اسماعیل کا ہے، آپ کے سبق سے متاثر ہونے والے غیر متعارف طلبہ اگر برائے ملاقات آجاتے تو فرماتے: بیٹے مجھ سے مل کر تمہیں کیا ملے گا؟ چائے پی لو۔

کرتا عموماً گھٹنے تک، پائجامہ علی گڈھی اور دو پلی ٹوپی پہنتے، نو وارد مہمانوں کو حضرت کا یہ لباس آپ کے علمی وعرفی مقام ومرتبہ سے میل کھاتا ہوا نظر نہ آتا تو انھیں شک اور تردد ہوتا، ایک بنگالی فاضل نے جو آپ کے شاگرد تھے ایک مرتبہ ہمت کر کے عرض کیا: حضرت ہمارے دیار میں بڑے علماء ٹخنوں تک لمبے جبے پہنتے ہیں، تو برجستہ فرمایا: بیٹا! کیا کروں اپنے اندر اتنے ہی کی اوقات پاتا ہوں۔

۲- دیانت واحساسِ ذمہ داری:

یہ وصف آپ کی زندگی کا نمایاں ترین وصف ہے، دیانت وامانت کے آپ پیکر تھے، نیز دار العلوم کی جانب سے سپرد کی جانے والی ذمہ داریوں کو دیانت کے ساتھ کما حقہ نبھانا اپنا فرض منصبی سمجھتے تھے، وقت پر حاضری، سبق کی پابندی، امتحانات میں دلچسپی کے ساتھ شرکت ہر شخص پر ظاہر وعیاں ہے، دار العلوم میں امتحانات کی ذمہ داری چند سالوں سے احقر سے متعلق رہا کرتی ہے اور اس سلسلہ میں حضرت مرحوم میرے لیے بہت بڑے سہارا تھے، اہم امور میں حضرت سے مشورہ ہوتا اور حضرت مناسب مشوروں سے نوازتے، آخری امتحان سالانہ میں جب کہ ضعف بڑھ گیا تھا ہر روز رکشہ سے دار الامتحان تشریف لاتے، دار الامتحان میں داخل ہونے کے لیے بہت سے زینوں پر چڑھنا اترنا پڑتا تھا، جس کی تاب لانا مشکل ہوتا، امتحان گاہ میں داخل ہو کر کسی قریبی کرسی پر تھوڑی دیر دم لیتے پھر مقررہ نشست گاہِ اکابر تک بہ تکلف تشریف لے جاتے، بحیثیت ذمہ دارِ امتحان احقر نے عرض کیا کہ حضرت آپ تشریف نہ لائیں، گھر ہی سے توجہ اور دعا فرماتے رہیں، فرمایا کہ جب گھنٹہ کی آواز سنتا ہوں تو رہا نہیں جاتا، ایک روز حضرت مہتمم صاحب مدظلہ نے بھی یہی بات فرمائی، پھر بھی تشریف لاتے رہے، ایک روز حضرت مولانا نعمت اللہ صاحب مدظلہ سے پوچھا کہ کیا مہتمم صاحب یا کسی ذمہ دار کی اجازت دینے سے میرے لیے حاضری سے رکنا جائز ہے؟ مولانا نے فرمایا: ’’اِسْتَفْتِ قَلْبَکَ‘‘ اپنے دل سے پوچھیے (مشکوٰۃ)، ظاہر ہے مہتمم صاحب کے فرمانے پر تو آپ کو رک ہی جانا چاہیے تھا؛ مگر واہ رے دیانت واحساسِ ذمہ داری! کہ ان کے دل نے حاضر ہونے ہی کا فتویٰ دیا اور آخری دن تک تشریف لاتے رہے۔

۳- خورد نوازی وحوصلہ افزائی:

خورد نوازی اور چھوٹوں کی حوصلہ افزائی تو آپ کا طرۂ امتیاز تھا، اپنے تعلق رکھنے والے شاگردوں، خصوصاً نوجوان اساتذۂ دار العلوم کو اہم موضوعات پر تصنیف اور مطالعہ کا شوق دلاتے رہتے تھے، براہِ راست کہنے کے بجائے موضوع سے متعلق کچھ سوالات اور قابلِ غور پہلو سامنے لاتے؛ تاکہ انھیں خود پڑھنے اور لکھنے کا شوق ہو؛ چنانچہ اس طرح متعدد اساتذہ اور فضلاء کے ذریعہ کئی اچھے اور مفید کام سامنے آگئے۔ کئی ایک کو آپ نے خود اپنے ساتھ تالیف یا تحشیہ کے کام میں لگا رکھا تھا، مثلاً مولانا فہیم الدین بجنوری صاحب استاذ دار العلوم دیوبند کو ’ایضاح البخاری‘ میں لگایا جس کی وجہ سے کام بہت آگے بڑھ گیا، مولانا عارف جمیل صاحب اور مولانا اشرف عباس صاحب اساتذۂ دار العلوم دیوبند کو ’کشاف اصطلاحات الفنون‘ کی تحقیق وتحشیہ کے کام میں لگایا جو تکمیل کے قریب ہے، اور مولانا عبد الرزاق امروہوی استاذ جامعہ اسلامیہ جامع مسجد امروہہ اور مفتی اشتیاق احمد صاحب دربھنگوی استاذ دار العلوم دیوبند کو ’خلاصۃ التفاسیر‘ کی تحقیق وتعلیق کے کام میں لگایا اور سب کے ساتھ لگ کر کام کی دیکھ بھال فرماتے تھے۔

اسی طرح دیگر مصنفین کی تصنیفات کو وقت نکال کر دیکھنا اور مناسب مشوروں واصلاحات کے بعد حوصلہ افزا تقریظات تحریر فرمانا تو روزمرہ کا

معمول تھا۔طویل تجربہ اور وسیع مطالعہ کی بنا پر حضرت مرحوم کا ذہن کیمرے کی طرح کام کرتا تھا اور پیشِ نظر تحریر یا کتاب کی خامی وخوبی بڑی آسانی سے اور بہت جلد اخذ فرما لیتے تھے۔راقم الحروف کی پانچ سو صفحے کی کتاب 'حدیث اور فہم حدیث' پر حضرت مرحوم کی مختصر اور جامع حوصلہ افزا تقریظ کا اقتباس دیئے بغیر جی نہیں مانتا، اس سے اندازہ کرنا مشکل نہ ہوگا کہ حضرت مرحوم کو اس سلسلہ میں کتنی مہارت حاصل تھی، ملاحظہ ہو:

''عزیز موصوف نے کتاب کا آغاز حدیث کی تعریف، اس کے فوائد اور غرض وغایت سے کیا ہے، پھر ان کا قلم حجیت حدیث کی جانب متوجہ ہوا، اور اس کی تکمیل کے لئے انھوں نے فتنۂ انکار حدیث اور اس کی تردید پر مشتمل قیمتی مباحث سپردِ قرطاس کئے۔پھر اس کے بعد موصوف کے قلم نے حدیثِ پاک کی تدوین کی طرف توجہ کی، جس میں انھوں نے دلائل کے ساتھ یہ بتایا کہ تدوین حدیث کا کام عہد صحابہؓ سے شروع ہوگیا تھا، اس کے بعد انھوں نے ہر صدی اور ہر دور میں انجام دی جانے والی خدمات کا احاطہ کیا۔ اس موضوع کی تفصیلات سے فراغت کے بعد انھوں نے حدیثِ پاک کی درسی کتابوں کی خصوصیات اور امتیازات پر سیر حاصل اور قابل قدر گفتگو کی، اس کے بعد نقد حدیث کے روایتی ودرایتی معیار پر اتنا محققانہ اور شاندار کلام کیا جو اہل علم کے لئے خاص طور پر توجہ کے لائق ہے۔اس کے بعد موصوف کا قلم فقہی اختلاف میں حدیث کے کردار کی طرف متوجہ ہوا، اس موضوع کی دلنشیں تحقیق کے بعد آخر میں انھوں نے امام اعظم اور علم حدیث کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا اور اس پر اطمینان بخش تفصیلات پیش کیں۔کتاب کیا ہے؟ مرتب معلومات کا بیش قیمت خزانہ ہے، یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ 'حدیث اور فہم حدیث' ایسے قیمتی اور تحقیقی مضامین پر مشتمل ہے کہ حدیث پاک کے ہر طالب علم کو اس کے مطالعہ سے فیضیاب ہونا چاہئے۔دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مصنفِ محترم کی محنت کو اپنی بارگاہ میں حسن قبول اور علمی حلقوں میں قبول عام عطا کرے، آمین۔''

۴- خودداری وبے نیازی:

یہ صفت بھی آپ کی طبعی تھی، غیرت وخودداری آپ کا ایسا قیمتی اثاثہ تھا جس کو ٹھیس لگنا کسی قیمت پر آپ کو گوارا نہیں تھا، اپنی ضرورت کسی سے نہ کہتے، اپنا کام خود کرتے، ضرورت کے باوجود طلبہ تو کیا صاحبزادگان تک سے بھی بدنی خدمت کبھی نہیں لیتے، کوئی ہدیہ پیش کرتا، اگر شناسا نہ ہوتا تو قبول ہی نہ فرماتے، بہت اصرار کرتا تو گرانی کے ساتھ قبول فرما لیتے اور ذاتی استعمال میں لانے سے پھر بھی احتیاط برتتے؛ البتہ شناسا اور بے تکلف لوگوں سے تکلف کے ساتھ قبول فرما لیتے تھے، راقم الحروف نے بارہا آپ کو یہ شعر پڑھتے ہوئے سنا جو ان کے واقعی حال کا ترجمان ہے:

تمام عمر اسی احتیاط میں گزری
کہ آشیاں کسی شاخِ چمن پہ بار نہ ہو

راقم الحروف نے یہ دعا بھی بار ہا آپ کی زبان سے سنی کہ اللہ کبھی کسی کا محتاج نہ بنائے، آپ کے محبوبِ حقیقی نے اس خواہش کا خیال رکھتے ہوئے اسی شانِ بے نیازی کے ساتھ اس دارِفانی سے کوچ کرنے کا انتظام فرمایا، ایسا لگا جیسے عصا لے کر معمول کے مطابق دارالعلوم کی طرف جارہے ہوں کہ اچانک مزارِقاسمی کی گلی پر پہنچ کر بائیں طرف مڑ گئے اور جوارِقاسمی میں جاکر لیٹ گئے۔

دیگر مصنّفین کی تصنیفات کو وقت نکال کر دیکھنا اور مناسب مشوروں و اصلاحات کے بعد حوصلہ افزا تقریظات تحریر فرمانا تو روزمرہ کا معمول تھا۔ طویل تجربہ اور وسیع مطالعہ کی بنا پر حضرت مرحوم کا ذہن کیمرے کی طرح کام کرتا تھا اور پیشِ نظر تحریر یا کتاب کی خامی و خوبی بڑی آسانی سے اور بہت جلد اخذ فرما لیتے تھے۔

وفات ۲۳؍شعبان المعظم ۱۴۳۸ھ مطابق ۲۰؍مئی ۲۰۱۷ء روز شنبہ بوقت ۴؍بجے صبح ہوئی، حضرتِ مرحوم کے ایک باصلاحیت وباذوق شاگرد جناب مولانا مفتی محمد طاہر صاحب اعظمی مقیم حال جدہ سعودی عرب نے درج ذیل مادۂ تاریخ وفات نکالے ہیں:

- محمودِ جہاں مولانا ریاست علی صاحب بجنوری (۱۴۳۸ھ)
- محمودِ جہاں مولانا ریاست علی صاحب بجنوری رحمہ المقسط المجیب (۲۰۱۷ء)
- محدثِ نکتہ شناس (۱۴۳۸ھ)
- بگو استاذِ خود را سالِ رحلت غمزدہ طاہر'' کہ بایدلحد فردوسِ بریں از رحمتِ مولیٰ'' ۱۴۳۸ھ
- جھکا کر سر سنِ رحلت میں جب ہم غور کرتے ہیں
  ندا پہنچتی کہ جنت میں وہ مفرح سیر کرتے ہیں (۲۰۱۷ء)

اللّٰهم اغفر له وارحمه وعافه ونقه من الخطايا كما نقيت الثوب الأبيض من الدنس، اللّٰهم لا تحرمنا أجره ولا تفتنا بعده. آمين!□□

کون اقدارِ سلف کی اب نگہبانی کرے

تحریر: مولانا عبدالرؤوف غزنوی (جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی)

دم بخود ہیں موت پر تیری روایاتِ سلف
کون اقدارِ سلف کی اب نگہبانی کرے (نغمۂ سحر)

۲۳رشعبان ۱۴۳۸ھ مطابق ۲۰رمئی ۲۰۱۷ء بروز ہفتہ فجر کی نماز کے بعد ہی میرے مخلص دوست جناب مولانا حکمت اللہ صاحب فاضل دارالعلوم دیوبند اور استاذ جامعۃ الشیخ حسین احمد المدنیؒ نے دیوبند سے فون پر ایک ایسی ناگہانی اور اندوہناک خبر سنائی کہ اس پر ظاہری اسباب کے تحت یقین کرنا مشکل ہوگیا، خبر یہ تھی کہ دارالعلوم دیوبند کے مایۂ ناز استاذِ حدیث اور سابق ناظم تعلیمات حضرت الاستاذ مولانا ریاست علی صاحب بجنوری کا گزشتہ رات (جمعہ اور ہفتہ کی درمیانی شب) صبح صادق سے کچھ پہلے تقریباً چار بج کر دس منٹ پر انتقال ہوگیا۔ یہ دلخراش خبرسن کر ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے میں نے ''إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ'' پڑھ کر ان سے کہا کہ ابھی چند ہی روز قبل تو حضرت الاستاذ سے فون پر حسبِ معمول میری بات ہوئی تھی اور بظاہر وہ بالکل تندرست تھے اور اپنے معمولات حسبِ سابق انجام دے رہے تھے! انہوں نے کہا کہ: جی ہاں! وہ آخری دن تک چل پھر رہے تھے اور اپنی کچھ پرانی بیماریوں کے علاوہ کوئی نئی بیماری بھی لاحق نہیں ہوئی تھی، لیکن اللہ تعالیٰ کا وقتِ موعود آ گیا اور وہ ہم سے جدا ہوگئے۔

مولانا حکمت اللہ صاحب چونکہ فاضلِ دارالعلوم دیوبند اور قابلِ اعتماد دوست ہیں، اس لیے ان کی خبر کو میں جھٹلا تو نہیں سکتا تھا، تاہم دل پھر بھی حضرت الاستاذ کی رحلت کی خبر کو ماننے کے لیے مکمل طور پر آمادہ نہیں تھا اور اپنے آپ کو یہ تسلی دینے کی کوشش کر رہا تھا کہ ہوسکتا ہے کوئی غلط فہمی ہوئی ہو اور حقیقت میں ایسا حادثہ پیش نہ آیا ہو! اسی امید پر میں نے فوری طور پر حضرت الاستاذ ہی کے موبائل نمبر پر فون کیا اور دل کو یہ تمنا تھی کہ اُدھر سے حسبِ معمول حضرت الاستاذ ہی کی شفقت بھری آواز سننے کو ملے لیکن پہلی بار ایسا ہوا کہ حضرت الاستاذ کے مخصوص نمبر سے ان کے بجائے ان کے فرزندِ اکبر مولانا محمد سفیان عرشی قاسمی صاحب کی آواز میں السلام علیکم ورحمۃ اللہ کے کلمات ادا کیے گئے، جس سے مذکورہ دلخراش خبر کو تقویت ملی۔ احقر نے سلام کا جواب دینے کے بعد استفسار کیا کہ آج کیوں حضرت الاستاذ کے مخصوص نمبر سے ان کے بجائے آپ کی آواز سن رہا ہوں؟ اس نمبر سے تو ہمیشہ ان ہی کی آواز سے دل کو سکون ملتا تھا! انہوں نے بہت ہی صبر وتحمل کے ساتھ حضرت کے وصال کی تصدیق کی، جس کے بعد میں نے فوراً اپنے آپ کو سنبھالنے اور مولانا محمد سفیان صاحب کو تسلّی دینے اور تعزیت کے الفاظ کہنے کی کوشش کی، لیکن غیر اختیاری طور پر میں اپنے آپ کو مکمل طور پر سنبھالنے میں کامیاب نہ ہوسکا اور بجائے اس کے کہ میں مولانا محمد سفیان صاحب کو تسلی دوں، وہ مجھے تسلی دینے لگے، جس سے میرے اندر بھی ہمّت پیدا ہوگئی اور حضرت الاستاذ کی قابلِ رشک زندگی کے چند اہم گوشوں کا ذکرِ خیر کرتے ہوئے اُن سے اور اُن کے توسط سے خاندان کے دیگر افراد سے تعزیت کرتے ہوئے صبر وتحمل کی درخواست کی۔

اس کے بعد احقر نے تعزیت کے لیے دارالعلوم دیوبند کے موجودہ مہتمم حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب اور نائب مہتمم حضرت مولانا عبدالخالق صاحب سنبھلی صاحب کو بھی فون کیا۔ مولانا عبدالخالق صاحب نے بتایا کہ حضرت مولانا ریاست علی صاحبؒ بالکل ٹھیک ٹھاک تھے اور چار روز قبل بروز منگل ۱۹رشعبان کو امتحانِ سالانہ کا آخری دن تھا، وہ امتحان گاہ تشریف لائے تھے اور میری ملاقات وگفتگو بھی ان سے ہوئی تھی، ماشاءاللہ! بالکل ٹھیک ٹھاک لگ رہے تھے اور ظاہری اسباب کے تحت ایسے حادثے کی کوئی توقع نہیں تھی، لیکن موت کا سب سے بڑا اور حقیقی سبب اللہ تعالیٰ ہی کا وہ مقرر کردہ وقت ہے جس کا علم اللہ کے علاوہ کسی کو نہیں ہوتا، اسی مقررہ وقت پر حضرت مولانا ریاست علی صاحبؒ نے داعیِ اَجل کو لبیک کہا۔

اس سانحہ کے بعد احقر کی تمنا تو یہ رہی کہ حضرت والا کی نمازِ جنازہ میں شرکت کرنے اور جنازہ کو کندھا دینے کی سعادت حاصل کرنے کے لیے فوری طور پر دیوبند حاضری دوں! لیکن پاکستان سے ہندوستان کا ویزا حاصل کرنا اور بالخصوص دیوبند کا ویزا بہت ہی مشکل اور وقت طلب ہے، لہٰذا ایصالِ ثواب اور دعاہائے مغفرت پر اکتفا کیا گیا اور احقر کی درخواست پر جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی میں ایصالِ ثواب کا اہتمام کیا گیا اور حضرت الاستاذ کی مغفرت ورفعِ درجات اور پسماندگان ومتعلقین کے صبرِ جمیل کے لیے دعائیں کی گئیں اور مزید یہ کہ جامعہ کے چند نوجوان اساتذہ وفضلاء جو دعوت وتبلیغ کے سلسلہ میں چلہ لگا رہے تھے، جب ان کو حضرتؒ کے وصال کا پتہ چلا تو

انہوں نے اپنے اس بابرکت سفر کے دوران سات آٹھ ختم قرآن کا ایصالِ ثواب کیا اور مجھ سے فون پر رابطہ کر کے تعزیت کرنے کے ساتھ ساتھ مذکورہ ایصالِ ثواب سے بھی آگاہ کر دیا۔

آپ کی نمازِ جنازہ بعد نمازِ ظہر احاطۂ دارالعلوم دیوبند میں حضرت قاری محمد عثمان صاحب منصور پوری استاذِ حدیث دارالعلوم دیوبند اور دامادِ شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ کی امامت میں ادا کی گئی، جس میں علماء وصلحاء اور طلبۂ عزیز وعام مسلمانوں کے ایک جم غفیر نے شرکت کی اور اکابرینِ دارالعلوم کے قبرستان ''مزارِ قاسمی'' میں آپ کو سپردِ خاک کیا گیا، رحمہ اللّٰہ رحمۃً واسعۃً۔

تعلیم وتربیت اور دارالعلوم دیوبند میں تقرری

حضرت مولانا ریاست علی صاحب بجنوریؒ کی ولادت ۹/مارچ ۱۹۴۰ء کو ہوئی۔ ابتدائی عصری تعلیم حبیب والا میں جو بجنور کے مضافات میں واقع ہے۔ درجۂ چہارم تک حاصل کی، پھر ان کے پھوپھا حضرت مولانا سلطان الحق صاحبؒ ناظمِ کتب خانہ دارالعلوم دیوبند نے ان کی تعلیم وتربیت کی ذمہ داری لیتے ہوئے دارالعلوم دیوبند میں درجۂ فارسی میں داخل کرایا۔ درجۂ فارسی سے دورۂ حدیث تک پوری تعلیم دارالعلوم دیوبند کے بابرکت ماحول میں حاصل کر کے ۱۹۵۸ء کو دورۂ حدیث سے فراغت حاصل کی۔ حضرت مولانا فخر الدین احمد صاحبؒ شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند (متوفی: ۱۳۹۲ھ) سے بخاری شریف پڑھی اور ان کے درسِ بخاری کو اہتمام کے ساتھ قلم بند کر دیا اور بعد میں 'ایضاح البخاری' کے نام سے شائع کرنا بھی شروع کیا۔

۱۳۹۱ھ مطابق ۱۹۷۲ء کو دارالعلوم دیوبند میں مدرس کی حیثیت سے آپ کا تقرر عمل میں آیا اور ابتدائی درجات سے لے کر دورۂ حدیث وتکمیلات تک کامیابی کے ساتھ سنِ ہجری کے حساب سے سینتالیس سال اور سنِ میلادی کے حساب سے تقریباً پینتالیس سال تک پڑھاتے رہے۔ آخری چند سالوں میں دورۂ حدیث میں حدیث کی اہم کتاب ترمذی شریف جلد اول زیرِ تدریس رہی۔

مزید علمی وادبی کارنامے

دارالعلوم دیوبند کا ماہانہ رسالہ 'دارالعلوم' ایک عرصے تک آپ کی ادارت میں شائع ہوتا رہا۔ اسی طرح شیخ الہندؒ اکیڈمی کی نگرانی بھی کچھ عرصے تک آپ فرماتے رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے آپ کو پاکیزہ شعر وشاعری کا ذوق بھی عنایت فرمایا تھا، چنانچہ آپ کے اشعار کا مجموعہ 'نغمۂ سحر' کے نام سے شائع ہو چکا ہے اور دارالعلوم دیوبند کا مشہور ومعروف ترانہ (یہ علم وہنر کا گہوارہ...) آپ ہی کی تخلیق اور آپ ہی کی پاکیزہ شاعری کا ترجمان ہے، جسے سن کر دلوں پر رقت طاری ہوتی ہے اور آنکھوں کو آنسو بہائے بغیر چین نہیں آتا۔ اس الہامی ترانے کی وجہ سے حضرت والا کی مقبولیت وشہرت میں مزید اضافہ ہوا۔

تصنیف وتالیف کے میدان میں آپ کا ایک عظیم کارنامہ 'ایضاح البخاری' شرح صحیح بخاری ہے، جس میں آپ نے اپنے استاذِ محترم فخر الاسلام حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صاحبؒ شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند کے افادات کو اپنی مزید تحقیق، حسنِ ترتیب اور حوالوں کی نشاندہی کے ساتھ جمع فرمایا ہے اور آپ کی وفات تک اس کی دس جلدیں (شروع سے کتاب الشروط کے اختتام تک) شائع ہو چکی تھیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے فرزندوں اور شاگردوں کو اس کی تکمیل کی توفیق عطا فرمائے۔

اسی طرح تصنیف وتالیف کے میدان میں آپ کی ایک اور شاہکار تصنیف 'شوریٰ کی شرعی حیثیت' ہے جو اپنے موضوع پر ایک مفصل ومدلل کتاب ہے۔ یہ کتاب مجلس شوریٰ اور مہتمم کی باہمی حیثیت سے متعلق لکھی گئی ہے اور نصوصِ شرعیہ اور اسلافِ امت واکابرینِ دارالعلوم دیوبند کی تصریحات کی روشنی میں شوریٰ کی بالادستی، مہتمم کو اس کے سامنے جواب دہ ہونا اور مجلسِ شوریٰ کا مہتمم کے نصب وعزل کا مختار رہنا ثابت کیا گیا ہے۔ یہ کتاب ۱۴۰۸ھ کو پہلی بار ۲۰۸ صفحات پر مشتمل شیخ الہندؒ اکیڈمی دارالعلوم دیوبند کی طرف سے شائع ہوئی اور اس کو علمی حلقوں میں بڑی پذیرائی وشہرت ملی۔ مفتی اعظم ہند حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی قدس سرہٗ، حضرت مولانا معراج الحق صاحبؒ صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا نصیر احمد خان صاحبؒ شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری موجودہ صدر المدرسین وشیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند مدظلہم اور مشہور مصنف حضرت مولانا قاضی اطہر صاحب مبارک پوریؒ نگرانِ اعزازی شیخ الہندؒ اکیڈمی دارالعلوم دیوبند ان تمام اکابر نے اس کتاب پر اعتماد کا اظہار فرماتے ہوئے اس پر تصدیقات ثبت فرما دی ہیں۔

آپ کی تحریر کا امتیاز

خوش نویسی، زود نویسی، باریک نویسی اور صاف نویسی ان چاروں عناصر کا مجموعہ میں نے اپنی زندگی میں صرف آپ ہی کی تحریروں میں دیکھا تھا، جب قلم ہاتھ میں لیتے تو روانی کے ساتھ خوبصورت چھوٹے حروف کے ساتھ موتیوں کی لڑیاں پرونے لگتے۔ عام طور پر یہ دیکھا جاتا ہے کہ اگر کسی کی تحریر میں خوشنویسی ہے تو زودنویسی اور باریک نویسی معدوم، اور زودنویسی یا باریک نویسی اگر موجود ہے تو صاف نویسی اور خوشنویسی ندارد، حضرت الاستاذ کی تحریروں میں بیک وقت یہ تمام اوصاف نظر آتے تھے۔ کاغذ کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے پر پورے مضمون کا خلاصہ لکھنا آپ ہی کی خصوصیت تھی۔ آپ کی تحریر چاہے چند ہی سطر پر مشتمل ہوتی اور صرف ایک وقتی ضرورت کے تحت لکھی گئی ہوتی، اگر کسی صاحبِ ذوق کے ہاتھ لگ جاتی تو اس کی ظاہری وباطنی

خوبصورتی کی وجہ سے وہ ہمیشہ اس کی حفاظت پر مجبور ہو جاتا۔

صاحبِ ذوق کو تو چھوڑ یئے! احقر جیسے مغفّل طالب علم نے بھی آپ کی ہر اس تحریر کی حفاظت کی ہے جو اس کے ہاتھ لگی ہے، چنانچہ آپ کے زمانۂ نظامتِ تعلیمات میں کسی سبق کے ردو بدل یا اضافہ وکمی یا دیگر تعلیمی امور سے متعلق جو وقتی حکم یا اطلاع کے طور پر آپ کی مختصر تحریریں احقر کے نام لکھی گئی ہیں، وہ سب آج تک احقر کی خصوصی فائل میں محفوظ ہیں اور بالخصوص وہ خطوط جو آپ نے اس ادنیٰ شاگرد کے خطوط کے جوابات میں لکھے ہیں، وہ تو کحل البصر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان تمام تحریروں کو موقع بموقع کھول کر ان سے استفادہ اور اپنے استاذ محترم کی یادوں کو تازہ کرتا رہتا ہوں۔

بلند اخلاق اور امتیازی تواضع وخاکساری

حضرت الاستاذ کو اللہ تعالیٰ نے بلند پایہ اخلاق کی دولت سے مالا مال فرمایا تھا، آپ نے ایک عرصہ تک ناظم تعلیمات کی حیثیت سے دارالعلوم کی خدمت کی۔ اس دوران آپ کا معاملہ اساتذہ کے ساتھ ہو یا طلبہ کے ساتھ' نہایت موزوں ومناسب ہوا کرتا تھا، کسی استاذ یا طالب علم کو ایسی شکایت کا موقع نہیں دیا کرتے تھے جسے 'شکایتِ بجا' کہا جاسکے۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ کا ایک امتیازی کمال اور انفرادی خصوصیت آپ کی حقیقی تواضع اور بے پناہ خاکساری تھی جس سے احقر بے حد متاثر ہوا ہے، اس لیے کہ ظاہری اور ادعائی تواضع کی مثالیں تو کافی ملتی ہیں، لیکن حقیقی تواضع اور وہ بھی صاحبِ کمال بلکہ مجمع الکمالات شخص کے اندر پایا جانا بہت نایاب ہے۔ رواں ہجری صدی کے شروع میں جب راقم داخلہ کی غرض سے دارالعلوم دیوبند پہنچا اور حضرت والا سے پڑھنے کا موقع نصیب ہوا، اور پھر آپ کو بحیثیتِ ناظم تعلیمات بھی قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور دارالعلوم دیوبند سے میری جدائی کے بعد بھی آپ سے تعلق قائم رہا- جو آپ کی وفات تک باقی رہا- اس طویل واقفیت کے بعد میں شرح صدر کے ساتھ یہ کہتا ہوں کہ تواضع کے جس مقام پر وہ فائز تھے وہ بہت کم لوگوں کو نصیب ہوا ہوگا۔ ظاہری تواضع کرنے والوں کی تواضع کا اس وقت پتہ چلتا ہے جب ان کو محسوس ہوتا ہے کہ ان کو نظر انداز کیا جا رہا ہے، یا یہ کہ ان کے ہم پلہ اور کم درجہ کے لوگوں کو ان پر فوقیت دی جا رہی ہے، یا ان کے ساتھ ان کے مقام سے کم درجہ کا برتاؤ کیا جا رہا ہے! ایسے موقع پر وہ سیخ پا ہونے لگتے ہیں اور مختلف طریقوں سے احتجاج کرنے پر اُتر آتے ہیں اور تمام ممکنہ وسائل بروئے کار لا کر اپنا مقام حاصل کرنے بلکہ اس سے بھی اوپر جانے کی کوشش کرتے ہیں، البتہ کچھ اللہ کے بندے ایسے بھی ہوتے ہیں جو نہ تو اپنے آپ کو نمایاں کرنے کے عادی ہوتے ہیں اور نہ ہی اپنے آپ کو ملے ہوئے مقام سے بالاتر سمجھتے ہیں، بلکہ ملے ہوئے مقام کو اپنی حیثیت سے بالاتر سمجھ کر اللہ کا شکر بجالاتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہوتے ہیں جن کے بارہ میں حدیث میں فرمایا گیا ہے: ''من تواضع للّٰہ رفعه اللّٰہ'' (جس نے اللہ کی رضا کے لیے تواضع اختیار کی، اللہ اس کو بلندی عطا فرماتا ہے)۔ حضرت الاستاذؒ کی حقیقی تواضع سے متعلق چند واقعات قلم بند کیے جا رہے ہیں:

پہلا واقعہ

حضرت مولانا ریاست علی صاحبؒ سے احقر غائبانہ طور پر اس وقت سے واقف ہو چکا تھا جب وہ تعلیمی سال ۱۴۰۰ھ-۱۴۰۱ھ کو مدرسہ امینیہ دہلی میں درجہ موقوف علیہ کا طالب علم تھا، البتہ زیارت کا موقع نہیں مل سکا تھا، اور جب اگلے تعلیمی سال ۱۴۰۱ھ-۱۴۰۲ھ کو دورۂ حدیث میں داخلہ لینے کی غرض سے دارالعلوم دیوبند حاضری ہوئی تو داخلہ کے ایام میں ہی ایک نورانی چہرہ والے اُدھیڑ عمر کے شخص کو دارالعلوم میں آتے جاتے دیکھا کرتا تھا جن کے سادہ لباس، بلاتکلف نقل وحرکت اور ہر ملنے والے کو سلام میں سبقت کرنے سے دل دل میں متأثر ہونے لگا تھا، اندازہ یہ تھا کہ یہ شخص دارالعلوم کے عام متعلقین میں سے کوئی ہوں گے جن پر بزرگوں کا رنگ چڑھا ہوا ہے، ان کی سادگی کو دیکھ کر یہ خیال ہرگز نہ تھا کہ یہ دارالعلوم کے بڑے استاذ ہوں گے، بعد میں پتہ چلا کہ یہی حضرت مولانا ریاست علی صاحب بجنوری ہیں۔

دوسرا واقعہ

ایک دفعہ دارُالحدیث تحتانی دارالعلوم دیوبند میں ایک جلسہ (جلسہ انعامیہ یا کوئی اور جلسہ) منعقد ہوا جس میں اساتذہ وطلبہ سب شریک تھے۔ اساتذہ حسبِ معمول اسٹیج پر تشریف فرما تھے، جبکہ طلبہ سامنے اور دائیں بائیں بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت مولانا ریاست علی صاحب غالباً ذرا دیر سے پہنچے ہوں گے تو پیچھے سے اسٹیج پر خالی جگہ نہ دیکھ کر (حالانکہ جگہ آسانی سے نکل سکتی تھی) کسی کو احساس دلائے بغیر ایک کونے میں جا کر طلبہ کی صفوں میں اس طرح خاموشی سے تشریف فرما ہوئے کہ حاضرین میں سے کسی کو آپ کی آمد کی خبر نہ ہوئی، راقم چونکہ اس وقت مدرس بن گیا تھا، اس لیے وہ بھی اسٹیج پر تھا، یاد پڑتا ہے کہ سب سے پہلے راقم ہی کی نظر پڑی اور بڑی شرمندگی ہوئی کہ ایک ادنیٰ شاگرد اسٹیج پر بیٹھا ہوا ہے اور استاذ الاساتذہ طلبہ کی صفوں میں!! تو سب سے پہلے احقر ہی نے حضرت والا سے اسٹیج پر آنے کی درخواست کی، اس دوران بڑے اساتذہ بھی متوجہ ہوئے اور ان کو اسٹیج پر بلایا، تب وہ تشریف لا کر اساتذہ کی صفوں میں تشریف فرما ہوئے۔

تیسرا واقعہ

جس وقت آپ اپنی مایۂ ناز تصنیف 'شوریٰ کی شرعی حیثیت' لکھ رہے تھے تو چند اکابر حضرات سے اس سلسلہ میں باقاعدہ اُن کا تبادلۂ خیال ہوتا رہا

اوران سے مشورے لیتے رہے، اور ایسا بھی ہوتا رہا کہ کبھی اپنے چھوٹوں اور شاگردوں سے کتاب کے کسی موضوع سے متعلق کوئی سرسری تبادلۂ خیال ہو جاتا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ صرف ایک ہی مرتبہ خود مجھ سے اس کتاب کے کسی موضوع سے متعلق کوئی سرسری تذکرہ فرمایا اور میری رائے دریافت کی، میں نے اپنی رائے ظاہر کر دی جو درحقیقت حضرت ہی کی رائے کی تائید تھی۔ حضرت والا کی تواضع وحق بینی کا یہ عالم دیکھئے کہ مذکورہ کتاب کے شروع میں 'پیش لفظ' کے تحت جہاں ان اکابر کا ذکر کیا ہے جن سے کتاب میں مدد لی گئی ہے وہاں ان اصاغر کا ذکر بھی فرمایا ہے جن سے تبادلۂ خیال کیا گیا ہے اوران کے ضمن میں احقر کا نام بھی شامل کر دیا ہے۔

اللہ ہدایت نصیب فرمائے ان مصنّفین کو جو 'علمی سرقہ' کرتے ہوئے دوسروں کی محنت وکاوش کو اپنا کارنامہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اوران کو بھی جو پورا کام یا اکثر کام دوسروں سے کرواتے ہیں اور نام صرف اپنا ہی لگا لیتے ہیں۔ حضرت والا نے کلیدی محنت خود ہی انجام دی، البتہ ایک معمولی شرکت کی وجہ سے اس کی نسبت دوسروں کی طرف کی ہے:

ببیں تفاوتِ راہ از کجا است تا بہ کجا

چوتھا واقعہ

کسی عالم کا اپنے ہم عصر دوسرے عالم کے علم وفضیلت کا اعتراف یا ان سے استفادہ کرنے کا اقرار کرنا اگرچہ بالکل معدوم تو نہیں البتہ شاذ ونادر ضرور ہے، لیکن دارالعلوم دیوبند کے سپوتوں نے بے شمار ایسی مثالیں پیش کی ہیں جن میں ہم عصروں کی بلندیوں کا اعتراف اوران کی فضیلت وعظمت کو تسلیم کرنا نمایاں طور پر نظر آتا ہے، چنانچہ حضرت مولانا عبدالماجد صاحب دریابادیؒ اور حضرت مولانا عبدالباری صاحب ندویؒ، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہٗ کی خدمت میں بیعت ہونے کی غرض سے حاضر ہوئے، حضرت شیخ الاسلامؒ نے ان کے اصرار کے باوجود حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ کی عظمت وفضیلت کا ذکر واعتراف کرتے ہوئے اُن سے بیعت ہونے کا مشورہ دیا، صرف مشورہ ہی نہیں بلکہ ان کو لے کر تھانہ بھون تشریف لے گئے اور حضرت تھانویؒ سے ان دونوں کو بیعت کر لینے کی درخواست کی، حضرت حکیم الامتؒ نے بھی حضرت شیخ الاسلامؒ کے مقام کو مدنظر رکھتے ہوئے ان سے فرمایا کہ: یہ لوگ چونکہ پہلے آپ ہی کے پاس حاضر ہوئے ہیں، اس لیے آپ ہی ان کو بیعت کر لیں، چنانچہ حکیم الامتؒ کے اس فرمان کے احترام میں شیخ الاسلامؒ نے دونوں کو بیعت تو کر لیا، لیکن اصلاح کا معاملہ حضرت حکیم الامتؒ کے سپرد کر دیا۔ حضرت الاستاذ مولانا ریاست علی صاحبؒ کی تواضع سے متعلق جو چوتھا واقعہ میں نقل کرنا چاہتا ہوں وہ بھی اکابرین کی یاد کو تازہ کرنے والا واقعہ ہے۔

تصنیف وتالیف کے میدان میں حضرت الاستاذ کا سب سے بڑا کام 'ایضاح البخاری' شرح صحیح البخاری کی ترتیب ہے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے، اس کتاب کی ترتیب آپ ہی کی محنتوں کا ثمرہ ہے، لیکن آپ کی تواضع کا یہ عالم ہے کہ اپنے ہم عصر اساتذۂ دارالعلوم سے مشکل مقامات پر تبادلۂ خیال کرنے اوراس کو استفادہ قرار دینے اور پھر تحریری شکل میں اس کے اعتراف کرنے سے اُن کو کوئی تردد لاحق نہیں ہوتا تھا، چنانچہ ایضاح البخاری جلد چہارم، صفحہ نمبر: ۵ پر 'عرضِ مرتب' کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

''اصلاحی نظر کے تدارک کی یہ صورت اختیار کی گئی ہے کہ مشکل مقامات پر دارالعلوم کے بالغ نظر اساتذۂ کرام سے رجوع کا اہتمام کیا جاتا ہے، خصوصاً حضرت مولانا نعمت اللہ صاحب اعظمی دامت برکاتہم سے عام طور پر تبادلۂ خیال، مذاکرہ اور استفادے کا موقع میسر ہے اور حضرتِ موصوف بھی از راہِ کرم بڑی دلچسپی کے ساتھ وقت مرحمت فرماتے ہیں اور کبھی کبھی حضرت مولانا سعید احمد صاحب پالن پوری زید مجدہم سے بھی تبادلۂ خیال یا مشورہ کیا جاتا ہے۔ اللہ ان حضرات کو جزائے خیر عطا فرمائے، آمین۔''

اسی طرح جب حضرت الاستاذ نے ایضاح البخاری جلد ششم کی ترتیب میں اپنے ایک ہونہار نوجوان شاگرد جناب مولانا فہیم الدین صاحب (جو اَب دارالعلوم دیوبند میں مدرس ہوگئے ہیں) سے اپنی سرپرستی میں تعاون لینا شروع فرمایا تو اس تعاون کے اعتراف میں ان کی ہمت افزائی کرتے ہوئے مرتب کی حیثیت سے اپنے نام کے ساتھ ان کا نام بھی بڑھا دیا، جسے خود مولانا فہیم الدین صاحب خوردنوازی اور کرم گستری قرار دیتے ہوئے ایضاح البخاری جلد ششم، صفحہ نمبر: ۶ پر 'عرضِ مرتب دوم' کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں: ''مجھے ندامت محسوس ہوتی ہے کہ کتاب کی پیشانی پر میرا نام مرتب کے طور پر آئے، لیکن حضرت والا کی خوردنوازی اور کرم گستری ہے کہ مرتب دوم کی حیثیت سے میرا نام آرہا ہے۔''

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ حضرت الاستاذ مولانا ریاست علی صاحبؒ کے اس عمل سے ان لوگوں کو سبق لینا چاہیے جو مصنف بننے کے شوق میں مختلف مصنّفین کی عبارات لے لیتے ہیں اوران کا نام یا حوالہ تک ذکر نہیں کرتے، یا دوسروں سے کام کرا لیتے ہیں اور نام اپنا ظاہر کرتے ہیں، اوراسی وجہ سے ایسے حضرات کی تصانیف میں کوئی کشش یا نورانیت محسوس نہیں ہوتی۔

غیر معمولی ذہانت وفطانت

حضرت الاستاذ کو اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی ذہانت سے مالا مال فرمایا تھا، مجھے میری نااہلی وغفلت کے باوجود اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل وکرم کے تحت

اس سعادت سے نوازا ہے کہ افغانستان، پاکستان، ہندوستان اور عالم عرب کے ایسے چیدہ چیدہ اور مایۂ ناز علمائے کرام کی خدمت میں حاضری، ان سے وابستگی اور استفادہ کرنے کا موقع عنایت فرمایا ہے جو صلاحیت و ذہانت اور تقویٰ و پرہیزگاری کے اعلیٰ مقام پر فائز اور اپنے ہم عصر علماء سے بہت آگے شمار کیے جاتے تھے۔ ان علمائے کرام، اساطینِ اُمت اور اساتذۂ ربانیین میں سے ذہانت وفطانت میں زیادہ سے زیادہ حضرت مولانا ریاست علی صاحب کے برابر اگر احقر نے کسی کو دیکھا ہو تو اس سے انکار نہیں، لیکن ان سے بڑھ کر کسی کی ذہانت وفطانت دیکھنے کا دعویٰ میں کسی طرح بھی نہیں کر سکتا۔ دارالعلوم دیوبند کے ماحول میں آپ کی ذہانت وذکاوت کی مثال دی جاتی تھی۔ میں جب ان کی ذہانت پر غور کرتا تو ایک بات ہمیشہ ذہن میں آتی کہ اگر محنت ویکسوئی اور نظم وضبط کے ساتھ حضرت الاستاذ کو تصنیف وتالیف اور دیگر علمی وتحقیقی کام کا موقع مل جاتا تو شاید وہ اتنا کام کر لیتے کہ کئی نسلوں تک اس کا چرچا ہوتا، لیکن افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ حضرت والا پر ایک طرف سے تواضع کا اتنا غلبہ تھا کہ وہ کسی نمایاں علمی خدمت کو انجام دینے یا کسی مشہور ومعروف مصنف کے طور پر ظاہر ہونے کے لیے آمادہ نہیں تھے اور دوسری طرف سے رواں صدی ہجری کے شروع میں جب دارالعلوم دیوبند میں ایک خلفشار کا سلسلہ شروع ہوا اور اس کے نتیجے میں ۱۴۰۲ھ مطابق ۱۹۸۲ء کو انتظامیہ کی تبدیلی بھی وقوع پذیر ہوئی، وہ حضرت والا کی جوانی اور کام کرنے کا وقت تھا، تاہم انتظامیہ کی تبدیلی کے بعد سب سے اہم اور نازک مسئلہ جو درپیش تھا وہ دارالعلوم کی کشتی کو سنبھالنے اور اس کے مقام وو قار کو بچانے کا مسئلہ تھا، جس میں حضرت والا نے کلیدی کردار ادا کیا، چنانچہ نہ چاہتے ہوئے بھی جدید انتظامیہ میں سب سے پہلے ان کو نائب ناظم تعلیمات اور پھر ناظم تعلیمات کا اہم عہدہ سپرد کیا گیا جس کی وجہ سے ان کو یکسوئی کا موقع نہ مل سکا، جو علمی وتحقیقی کام کے لیے ضروری سمجھا جاتا ہے، لہٰذا حضرت والا اگرچہ ایک طویل عرصے تک کامیابی کے ساتھ دارالعلوم کی تدریس اور انتظامی خدمت انجام دیتے رہے، تاہم ان کے واقف کاروں، متعلقین اور شاگردوں کو (جن میں سے ایک ادنیٰ فرد راقم الحروف بھی ہے) یہ افسوس ہمیشہ دامن گیر رہے گا کہ حضرت والا اپنی خداداد صلاحیتوں اور اعلیٰ ذہانت وفطانت کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ اپنے ساتھ لے گئے اور جو مزید بڑی توقعات ان کی ذاتِ گرامی سے وابستہ اور امتیازی امیدیں قائم تھیں وہ دم توڑ گئیں، یہاں تک کہ 'ایضاح البخاری' شرح صحیح البخاری جو بڑی مقبولیت حاصل کر رہی تھی اور اس کی دس جلدیں شائع بھی ہو گئی تھیں، وہ بھی مکمل نہ ہو سکی، بلکہ پوری بخاری شریف میں سے اس کی صرف ایک ہی تہائی ان دس جلدوں میں آ گئی اور دو تہائیاں رہ گئیں:

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

اللہ تعالیٰ حضرت والا کے نسبی اور روحانی فرزندانِ گرامی کو اس کی تکمیل کی توفیق عطا فرمائے۔

ظرافت وحاضر جوابی

حضرت الاستاذ ظرافت وحاضر جوابی میں بھی یکتا تھے، اس مناسبت سے ان کے تین واقعات نمونے کے طور پر قلم بند کیے جا رہے ہیں:

پہلا واقعہ: ایک دفعہ دارالعلوم کے چند اساتذۂ کرام کی مجلس میں ایک بڑے استاذ نے جو حضرت والا کے ہم عصر اور ان سے کافی حد تک بے تکلف تھے، کسی مناسبت سے بدعتیوں کے تعصب اور اہلِ حق وعلمائے دیوبند سے ان کی دشمنی کا ذکر کرتے ہوئے علمائے حق میں سے کسی عالم دین کا قصہ سنایا جن کا نام انہوں نے ذکر نہیں کیا، قصہ یہ تھا کہ: ''وہ عالم دین سفر کے دوران ایک مسجد میں نماز پڑھنے کے لیے داخل ہوئے، مسجد اہل بدعت کی تھی جس کا اندازہ اس عالم دین کو نہ ہو سکا، اتفاق سے مسجد کا امام یا محلّہ کا کوئی اور ایسا شخص جو نماز پڑھا تا موجود نہیں تھا، اس لیے لوگوں نے اس مسافر عالم کے حلیہ کو دیکھ کر ان سے نماز پڑھانے کی درخواست کی، مسافر عالم دین نے سنت کے مطابق نماز پڑھا کر سلام پھیرا اور سلام پھیرنے کے بعد بریلویوں کی طرح چیخ وپکار اور ان کی دیگر مروجہ بدعتوں کا ارتکاب نہیں کیا، جس سے نمازیوں کو اندازہ ہوا کہ یہ تو کوئی دیوبندی معلوم ہوتے ہیں، اس لیے جوتوں سے ان کی پٹائی شروع کر دی اور مسجد سے باہر نکال دیا۔''

حضرت مولانا ریاست علی صاحب کے ہم عصر استاذِ دارالعلوم مذکورہ بالا قصہ کا بقیہ حصہ سنانے جا رہے تھے کہ حضرت الاستاذ مولانا ریاست علی صاحب درمیان میں اپنے مخصوص اور لطیف انداز کے ساتھ ان سے کہنے لگے کہ: ''حضرت! معاف کیجیے! مجھے اس واقعے کا علم نہیں ہو سکا تھا، ورنہ آپ کی عیادت کے لیے ضرور حاضر ہو جاتا۔'' یہ کہنا تھا کہ پوری مجلس بیک وقت ہنستی ہوئی کشتِ زعفران بن گئی اور قصہ سنانے والے استاذ برابر یہ کہتے رہے کہ ارے! یہ میرا واقعہ نہیں تھا، کسی اور کا تھا، آپ نے خواہ مخواہ میری طرف منسوب کر دیا، لیکن مجلس والوں نے ان کی بات پر کوئی خاص توجہ نہیں دی اور حضرت مولانا ریاست علی صاحب کی ظرافت سے لطف اندوز ہوتے رہے۔

دوسرا واقعہ: ایک مرتبہ ایک بزرگ مبلغ صاحب نے دارالعلوم کے چند اساتذہ کی مجلس میں جس میں حضرت الاستاذ مولانا ریاست علی صاحب بھی

موجود تھے، اپنی ایک تقریر کا حوالہ دیتے ہوئے اس میں شرکاء کی تعداد مبالغہ آمیز حد تک زیادہ بتادی جس پر باقی حضرات تو خاموش ہوگئے، لیکن حضرت مولا نا ریاست علی صاحب اپنے مخصوص انداز کے ساتھ ان سے کہنے لگے کہ: ''حضرت! شرکاء کی تعداد کچھ کم کردیجیے!'' شرکائے مجلس چونکہ پہلے ہی ان کی مبالغہ آرائی کو محسوس کر چکے تھے، اس لیے مولانا کا مذکورہ جملہ سن کر سب بے اختیار ہنس پڑے، جس سے مبلغ صاحب کو غصہ آیا اور برہمی کے انداز میں کہنے لگے کہ: ''اس کا مطلب تو یہ ہے کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں!'' حضرت فرمانے لگے کہ: ''آپ کی شان میں یہ لفظ تو میں ہرگز استعمال نہیں کرسکتا، بس اتنا خیال ضرور ہوا کہ شاید آپ نے ضرب دے دیا ہوگا۔'' اس آخری جملہ نے مجلس کو مزید خوشگوار بنا دیا۔

تیسرا واقعہ جس زمانے میں دارالعلوم دیوبند کچھ مشکل حالات سے گزر رہا تھا، اس وقت کی بات ہے کہ چند اساتذۂ کرام دفتر تعلیمات میں ان مشکلات کے حل کے لیے دارالعلوم کی روایات کے مطابق امام محمد بن محمد جزریؒ (متوفی: ۸۳۳ھ) کی کتاب 'الحِصْنُ الحَصِین' کا ختم کررہے تھے، ختم ودعا کے بعد جناب مولانا عبدالخالق صاحب مدراسی استاذ دارالعلوم دیوبند جو آج کل نیابتِ اہتمام کی ذمہ داری بھی انجام دے رہے ہیں اور اس زمانے میں ان کا کمرہ دفتر تعلیمات کے قریب واقع تھا، ان کے کمرے سے شرکائے ختم کے لیے کچھ کھانے پینے کی چیزیں آ گئیں، جن میں سے تمام شرکاء نے کچھ نہ کچھ لے لیا، البتہ ایک بزرگ استاذ نے قبض کی شکایت کرتے ہوئے کچھ بھی نہیں لیا، جس پر حضرت مولانا ریاست علی صاحب برجستہ بولنے لگے کہ: حضرت! آپ کیوں تناول نہیں فرماتے؟ ابھی تو ہم لوگ 'الحِصْنُ الحَصِین' کی تیسری منزل میں کھانے پینے سے متعلق دعاؤں کے اندر یہ مسنون دعا پڑھ رہے تھے: ''الحمد لله الذي أطعم وسقى وسَوَّغَهُ وجعل لهُ مَخرجًا'' یعنی ''ساری تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے کھلایا اور پلایا اور اسے خوشگوار بنادیا اور اس کے لیے نکلنے کا راستہ بنایا۔'' (ابوداؤد، نسائی) حضرت الاستاذ کی اس ظرافت اور برجستہ تحقیق سے شرکائے مجلس خوب محظوظ ہوئے۔

حضرت شیخ الاسلام اور شیخ الادبؒ سے وابستگی

حضرت مولانا ریاست علی صاحبؒ کو شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ (متوفی: ۱۳۷۷ھ) اور شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی امروہویؒ (متوفی: ۱۳۷۴ھ) سے کچھ پڑھنے کا موقع تو نصیب نہ ہوسکا تھا، البتہ ان دونوں بزرگوں کی زندگی میں وہ اپنے پھوپھا حضرت مولانا سلطان الحق صاحب ناظم کتب خانہ کی نگرانی وسرپرستی میں دارالعلوم کے درجہ فارسی میں داخل ہوئے اور فراغت تک پوری تعلیم دارالعلوم کے پرنور ماحول میں حاصل کی اور حضرت مدنیؒ کے وصال کے اگلے ہی سال دورۂ حدیث سے ان کی فراغت ہوئی، اور چونکہ حضرت مولانا سلطان الحق صاحبؒ کو حضرت شیخ الاسلامؒ اور حضرت شیخ الادبؒ دونوں سے کافی گہرا تعلق تھا، اس لیے حضرت مولانا ریاست علی صاحبؒ کو بھی ان کی صحبتوں سے فائدہ اُٹھانے کا موقع نصیب ہوا اور ان کی صحبتوں کے اثرات آپ کی زندگی اور اطوار وعادات میں نمایاں طور پر محسوس ہوتے تھے۔ شیخ الاسلامؒ اور شیخ الادبؒ کے حیرت انگیز واقعات میں سے آپ وقتاً فوقتاً کچھ ایسے واقعات بیان کرتے تھے جن سے وہ خود بھی آبدیدہ ہوجاتے اور سننے والوں پر بھی رقت طاری ہوجاتی۔ احقر نے مذکورہ دونوں بزرگوں کے مختلف واقعات ان سے براہ راست سنے ہیں جن میں سے صرف ایک واقعہ بطور نمونہ سپرد قلم کیا جارہا ہے:

حضرت مدنیؒ کی غیر معمولی شفقت کا ایک واقعہ:

حضرت مولانا ریاست علی صاحبؒ نے بتایا کہ ایک مرتبہ دارالعلوم دیوبند کے مطبخ میں طلبہ اور مطبخ کے عملہ کے درمیان کسی بات پر جھگڑا ہوگیا، حضرت شیخ الاسلامؒ کو اس کا پتہ چلا تو فوراً مطبخ پہنچ گئے، شیخ الاسلام کے سامنے طلبہ اپنی صفائی اور مطبخ والے اپنی صفائی پیش کررہے تھے اور آپ دونوں جانبین کی باتیں اطمینان سے سن رہے تھے۔ اُدھر شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ کو بھی کسی نے بتایا کہ مطبخ میں جھگڑا ہورہا ہے تو وہ بھی مطبخ کی طرف روانہ ہوگئے، اور چونکہ شیخ الادبؒ کا رعب طلبہ پر بہت زیادہ تھا، اس لیے ان کو دور سے دیکھتے ہی تمام طلبہ اِدھر اُدھر چلے گئے اور میدان صاف ہوگیا۔ شیخ الادبؒ نے پہنچ کر شیخ الاسلام قدس سرہٗ سے عرض کیا کہ حضرت! آپ نے ان طلبہ کو بے حد جری کردیا ہے، آپ کی موجودگی میں خاموش رہنے کی بجائے یہ دلائل بیان کررہے تھے! اور اپنی صفائی پیش کررہے تھے! شیخ الاسلامؒ نے فرمایا کہ: جن طلبہ کی تربیت کے لیے آپ کی طرح والد موجود ہو ان کے لیے میری طرح والدہ کی بھی ضرورت ہے۔ آپ ان طلبہ کے والد ہیں اور میں ان کی والدہ ہوں۔

حضرت الاستاذ کی شفقتیں اور عنایتیں:

احقر نے حضرت الاستاذ مولانا ریاست علی بجنوریؒ سے تعلیمی سال ۱۴۰۱ھ-۱۴۰۲ھ کو سنن ابن ماجہ پڑھی ہے، جس کی سند حضرت الاستاذ سے لے کر مسند الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ تک درج کی جارہی ہے:

''فضيلة الشيخ / رياست على عن العلامة الخطيب المقرئ/محمد طيب مدير الجامعة سابقاً عن العلامة

المحدث الشیخ/ محمد أنور شاہ الکشمیری عن شیخ الھند العلامة /محمود الحسن الدیوبندی عن حجة الإسلام الشیخ/ محمد قاسم النانوتوی عن الشیخ/ عبد الغنی المجددی عن الشیخ/ محمد إسحاق الدھلوی عن الشیخ/ عبد العزیز الدھلوی عن مسند الھند الإمام/ ولی اللہ الدھلوی. رحمھم اللہ تعالیٰ۔‘‘

حضرت شاہ ولی اللہؒ سے لے کر اُمہاتِ کتبِ حدیث کے مؤلفین تک کی سند مشہور و معروف ہے۔

اگلے تعلیمی سال ۱۴۰۲ھ-۱۴۰۳ھ کو احقر نے شعبۂ افتاء (تخصص فی الفقہ) میں داخلہ لیا اور ماہِ ربیع الاول ۱۴۰۳ھ کو مدرس کی حیثیت سے اپنی مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند میں تقرر ہوا اور پڑھانا شروع کیا۔ مجھے چونکہ پڑھانے کا تجربہ نہیں تھا اور ساتھ ساتھ اُردو زبان بھی کافی کمزور تھی، ایسی صورت حال میں دارالعلوم دیوبند میں پڑھانا آسان کام نہیں تھا۔ حضرت الاستاذ مولانا ریاست علی صاحب اس وقت نائب ناظم تعلیمات اور بعد میں مستقل ناظم تعلیمات کی حیثیت سے اہم ذمہ داری انجام دے رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کو اور میرے دیگر اساتذۂ کرام کو جزائے خیر عطا فرمائے، جنہوں نے ہر ہر موقع پر میری راہنمائی اور ہمت اَفزائی فرماتے ہوئے اپنی گراں قدر نصیحتوں اور مفید مشوروں سے نوازا جن سے میری ہر علمی مشکل حل ہوئی۔

۱۴۰۷ھ کو اُن کے مشوروں سے میں نے جامعۃ الملک سعود ریاض میں داخلہ لینے اور اعداد المعلّمین کورس کرنے کا ارادہ کیا اور اس مقصد کے لیے دارالعلوم دیوبند سے فراغت کی سند نکالنے کے لیے منشی محمد عزیز صاحبؒ (متوفی: ۱۴۱۹ھ) منشی دفتر تعلیمات کے پاس درخواست جمع کرادی اور چند ہی دن کے اندر مجھے سند مل گئی۔ سند دیتے وقت منشی محمد عزیز صاحب نے بتایا کہ آپ کی سند میں تو ایک رُکاوٹ تھی، جسے حضرت ناظم صاحب تعلیمات نے آپ کے ساتھ خصوصی شفقت کا معاملہ فرماتے ہوئے خود ہی ختم کر دیا اور سند جاری کرنے کا حکم دے دیا، میں نے حیرت کے ساتھ پوچھا کہ رُکاوٹ کیا تھی؟ منشی صاحب کہنے لگے کہ: شاید آپ دورۂ حدیث کے سال تجوید کا امتحان دینا بھول گئے تھے جس کے بغیر سند جاری نہیں ہوتی! اس کی تفصیل یہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند کا یہ قانون ہے کہ ہر طالب علم کے لیے ضروری ہے کہ وہ دارالعلوم کے اساتذۂ تجوید میں سے کسی سے اپنی تجوید درست کروا کر پھر اس کا امتحان بھی دے دے، ورنہ اس کو سند نہیں ملے گی۔ البتہ تجوید کے امتحان کے لیے نہ کوئی تاریخ متعین ہوتی ہے اور نہ ہی اس کے نمبرات دیگر مضامین کے مجموعی نمبرات میں شامل ہوتے ہیں۔

احقر نے دارالعلوم کے نظام کے مطابق حضرت قاری محمد نعمان صاحب استاذِ تجوید دارالعلوم دیوبند (فرزند حضرت مولانا محمد ابراہیم بلیاویؒ) کے پاس اپنا اندراج تو کرالیا تھا اور وقتاً فوقتاً ان سے استفادہ بھی کرتا تھا، تاہم سالانہ امتحانات کے موقع پر دورۂ حدیث کی کتابوں کی تیاری میں لگ کر تجوید کا امتحان دینا بھول گیا اور چونکہ فارغ ہونے کے بعد احقر کو دارالعلوم ہی میں تدریس و امامت کی ذمہ داری انجام دینے کا موقع ملا، اس لیے کسی دوسرے مدرسے یا ادارے میں جانے اور سند نکالنے کی ضرورت پیش نہیں آئی، جس سے تجوید کا امتحان یاد آتا۔ بہرصورت! حضرت الاستاذ مولانا ریاست علی صاحب ناظم تعلیمات دارالعلوم دیوبند کے سامنے جب میری یہ رپورٹ پیش ہوئی کہ اس نے تجوید کا امتحان نہیں دیا ہے تو انہوں نے مجھے بلوائے بغیر اپنے ہاتھ سے تجوید کے پورے نمبر لگاتے ہوئے فرمایا کہ: ’’جب دارالعلوم کے اساتذہ وطلبہ سب اس کے پیچھے پانچ وقت کی نمازیں ادا کرتے ہیں، یہی اس کا امتحان اور امتحان میں کامیابی کی دلیل ہے، لہٰذا اس کی سند جاری کردی جائے۔‘‘

حضرت الاستاذ کی رحلت پر احقر کا تعزیتی خط

احقر نے حضرت الاستاذ مولانا ریاست علی صاحب بجنوریؒ کے وصال کے موقع پر مندرجہ ذیل تعزیتی خط اُن کے صاحبزادوں کے نام ارسال کیا:

’’بخدمت برادرانِ گرامی جناب مولانا محمد سفیان عرشی قاسمی، جناب مولانا محمد عدنان قاسمی، جناب مولانا محمد سعدان قاسمی اور خاندان کے دیگر افراد حفظھم اللہ ورعاھم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

حضرت الاستاذ مولانا ریاست علی صاحب بجنوری استاذِ حدیث وسابق ناظم تعلیمات دارالعلوم دیوبند رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً کی رحلت صرف آپ ہی کے لیے نہیں، بلکہ دارالعلوم دیوبند اور اس سے بلا واسطہ یا بالواسطہ منسلک بے شمار افراد اور ہم جیسے دورافتادگان سب کے لیے ایک عظیم سانحہ ہے:

زبانِ خامہ ندارد سرِّ بیانِ فراق
وگرنہ شرح دہم با تو داستانِ فراق

تاہم ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم سب کو اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی رہنا چاہیے، إنا للّٰہ وإنا إلیہ راجعون، إن للّٰہ ما أخذ ولہٗ ما أعطی وکلٌّ عندہٗ بأجل مسمّٰی۔ سانحہ اگرچہ عظیم ہے، تاہم حضرت والا قدس سرہٗ سے متعلق چند امور ایسے ہیں کہ اگر ہم ان پر غور کریں گے، امید ہے کہ ہمیں اطمینان وصبر نصیب ہوگا۔

(۱) حضرت والا نے ایک طویل عرصے تک اپنی خداداد صلاحیت، ذہانت

اور مقبولیت کو صرف مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند اور اس کی چار دیواری میں مقیم مہمانانِ رسول ؐ کی خدمت کے لیے استعمال کیا، نہ کہ ذاتی مفادات کے لیے۔

(۲) دارالعلوم میں تدریس کے ساتھ ساتھ آپ نہ چاہتے ہوئے بھی کچھ انتظامی عہدوں پر وقتاً فوقتاً فائز رہے! اس دوران ان کی زبان یا کسی بھی طرزِ عمل سے کسی استاذ یا ملازم یا طالب علم کو میرے علم کے مطابق کوئی ایسی شکایت نہیں رہی ہوگی جسے شکایتِ واقعی کہا جاسکے، اس بات کی گواہی میرے خیال میں ہر واقفِ حال شخص دے سکتا ہے۔

(۳) حضرت الاستاذ نے جہاں تین صالح صاحبزادوں اور بے شمار روحانی اولاد (جن میں سے ایک راقم الحروف بھی ہے) کی صورت میں ایک صدقۂ جاریہ اپنے پیچھے چھوڑ دیا ہے، وہاں دس جلدوں پر مشتمل 'ایضاح البخاری' کی شکل میں ایک اور صدقۂ جاریہ علمیہ طالبانِ علومِ نبوت کی خدمت میں پیش کردیا ہے، جس کا ثواب ان شاء اللہ! ان کو ملتا رہے گا، اللہ تعالیٰ اس کی تکمیل کے اسباب بھی پیدا فرمادیں۔

(۴) حضرت والا قدس سرہٗ نے اپنی مرنجاں مرنج شخصیت کے مطابق رحلت بھی ایسے وقت میں فرمائی کہ اپنی کوئی ذمہ داری ادھوری چھوڑ کر نہیں گئے، جس سے طلبۂ دارالعلوم یا اربابِ انتظام کو فوری طور پر دقت کا سامنا کرنا پڑتا، اس لیے کہ اسباق کے ساتھ ساتھ امتحانات کا مرحلہ بھی پایۂ تکمیل تک پہنچ گیا تھا۔

(۵) حضرت الاستاذ اپنی زندگی میں کسی کو تکلیف دینے کے روادار نہیں تھے، اس لیے انہوں نے رحلت کے وقت بھی نہ تو گھر والوں کو اور نہ ہی متعلقین کو کوئی تکلیف دینا گوارا کیا اور نہ ہی ہسپتالوں کے پرتکلف ماحول میں رہنے کو پسند کیا، بلکہ ایک مختصر علالت کے ساتھ رات کے اس حصہ میں ارحم الراحمین کے حضور پہنچ گئے جس میں صحیح حدیث کے مطابق وہ خود اعلان فرماتے ہیں:

''من يدعوني فأستجيب له؟ من يسألني فأعطيه؟ من يستغفرني فأغفر له؟'' (متفق علیہ)

ان تمام باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمیں قوی امید ہے کہ حضرت الاستاذ قدس اللہ سرہٗ العزیز بہت ہی خوش ہوں گے اور اپنی زبانِ حال سے ہمیں تسلی دے رہے ہوں گے کہ فکرمند رہنے کی ضرورت نہیں، بلکہ تمہارے مطمئن رہنے اور صبر کرنے سے مجھے خوشی ہوگی۔ اللّٰهم اغفر لهٗ وارفع درجاته في الجنة وارزق ذويه وأقاربهٗ ومن يتعلق به الصبر والسلوان

حضرت مہتمم صاحب، حضرت شیخ الحدیث وصدر المدرسین صاحب، دونوں نائب مہتمم حضرات اور اساتذۂ کرام کی خدمت میں بھی تعزیت پیش کرتا ہوں۔ والسلام'' □□

اے تو مجموعۂ خوبی ....

تحریر: مولانا مفتی محمد راشد صاحب اعظمی (استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند)

وہ نابغہ روزگار ہستیاں جن کی حسین یادیں صدیاں گذر جانے کے بعد بھی دلوں سے محو نہیں ہوتیں؛ بلکہ وہ دلوں میں زندہ جاوید رہتی ہیں اور یہ عالم رہتا ہے۔ ''رفتید و لے نہ از دلِ ما'' بلکہ ان کے ظاہری حجابِ ہستی کے ہٹ جانے کے بعد ان کے باطنی کمالات، خصوصیات اور امتیازات اور نکھر کر سامنے آتے ہیں۔

وہ اپنی زندگی میں حتی الوسع بے نام ونشان رہنا پسند کرتے ہیں، اپنے کو چھپائے اور مٹائے رہتے ہیں؛ لیکن ان کے کمالات کا خالق ان کے کمالات کو ظاہر کردیتا ہے "مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰہِ رَفَعَهُ اللّٰهُ" لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ ان ظاہرو باہر کمالات کا احاطہ ہر کس وناکس کے بس کا بھی نہیں ہے۔

داماں نگہ تنگ وگلِ حسن تو بسیار گلچیں بہارِ تو زداماں گلہ دارد

ہمارے محبوب ومحترم استاذ حضرت مولانا ریاست علی صاحب نوراللہ مرقدہٗ کی ذاتِ گرامی کی بالکل یہی شان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو گونا گوں خصوصیات وکمالات کا ایسا جامع بنایا تھا کہ ان بہاروں کا گل چیں اپنی تنگیِ دامن پر نادم ہوتا ہے۔ جس طرح قطرۂ نیساں آغوشِ صدف میں پرورش پاکر گوہرِ آب دار بن جاتا ہے۔ اسی طرح ممتاز اور صالح فطرت افراد جب کیمیا اثر نگاہوں کا فیض پاتے ہیں تو آفتاب وماہتاب کی طرح چمک اٹھتے ہیں۔

حضرت مولانا ریاست علی صاحب بجنوریؒ انتہائی خُردسالی میں یتیم ہوگئے۔ علی گڈھ میں والد مرحوم اللہ کو پیارے ہوگئے وہ اسی کم سنی میں اپنی والدہ محترمہ کے ساتھ اپنے بہت ہی شفیق پھوپھا حضرت مولانا سلطان الحق صاحبؒ ناظم کتب خانہ دارالعلوم دیوبند کے یہاں منتقل ہوگئے۔ دیوبند کی روح پرور فضا ان کے لیے آغوشِ صدف ثابت ہوئی، کم سنی ہی سے علمائے دیوبند کی فیض آگیں صحبتوں کا اثر ان پر نمایاں ہوتا گیا۔ آگے چل کر فخرالمحدثین حضرت مولانا فخرالدین احمد صاحبؒ کی صحبت میں مسلسل حاضری، خدمت اور ان کے علوم ومعارف کے بحرِ بیکراں سے بھرپور استفادہ نے مولانا کی شخصیت میں نمایاں شان پیدا کردی۔ استاذ کی فیض گستری اور شاگرد کی طلبِ صادق نے دونوں کو ایک دوسرے پر فدا کردیا۔ استاذ کا گھر ہی ان کی ساری تگ ودو کا مرکز بن گیا۔

نَسِيتُ كُلَّ طَرِيقٍ كُنْتُ أَعْرِفُهُ انّا طَرِيقاً يُؤَدِّينِي انی ربعكم

شاگرد کی فداکاری کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک مرتبہ مولانا حضرت الاستاذ کی خدمت میں تھے۔ اسی دوران زلزلہ کے جھٹکے محسوس ہوئے۔ دیگر حاضرین اپنے بچاؤ کے لیے محفوظ جگہوں کی طرف دوڑ پڑے۔ مولانا نے فی الفور استاذ محترم کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ اپنی حفاظت کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ انھیں فداکاریوں کا صلہ تھا کہ وہ اپنے استاذ کے علوم ومعارف کے سب سے بڑے امین اور شارح بنے۔ ایضاح البخاری کے صفحات اس کے شاہد عدل ہیں۔ استاذ محترم کے درس بخاری کو اس جامعیت اور حسن وخوبی کے ساتھ مرتب کیا کہ وہ مولانا کا بھی بہت بڑا علمی کارنامہ ثابت ہوا۔ حضرت مولانا کے بے نظیر درس کی محدثانہ شان اور فقہی نکتہ سنجیوں، علوم واسرارِ شریعت کے بحر بیکراں کو اس شان کے ساتھ سمیٹا ہے کہ خود مولانا ہی کا یہ شعر سامنے آجاتا ہے:

روشن ہے جمالِ انور سے پیمانۂ فخرالدین یہاں

مولانا نے ابتداء ہی سے دیوبند اور علمائے دیوبند کو بہت قریب سے اور بڑی عقیدت سے دیکھا تھا؛ اس لیے دارالعلوم کی نسیم جانفزا ان کی رگ رگ میں سما گئی تھی۔ وہ علمائے دیوبند کے مسلک ومزاج اور ان کی روایات کے حامل اور قدر آشنا تھے اور یہی مسلک ومزاج ان کی متاعِ گرانمایہ تھا اور اس سے ذرا سا بھی انحراف انھیں گوارہ نہ تھا، وہ اپنے شاگردوں اور طلبائے دارالعلوم کو بھی انھیں راہوں پر گامزن دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ طلبائے مدارسِ عربیہ جو دورانِ تعلیم یونیورسٹیوں اور کالجوں کے امتحانات دیتے تھے یا انگریزی اور کمپیوٹر وغیرہ سیکھتے تھے مولانا کو ان کا یہ عمل بالکل پسند نہیں تھا۔ وہ اس کو طالبانِ علوم نبوت کی شانِ بلند سے فروتر سمجھنے کے ساتھ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے اس اصول کے بھی خلاف سمجھتے کہ علومِ عربیہ کی تحصیل کے زمانے میں ان چیزوں میں انہماک علوم میں گہرائی وگیرائی پیدا ہونے سے مانع بن جاتی ہے۔ ہاں ان علوم سے پہلے یا بعد میں سیکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں: ''شرکتِ غیر نہیں چاہتی غیرت میری''

اسلام میں شورائی نظام کی بڑی اہمیت ہے، مومنین کی شان میں ارشادِ باری ہے: ''وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ'' حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشادِ الٰہی ہے: ''وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ'' مسلمانوں سے معاملات میں مشورہ کرتے رہیں۔ ہر اہم معاملہ میں مسلمانوں یا بعض مخصوص حضرات سے مشورہ کرنا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول مبارک تھا۔

بانی دارالعلوم دیوبند حجۃ الاسلام حضرت نانوتوی رحمتہ اللہ علیہ نے اسوۂ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت ساری اداؤں کے ساتھ اس خاص ادا کو دارالعلوم کے بنیادی اصولوں میں شامل فرمادیا تھا۔ انھوں نے اس پر بڑا زور دیا تھا کہ متعین اربابِ شوریٰ کے علاوہ بھی ذمہ دارانِ دارالعلوم، اہلِ نظر واردین وصادرین سے بھی مشورہ لیتے رہیں۔ دارالعلوم دیوبند ان روحانی اصولوں پر بحمد اللہ آج بھی گامزن ہے۔ بعض دفعہ اسی شورائی نظام پر کچھ اعتراضات وشبہات کا اظہار کیا گیا۔

حضرت مولاناؒ نے 'اسلام میں شوریٰ کی شرعی حیثیت' کے نام سے کتاب وسنت اور اصولِ شریعت کی روشنی میں زبردست کتاب تصنیف فرمائی اور موضوع کا

حق ادا کردیا۔ ان کے پرزور قلم اور مدلل اندازِ بیان سے شکوک واعتراضات کے سارے بادل چھٹ گئے۔ دارالعلوم دیوبند کا ترانہ جس وارفتگی اور کیف وشوق کے عالم میں لکھا، ترانوں کی دنیا میں اس کی کوئی مثال نہیں ہے، وہ ایک ادبی شہ پارہ بھی ہے۔ دارالعلوم کا حسین تعارف بھی اور اس کی ڈیڑھ سو سالہ خدمات کا بہترین اور جامع مرقع بھی ہے۔ اس ترانے کے سامنے کسی ترانے کا رنگ جما ہی نہیں۔

نہ ہوا پر نہ ہوا میرؔ کا انداز نصیب
ذوقؔ یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

مولانا کی عظمتِ کردار کے مختلف جلوؤں پر نظر ڈالیں تو جلوؤں کی کشش سے حیرت ہوتی ہے کہ بات کہاں سے شروع کی جائے۔

کائنات کی سب سے عظیم ہستی جناب سرور کونینؐ کے اخلاق وشمائل کے سلسلہ میں حضورؐ کے خادمِ خاص حضرت انسؓ فرماتے ہیں: اِنَّ رَسُولَ اللّٰہِ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کَانَ اِذَا صَافَحَ الرَّجُلَ لَمْ یَنْزِعْ یَدَہٗ مِنْ یَدِہٖ حَتّٰی یَکُوْنَ ھُوَ الَّذِيْ یَنْزِعُ یَدَہٗ وَلَا یُصْرِفُ وَجْھَہٗ عَنْ وَجْھِہٖ حَتّٰی یَکُوْنَ ھُوَ الَّذِيْ یُصْرِفُ وَجْھَہٗ عَنْ وَجْھِہٖ وَلَمْ یُرَ مُقَدِّمًا رُکْبَتَیْہِ بَیْنَ یَدَیْ جَلِیْسٍ لَہٗ. (رواہ الترمذی بحوالہ مشکوٰۃ شریف ج۲، ص ۵۲۰)

ترجمہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی سے مصافحہ فرماتے تو آپ اپنا ہاتھ نہیں کھینچتے تھے؛ جب تک کہ وہی آدمی اپنا ہاتھ نہ کھینچے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنا چہرہ نہیں پھیرتے تھے؛ جب تک کہ وہی آدمی اپنا چہرہ نہ پھیرے۔ اپنے سامنے بیٹھے ہوئے شخص کے سامنے اپنے گھٹنے نہیں پھیلاتے تھے۔ حضرت انسؓ نے ان چند جملوں میں دوسرے انسانوں کے ساتھ معاملہ کے سلسلہ میں حضورؐ کے مزاجِ مبارک کی پوری کیفیت بیان کردی ہے۔

کسی عظیم ترین ہستی کی طرف سے ہر طرح کے انسانوں کی عظمتِ نفس کی رعایت ان کی دل داری اور قدر افزائی کی اس سے بہتر کوئی مثال نہیں پیش کی جاسکتی۔ حضرت مولانا ریاست علی رحمۃ اللہ علیہ کے مزاج وطبیعت کو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس ادائے مبارک سے ہم بہت قریب پاتے ہیں۔ وہ آنے جانے والوں کی کثرت، حاجت مندوں کی بار بار اور وقت بے وقت آمد سے کبھی چیں بہ جبیں نہیں ہوتے تھے؛ ہر ایک کے ساتھ شفقت وعنایت، غایت اپنائیت کا معاملہ، پرسشِ احوال اور حاجت مندوں کی خندہ پیشانی کے ساتھ حاجت برآری ان کا مزاج تھا۔ ان کی مجلس میں ہر فرد برابر کا شریک تھا، کہہ ومہ کا کوئی امتیاز نہیں تھا۔ ہر شریکِ بزم اپنی بات کہنے کا پورا حق رکھتا تھا اور حضرت کی توجہات وعنایات کا مکمل حق دار ہوتا تھا۔ درمیان درمیان میں حضرت کی نکتہ سنجیاں مجلس کو زعفران زار بناتی رہتی تھیں۔ بہت سے وہ حضرات جن کا مولانا سے تعلق دارالعلوم دیوبند کی تدریس اور مختلف اہم ذمہ داریوں سے وابستگی سے پہلے تھا، مولانا نے آخر تک اپنے ان احباب سے تعلق اور ان سے بے تکلفی میں کوئی فرق واقع نہیں ہونے دیا، ان سے پہلے ہی جیسا اعزاز واکرام اور برتاؤ کا معاملہ رہا۔

دوپہر کا قیلولہ سنت ہونے کے ساتھ ساتھ پڑھنے پڑھانے والوں کی ایک ضرورت بھی ہے، اس کی وجہ سے دوسرے وقت میں کام کرنے کی ہمت اور بشاشت پیدا ہوتی ہے۔ عام زندگی گذارنے والوں کے نزدیک قیلولہ کی چنداں اہمیت نہیں ہے۔ بہت سے لوگ عین اس وقت حضرت مولانا کی خدمت میں آجاتے، جب مولانا صبح کے گھنٹوں کی سرگرم محنت کے بعد دوپہر میں تھوڑی دیر کے لیے لیٹ جاتے تھے۔ وہ دروازہ کھٹکھٹاتے مولانا فوراً بیدار ہوکر ان کو اندر بلا لیتے۔ ان سے بات کرتے، کسی طرح کی کبیدگی اور بے کیفی کا قطعاً کوئی اظہار نہ فرماتے، گھر کے لوگ کہتے آپ اندر مکان میں آرام فرمالیا کریں؛ تاکہ کچھ سکون حاصل ہوجائے۔ حضرت منع فرماتے اور باہری کمرے میں رہنا پسند فرماتے۔ مقصد یہی تھا کہ آنے جانے والے یا اپنی حاجتیں لانے والے پریشان نہ ہوں، اپنی راحت کو دوسروں کی راحت پر قربان کردینا انھیں بزرگوں کا حصہ تھا۔ یہ بھی درخواست کی گئی کہ ملاقات کے لیے کوئی وقت متعین فرمادیں۔ برجستہ فرمایا: کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ملنے کا کوئی وقت متعین فرمایا تھا؟

حضرتؒ کی ذہانت، فطانت، نکتہ رسی، حاضر جوابی نوادرِ روزگار میں سے تھی، بذلہ سنجی اور مزاح لطیف سے بھی اللہ نے انھیں خوب نوازا تھا، اگر ان کو جمع کیا جائے تو ''کتاب الاذکیاء'' جیسا بہترین مجموعہ مرتب ہوجائے۔

وہ لوگوں کے بہت ہمدرد، بے حد خیر خواہ تھے۔ ان کی زندگی دوسروں کی بھلائی کے لیے وقف تھی؛ مگر دوسروں کا احسان مند ہونا انھیں پسند نہیں تھا:

تمام عمر اسی احتیاط میں گذری — کہ آشیاں کسی شاخِ چمن پہ بار نہ ہو

وہ امتِ مسلمہ اور عالمِ اسلام کے سلسلہ میں دلِ دردمند رکھتے تھے، قومی اور ملی مسائل کی انھیں بہت فکر رہتی تھی۔ اس سلسلہ میں جمعیۃ علمائے ہند اور اس کے اکابر سے وہ ہمیشہ وابستہ رہے اور اس وابستگی پر انھیں فخر تھا۔ وہ طویل عرصہ تک جمعیۃ علمائے ہند کی مجلسِ عاملہ کے اہم رکن اور نائب صدر رہے؛ جب تک ہمت وتوانائی رہی اس کے اجلاس اور میٹنگوں میں اہمیت کے ساتھ شرکت فرماتے۔ اپنے اعذار کی وجہ سے اگر کسی اجلاس میں نہ شریک ہوتے تو اس اجلاس کی تمام تفصیلات جاننے کا اہتمام فرماتے، جمعیۃ کے عاملہ کے اجلاسوں میں ان کی رائے اور مشوروں کی بڑی اہمیت تھی۔ ان کی رائے ہر ایک کے لیے قابل لحاظ تھی۔ جمعیۃ کے بڑے بڑے اجلاس میں ان کی تقاریر بڑی پُرمغز اور اکابر کی روایات اور روح کے مطابق اور ہم جیسے نو واردوں کے لیے گرہ کشا ہوتی تھیں۔ تواضع اور فروتنی ان کی خاصۂ طبیعت تھی؛ لیکن سرگرانوں کے سامنے وہ سبک سر بھی نہیں تھے۔ کلمۂ حق کے اظہار میں وہ بہت جری تھے، اس سلسلہ میں کسی بڑے سے بڑے کا رُعب وجلال انھیں مرعوب نہیں کرسکتا تھا۔ زہد واستغناء میں بھی وہ اپنے اکابر واسلاف کے ہم رنگ تھے، وہ بعض دفعہ مقروض بھی رہے؛ لیکن اہلِ ثروت ودولت کی طرف نگاہ اٹھاکر بھی نہیں دیکھا۔ وہ دینی غیرت وحمیت میں بھی بے نظیر تھے۔ آخر میں اس مصرع پر اپنی بات ختم کرتا ہوں:

اے تو مجموعہ خوبی بچہ نامت خوانم ❑❑

حضرت الاستاذ مولانا ریاست علی ظفر بجنوری رحؒ کی یاد

تحریر: مولانا مفتی محمد سلمان منصورپوری (مفتی واُستاذِ حدیث جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد)

جس وقت دارالعلوم میں صد سالہ عالمی اِجلاس ہوا، اور اُس کی افتتاحی نشست میں پوری شان وشوکت کے ساتھ دارالعلوم کا ترانہ ''یہ علم وہنر کا گہوارہ، تاریخ کا وہ شہ پارہ ہے، ہر پھول یہاں ایک شعلہ ہے، ہر سرو یہاں مینارہ ہے'' پڑھا گیا، تو سننے والا ہر شخص جھوم اُٹھا، اور ہر طرف اِس ترانہ کی دھوم مچ گئی، الفاظ کی چست بندش، تاریخ کے تناظر میں معانی کی جامعیت، اَشعار کی صورت میں فکر دیوبند کی بھرپور ترجمانی اور دارالعلوم سے وابستہ بلند مرتبہ شخصیات کے پاکیزہ اور برمحل تذکرے نے اِس ترانہ کو جو قبولیت عامہ عطا کی، اس کی نظیر نہیں ملتی، ہم جیسے کتنے ہی لوگوں کے حضرت الاستاذ مولانا ریاست علی صاحبؒ سے تعارف کا ذریعہ یہی ترانہ بنا۔ وہ ہمارا بے شعوری کا زمانہ تھا، اور ہم مدرسہ اسلامیہ جامع مسجد امروہہ میں زیر تعلیم تھے، مگر اسی وقت سے اس ترانہ کے ذریعہ صاحب ترانہ سے اُنسیت دل میں پیدا ہوچکی تھی۔ پھر ۱۴۰۲ھ میں جب دارالعلوم کی چہار دیواری میں قدم رکھا تو صد سالہ کے بعد کے بلاخیز طوفان کے بعد دارالعلوم ترقی کی نئی منزلوں کی طرف گامزن تھا، تعلیم سمیت تمام شعبوں میں اصلاحات کا عمل تیزی سے جاری تھا، گویا اِس تاریخی ورثہ کی تزئین وتحسین کا مشن چل رہا تھا، اندازہ ہوا کہ اس مشن میں جن حضرات کو فعالیت کا درجہ حاصل ہے، اُن میں اور حضرات کے ساتھ حضرت مولاناؒ کا کردار بھی خاصا نمایاں تھا۔

دارالعلوم میں طلبہ کی انجمنیں اُن کی صلاحیتیں نکھارنے میں اہم کردار اَدا کرتی ہیں، اُن میں مدنی دارالمطالعہ اپنی الگ شان رکھتا ہے، دارالعلوم میں اس کی ذمہ داری جب رفیق محترم مولانا معزالدین احمد (حال ناظم امارتِ شرعیہ ہند) اور اِس ناکارہ کے سر آئی، تو اُس کے سرپرستوں میں حضرت الاستاذ بھی شامل تھے، اِس بہانے حضرت کی خدمت میں وقتاً فوقتاً حاضری ہونے لگی، حضرت والا مدنی دارالمطالعہ کی سرگرمیوں میں خوب دل چسپی لیتے اور اُس کے پروگراموں پر دل کھول کر حوصلہ افزائی فرماتے۔

ایک مرتبہ ہم لوگوں نے حضرتؒ کی صدارت میں 'ردِ مودودیت' پر دارالحدیث تحتانی میں ایک خصوصی پروگرام منعقد کیا، حضرت ازاول تا آخر شریک رہے، اور بہت زیادہ پسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ اِس ضمن میں ایک واقعہ ہم لوگ کبھی بھول نہیں سکتے، ہوا یہ کہ مدنی دارالمطالعہ کے سالانہ اختتامی اجلاس میں ایک سال کافی تاخیر ہوگئی، رجب کا مہینہ شروع ہوچکا تھا، اور طلبہ کی توجہ امتحان کی تیاریوں کی طرف ہوگئی تھی، ایسے میں اجلاس کو کامیاب بنانا اور طلبہ کی شرکت کو یقینی بنانا بڑا دشوار تھا، اِس لئے ذہن میں یہ بات آئی کہ مکالمہ کا کوئی ایسا دلچسپ پروگرام رکھا جائے جو طلبہ کی رغبت کا سبب بن سکے، چنانچہ ایسے ہی ایک مکالمہ کی تیاری کر لی گئی، اور اعلان کردیا گیا، مخدوم محترم حضرت الاستاذ مولانا سید ارشد مدنی صاحب مدظلہ (حال صدر جمعیۃ علماء ہند) اجلاس کے صدر تھے، اور حضرت الاستاذ مولانا ریاست علی صاحبؒ مہمانِ خصوصی تھے، اجلاس میں دیگر پروگراموں کے ساتھ بڑا دلچسپ مکالمہ بھی پیش ہوا، جو ''مفتی اور مستفتی'' پر مشتمل تھا، مگر مکالمہ ختم ہوتے ہی شریک طلبہ جلسہ سے اُٹھ کر چل دئے، اور دارالحدیث فوقانی آدھے سے زیادہ خالی ہوگئی، اور ایک عجیب وغریب صورتِ حال پیدا ہوگئی۔ اَناؤنسر نے اِسی دوران حضرت الاستاذ مولانا ریاست علی صاحبؒ کے نام کا اعلان کیا، حضرت مائک پر تشریف لائے، اور مختصر خطبہ کے بعد بھرپور خطابی اُسلوب میں یہ جملہ فرمایا: ''میں کیا کہوں، جن سے کہنا تھا وہ تو جاچکے'' یہ جملہ کچھ ایسے پراثر انداز میں آپ نے فرمایا کہ باہر نکلنے والے جس طالب علم کے کان میں پڑا وہ فوراً واپس لوٹ آیا، اور پھر دارالحدیث بھر گئی، اس کے بعد آپ نے اور آپ کے بعد صدر اجلاس حضرت الاستاذ مولانا سید ارشد مدنی صاحب مدظلہ نے ڈرامائی مکالموں پر سخت تنبیہ فرمائی، اور اس طرز کے مفاسد بیان فرمائے۔ اس کے بعد سے دارالمطالعہ کے پروگراموں میں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا کہ کوئی بات اکابر کے طریقہ کے خلاف نہ ہو۔

۱۴۰۹ھ سے ہمیں جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی میں خدمت کا موقع ملا؛ تاہم دیوبند آتے جاتے وقت حضرت الاستاذ سے راہ ورسم برقرار رہی، جب بھی ملاقات ہوتی نہایت مسرت کا اظہار فرماتے، اور فرماتے کہ: ''تمہیں دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے''۔ ایک مرتبہ مدرسہ شاہی کے آٹھ سالہ اجلاس دستار بندی میں آپ کو دعوت دی گئی، شاہی مسجد میں اجلاس جاری تھا، نظامت احقر کے سپرد تھی، ایک واعظ صاحب نے دورانِ بیان سیرت کا ایک واقعہ بیان کیا، جو بظاہر غیر مستند تھا۔ ایک ساتھی کے توجہ دلانے پر احقر نے اپنی حماقت میں اُن کے بیان کے بعد اس واقعہ کی برملا تردید کردی، جو بہرحال اس انداز میں مناسب نہ تھی۔ (اللہ تعالیٰ معاف فرمائیں) حضرت والا مجلس میں موجود تھے، اور اگلا بیان

آپ ہی کا تھا، آپ نے بیان کا آغاز کچھ اس طرح فرمایا کہ: ''میرے لئے اِس ماحول میں تقریر کرنا مستقل امتحان ہے، جہاں تقریر کے ساتھ لگے ہاتھوں تصحیح بھی ہورہی ہو' پھر آپ نے مشفقانہ انداز میں نصیحت کی کہ کسی بات کی تردید اور تصحیح میں بھی نرم پہلو پیشِ نظر رہنا چاہئے، کہ دوسرے کو ناگوار نہ گذرے۔ حضرت کی اس نصیحت سے احقر مارے شرم کے پانی پانی ہوگیا، اور بعد میں مذکورہ واعظ صاحب سے ندامت کے ساتھ بہت معذرت کی، اور موصوف نے بھی بڑائی کا ثبوت دیتے ہوئے دل سے معاف کردیا، اللہ تعالیٰ سب کو جزائے خیر سے نوازیں۔

آپ ندائے شاہی کے مستقل قارئین میں شامل تھے؛ بلکہ ایک عرصہ تک پابندی سے اس کا زرِ سالانہ بھی باصرار ادا فرماتے تھے۔ احقر اپنی کوئی تالیف پیش کرتا تو اس کی بھی بڑی قدر فرماتے اور اس کا مطالعہ بھی فرمایا کرتے تھے، کئی تالیفات پر آپ نے گراں قدر تقریظ بھی لکھ کر مرحمت فرمائی، جو احقر کے لئے باعثِ فخر وسعادت ہے۔

حضرت والا گوناگوں اَوصاف وخصوصیات سے متصف تھے، بالخصوص سادگی، اِنسانی ہمدردی، حلم وبردباری، وقار وخودداری میں اپنے ہم عصروں میں خاص امتیاز کے حامل تھے۔ اور تواضع تو آپ کی طبعیت میں ایسی رچ اور بس گئی تھی کہ آپ سے ملنے والا آپ سے پہلی ہی ملاقات میں آسانی محسوس کرلیتا تھا، کسی بھی معاملہ میں اپنا امتیاز آپ کو طبعًا پسند نہ تھا؛ بلکہ اس سے بڑی کوفت ہوتی تھی، قادر الکلام خطیب ہونے کے باوجود آپ وعظ وخطابت سے حتی الامکان گریز فرماتے تھے۔ کوئی شاگرد بہت ہی تقاضا کرتا تو اُس کی دل داری کی خاطر پروگرام میں شرکت منظور فرمالیتے تھے؛ لیکن گفتگو مختصر، پرمغز اور جامع فرماتے تھے، جو حشو وزوائد سے پاک ہوتی تھی۔

یہی حال آپ کے درس کا بھی تھا، آپ جو بھی کتاب پڑھاتے، اُس کا پورا حق اَدا کرنے کی کوشش فرماتے تھے، اور درس کا انداز ایسا پیارا اور دل موہ لینے والا ہوتا تھا کہ ہر طالب علم آپ سے قریب اور مانوس ہوجاتا، اور آپ کی گفتگو سے محظوظ ہوتا تھا۔

عصر کے بعد آپ کے یہاں عام مجلس لگتی تھی، جس میں ہر شخص کو شرکت کی اِجازت تھی، حاضرین کی چائے سے تواضع کی جاتی، ہلکی پھلکی ظرافت سے آپ کی مجلس زعفران زار بنی رہتی تھی، حالاتِ حاضرہ پر آپ کے برمحل اور بروقت بے تکلف تبصروں سے حاضرین خوب لطف اندوز ہوتے۔

فہم وفراست اور ذکاوت آپ کے چہرے بشرے سے عیاں تھی، اِصابت رائے اور فکر کی پختگی ایسی تھی کہ کوئی شخص کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو، وہ آپ کو مرعوب نہ کرسکتا تھا۔ مردم شناسی بھی بلا کی تھی، کسی آدمی کے صرف ظاہر کو دیکھ کر آپ کبھی متأثر نہ ہوتے، خوشامد اور چاپلوسی کا آپ کی زندگی میں گذر نہ تھا، محض مال کی وجہ سے بڑے سے بڑے سرمایہ دار کا خاص اکرام کرتے ہوئے آپ کو نہیں دیکھا گیا۔ اس کے برخلاف اہل صلاح اور اہل علم کی تعظیم اور قدردانی میں کوئی کمی نہ فرماتے؛ بلکہ اُن کی خدمت میں نیازمندانہ حاضر ہوتے تھے۔

حضرت والا کا خاص کر اپنے چھوٹوں اور شاگردوں کے ساتھ عجیب وغریب شفقت کا معاملہ تھا، اُن کی دینی خدمات اور سرگرمیوں پر دل کھول کر شاباشی دیتے اور بالکل ایک حقیقی باپ کی طرح مسرت کا اظہار فرماتے تھے۔ اکثر آپ کے شاگرد اپنی تالیفات پر آپ سے تقریظ لکھوانے کے متمنی رہتے تھے، چناں چہ آپ حوصلہ افزائی کی خاطر کسی شاگرد کی درخواست کو رد نہ فرماتے، اور نہایت نپے تلے انداز میں تقریظ تحریر فرما کر ہمت افزائی کرتے تھے۔ بلاشبہ سیکڑوں کتابوں اور رسائل میں آپ کی تقریظات شائع شدہ ہیں۔

آپ کی پیدائش ۹؍مارچ ۱۹۴۰ء کو علی گڈھ میں ہوئی، جہاں آپ کے والد منشی فراست علی صاحب بسلسلہ ملازمت مقیم تھے، آپ کا اصل وطن قصبہ ''حبیب والا'' ضلع بجنور ہے، اور سلسلہ نسب میزبانِ رسول سیدنا حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ ابھی آپ کی عمر کل پانچ سال کی تھی کہ والد ماجد کا انتقال ہوگیا، آپ نے شروع میں وطن ہی میں پرائمری اسکول میں تعلیم حاصل کی؛ لیکن والد محترم کی وفات کی وجہ سے گذر بسر کا معقول انتظام نہ تھا، اس مایوسی کے عالم میں آپ کے پھوپھا حضرت مولانا سلطان الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ سابق ناظم کتب خانہ دارالعلوم دیوبند نے ۱۹۵۱ء میں اللہ کی توفیق سے آپ کی پرورش اور تربیت کی ذمہ داری لی، اور آپ کو اپنے ساتھ دیوبند لے آئے۔ اور دیوبند میں گھر پر رکھ کر آپ کی بالکل سگی اولاد کی طرح مکمل کفالت فرمائی؛ تاآں کہ آپ نے ۱۹۵۸ء میں دارالعلوم دیوبند سے اول نمبر سے تعلیم مکمل فرمائی، بعد میں ۱۹۶۴ء میں حضرت مولانا سلطان الحق صاحبؒ نے اپنی لختِ جگر سے آپ کا نکاح بھی کردیا۔ حضرت والا؛ مولانا سلطان الحق صاحب مرحوم کے احسانات کو ہمیشہ یاد رکھتے تھے، اور اُن کی بڑی قدر فرماتے تھے۔

دارالعلوم سے فراغت کے بعد بھی آپ نے اپنے خاص اُستاذ اور مربی فخر المحدثین حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صاحب نور اللہ مرقدہٗ شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند کی مجالس اور دروس میں شرکت اور اِستفادہ کا سلسلہ جاری رکھا، اور حضرت کے درسی اِفادات کو ''اِیضاح البخاری' کے نام سے شائع کرنا شروع فرمایا، جس کی اب تک الحمدللہ ۹؍ضخیم جلدیں شائع ہوچکی ہیں اور مقبول ہیں۔ بخاری شریف کی اُردو شروحات میں اِس شرح کو ممتاز مقام حاصل ہے۔

حضرت الاستاذ نے اِس کی تکمیل کے لئے بطور معاون دارالعلوم کے جواں سال اُستاذ فاضل گرامی حضرت مولانا مفتی فہیم الدین صاحب بجنوری زیدعلمہ کو ذمہ داری سپرد کی تھی، جسے موصوف بخوبی انجام دے رہے ہیں، اور اُمید ہے کہ جلد ہی اِس شرح کی مکمل اِشاعت ہوجائے گی، اِن شاءاللہ تعالیٰ۔

دارالعلوم سے فارغ ہونے کے بعد چوں کہ معاش کا کوئی بظاہر ذریعہ نہ تھا، اِس لئے کچھ دن دہلی میں الجمعیۃ پریس اور بک ڈپو میں ملازمت کی، پھر دیوبند آ کر کتابت کو ذریعہ معاش بنایا، اور اپنے ہاتھوں سے ''ایضاح البخاری'' کے ابتدائی اجزاء اور ''تاریخ اسلام'' (نجیب آبادی) کی کتابت کر کے اُنہیں خود ہی شائع کیا، اور اس سے کسی طرح گذر بسر ہوتا رہا۔ پھر حروفِ مقطعات والی چاندی کی انگوٹھی کا کام شروع کیا، اس میں اللہ نے خوب برکت دی، اور کچھ فراوانی ہوئی، آپ نے زندگی کا بڑا حصہ محلّہ لال مسجد کے ایک تنگ مکان میں گذارا، جو ''کاشانۂ رحمت'' کہلاتا تھا؛ تاہم آپ کے حسن انتظام اور کفایت شعاری کی بدولت اخیر میں محلّہ ''خانقاہ'' میں اللہ تعالیٰ نے وسیع مکان کا انتظام فرمادیا۔ احقر سے کئی مرتبہ بڑے تأثر سے فرمایا کہ: ''بیٹا! کام کرو تمہارے لئے راستے کھلے ہوئے ہیں، ہم تو جن حالات سے گذرے ہیں اُن کی وجہ سے کتنے اِرادے دل ہی میں رہ گئے۔''

۱۹۷۲ء میں دارالعلوم میں درجہ عربی ابتدائی میں آپ کا تقرر ہوا، پھر ۱۹۷۶ء میں درجہ وسطیٰ ب میں ترقی ہوئی، ۱۹۸۲ء میں درجہ وسطیٰ الف کا گریڈ ملا، اور ۱۹۸۴ء میں درجہ علیا کے اُستاذ بنائے گئے۔ اِسی کے ساتھ مجلس تعلیمی کے نائب ناظم کے منصب پر بھی فائز ہوئے، اور ۱۹۸۵ء میں باقاعدہ ناظم مجلس تعلیمی مقرر کئے گئے۔ آپ کے دورِ نظامت میں تعلیمات کے شعبہ میں کافی سدھار ہوا، بالخصوص امتحانات کا صاف شفاف نظام قائم کیا گیا جو اَب تک جاری ہے۔ اِسی دوران آپ نے دو سال تک ماہنامہ ''دارالعلوم'' کی اِدارت کی ذمہ داری بھی نبھائی، اور بعد میں ''شیخ الہند اکیڈمی'' کے نگراں کے عہدہ پر بھی فائز رہے۔ آپ نے ''شوریٰ کی شرعی حیثیت'' کے نام سے ایک مدلل تالیف بھی فرمائی، جو اپنے موضوع پر ایک معتبر کتاب سمجھی جاتی ہے۔ اجتماعی معاملات میں آپ ہمیشہ اِدارے کا مفاد مقدم رکھ کر مشورے دیا کرتے تھے، چناں چہ حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب بجنوری نور اللہ مرقدہٗ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند اہم معاملات میں آپ سے مشورے لیتے تھے، اور آپ کی رائے کو وقعت دیتے تھے۔ موجودہ انتظامیہ کے ساتھ بھی آپ کا رویہ ناصحانہ اور خیرخواہانہ تھا۔

اکابر واَسلاف کے فکر پر آپ مضبوطی سے قائم تھے، اور جادۂ حق سے معمولی انحراف بھی آپ کو پسند نہ تھا۔ جمعیۃ علماء ہند اور اُس کی فکر سے آپ بچپن سے وابستہ رہے، تا آں کہ عمر کے آخری دس سالوں میں جمعیۃ علماء ہند کے مرکزی نائب صدر کے منصب پر بھی فائز رہے۔ اور جب ''مباحث فقہیہ جمعیۃ علماء ہند'' کے فقہی اجتماعات کا سلسلہ شروع ہوا، تو جب تک صحت رہی اُن کی نظامت کی ذمہ داری آپ کے سپرد ہوتی تھی، جسے آپ پوری کامیابی سے انجام دیتے تھے۔

آپ کو شعر واَدب کا صاف ستھرا ذوق بھی عطا ہوا تھا، جو آپ کی فطری ذہانت وذکاوت سے ہم آہنگ تھا، جس کو اُستاذ الشعراء حضرت مولانا محمد عثمان کاشف الہاشمیؒ کی رفاقت نے دو آتشہ بنادیا تھا؛ چنانچہ آپ کے قلم سے ایسے بلند پایہ پاکیزہ اَشعار صادر ہوئے جو زباں زدِ خاص وعام ہوگئے۔ بالخصوص دارالعلوم دیوبند اور جمعیۃ علماء ہند کا بہترین ترانہ آپ کی یادگار ہے، اُن کے علاوہ آپ نے جو نعتیں یا غزلیں لکھیں، اُن سے آپ کی فکری لطافت اور حسن ذوق کا بآسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یہ سب تخلیقات ''نغمۂ سحر'' کے نام سے ۱۴۴ صفحات پر مشتمل کتاب میں شائع کردی گئی ہیں۔ باذوق حضرات اُس سے محظوظ ہوسکتے ہیں۔

زندگی میں عام طور پر آپ صحت مند رہے، گٹھے ہوئے بدن اور چست اور جفاکش طبیعت کے مالک تھے؛ لیکن اخیر میں شوگر کے عارضہ نے جسم کو گھلا کر رکھ دیا تھا، اِسی کے ساتھ قلب اور گردے بھی شدید متأثر ہوگئے تھے۔ بالآخر یہی بیماری جان لیوا ثابت ہوئی، اور آپ نے ۲۳؍شعبان المعظم ۱۴۳۸ھ مطابق ۲۰؍مئی ۲۰۱۷ء بروز ہفتہ بوقت سحر داعیٔ اجل کو لبیک کہا، اور اپنی حسنات لے کر بارگاہِ رب العالمین میں حاضر ہوگئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اُسی دن بعد نماز ظہر امیر الہند حضرت مولانا قاری سید محمد عثمان صاحب منصور پوری مدظلہ صدر جمعیۃ علماء ہند واُستاذ حدیث دارالعلوم دیوبند کی اقتداء میں احاطۂ مولسری میں آپ کی نماز جنازہ پڑھی گئی، اور مزار قاسمی میں نم آنکھوں سے آپ کو سپرد خاک کیا گیا، عوام وخوص کا بڑا مجمع شریک جنازہ تھا، اور زبانِ حال سے یہ کہہ رہا تھا کہ:

جان کر من جملۂ خاصانِ مے خانہ تجھے
مدتوں رویا گے جام و پیمانہ تجھے

آپ کے تین صاحب زادے ہیں: مولانا محمد سفیان صاحب قاسمی، مولانا قاری محمد عدنان صاحب قاسمی مقیم حال دارالعلوم شکاگو امریکہ اور مولانا مفتی محمد سعدان صاحب قاسمی اُستاذ معہد اَنور دیوبند۔ ماشاء اللہ تینوں دارالعلوم سے فارغ ہیں، اور خدمات میں لگے ہوئے ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت الاستاذ کے درجات بلند فرمائیں، متعلقین کو صبر جمیل سے نوازیں، اور ہم سب کو آپ کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین۔ ◻◻

حضرت ظفرؔ بجنوریؒ کا حضرت کاشف الہاشمیؒ سے کسبِ فیض

تحریر: مولانا خورشید حسن قاسمی (دارالعلوم دیوبند)

تاریخ، ادب، صحافت، انشاء پردازی، مقالہ نویسی اور مضمون نگاری کے حوالہ سے مولانا ریاست علی ظفرؔ صاحب بجنوریؒ کی گرامی قدر شخصیت دراصل حضرتؒ کے خصوصی مربی و مشفق استاذ جناب مولانا کاشف الہاشمی راجوپوریؒ کی مرہونِ منت ہے۔

مولانا کاشف الہاشمی صاحبؒ دیوبند کے قریب واقع خاندانِ سادات وشیوخ کی قدیم بستی راجوپور کے باشندہ تھے اور جن کا شمار علمائے دین نامور دانشورانِ دیوبند میں ہوتا ہے اور جنھوں نے تقریباً نصف صدی قبل رواں دواں سلیس اردو میں سب سے پہلے لغات اور فرہنگ کے اعتبار سے آسان تفسیر قرآن کریم 'تفسیر ہدایت القرآن' کا آغاز فرمایا جو اردو تفاسیر میں ایک یادگار شاہکار کی حیثیت سے متعارف ہے، اس کے علاوہ اردو میں 'تفسیر طحطاوی' و 'تفسیر مظہری' کے ابتدائی حصے کا ترجمہ فرمایا جو عرصہ سے بازار میں نایاب ہے، البتہ کتب خانہ دارالعلوم دیوبند میں اس کے نسخے موجود ہیں۔ مولانا بجنوریؒ کا خصوصی تعلق زمانۂ طالب علمی میں خاص طور سے مولانا کاشف الہاشمیؒ سے رہا۔ آخرالذکر مولانا موصوفؒ راقم الحروف کے تاریخی آبائی مکان 'نبیہ منزل' میں طویل عرصہ قیام پذیر رہے، 'نبیہ منزل' یہ دیوبند کا وہی تاریخی قدیم مکان ہے، جو ایک دانش گاہ کی حیثیت رکھتا ہے، جس میں دورِ طالب علمی میں منتسب شیخ الہندؒ مولانا نبیہ حسن صاحبؒ سابق استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند کے تلامذہ کی حیثیت سے حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ، حضرت مولانا مفتی محمود صاحب گنگوہیؒ، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ، مولانا مرغوب الرحمٰن صاحبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند جیسی برگزیدہ شخصیات کی آمدورفت رہتی تھی، تقسیم ہند کے موقع پر دانشورانِ دیوبند کا یہی مکان 'دارالمشورۃ' بھی رہا۔ مذکورہ تاریخی ''دانش گاہ'' اور راقم الحروف کے جدی مکان میں دارالعلوم کے جیدالاستعداد طلباء کا ہمہ وقت اجتماع رہتا تھا، جو کہ حضرت مولانا کاشف الہاشمی صاحبؒ سے خوب خوب کسب فیض فرماتے، ان طلباء میں حضرت مولانا ریاست علی ظفرؔ بجنوریؒ، مولانا عبدالجلیل راغبی آسامی، مولانا ابوالحسن صاحبؒ بارہ بنکوی، مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی وعالی جناب مولانا حسیب صدیقی و برادرِ مکرم حضرت مولانا شاہد حسن صاحب قاسمیؒ سابق استاذ دارالعلوم دیوبند جیسے ممتاز فضلائے دارالعلوم تھے۔

آبائی مکان ہونے کی وجہ سے بچپن میں راقم الحروف کی مذکورہ مکان میں ہروقت حاضری رہتی اور مذکورہ حضرات سے خانگی نوعیت کا رابطہ رہتا اور ان حضرات کے والد ماجد حضرت مولانا سیّد حسن صاحبؒ سابق استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند کے مخصوص تلامذہ ہونے کی وجہ سے مذکورہ حضرات کی والد صاحبؒ کی خدمت میں بکثرت حاضری رہتی اور زیادہ تر مولانا ریاست علی صاحبؒ کا خارجی وقت احقر کے اسی جدی مکان میں گزرتا، اس کے علاوہ حضرتؒ کے برادرِ نسبتی جناب مولانا برہان الحق صاحب قاسمی بجنوری استاذ شعبۂ فارسی دارالعلوم دیوبند کی راقم الحروف کے ساتھ تقریباً پانچ سال تک شعبۂ فارسی میں رفاقت رہی اور جماعتِ فارسی کی اہم کتب میں ساتھ رہا، اس وجہ سے بھی راقم کی حضرتؒ کے سسرالی مکان میں مستقل آمدورفت رہتی جس کی وجہ سے حضرتؒ سے احقر کا تعلق گھر جیسا رہا؛ چنانچہ اسی مشفقانہ تعلق کا مولانا اکثر اظہار بھی فرماتے، ماضی میں راقم الحروف کو خانگی مسائل میں مختلف النوع دشوارکن مراحل کا سامنا ہوا اور مختلف حوادث سے گزرنا ہوا، جن کی تفصیل کا اس جگہ موقع نہیں۔

بہرحال ذاتی وخانگی نوعیت کے پیچیدہ مسائل میں مولاناؒ کی احقر کے ساتھ پوری معاونت رہی اور حضرتؒ نے ہر موقع پر راقم الحروف کی سرپرستی فرمائی، آج حضرتؒ کی شفقتیں رہ رہ کر یاد آرہی ہیں، حضرت مولاناؒ درحقیقت اپنی ذات میں ایک انجمن تھے، ایک تاریخ اور ایک تحریک تھے، حضرتؒ کی وفات حسرت آیات سے آج اہل خانہ کے علاوہ تمام ہی علمی حلقے آہ بلب اوراشکبار ہیں، نصف صدی سے زائد مولانا کی تدریسی، تصنیفی، ادبی، صحافتی وسماجی خدمات کا تقاضہ ہے کہ حضرتؒ کی شخصیت پر سمینار منعقد کیے جائیں اور حضرتؒ کے سانحہ وفات کی وجہ سے جو علمی خدمات درمیان میں رہ گئی ہیں اُن کی تکمیل کا انتظام قائم کیا جائے اور یہ کام حضرتؒ کے صاحبزادگان کے ذریعے زیادہ آسان ہیں اور احقر کی ذاتی رائے میں اس یادگار وتاریخی اقدام کے لیے حضرتؒ کے صاحبزدگان وحضرتؒ کے علوم کے حقیقی امین اور ترجمان عزیزم مفتی محمد سعدان قاسمی سلّمہٗ سے بظاہر زیادہ توقع کی جاسکتی ہے۔

خداوندقدوس حضرتؒ کی مغفرت فرمائیں اور اعلیٰ علیین میں مقام عطا فرمائے، آمین!□□

حضرت الاستاذ مولانا ریاست علی بجنوریؒ: کچھ یادیں کچھ باتیں

تحریر: مولانا اشرف عباس قاسمی (استاذ دار العلوم دیو بند)

استاذ عالی مرتبت، مخدوم گرامی قدر حضرت مولانا ریاست علی صاحب بجنوری کی وفات کی خبر جان کاہ نے قلب وجگر کو ہلا کر رکھ دیا، آج کئی دن کے بعد جب یہ سطریں لکھنے بیٹھا ہوں تو عجب بے کیفی اور اضطرابی کیفیت ہے۔

آ! عندلیب مل کے کریں آہ وزاریاں
تو ہائے گل پکار میں پکاروں ہائے دل

اور یہ تنہا میرا حال نہیں؛ بلکہ حضرت والا کی جدائی سے دار العلوم کے طلبہ واساتذہ بالخصوص آپ کے فیض یافتہ اساتذہ میں اب تک صفِ ماتم بچھی ہوئی ہے، شاید ہی کسی اور حادثے پر قلب اتنا مضطرب ہوا ہو اور آنکھوں نے اتنے آنسو بہائے ہوں:

آج لیکن ہمنوا! سارا چمن ماتم میں ہے
شمعِ روشن بجھ گئی بزمِ سخن ماتم میں ہے

گزشتہ چار سالوں سے کبھی کبھار کے ناغے کے استثنا کے ساتھ مسلسل آپ کے فیضِ صحبت اور خاص شفقت وعنایت سے مستفید ہونے کا موقع ملتا رہا؛ لیکن میری محرومی رہی کہ اس حادثہ فاجعہ کے وقت میں دیو بند سے دور اپنے وطن دربھنگہ میں تھا اور تجہیز وتکفین میں شرکت کی حسرت بھی دل ہی میں رہ گئی، اگرچہ صرف ایک روز قبل حضرت والا نے فون کر کے خیریت دریافت کی اور ایک علمی کام کے سلسلے میں شدید تقاضا فرمایا اور میری طرف سے تکمیل کی یقین دہانی پر دعاؤں سے نوازتے ہوئے فون رکھ دیا؛ لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ سلام، سلام وداع ورخصت بھی ہے:

اب صبا سے کون پوچھے گا سکوت گل کا راز
کون سمجھے گا چمن میں نالۂ بلبل کا راز

بے مثال شخصیت:

حضرت مولانا ریاست علی صاحبؒ مردم گر اور عہد ساز شخص تھے، دار العلوم دیو بند کے مسلک ومشرب، اس کی پاکیزہ روایات کے امین اور سلف کے بہترین جانشین تھے، علم وتقویٰ کے اعلیٰ مقام پر فائز ہونے کے باوجود طبیعت کی سادگی، کمالِ تواضع، خردنوازی اور جذبۂ شفقت نے آپ کو غیر معمولی ہر دل عزیزی اور محبوبیت ومرجعیت عطا کر دی تھی۔ آپ نسلوں کے مربی ومعلم رہے، دار العلوم کی محبت آپ کے رگ وریشے میں پیوست تھی، اس کی خیر خواہی اور بقاء واستحکام کے لیے اپنی ساری صلاحیتیں اور توانائیاں وقف کر رکھی تھیں، اس طرح آپ کی وفات دار العلوم کی زریں روایات کی انتہا اور ایک عہد کا خاتمہ ہے۔

ذاتی تعلق:

۱۹۹۹ء میں دار العلوم دورۂ حدیث شریف کے لیے حاضری ہوئی تو حدیث شریف کی مشہور کتاب سنن ابن ماجہ کی تدریس آپ سے متعلق تھی، اس طرح پہلی بار بلا واسطہ آپ سے کسبِ فیض کی سعادت حاصل ہوئی، صاف اور شستہ زبان استعمال کرتے، سوالات کے جوابات اس خوش اسلوبی کے ساتھ دیتے کہ طلبہ آپ کی حاضر جوابی اور غزارت علم سے خوب مستفید ہوتے؛ لیکن اس کے ساتھ ہی نہایت صاف گوئی سے کام لیتے اور ادعاءِ علم جیسے امراض سے کوسوں دور تھے، دورۂ حدیث کے بعد ادب کے سال 'البلاغۃ الواضحۃ' پڑھنے کا موقع ملا تو ہمارے لیے علمی عملی کمالات کے مزید دریچے کھلتے اور تفہیم وتدریس کے نئے اسالیب سامنے آتے گئے، طلبہ کے ساتھ برتاؤ نہایت مشفقانہ تھا، آپ کی طرف سے درسگاہ کے تمام طلبہ کے لیے آم اور دودھ کی پر تکلف ضیافت اب تک یاد ہے۔

۲۰۰۱ء میں افتاء کی تکمیل کے بعد میں تدریس کے لیے جامعہ مظہر سعادت ہانسوٹ منتقل ہو گیا اور دس گیارہ سال وہاں مقیم رہا اس دوران ایک دو بار ہی خدمت میں حاضری ہو سکی۔

۲۰۱۳ء میں جب فضل ایزدی سے دار العلوم دیو بند میں تدریس کے لیے انتخاب ہوا تو میں نے حاضرِ خدمت ہو کر حضرت والا کو اطلاع دی تو حضرت بے انتہا مسرور ہوئے اور دعاؤں سے نوازا اور دوسرے دن جب عصر بعد کی مجلس میں حاضر ہوا تو حضرت نے وہاں موجود اساتذۂ دار العلوم سے خود ہی وقیع الفاظ میں تعارف کروا کر مجھ جیسے دہقاں کی کلاہ کو آفتاب تک پہنچا دیا۔

اس دوران حضرت مولاناؒ - کشاف اصطلاحات الفنون - کی تصحیح ومراجعت کا کام جناب مولانا عارف جمیل کی معاونت سے انجام دے رہے تھے، بنیادی کام ہو چکا تھا، نظر ثانی کا کام چل رہا تھا کہ مولانا عارف جمیل صاحب پر شوریٰ کی جانب سے مجلّہ ''الداعی'' کی مساعدتِ تحریر کی اضافی ذمہ داری ڈال دی گئی جس کی بنا پر کشاف کے لیے وقت نکالنا دشوار ہو گیا اور ان کی جگہ حضرت نے مشورہ کر کے مجھے اس کام میں شامل فرما لیا۔ میں اسے فضلِ خداوندی اور توفیقِ ایزدی خیال کرتا ہوں کہ اس طرح مجھے اس عبقری شخصیت سے قریب

رہنے اوران کے تجربات وفیوضِ علمیہ سے مستفید ہونے کا موقع ملا، روزانہ چھٹے گھنٹے میں حضرت کی رہائش گاہ پر حاضری ہوتی، میں کشاف کے کمپوز شدہ صفحات پڑھتا اور حضرت کیسنجر کے قلمی نسخے سے جو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے آپ نے حاصل کر رکھا تھا، ضروری تصحیح فرماتے اس کام کو اس قدر انہماک اور دلچسپی سے انجام دیتے کہ اس دوران کسی کا آجانا آپ کو گراں گزرتا تھا۔ اس طرح تصحیح کا یہ مرحلہ بھی بحمد اللہ پورا ہوگیا۔

تصحیح کے اس کام میں ہلکی پھلکی معاونت کی وجہ سے حضرت کی خاص عنایت وشفقت حاصل رہی، کئی موقعوں پر خاص مہمانوں کے ساتھ اپنے دسترخوان پر مجھ ناچیز کو بھی مدعو فرمایا، مجھے اگر کہیں جانا ہوتا تو دارالعلوم سے اجازت لینے کے ساتھ حضرت کو بھی اطلاع کرنی ہوتی ورنہ فوراً حضرت کا فون آجاتا، حضرت زیادہ جلسے جلوس اور تقریری پروگراموں کے قائل نہیں تھے؛ اس لیے اس نسبت سے غیر حاضری کی اطلاع بہت محتاط انداز میں دیا کرتا تھا، حضرت میرے شفیق باپ کی طرح تھے اور وہ اپنی عظمتوں کے باوجود میرے نجی معاملات اور ذاتی امور میں بھی دلچسپی لیتے تھے۔

اسی سال محلّہ خانقاہ میں زمین کی خریداری کے سلسلے میں اچانک نوٹ بندی کی وجہ سے میں سخت پریشانی میں مبتلا ہوگیا، جن سے مجھے اپنا حق وصول کرکے ادائیگی کرنی تھی انھوں نے پوری طرح ہاتھ کھڑے کردیے، میں نے اپنی پریشانی ذکر کرکے دعا کی درخواست کی تو آپ بے چین ہوگئے۔ تسلی کے کلمات کہے، اسی ضمن میں اپنی زمین کی خریداری کی تفصیل، نامساعد حالات اور حضرت مولانا انظر شاہ کشمیریؒ کی معاونت کا خاص تذکرہ فرمایا جس سے مجھے کافی حوصلہ ملا، اس کے بعد روزانہ زمین کی بابت معلوم کرکے فرماتے کہ میں دعا کررہا ہوں اور مجھے بڑی فکر ہے، پھر ایک موقع پر آپ نے براہِ راست دارالعلوم کے ایک مؤقر ومعمر استاذ حضرت مولانا جمال صاحب سے میرے مسئلے میں گفتگو کی۔ حضرت مولانا جمال صاحب نے حضرت کی سفارش اور ضمانت پر بطور قرض ایک خطیر رقم عنایت فرمائی، جس سے مسئلہ الحمدللہ حل ہوگیا۔ اس کے ایک دو ہفتہ بعد فرمانے لگے اب میرے پاس بھی کچھ رقم آگئی ہے، اگر اس سے تمہارا کام بن سکے تو اس کو ضرور کام میں لے آؤ۔ آپ کی یہ شفقتیں اور عنایتیں زندگی بھر یاد آئیں گی اور رُلائیں گی، بلکہ آپ غایت شفقت کی وجہ سے بسا اوقات اہم امور میں مشورہ طلب فرماتے اور اصرار کے بعد مجھے کچھ نہ کچھ عرض کرنا ہی پڑتا۔ کئی بار آپ نے ایسے حقائق بھی ذکر کیے ہیں جن کا میرے خیال میں راز رہنا ہی زیادہ مناسب ہے۔

دو اہم علمی کارنامے:

یوں تو آپ نے اپنے پیچھے ہزاروں شاگرد، کئی تصنیفات اور شعری مجموعے چھوڑے ہیں تاہم دو علمی کارنامے ایسے ہیں جن پر علمی دنیا ہمیشہ آپ کو خراجِ تحسین پیش کرتی رہے گی۔

(۱) 'ایضاح البخاری' بخاری شریف کی اُردو زبان میں علمی نکات و دلائل اور حدیثی ابحاث سے مزین مبسوط اور مفصل شرح ہے جس کو اکابر علماء ومحدثین بالخصوص فخر المحدثین حضرت مولانا سیّد فخر الدین صاحب مرادآبادیؒ سابق شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند کے افادات کی روشنی میں آپ نے مرتب فرمادیا ہے۔ اہلِ علم جنھوں نے اس شرح کا مطالعہ کیا ہے انھیں معلوم ہے کہ اس میں حدیثی وفقہی ابحاث کس قدر تحقیق کے ساتھ آئی ہیں۔ گزشتہ کئی سالوں سے آپ نے اپنی علالت اور ضعف کی وجہ سے دارالعلوم کے مؤقر استاذ جناب مولانا فہیم الدین صاحب بجنوری کو شریکِ کار بنالیا تھا، جن کی سرگرم مساعدت اور تندہی سے کام نے خاصی رفتار پکڑلی تھی اور اب تک دس جلدیں منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ مولانا فہیم الدین صاحب سے توقع ہے کہ حضرت کے متعین کردہ خطوط پر اسی فکر اور سرگرمی کے ساتھ اس علمی کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچائیں گے۔

(۲) کشاف کی تصحیح: 'کشاف اصطلاحات الفنون' مختلف علوم وفنون کی اصطلاحات کو جامع قاضی محمد اعلیٰ تھانوی کی شہرۂ آفاق کتاب ہے جسے ہندوستان کے قابلِ فخر کارناموں میں شمار کیا جاتا رہا ہے۔ حضرت والد کو اس کتاب سے شروع ہی سے خاص لگاؤ رہا ہے اور اس کی ترتیب وطباعت کو عصرِ حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے سلسلے میں کوشاں رہے۔ چنانچہ مولانا عارف جمیل صاحب کی معاونت سے اس عظیم کام کا بیڑا اُٹھایا اور بڑی دقت نظری سے کتاب کی تصحیح، طباعت کی درآئی غلطیوں سے اسے پاک کرنے اور فارسی عبارت کی صحیح عربی ترجمانی میں تقریباً چھ سال صرف کیے اور اب یہ کتاب طباعت کے لیے تیار ہے۔ وفات سے چند ایام قبل آپ نے اس کا مقدمہ بھی تحریر کردیا تھا۔ میرے پاس حضرت کا آخری فون بھی اسی کتاب کے سلسلے میں تھا، بہرحال اس کا بڑا قلق ہے کہ یہ عظیم علمی سرمایہ آپ کی حیات میں طبع نہ ہوسکا لیکن امید ہے کہ جلد ہی اس کی اشاعت عمل میں آجائے گی۔

اوصاف واخلاق:

حضرت مولانا کی طبیعت میں استغناء وبے نیازی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی حتی الوسع اپنا کام خود کرنے کے عادی تھے، علالت اور پیرانہ سالی کے باوجود کسی طالب علم سے آپ نے جسمانی خدمت نہیں لی۔ ظاہری شان وشوکت کے مظاہر بھی پسند نہیں تھے، اگر کوئی آگے بڑھ کر آپ کے جوتے

اٹھالیتا تو اسے فوراً آپ کی خفگی کا سامنا کرنا پڑتا، کوئی اگر مبالغہ آمیز گفتگو کرتا تو خاص انداز میں فرماتے اس میں سے کچھ فیصد کم کرلو، دارالعلوم میں عام حالات میں آپ نے صرف وہ عہدے قبول کیے جن کا تعلق تعلیم وتربیت سے بھی تھا، ورنہ عموماً عہدوں سے دور رہنے کی کوشش کرتے، ایک موقع پر جب مہتمم حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب نے جو آپ پر بہت اعتماد فرماتے اور آپ کو بھی ان سے تعلقِ خاطر تھا، نیابتِ اہتمام کا عہدہ قبول کرنے کے لیے کئی بار اصرار کیا؛ بلکہ ایک بار شوریٰ نے تجویز بھی پاس کردی؛ مگر آپ نے صاف کہہ دیا کہ کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں دارالعلوم سے ہی مستعفی ہو جاؤں؟ حضرت کا یہ رنگ دیکھ کر مہتمم صاحب نے دوبارہ اس طرح پیش کش نہیں کی، عموماً طلبہ اور عام لوگوں کی طرف سے ہدایا قبول کرنے میں بڑا تأمل فرماتے، حتی الامکان اسفار سے گریز کرتے حتیٰ کہ بیرون ملک کے اسفار سے بھی بچنے کی کوشش کرتے ایک مرتبہ چند خاص اہلِ تعلق نے باصرار برطانیہ آنے کی دعوت دی اور سارے انتظامات مکمل کرلیے، آپ مقررہ تاریخ پر دہلی ایئرپورٹ پہنچ گئے، ایمیگریشن کا مرحلہ آیا تو وہاں تعینات افسر نے آپ سے معمول کا سوال کیا، برطانیہ کیوں جارہے ہیں؟ آپ نے نہایت سادگی اور کمالِ بے نیازی سے جواب دیا میں تو جانا ہی نہیں چاہتا دوستوں کے اصرار کی وجہ سے مجبور ہوں، آپ کوئی ایسا نشان لگادیجیے کہ مجھے بھی ایک عذر ہاتھ لگ جائے اور میں جانے سے بچ جاؤں، آپ کے اس جواب پر افسر دنگ رہ گیا اور چہرہ بغور دیکھنے کے بعد کہا، نہیں مولانا! میں آپ کو واپس نہیں کروں گا، آپ کو برطانیہ ضرور جانا ہے۔

آپ بڑے مہمان نواز تھے، دسترخوان بڑا وسیع تھا، لیکن ایک موقع پر جب کہ پڑوسی ملک کے ایک خاص شاگرد دارالعلوم آئے تو آپ نے ان کے لیے عشائیہ کا اہتمام فرمایا اور مجھ ناچیز کو بھی حاضر ہونے کا حکم دیا۔ میں عشاء کے بعد وقت پر حاضر ہوگیا، لیکن مہمان صاحب کو آنے میں تاخیر ہورہی تھی تو اس پر حضرت فرمانے لگے، کھلانے پلانے کو میرا جی چاہتا ہے اور میں نے جوانی میں خوب ضیافتوں کا اہتمام کیا ہے، لیکن اب اس طرح کے تلخ تجربات کی وجہ سے دعوت نہیں کرتا، عموماً مہمان تاخیر کردیتے ہیں اور اوقات کا ضیاع ہو جاتا ہے۔

طبیعت میں احتیاط غالب تھی، حقوق العباد کی ادائیگی کا بڑا اہتمام فرماتے اور بسا اوقات اپنا بڑے سے بڑا حق محض اللہ کے لیے چھوڑ دیا کرتے تھے، آبائی وطن حبیب والا کی زمین کے ایک بڑے حصہ پر بعض لوگ ناجائز قبضہ کرکے بس گئے ہیں، ایک بار ایک بڑے وکیل صاحب نے آکر پیش کش کی کہ آپ مجھ سے پچاس لاکھ روپے لے لیں اور اس کا اختیار مجھے سونپ دیں ان کو بے دخل کر کے قبضہ کرنا میری ذمہ داری ہے، آپ نے یہ خطیر رقم قبول کرنے سے صاف منع کردیا اور وہاں موجود اپنے فرزندانِ گرامی سے فرمایا: اس فکر میں مت پڑو اور آخرت کے لیے رہنے دو۔

دارالعلوم کے طلبہ واساتذہ اور کارکنان میں آپ کو غیر معمولی عظمت حاصل تھی، آپ بھی تعلقات کو خوب نبھاتے تھے، جائز سفارش سے انکار نہیں کرتے تھے، متعلقین کے دکھ درد میں شریک ہوتے، بیماری کی اطلاع پاکر خود فون کرتے اور خیریت دریافت فرماتے تھے، کبار اساتذہ دارالعلوم اور حضرت مہتمم صاحب دامت برکاتہم آپ کا بڑا لحاظ واکرام فرماتے اور اہم امور میں آپ سے مشورہ لیتے تھے۔

آپ کو اولاد واحفاد کا بھی بڑا خیال تھا، سال گزشتہ جب فرزند گرامی مولانا سعدان جامی علیل ہوئے اور آپریشن ناکام ہونے کی وجہ سے ان کی تکلیف بڑھی تو آپ کے اضطراب اور بے چینی میں بھی کافی اضافہ ہوگیا، اگرچہ اپنے آپ کو پرسکون ظاہر کرتے، پوتے مفتی عبداللہ حمدان کے بعد آپ کو دوسرے پوتے عزیزم شیبان سلّمہٗ کی بڑی فکر تھی، عزیزم کی تعلیم کے سلسلہ میں دسیوں بار متعلقہ اساتذہ سے ملاقات کی یا فون پر بات چیت کی۔

مجلس سونی ہوگئی:

عصر کے بعد کی آپ کی مجلس ہمیشہ یاد رہے گی، مؤقر اساتذہ کا جمگھٹا ہوتا، علم ومعرفت کی باتیں ہوتیں اور لطائف وظرائف کی خوش گپیاں بھی، ملکی حالات زیر بحث آتے اور دارالعلوم کے احوال وکوائف بھی، اس بزم مئے سے ہر رند کو بادہ کشی کی اجازت تھی، مجلس کو آپ گل گلزار بنانا بھی جانتے تھے اور اگر نامناسب رخ پر جانے لگتے تو اس کو سنبھالنا بھی، آپ ہی میرِ مجلس ہوتے شرکاءِ مجلس کی چائے سے ضیافت فرماتے، کوئی تھوڑی دیر کے لیے آتا تو تازہ دم ہوکر واپس جاتا؛ لیکن آہ اب وہ مجلس سونی ہوگئی، علمِ بصیرت کی بساط الٹ گئی، وہ کیا گئے قیامت ڈھاگئے، اب روحانی ملاقات صرف مزارِ قاسمی میں ہوسکے گی، اب وہ ہماری مجلس سے اٹھ کر اس جہاں کو آباد کرچکے، جہاں ہمارے گرم گرم آنسو بھی انھیں واپس نہیں لاسکتے اور وہ وہاں کے اعزاز واکرام اور لامتناہی انعامات کو چھوڑ کر واپس بھی کیوں آنا چاہیں گے:

محفل سے اٹھ کے رونقِ محفل کہاں گئی
کھل اے زبانِ شمع کہ ماجرا کھلے

خدائے رحمٰن سدا آپ کو اپنی بے پایاں رحمتوں کی آغوش میں رکھیں۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورُستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

□□

حضرت الاستاذ مولانا ریاست علی بجنوریؒ: اوصافِ حمیدہ کی روشنی میں

تحریر: مولانا توحید عالم قاسمی بجنوری (مدرس دارالعلوم، دیوبند)

راقم درج ذیل سطور میں ایک منفرد، مثالی، مردم شناس، رجال ساز، صلاح وتقویٰ سے آراستہ، صلح وآشتی سے مزین، اکابر واسلاف کے محبّ وعاشق، خُردوں اور چھوٹوں کی محسن ومربی، علم وفکر کی آفتاب وماہتاب اور باتوفیق وباعمل شخصیت کے چند نقوش کو قارئین کی خدمت میں پیش کرنے کی کوشش اور سعی کر رہا ہے؛ جبکہ راقم اپنی بے علمی، کوتاہ فہمی، بے بصیرتی اور زبان وادب سے نادانی کا کھلے لفظوں میں معترف ہے۔

حضرت الاستاذ حضرت اقدس مولانا ریاست علی صاحب بجنوری قدس سرہ استاذِ حدیث وسابق ناظمِ تعلیمات دارالعلوم دیوبند ونائب صدر جمعیۃ علماء ہند کی ذاتِ ستودہ صفات کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے اور ایسی ذات کا تعارف کرانا سورج کو چراغ دکھانے جیسا ہے؛ البتہ اُذْکُرُوا مَحَاسِنَ مَوْتَاکُمْ پر عمل کرتے ہوئے حضرت والا کی وہ خوبیاں، صفات وکمالات سپردِ قرطاس کیے جارہے ہیں، جن سے راقم سطور جیسے ان گنت افراد متاثر ہوتے رہے ہیں اور اوصاف وخصائل کے تذکرے سے مقصود حضرت والا قدس سرہٗ کے شاگردوں اور عقیدت مندوں کے لیے اپنی اپنی پرسنل اور نجی زندگیوں میں حضرت والا قدس سرہ کی ذات کو آئیڈیل اور نمونہ بنا کر مذکورہ صفات کو اپنا کر حضرت والا قدس سرہ کو حقیقی سکون اور راحت بہم پہنچانا ہے؛ کیوں کہ یہ بھی مَنْ سَنَّ سُنَّةً حَسَنَةً فَلَهُ اَجْرُهَا وَاَجْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا میں آئے گا۔

حضرت الاستاذ حضرت اقدس مولانا ریاست علی بجنوری قدس سرہ کو ذات باری تعالیٰ نے بے شمار اور ان گنت خوبیوں اور کمالات سے نوازا تھا؛ لیکن راقم درج ذیل سطور میں ان تمام کمالات واوصاف میں سے چیدہ چیدہ خوبیوں کو ہی رقم کر رہا ہے، یہ نہ سمجھا جائے کہ راقم نے جن اوصاف کو بیان کیا ہے، حضرت قدس سرہ صرف انھیں خوبیوں سے آراستہ تھے یا راقم صرف انھیں اوصاف سے متاثر ہوا ہے؛ بلکہ مضمون کی طوالت اور وقت کی قلت کے پیش نظر چند پر اکتفا کیا گیا ہے۔

(۱) ذکاوت وذہانت: جو حضرات حضرت قدس سرہ سے واقف ہیں وہ راقم کی تصدیق وتصویب فرمائیں گے کہ حضرت والا کا سب سے مشہور ومعروف وصف اُن کی ذکاوت وذہانت ہے، مبدأ فیاض سے حضرت والا کو ایسا غضب کا ذہن ملا تھا اور آپ اس قدر ذہین وفطین تھے کہ ہم خُردوں کو تعجب ہوتا تھا، ایک مرتبہ خود راقم سطور کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: بیٹے توحید اب ظاہری اعضا کی طرح ذہن ودماغ بھی کمزور ہوگیا، راقم نے عرض کیا کہ کیوں حضرت؟ ایسا تو نہیں ہے، آپ کو اب بھی اتنی پرانی باتیں اور علمی استحضار ہے کہ ہم جوانوں کو نہیں ہے۔ فرمایا: نہیں بیٹے، پہلے جب کسی کو دور سے آتا دیکھتا تھا تو میں سمجھ جایا کرتا تھا کہ یہ کیا کہے گا میں اس کے بولنے سے پہلے جواب تیار رکھتا تھا پھر اپنے جواب پر اس کی طرف سے ہونے والے سوال کو سمجھ جایا کرتا تھا کہ پھر میرے جواب پر یہ سوال کرے گا تو اس کا بھی جواب سوچ لیا کرتا تھا؛ لیکن اب صرف اتنا تو سمجھ جاتا ہوں کہ آنے والا کیا کہے گا اس کا جواب بھی ذہن میں آجاتا ہے؛ لیکن میرے جواب پر اس کا ردعمل اور پھر اس کا جواب ذہن میں نہیں آتا۔ یہ اور اس انداز کے بے شمار دلائل ہیں حضرت والا کی ذکاوت وذہانت کے۔

(۲) اصابتِ رائے: حضرت والا قدس سرہٗ کے دنیائے فانی سے تشریف لے جانے کے بعد مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند اور جمعیۃ علماء ہند دونوں اداروں کے وہ ذمہ داران جن کو حضرت والا کے ساتھ مجالس میں شرکت کے مواقع نصیب ہوئے ہیں تقریباً سبھی کو اس بات کا اعتراف کرتے سنا گیا کہ حضرت والا کا سب سے اہم وصف رائے کی پختگی تھی، ہر دونوں اداروں میں نہایت اہم اور نازک مواقع آئے ان موقعوں پر حضرت والا کی رائے اتنی مضبوط اور پختہ ہوتی تھی کہ شاید دوسرا کوئی آپ کی نظیر نہ ہو۔ عصر کے بعد کی مجالس میں راقم اور دیگر شرکاء بھی بارہا دیکھتے تھے کہ کسی انتظامی مسئلے میں یا سیاسی اعتبار سے جو رائے اور نظریہ حضرت والا قدس سرہ اپناتے تھے وہ نہایت پختگی کے ساتھ اپناتے تھے، مجلس میں بعض لوگ اختلاف رائے کرتے تھے؛ لیکن بعد میں حضرت والا کی رائے کی تصویب کرنا پڑتی تھی؛ کیوں کہ بعد میں وہی بات اور رائے درست ہوتی نظر آتی تھی جو حضرت والا فرماتے تھے۔

(۳) تصلب فی المذہب: حضرت والا قدس سرہ چوں کہ ائمہ اربعہ میں سے حضرت امام ابوحنیفہ قدس سرہ کے مقلد تھے اور دورِ حاضر میں مختلف نظریات کے درمیان قاسمی دیوبندی تھے، وہ صرف نسلی نہیں؛ بلکہ بڑی بصیرت کے ساتھ تھے؛ اسی لیے جب یہ کہا جاتا کہ فلاں مسئلے میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کا موقف کمزور ہے اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا موقف مضبوط ہے تو حضرت بے چین ہوجاتے اور نصوص کی ایسی توجیہ اور تشریح فرماتے کہ امام صاحب کے موقف کے سامنے دوسرا موقف نہایت ہلکا محسوس ہونے لگتا، حضرت والا کا سبق غور سے سننے والے طلبہ اس کی تائید وتصویب فرمائیں گے

اورایضاح البخاری میں تقریباً ہر باب میں اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔
کسی نے نقل کیا کہ فلاں مشہور محدث حنفیت کو مرجوح اور شافعیت کو راجح قرار دیتے ہیں تو برجستہ فرمایا کہ ایسا لگتا ہے اُن کا اصولِ فقہ کمزور ہے۔ خود فرمایا کرتے تھے کہ میں فخر المحدثین حضرت مولانا فخر الدین صاحب نور اللہ مرقدہ کے پاس اصول الشاشی یا نورالانوار لے کر حاضر ہوا تو حضرت فخر المحدثین نور اللہ مرقدہ نے دلالت النص، عبارۃ النص اور اشارۃ النص والی بحث اس انداز سے سمجھا دی کہ پورا اصول فقہ آسان ہوگیا۔ اسی طرح دیوبندی نظریے میں بھی آپ جیسا پختہ رائے اور مضبوط راقم نے چند ہی کو دیکھا ہے۔ راقم سطور نے جب چند سال قبل ''مسلک اہل سنت والجماعت یعنی علمائے دیوبند کے عقائد ونظریات'' نامی کتاب ترتیب دی تو اس وقت دارالعلوم دیوبند کے اکابر اساتذہ کرام سے مراجعت کی بہت زیادہ ضرورت پیش آئی، اس وقت حضرت والا قدس سرہ کو دیوبندیت میں جتنا پختہ اور مضبوط پایا۔ اکابر اساتذۂ کرام میں بعض ہی کو ایسا پایا۔

(۴) **عدمِ مرعوبیت:** حضرت والا کو راقم نے کبھی کسی سے مرعوب ہوتے نہیں دیکھا؛ بلکہ بڑی مضبوطی کے ساتھ پہاڑ کی طرح جم کر گفتگو فرماتے تھے، اس کی ایک مثال راقم کے سامنے یہ ہے کہ ایک مرتبہ ایک عرب عالم (غالباً شامی تھے) مجلس میں حاضر ہوے وہ دیگر اکابر اساتذۂ کرام سے مل کر آئے تھے، ان سے گفتگو چل رہی تھی وہ دورانِ گفتگو کہتے انا قاسمی، انا دیوبندی، اس پر سبھی حاضرین محظوظ ہوئے اس کے بعد وہ شکایت کے انداز میں بولے آپ حضرات نے اکابر کی تصنیفات کو عربی میں منتقل نہیں کیا یہ آپ سے شکایت ہے۔ سبھی حاضرین، بڑے چھوٹے منھ لٹکا کر بیٹھ گئے؛ لیکن حضرت والا نے برجستہ فرمایا یہ کام آپ کیجیے، اردو سیکھیے اور ہماری کتابوں کو عربی میں منتقل کیجیے، اس پر وہ خاموش ہوگئے۔

(۵) **احساسِ ذمہ داری:** حضرت والا قدس سرہ میں ایک بہت بڑی خوبی احساس ذمہ داری والی تھی کہ اس میں آپ دوسروں سے ممتاز نظر آتے ہیں۔ اربابِ انتظام نے جو ذمہ داری حضرت والا کے سپرد فرمادی اس کو پوری امانت ودیانت کے ساتھ انجام دیتے تھے، حتی کہ آخری سانس تک اپنے تینوں فرزندوں کو گھریلو ذمے داری سے بالکل آزاد کررکھا تھا، تمام تر گھریلو ذمے داری خود اپنے ذمے لے رکھی تھی؛ یہاں تک کہ تمام صاحب زادگان، پوتے وغیرہ اپنے مصارف کے لیے حضرت والا ہی کے سامنے ہاتھ پھیلاتے تھے۔ منجھلے بیٹے جو امریکہ میں ہیں، وہ بھی دیوبند آنے کے بعد اپنی ضروریات کے لیے حضرت والا سے خرچ لیتے تھے؛ جبکہ عام طور پر جب بچے شادی شدہ ہو جاتے ہیں تو سبھی اپنے آپ کو ذمے داری سے الگ تھلگ کر لیتے ہیں؛ لیکن حضرت والا کا انداز ہی نرالا تھا۔

(۶) **ضیافت ومیزبانی:** ضیافت اور مہمان نوازی بھی آپ کا ایسا وصف ہے جو آپ کے اندر امتیازی شان کے ساتھ موجود تھا، عام طور پر لوگ اپنی جیب دیکھ کر مہمان نوازی کا فریضہ انجام دیا کرتے ہیں؛ لیکن ہمارے حضرت والا قدس سرہ قرض لے کر ضیافت فرمایا کرتے تھے، بعض مہمانوں کو اس کا احساس کسی طرح ہوگیا تو انھوں نے اپنے متعلقین کو بھی بتایا۔ آپ قدس سرہ اپنی اکثر زندگی میں مقروض رہتے تھے، اب چند سالوں سے کچھ فراوانی ہوئی تھی؛ لیکن ضیافت میں کبھی پیچھے نہیں رہے اور عصر بعد کی مجالس میں ہی چائے کا صرفہ کوئی چھوٹا موٹا صرفہ نہیں تھا جو پھوپاجان حضرت مولانا سلطان الحق صاحب قدس سرہ ناظمِ کتب خانہ دارالعلوم دیوبند سے وراثت میں ملا تھا، اس کو پوری زندگی اپنا کر چلے گئے۔

دارالعلوم دیوبند اور جمعیۃ علماء ہند دونوں اداروں کے وہ ذمہ داران جن کو حضرت والا کے ساتھ مجالس میں شرکت کے مواقع نصیب ہوئے ہیں تقریباً سبھی کو اس بات کا اعتراف کرتے سنا گیا کہ حضرت والا کا سب سے اہم وصف رائے کی پختگی تھی، ہر دونوں اداروں میں نہایت اہم اور نازک مواقع آئے ان موقعوں پر حضرت والا کی رائے اتنی مضبوط اور پختہ ہوتی تھی کہ شاید دوسرا کوئی آپ کی نظیر نہ ہو۔

(۷) **حیا و پاک دامنی:** حضرت الاستاذ قدس سرہ کی ذات والا صفات نہایت باحیا ثابت ہوئی ہے، حضرت والا کی مجلس لالہ زار اور قہقہوں سے پرضرور ہوا کرتی تھی؛ لیکن ایسا ممکن نہیں تھا کہ کوئی جملہ اور فقرہ بے حیائی کا زبان پر آجائے، اسی طرح حضرت والا کی مؤقر تحریر و ترتیب دادہ اور بخاری شریف کی اردو شروحات میں نہایت وقیع اور بلند پایہ شرح ایضاح البخاری میں کسی حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریح کے ضمن میں کوئی بات ایسی آجائے جو مہذب لوگوں کی زبان پر نہیں آتی یا وہ شائستگی کے خلاف سمجھی جاتی ہو وہ حضرت والا کی تحریر میں آجائے یہ بالکل ناممکن تھا، ایضاح البخاری کی ترتیب میں شریک کار رفیق محترم جناب مولانا مفتی فہیم الدین صاحب زید مجدہ استاذ دارالعلوم دیوبند خود بیان فرماتے ہیں کہ بعض مرتبہ میری عبارت میں کوئی لفظ کھلا ہوا آجاتا ہے تو حضرت والا فوراً قلم زد فرمادیتے اور فرماتے کہ ان باتوں کو پردے کے پیچھے ہی رہنے دو۔

(۸) **زہد وقناعت:** جیسا کہ اوپر کی سطور میں بھی آچکا ہے کہ حضرت والا قدس سرہ کی زندگی کا اکثر وبیشتر حصہ غربت ونا داری اور عسرت وتنگ دستی کی

حالت میں گذرا ہے؛ لیکن اس کے باوجود حضرت والا قدس سرہ نے نہایت زہد اور قناعت کے ساتھ زندگی بسر فرمائی ہے۔ آپ قدس سرہ کی طبیعت میں حرصِ مال اور طمع ولالچ کا تو مطلب ہی نہیں تھا، ایک مرتبہ خود فرمایا کہ میں کسی جگہ سفر پر تھا ایک صاحب نے گھر پر دعوت کھلائی اور رخصتی کے وقت کچھ رقم ہدیۃً عطا فرمائی، میں نے پوچھا کہ بھائی یہ کیا ہے؟ میز بان کہنے لگے کہ یہ ہمارے یہاں کا رواج ہے کہ مہمان کو کچھ ہدیہ دیا جاتا ہے، حضرت والا گھر واپس آ گئے چند سالوں کے بعد وہ صاحب دیوبند تشریف لائے تو آپ قدس سرہ نے ان کی دعوت فرمائی اور جب وہ کھانے سے فارغ ہوگئے تو آپ نے لفافے میں کچھ رقم ہدیے کے طور پر عنایت فرمائی، وہ صاحب کہنے لگے حضرت یہ کیا ہے؟ حضرت نے فرمایا: یہ وہی رواج ہے جو آپ نے میرے ساتھ فرمایا تھا۔

(۹) انسانی غم خواری وہمدردی: حضرت والا کی نہایت قدیم عادت اور پرانی صفت غم خواری وہمدردی تھی، آپ عُسرت بھری زندگی گذارتے ضرور تھے؛ لیکن اللہ تعالیٰ کے غریب بندوں کا بہت زیادہ خیال رکھتے تھے، اسی لیے بہت پہلے سے متعدد لوگوں کو سالانہ وظیفہ عطا کرتے تھے اور اس سے بڑھ کر کچھ لوگوں کو ماہانہ وظیفہ بھی دیا کرتے تھے، ہم اہلِ مجلس خود دیکھا کرتے تھے کہ ہر ماہ ابتدائی ایام میں لوگ آ کر بیٹھ جایا کرتے تھے اور ان کو کہنے کی نوبت بھی نہ آتی تھی کہ حضرت قدس سرہ مقررہ رقم خود عطا فرماتے یا کسی عزیز بیٹے، پوتے کے ہاتھوں بھیج دیتے تھے۔ اسی طرح وہ اساتذۂ دارالعلوم جو آپ سے گھریلو حالات میں مشورہ وغیرہ کرتے تھے، ان کی ضرورت کے وقت قرض وغیرہ سے مدد فرمایا کرتے تھے۔

(۱۰) زندہ دلی وملنساری: حضرت الاستاذ قدس سرہ کی وہ عادت اور خوبی جو سبھی کو سب سے زیادہ رُلا رہی ہے وہ آپ کی زندہ دلی ہے، آپ قدس سرہ نہایت ہی مشکل حالات میں بھی مُسکرانے کا ہُنر جانتے تھے، یہی وجہ تھی کہ دارالعلوم دیوبند میں کبھی بھی ماحول گرم ہو جاتا ہے اور ہر حساس شخص کے چہرے پر اس کا تاثر نمایاں نظر آتا ہے؛ لیکن حضرت والا سب سے زیادہ واقف اور مادر علمی کے وقار پر جان نثار؛ لیکن عام حضرات کے سامنے ایسے پیش آتے جیسے حضرت والا حالات سے بے خبر ہیں، جب بات چھڑتی تو اولاً ایسا لگتا جیسے کچھ معلوم نہیں، بعد میں پتہ چلتا کہ حضرت والا تو معاملہ کی گہرائی وگیرائی تک پہنچے ہوئے ہیں۔ اسی زندہ دلی کا اثر تھا کہ آپ سب سے زیادہ ملنسار باور کیے جاتے تھے۔ اساتذۂ مدارس اور باشندگانِ دیوبند کی نظروں میں شاید ہی آپ قدس سرہ سے زیادہ کوئی ملنسار ہو۔ ☐☐

ریاستِ علم وادب اور پیکر خلقِ عظیم

تحریر: مولانا اشتیاق احمد قاسمی (استاذ دارالعلوم دیوبند)

اولین نصیحت:

غالباً ۱۹۹۵ء کی بات ہے، جب دارالعلوم دیوبند میں ناچیز کا داخلہ ہوا، داخلہ کی کارروائیوں کی تکمیل کے بعد افتتاحی اجلاس دارالحدیث تحتانی میں ہوا، اس میں بہت سے اکابر اساتذہ تشریف لائے، اُن میں حضرت الاستاذ مولانا ریاست علی صاحب ظفرؔ بجنوریؒ بھی تھے، آپ نے نہایت مختصر نصیحت فرمائی، سب سے اہم بات اوقات کی حفاظت کی تلقین تھی، آپ نے فرمایا:

''طلبۂ عزیز! آپ اپنے اوقات ضائع نہ کریں، وقت اللہ تعالیٰ کی امانت ہے، اسے ضائع کرنا اپنی عمر کو ضائع کرنا ہے، مصروفیات بہت ہوتی ہیں، اگر ان کے لیے اوقات کو مرتب نہ کیا جائے، تو کوئی کام منضبط انداز میں مکمل نہیں ہو پاتا؛ اس لیے آپ اپنے لیے ایک نظام الاوقات بنا لیجیے! اس میں ہر کام کا وقت لکھ لیجیے اور کوشش کیجیے کہ اس کے خلاف نہ ہونے پائے تو ان شاء اللہ آپ کے علم میں ترقی ہوگی اور کم وقت میں آپ زیادہ کام کر لے جائیں گے۔''

حضرت کی تقریر سن کر میں نے یہ عزم کرلیا کہ نظام الاوقات ضرور بناؤں گا اور اس کے خلاف نہیں کروں گا؛ چنانچہ میں نے شب وروز کے لیے ایک نظام الاوقات بنایا اور اس کو اپنی نشست گاہ کے قریب دیوار پر چپکا دیا اور دعا کی کہ یا اللہ! مجھے اس کی پابندی کی توفیق عطا فرما! الحمدللہ! اس کی پابندی پورے سال اس انداز سے ہوئی کہ مجھے دارالحدیث، کمرہ اور مطبخ کے علاوہ دارالعلوم کو دیکھنے کا موقع ہی نہیں ملا اور الحمدللہ! سالانہ امتحان میں تیسری پوزیشن سے کامیابی حاصل ہوئی، افتاء اور تدریب افتاء میں بھی اس کی پابندی کی، پھر معین مدرسی کے زمانے میں اس پر اور بھی سخت ہوگیا، اس کی برکت سے بہت سی کتابوں کے بالاستیعاب مطالعے کا موقع نصیب ہوا۔ اپنی کمیوں، کوتاہیوں کے دور کرنے کا موقع ملا، میں فارسی اور عربی زبان میں بہت کمزور تھا، مقالہ نویسی اور مضمون نگاری سے نابلد تھا، تصنیف وتالیف کے اصول وضوابط سے بے خبر تھا، ان ساری کمیوں کو دور کرنے کا موقع محض حضرت الاستاذ کے چند جملوں کی برکت سے نصیب ہوا، اللہ تعالیٰ حضرت کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائیں!

ابن ماجہ کا سبق:

جب اسباق شروع ہوئے تو ظہر بعد حضرت درس گاہ تشریف لائے اور ابن ماجہ کا سبق شروع فرمایا، پہلے ہی سبق میں حضرت کے سادے اور پُر مغز اندازِ بیان سے دل متأثر ہوا، سب سے زیادہ متأثر کن حضرت کی زبان تھی، سادگی میں ادبی لطافت سے بڑا حظ ملتا تھا، آپ کوئی جملہ شروع کرتے اور ایسا لفظ استعمال کرتے کہ اندازہ ہوتا کہ اس لفظ کو بدل کر ہی جملہ درست ہوگا؛ مگر ایسا ہرگز نہ ہوتا اس کے لیے نئی تعبیر لاتے اور جملہ بہت خوب صورت ہو کر پورا ہوتا۔

اندازِ بیان کبھی بھی مرعوب مرعوب کن نہیں ہوتا، طلبہ سے رعب ختم کرنے کے لیے کبھی کہتے، میں نے یہ مسئلہ بہشتی زیور میں دیکھا ہے، میری علمی سطح ایسی کہاں کہ میں عربی کتابیں دیکھ سکھوں، میں نے اردو کتاب ہی دیکھ لی ہے۔ کبھی فرماتے کہ یہ مسئلہ مولانا نعمت اللہ صاحب سے پوچھ کر آیا ہوں۔ میں تم کو وہی بتا رہا ہوں، تم لوگ تحقیق کر لینا۔ اس اندازِ بیان سے عام طالب علم کو کبھی محسوس نہیں ہوتا کہ وہ عظیم ترین محقق، بلیغ متکلم اور صاحبِ طرز ادیب ہیں۔

حضرت کے افادات کو مولانا اسعد قاسم سنبھلی مدظلہٗ العالی نے 'مصباح الزجاجۃ' کے نام سے کتابی شکل دی ہے، اس سے قارئین حضرت کے درس کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ ابن ماجہ کے شروع میں عقائد اور کلام کی بحثیں بھی ہیں، بعض مباحث معرکۃ الآراء ہیں، مگر حضرت الاستاذ کے اندازِ بیان نے مضامین کو عرش سے فرش پر لا کر ہر کس وناکس کے لیے قابلِ فہم بنا دیا تھا۔

ادبی لطافت:

زبان وادب میں حضرت الاستاذ کا امتیاز کسی اور میں دیکھنے کو نصیب نہیں ہوا، کلام کی سطح کس طرح بلند اور کس طرح پست ہوتی ہے؟ یہ چیزیں آپ کے لیے کھلونے کی طرح تھیں اور نظم ونثر دونوں میں یکساں تھیں۔

نظم اور شعر میں حضرت کے مقام کا اندازہ کرنے کے لیے 'نغمۂ سحر' کافی ہے۔ نظم کلام کے موزوں کرنے کا نام ہے اور شعر میں احساسِ لطیف ہوتا ہے؛ اس لیے ہر نظم کو شعر نہیں کہا جا سکتا ہے، آپ شعر کو کبھی کبھی اتنا بلند کر دیتے تھے کہ عام قارئین کی سطح سے تو اونچا ہو ہی جاتا تھا بعض اوقات خواص کے لیے بھی سمجھنا دشوار ہوتا، ایسے اشعار کے سلسلے میں کبھی خود کہتے کہ اس میں ابہام زیادہ ہوگیا ہے، اس کو کچھ واضح کرنا چاہیے۔

کلیاتِ کاشفؔ کی ترتیب کے دوران اس کا خوب مشاہدہ ہوا، خصوصاً 'رباعیات' میں آپ کے جواہر پاروں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔

اس طرح کی عبقری استعداد کے باوجود شعرگوئی سے کنارہ کش رہتے، اس کو اپنے لیے قابلِ فخر نہ سمجھتے تھے، اپنے کلام محفوظ رکھنے کا بھی کوئی اہتمام نہ فرماتے، بہت سے قصیدے، نظمیں اور رخصت نامے جہاں اور جس کے لیے لکھے وہیں چھوڑ دیے، میں نے ایک بار عرض کیا کہ آپ کے اشعار محفوظ ہیں یا نہیں؟ فرمایا: نہیں، میں نے کہا: کیوں محفوظ نہیں رکھتے؟ تو فرمایا: میرے کلام کا انتخاب 'نغمۂ سحر' میں چھپ گیا ہے، اس کے علاوہ جو کلام ہے اس کی سطح اتنی اونچی معلوم نہیں ہوتی کہ اس کو محفوظ رکھوں اور طباعت کے لیے سوچوں، یہ تو حضرت کی متواضعانہ بات تھی؛ مگر ناچیز کو بعض غیر مطبوعہ نظمیں اور قصیدے ملے ہیں، جو نہایت پاکیزہ اور بلند ہیں۔

نثری ادب میں بھی حضرت کا مقام کافی بلند تھا، عام بول چال میں نہایت سہل؛ بلکہ سہلِ ممتنع بولتے اور لکھتے تھے؛ لیکن جب کبھی کسی ادبی کتاب، کسی شاعر کے کلام پر کچھ لکھنا ہوتا تو زبان نہایت شگفتہ اور ادبی ہوجاتی تھی۔ قارئین مثال کے لیے 'کلیاتِ کاشف' اور 'نغمۂ سحر' میں اس کے نمونے دیکھ سکتے ہیں، اسی طرح 'واردات' کا مقدمہ بھی نہایت بالیدگی اور بلندی کے لیے ہوئے ہیں۔ یہ جناب مولانا عبدالجلیل راغبی آسامی رحمۃ اللہ علیہ کے کلام کا مجموعہ ہے۔ موصوف حضرت کاشف الہاشمیؒ کے خوشہ چینوں میں شمار ہوتے ہیں اور حضرت الاستاذ کے بے تکلف دوستوں میں بھی۔ بعض الفاظ کی تذکیر و تانیث سے متعلق حضرت سے گفتگو ہوئی تو آپ نے اپنے ذوق سے اجتہادی رہنمائی فرمائی۔ مثلاً لفظ 'نشاط' ہے، اس کو اہلِ لغت نے مؤنث لکھا ہے، مگر حضرت نے کہا نہیں اسے مذکر لکھو۔ اسی طرح 'کلیات' کو ادباء مذکر استعمال کرتے ہیں اور دوسرے حضرات مؤنث، حضرت نے مؤنث استعمال کو ترجیح دی وغیرہ۔

غزلیہ شاعری سے دلچسپی

حضرت الاستاذ سے ایک بار سوال کیا کہ آپ کو کس صنف کی شاعری سے طبعی مناسبت ہے؟ تو آپ نے فرمایا: ''غزلیہ شاعری'' سے میں طبعی مناسبت پاتا ہوں، میں نے تجزیہ کیا تو اندازہ ہوا کہ نظم اور قصیدہ میں بھی مضمون غزلیہ باندھتے ہیں، اس سے کلام اونچا ہوجاتا ہے؛ بلکہ نعتوں میں بھی آپ کی تعبیرات غزل کا لطف دیتی ہیں۔

خواب میں حضورؐ کی زیارت پر نعت شریف:

جب میں ایم فل کے مقالے کے لیے حضرت کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ کررہا تھا، اس موقع سے 'نغمۂ سحر' لے کر خدمت میں حاضر ہوا، اس کے بہت سے اشعار میری سمجھ سے بالا تھے، حضرت نے اُن سب کو سمجھایا، بعض اشعار کے سیاق وسباق، پس منظر اور شانِ ورود کو بھی واضح فرمایا، تب اچھی طرح باتیں سمجھ میں آئیں۔ 'نغمۂ سحر' میں ایک نعت شریف ہے، اس کا پہلا شعر ہی بڑا پُر کیف ہے؛ مگر عام روش سے بالکل الگ:

فَنا ہوا تو ملی منزلِ سلام مجھے
کمالِ بادہ کشی ہے شکستِ جام مجھے

میں نے حضرت سے اس کا مطلب پوچھا تو حضرت نے فرمایا: اس کا شانِ ورود یہ ہے کہ مجھے خواب میں حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی، میں نے دیکھا کہ ''روضۂ اقدس کے پاس ہوں اور وہاں سے مجھے سلام کی آواز آرہی ہے۔''

میں نے اس خواب کو بھائی کاشفؔ سے بیان کیا، انھوں نے مبارک باد دی اور مجھے کہا کہ ایک ''نعت'' کہو؛ تاکہ خواب محفوظ ہوجائے تو میں نے پہلا مصرع کہا، جس کا مطلب ہے کہ جب میں نے اپنی ساری خواہشوں کو سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے تابع کرکے، اپنے کو فنا کردیا تو مجھے یہ منزل نصیب ہوئی کہ میں روضۂ اقدس کے پاس ہوں اور مجھے وہاں سے سلام آرہا ہے۔

حضرت الاستاذ نے فرمایا کہ دوسرا مصرع بھائی کاشفؔ کا ہے، جس کا مطلب یہ ہے: مے نوشی کا کمال یہ ہے کہ میخانے کی ساری شراب پی لی جائے، جام و پیمانہ اور ساغر و مینا کو ضرورت نہ ہونے کی وجہ سے توڑ دیا جائے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت وسیرت اور اُسوۂ حسنہ کو مکمل طور پر اپنا کر، محبتِ نبوی میں بالکل وارفتگی کی کیفیت پیدا ہوجائے یہی کمال ہے اور اتباع کا اوجِ ثریا بھی۔ خواب کو ذہن میں رکھ کر نعت کے چند اشعار پڑھیے:

عنایتوں کا یہ عالم کہ زندگی ہمہ کیف
اب اور جو بھی ملے رحمتِ تمام مجھے

رحمتِ تمام سے حضورؐ مراد ہیں اور اس سے پہلے حرفِ ندا 'اے' محذوف ہے:

نمودِ صبح سعادت، نجوم در آغوش
ملا ہے مہر سعادت سے یہ پیام مجھے
چلا ہوں سوئے حرم اور کہکشاں بردوش
فریبِ زیست نے رکھا تھا زیرِ دام مجھے
زمانہ آنکھ سے دیکھے گا محشرِ جذبات
کبھی حضور نے بخشا جو اذنِ عام مجھے
ظفرؔ نہ پوچھ، قیامت ہے وہ نظر جس نے
سکھادیا ہے تمنّا کا احترام مجھے

(ص ۴۴)

حضرت الاستاذ کو اپنے مجموعۂ شاعری 'نغمۂ سحر' پر ایوارڈ بھی ملا تھا؛ مگر

حضرت نے اس کو کبھی ظاہر نہیں فرمایا، جب میں ''ایم فل'' کا مقالہ لکھ رہا تھا، اس وقت میں نے پوچھنے کے لیے کچھ سوالات مرتب کیے تھے، آپ نے بس ان ہی سوالوں کے جواب دیے، ان کے علاوہ اپنی ذات سے متعلق کچھ نہ بتایا، بعد میں معلوم ہوا کہ اردو اکیڈمی لکھنؤ نے آپ کی ادبی اور شعری خدمات پر ایوارڈ بھی دیا تھا۔اور ادیب کامل کے امتحان میں نمایاں کامیابی پر 'سرسید میڈل' ملا، اس سے تو ہر شناسا واقف ہے۔

اشعار میں ترمیم:

حضرت الاستاذ کی ایک خوبی جو بہت قریب رہ کر بار ہا دیکھنے کو ملی وہ آپ کا شعری ذوق ہے۔آپ کے اشعار میں بہت جلد اور نہایت ہی عمدہ ترمیم فرماتے تھے۔اتنی سرعت میں نے اور شعراء میں نہیں دیکھی۔'ترانۂ دارالعلوم' کے قارئین جانتے ہیں کہ اس میں بھی بعض اشعار میں ترمیم ہوتی رہی ہے۔

'کلیاتِ کاشف' کی ترتیب کے دوران متعدد اشعار میں حضرت نے بڑی اچھی ترمیم فرمائی اور یہ بھی فرمایا کہ بھائی کاشف شاعری میں میرے استاذ ہیں مگر میں ان کے اشعار میں تبدیل وترمیم کا مشورہ دیتا تھا اور وہ مانتے بھی تھے، بعض وقت اصرار ہوتا تو میں خاموش ہوجاتا، میرے اشعار میں بھائی کاشف خوب ترمیم فرماتے تھے اور اس سے کلام اونچا ہوجاتا تھا، میری شاعری میں جو بھی خوبیاں ہیں وہ بھائی کاشف کی دین ہیں، فرمایا 'ترانۂ دارالعلوم' کے لیے میں نے کافی محنت کی ہے اور اصلاح میں بھائی کاشف نے بڑی دلچسپی لی۔ جب بھائی کاشف پر فالج کا حملہ ہوگیا اور وہ اپنے وطن راجو پور میں رہنے لگے تو ترانہ کے بعض اشعار کو لے کر میں اُن کے پاس گیا، انھوں نے اس میں ترمیم واصلاح فرمائی۔ترانہ صد سالہ سے کافی پہلے لکھا گیا، البتہ اس میں اضافہ کافی بعد تک ہوتا رہا۔

'کلیاتِ کاشف' میں بعض جگہ رُک کر فرمایا کہ دیکھو اس شعر میں تبدیلی کے لیے بھائی کاشف راضی نہیں تھے، لیکن بلاترمیم اس کی اشاعت مناسب نہیں ہے، اس لیے ہلکی سی ترمیم کررہا ہوں۔مضمون وہی ہے جو انھوں نے باندھا ہے، محض تشبیہ یا استعارہ بدل گیا ہے۔

نظم میں 'ق' کا مطلب:

شاعری کی بہت سی باریکیوں کے سمجھنے کا موقع نصیب ہوا، بہت سی باتیں جو کتابوں میں تشنہ رہ گئی تھیں، حضرت الاستاذ نے نہایت سادگی سے ان کو سمجھادیا، مثلاً کلیات اور دیوان میں بعض جگہ دوشعروں کے بالکل بیچ میں 'ق' لکھا ہوا رہتا ہے، میں اسے نہیں سمجھتا تھا، 'کلیاتِ کاشف' (ص ۱۴۲) کی ترتیب کے دوران حضرت کی کاپی میں ایک نظم میں اسی طرح لکھا ہوا تھا۔حضرت سے اس کا مطلوب پوچھا تو آپ نے بتایا کہ کبھی کبھی دوشعروں کو ملاکر مفہوم پورا ہوتا ہے، اس جگہ 'ق' لکھتے ہیں تاکہ قاری دونوں کو ملاکر مضمون کو سمجھے، یہ 'قرین' کا مخفف ہے۔اس کے بعد کلیاتِ اقبال اور جناب مولانا خلیل الرحمٰن راؔز کی کلیات میں دیکھا تو اور بھی اطمینان ہوا۔

غزل میں ہر شعر کا مفہوم الگ ہوتا ہے:

غزلیات کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ غزل میں ہر شعر کا مطلب الگ ہوتا ہے، لیکن کبھی شاعر غزل میں بھی مربوط مفہوم باندھتا ہے، اس کا انداز نظم کی طرح ہوتا ہے، مگر مضمون میں بانکپن اور غزل کی خوبیاں ہوتی ہیں، ایسی غزل کو 'غزل مسلسل' کہتے ہیں۔خالی الذہن قاری کبھی غزل کو غزل مسلسل سمجھ لیتا ہے تو اسے مربوط مضمون نکالنے میں زحمت ہوتی ہے۔

ایک بار ایسا ہی ہوا کہ مجھے ایک غزل کے دومصرعوں کے درمیان ربط سمجھ میں نہیں آرہا تھا، میں اس غزل کو غزل مسلسل سمجھ رہا تھا، حضرت الاستاذ کے پاس لے گیا تو آپ نے فرمایا، یہ واقعتاً غیر مربوط ہے، دونوں کا مطلب الگ ہے، غزل مسلسل نہیں ہے۔

کسی جملہ کی صحت پر اطمینان نہ ہو تو بدل دو:

الحمدللہ! حضرت الاستاذ کے پاس رہ کر بہت سی تحریروں کے لکھنے کا اتفاق ہوا، بعض وقت کسی لفظ کے بارے میں پوچھا، کبھی کسی جملہ کی تصحیح کرائی، کبھی کسی تشبیہ یا استعارہ پر اطمینان نہیں تھا تو پوچھا، آپ نے اپنے ادبی ذوق سے ہمیشہ بہت ہی اطمینان بخش جواب دیا۔اسی کے ساتھ ایک جملہ ارشاد فرمادیا:

''ادبیات کا جسے ذوق ہوتا ہے اس کو اس طرح کے اشکالات پیش آتے ہیں، ایسے وقت میں اگر اطمینان نہ ہو تو جملہ بدل دو، لفظ بدل دو، تشبیہ بدل دو۔'' پھر فرمایا: ''میں ایسا ہی کرتا ہوں۔''

اس سے راقم الحروف کو راہ ملی اور اطمینان ہوا۔حضرت کی رحلت کے بعد اب اس پر عمل کیے بغیر چارہ نہیں۔

جب ایم۔ فل کا مقالہ لے کر پہنچا:

ناچیز نے تین شخصیات کی شاعری کے تجزیاتی مطالعے کو اپنا موضوع بنایا تھا، حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند، حضرت مفتی کفیل الرحمٰن صاحب نشاطؔ عثمانیؒ سابق نائب مفتی دارالعلوم دیوبند اور حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ۔ جب مقالہ جمع ہوگیا، تو حضرت کی خدمت میں اس کی ایک کاپی لے کر پہنچا، حضرت نے جستہ جستہ دیکھا اور حوصلہ افزائی کے لیے فرمایا: 'ماشاءاللہ! تمہاری زبان نکھر گئی ہے، اللہ تعالیٰ اپنے دین کی

خدمات کا موقع عنایت فرمائیں!'' چند دنوں بعد ہی دار العلوم نے 'مالا بدمنہ' کے اردو ترجمہ کی ذمہ داری سونپی اور الحمدللہ پانچ سال سے تجوید سال دوم کے نصاب میں داخل ہے، پھر حضرت الاستاذ کی نگرانی میں 'کلیات کاشف' کی ترتیب و تحقیق کا موقع ملا اور اس سے پہلے مولانا عبدالرحیم بستویؒ کی حیات و خدمات لکھنے کا بھی حسین موقع نصیب ہوا، حضرت الاستاذ ناچیز کے اردو ادب پڑھنے سے بہت خوش تھے، ہمیشہ حوصلہ افزائی فرماتے تھے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ آپ نے مقالے میں اپنی شاعری سے متعلق کچھ نہیں پڑھا، بقیہ دونوں شخصیات سے متعلق مواد کو دیر تک دیکھتے رہے۔ اس طرزِ عمل سے میں کافی متأثر ہوا۔

خوش نویسی اور زود نویسی

حضرت الاستاذ کا رسم الخط کافی خوب صورت تھا، باضابطہ کاتب تھے، کافی دنوں تک کتابت کو بہ طور پیشہ بھی اپنایا، اللہ تعالیٰ نے زود نویسی کی دولت سے بھی نوازا تھا، بڑی رفتار کے ساتھ نہایت ہی خوب صورت تحریر لکھتے چلے جاتے، غالباً ۱۹۹۸ء کی بات ہے، دیوبند کے 'محمود ہال' میں جمعیۃ علمائے ہند کا فقہی اجتماع ہوا تھا، تجاویز کی تحریر آپ نے لکھی تھی، نہایت ہی رفتار کے ساتھ تھوڑی ہی دیر میں لکھ ڈالی، نہ کہیں حک و فک کیا اور نہ ہی غور و فکر، تجاویز کے نپے تلے الفاظ اور ان کے معانی کے ساتھ حضرت الاستاذ کے باریک اور خوب صورت رسم الخط میں میرے لیے بڑی کشش تھی۔ جناب مولانا محمد سلمان بجنوری مدظلہ العالی مدیر 'ماہ نامہ دار العلوم' کی تحریر میں حضرت الاستاذ کی تحریر کی خوشبو محسوس ہوتی ہے؛ مگر زود نویسی اور باریک نویسی کی وہ فن کاری نظر نہیں آتی جو حضرت میں تھی؛ لیکن موصوف کی تحریر راقم الحروف کو حضرت الاستاذ کی یاد دلا دیتی ہے۔

حضرت الاستاذ جب کسی کتاب کا ٹائٹل لکھواتے تب آپ کی فنی مہارت کھل کر سامنے آتی تھی، کاتب کو اپنے ذوق سے مشورہ دیتے تو آپ کی جمال پسندی کا اندازہ ہوتا، بڑے بڑے خوش نویس داد دیے بغیر نہ رہتے۔

امتحان کے پرچوں کی کتابت:

ایک بار عصر بعد کی مجلس میں حضرت نے فرمایا کہ میں نے کافی دنوں تک مادر علمی دار العلوم دیوبند کے پرچوں کی کتابت کی ہے، جب کام زیادہ ہوتا تو کافی کافی دیر تک بیٹھنا پڑتا تھا، بعض اوقات اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے میں نے کتابت کی ہے۔ ان دنوں کھانا نہیں کھاتا تھا، صرف انڈے کھالیتا تھا؛ تاکہ باربار استنجاء کی حاجت نہ ہو، معدے پر بوجھ نہ ہو، چستی باقی رہے اور کام کی رفتار میں فرق نہ آئے۔

طباعت سے پہلے مسودہ کو بار بار دیکھنا:

حضرت الاستاذ کی ایک عادت یہ تھی کہ کسی بھی کتاب یا مضمون کے چھپنے سے پہلے اُسے بار بار پڑھتے تھے، حک و فک اور ردّ و بدل کا سلسلہ چلتا رہتا تھا، جب بالکل تیار کرلیتے تو بھی ایک بار آخری نظر ڈالتے اور جن جن صفحات میں غلطیاں نظر آتیں اُن کو دوبارہ کمپیوٹر سے نکلواتے۔ 'کلیاتِ کاشف' کی تصحیح پانچ یا چھ بار کی گئی اور اخیر تک کچھ نہ کچھ حک و فک ہوتا رہا، اس لیے طباعت میں تاخیر ہوتی چلی گئی۔ تقریباً پانچ سال تک اس مسودے پر محنت ہوتی رہی، اس محنت سے راقم الحروف کا بڑا فائدہ ہوا۔ تصنیف کے بہت سے پوشیدہ گوشے کھلے۔ طباعت سے پہلے کاغذ کا انتخاب بھی بڑی باریکی سے فرماتے، جلد اور ٹائٹل کی نوعیت کی تعیین بھی قابلِ تقلید رہتی تھی۔

تحقیق کا مزاج:

حضرت الاستاذ کا مزاج تحقیقی تھا، یہ مبارک خوبی اُس وقت دیکھنے کی ہوتی تھی جب ان کے سامنے کوئی سوال آتا اور اس کا تعلق ان کے ذوق سے ہوتا۔ نہایت سبک رفتاری سے اُٹھتے، الماری سے کتاب نکالتے اور بڑی جلدی سے اس مقام کو کھول کر پڑھنے لگتے۔ تفسیر، حدیث، اصولِ حدیث اور متعدد شعری مسائل کے سلسلے میں ناچیز نے مشاہدہ کیا۔ بعض چیزوں کا حوالہ یاد نہ ہوتا تو حجرہ کے گوشے میں رکھا ہوا لیپ ٹاپ اُٹھاتے اور 'مکتبہ شاملہ' میں تلاش کرتے۔ آپ نے اپنے اسی ذوق کی تسکین کے لیے لیپ ٹاپ لیا اور اس کو چلانا سیکھا۔ حضرت مولانا عبدالسلام قاسمی مدظلہٗ العالی ناظم شعبۂ کمپیوٹر اس میں مشورہ دیتے اور بتاتے تھے، بٹن پر عربی حروف تہجی کا اسٹیکر چپکا رکھا تھا اور اسی کے مطابق اسے سیٹ کر رکھا تھا۔ آپ جب اہلِ علم کو انٹرنیٹ سے استفادہ کرتے دیکھتے تو رشک کرتے، آپ سے بار بار سنا کہ سوچتا ہوں کہ ایسا موبائل لے لوں جس میں علمی تحقیق کی سہولت ہو، دوسری طرف موبائل کے منفی استعمال سے کبیدہ خاطر رہتے۔

احباب کے سامنے سوالات:

حضرت الاستاذ کی عادت تھی کہ اپنے اہلِ مجلس کے سامنے سوال رکھتے تھے، چاہے اس کا تعلق دین سے ہو یا سیاست سے یا کسی اور چیز سے، اس طرح ہر آدمی کی معلومات سامنے آجاتی، اگر کتابوں کی مراجعت کی ضرورت ہوتی تو وہ بھی کی جاتی۔ قرآن، حدیث، لغت، طب اور شرعی مسائل میں عموماً صحیح بات سامنے آجاتی۔ سیاسیات سے متعلق سوالات بھی بڑے مفید ہوتے، اخبار میں کوئی خبر آتی اس پر بھی خوب تبصرہ ہوتا۔ ایک بار فرمایا کہ اگر جھوٹ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ جہنم میں لوگوں کو ڈالیں گے تو سب سے آگے یہ اخبار والے

ہوں گے، جو جھوٹی خبریں پھیلاتے ہیں۔ واٹس اَپ کے ذریعہ پھیلائے جانے والے جھوٹ اور فتنوں سے بھی بڑی کوفت کا اظہار فرماتے۔ غرض یہ کہ حضرت الاستاذ سوالات کے ذریعے مسائل میں رائے زنی کراتے، پھر ایک معتدل موقف پر جم جاتے تھے اور آپ کا سوچا ہوا موقف ہی صحیح ہوتا جو اکثر رائے زنی سے پہلے معلوم نہ ہو پاتا تھا۔

فقراء کی ضد پر تحمل:

حضرت الاستاذ فقراء، غرباء اور عاجزین کا بڑا خیال رکھتے تھے، ان کے در پر سائلین کا تانتا بندھا ہوتا تھا، ایک کو دے کر رخصت کرتے اور مطالعہ وتصنیف میں مصروف ہوتے کہ دوسرا آ جاتا، ہر ایک کو کچھ نہ کچھ دے کر واپس فرماتے، اگر کوئی اپنی کوئی ایسی مجبوری بتاتا، جس میں زیادہ پیسے خرچ ہوتے ہیں تو آپ اس کو کچھ زائد دیتے تھے۔ بہت سے فقراء کے لیے تاریخ متعین تھی، دارالعلوم دیوبند میں تنخواہ پہلی تاریخ کو مل جاتی ہے، پہلی تاریخ کو فقراء دروازے پر پہنچ کر سلام کرتے اور حضرت ہر ایک کو دیتے، متعارف فقراء کے لیے رقم متعین ہوتی تھی، وہ خاموشی سے لے کر چلے جاتے، درمیان میں نہ آتے تھے؛ لیکن بعض درمیان میں بھی آ جاتے اور سلام کرتے۔

ایک دن 'کلیاتِ کاشف' کا کام حضرت کے ساتھ کر رہا تھا، ایک ضعیف شخص نے سلام کیا، میں جلدی سے باہر آیا اور اُن سے ضرورت پوچھی، اس نے اپنی ضرورت بتائی، حضرت نے پہچان لیا اور فرمایا: بھئی! ابھی تو چاند نظر نہیں آیا ہے۔ اُس نے کہا: جی نظر آ گیا ہے، حالانکہ ابھی دو ہفتے ہی ہوئے تھے، وہ اصرار کر رہا تھا کہ چاند نظر آ گیا ہے۔ اتنے میں حضرت نے غالبًا پچاس روپے نکالے اور کہا: ان کو دے دو۔ پھر فرمایا: اگر ان کو زیادہ دوں تو اور بھی جلدی جلدی آنے لگتے ہیں۔ دیکھو! دو ہفتے بعد ہی ان کو چاند نظر آ گیا۔

حضرت الاستاذ میں تحمل و برداشت کی قوت باری تعالیٰ نے بہت زیادہ ودیعت کر رکھی تھی۔ فقراء کے بے جا اصرار پر کبھی بھی اُن کو ڈانٹا اور جھڑکا نہیں۔ وہ ''وَأَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ'' پر کاربند تھے۔

سلام کا جواب سنا کر دیتے:

حضرت الاستاذ کے پاس جانے، مجلس میں بیٹھنے اور علمی استفادے کا بارہا موقع نصیب ہوا، جب بھی حاضر ہوتا، سلام کرتا تو بڑے صاف اور قدرے بلند آواز سے جواب عنایت فرماتے خواہ وہ کسی بھی کام میں مصروف ہوتے، واپس ہوتے وقت اجازت چاہنے پر بخوشی اجازت دیتے اور کبھی فرماتے: اگر کوئی ضروری کام نہ ہو تو بیٹھو۔ میں عرض کرتا کہ آپ کا حرج ہوگا، فرماتے: نہیں، میرا کیا حرج ہوگا، میں کس کام کا ہوں؟ پھر کام کی بہت سی باتیں کرتے، میرے لیے اُن میں بڑے دروس ہیں، اُن سب کو نوکِ قلم پر لانا دشوار ہے۔ غرض یہ کہ اگر کبھی اہلِ مجلس کی تعداد زیادہ ہوتی اور واپس ہوتے وقت صراحتًا اجازت لینا مناسب نہ ہوتا اور صرف سلام کے ساتھ دروازے سے باہر نکلتا تو بھی جواب بہت ہی واضح انداز میں دیتے۔ ایسا صرف میرے ساتھ نہیں تھا، بلکہ سارے ہی واردین وصادرین کے ساتھ تھا۔

ہدیہ قبول کرنے میں احتیاط:

حضرت الاستاذ بڑے کُشادہ دست تھے، گھر والوں پر بھی اور دوست واحباب پر بھی دل کھول کر خرچ کرتے، ہدایا دیتے، اگر کوئی اہلِ تعلق ہدیہ دیتا تو اسے قبول فرما لیتے، اگر مجلس میں کوئی ہدیہ دیتا تو قبول کر کے اہلِ مجلس کو محظوظ کرتے، اگر کھانے کی چیز ہوتی تو سب کو کھلا دیتے۔

اگر کوئی ایسا آدمی ہدیہ دیتا جس سے حضرت کا زیادہ تعلق نہ ہوتا تو آپ قبول نہ فرماتے، اگر اصرار کرتا تو اس سے انقباض ہوتا تھا۔

آج کا دور مال ودولت کا ہے، مال کے لیے لوگ کیا کیا جائز اور ناجائز حیلے کرتے ہیں؛ لیکن حضرت الاستاذ اس سے کوسوں دور تھے، جیسے اُن کے دل میں دنیا کی محبت تھی ہی نہیں۔

ضیافت:

ضیافت بہت ہی شوق سے کرتے، قسم قسم کے لذیذ کھانے بنواتے اور مہمانوں کو اصرار کے ساتھ کھلاتے، ضیافت میں اکثر مقروض ہو جایا کرتے؛ لیکن کسی کو احساس نہ ہونے دیتے۔ مہمانوں کی کثرت اور ضیافت کا معیار قابلِ رشک ہوتا تھا۔ حیدرآباد سے جناب رحیم الدین انصاری مدظلہٗ اور مولانا محمد فاروق صاحب مفتاحیؒ آتے تو اکثر حضرت کے گھر ہی ٹھہرتے تھے اور بھی بہت سے مہمان اپنے لیے وہاں سہولت محسوس کرتے تھے۔

عصر بعد کی مجلس میں روزانہ دس بیس اور کبھی پچیس تیس اساتذہ طلبہ اور اہلِ تعلق حاضر ہوتے، ہر ایک کو نہایت ہی نفیس پیالی میں چائے پیش کی جاتی، پتی کافی قیمتی ہوتی تھی، یہ سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوا۔

اسفار سے کنارہ کشی:

حضرت الاستاذ سفر سے وحشت محسوس کرتے تھے، بڑی مجبوری میں سفر کرتے، مثلاً جمعیۃ علمائے ہند کا اجلاس، یا اس کا فقہی اجتماع ہوتا، یا کسی اہلِ تعلق کا حد درجہ اصرار ہوتا تو ہی سفر کرتے، اپنے وطن بجنور بھی کبھی اتفاق سے ہی کسی کی شادی یا غم کے موقع سے جاتے تھے۔

رقتِ قلبی:

حضرت الاستاذ میں نرمی، خیرخواہی، ہمدردی اور رقتِ قلبی نمایاں تھی،

مولانا عبدالرحیم بستوی کی سوانح جن دنوں لکھ رہا تھا اور حضرت کے پاس بار ہا دیر دیر تک بیٹھنے کا اتفاق ہوتا تھا، دونوں بزرگوں میں بے انتہا محبت تھی، حضرت مولانا بستوی کو بہت یاد کرتے تھے، ان کے ساتھ زندگی کے بیتے ہوئے لمحات کو یاد کرکے آب دیدہ ہوجاتے۔ گزشتہ سال جب طبیعت ناساز ہوئی تو بار ہا کہتے کہ مولانا عبدالرحیم صاحب کی وفات کے ایک سال پورے ہوگئے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ایک سال بعد حضرت اُن سے ملنے راہی ملکِ عدم ہوجائیں گے۔

'کلیاتِ کاشف' کی ایک نظم میں حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک واقعہ کی حکایت کی گئی ہے کہ حضرت نانوتوی کی وفات کے بعد لوگوں نے جمعہ کی نماز کے بعد حضرت گنگوہیؒ سے تقریر کی فرمائش کی تو حضرت نے عذر فرمایا۔ جب اصرار ہوا تو منبر پر بیٹھ گئے اور کوئی کتاب سنانا شروع فرمادیا۔ اس موقع سے حضرت گنگوہیؒ نے ایک بار 'اللہ' اس انداز سے کہا کہ پوری مجلس زار وقطار ہوکر رونے لگی۔ حاضرین کافی دیر تک اسی حال میں رہے۔ 'تذکرۃ الرشید' میں تفصیل موجود ہے۔ حضرت الاستاذ نے جب اس نظم کا پس منظر بیان فرمایا تو آب دیدہ ہوگئے اور فرمایا کہ سچ کہا ہے کسی نے کہ خیر القرون کی صفات کا حامل ایک قافلہ روک لیا گیا تھا، اس کو ان حضرات کی شکل میں اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا۔

طبیعت میں اپنی نفی راسخ:

حضرت الاستاذ میں اپنے کمالات کی نفی راسخ تھی، اپنے کو بالکل کچھ بھی نہیں سمجھتے تھے، اپنے شاگردوں کو اپنے سے بڑا سمجھتے تھے، اپنے علم کو بالکل ہی کم تصور کرتے تھے، کہتے بھی رہتے کہ بیٹے! مجھے تو کچھ نہیں آتا، پھر اس کے دلائل دینے لگتے، سامنے والا بالکل ساکت وصامت رہ جاتا۔

خوش مزاجی:

حضرت الاستاذ کی ذہانت وفطانت کی طرح آپ کی خوش طبعی اور خوش مزاجی بھی کافی مشہور ومعروف ہے، آپ کی اس صفت نے بہت سے قلوب کو آپ سے قریب کردیا تھا، دن بھر کی تکان آپ کے یہاں عصر بعد کی مجلس میں دور ہوجاتی تھی۔ اگر آپ کی خوش مزاجی اور لطائف کو جمع کیا جائے تو مستقل ایک مضمون ہوجائے گا۔

(۱) حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب بستویؒ سے آپ زیادہ دلگی کیا کرتے تھے، ایک بار موصوف محترم پان کھائے ہوئے تھے، اُن کو کلی کرنے کی ضرورت پیش آئی تو آپ جلدی سے اٹھے اور اندر سے اُگل دان لے کر آئے اور فرمایا: "مولانا اگلدان کو شرفِ کلی بخشیں گے"۔ اس جملے سے ایک طرف تو مولانا کے منطقی اور فلسفی رجحان کا مذاق کیا، اور کلی وجزئی کی طرف رمز فرمایا، دوسرے ان کی محترم شخصیت کا اعتراف بھی فرمایا کہ ان کے کلی کرنے کی وجہ سے اُگلدان کو مکمل عزت ملے گی۔

(۲) ایک بار حضرت مولانا بستویؒ نے مغرب کی نماز پڑھائی اور بڑے ہی اطمینان وسکون سے نماز پوری ہوئی، آپ نے نماز کے بعد فرمایا: "فجر کا مزا آ گیا۔"

آنکھ کے آپریشن میں تأمل:

حضرت الاستاذ کی ایک آنکھ کا آپریشن چار سال پہلے دہلی کے شراف ہسپتال میں ہوگیا تھا، آپریشن ماشاء اللہ کامیاب رہا، مگر آپریشن کے بعد کھانا حلق سے نیچے اُترنے میں تکلیف دیتا تھا، چھوٹے چھوٹے لقمے کو گھونٹ گھونٹ پانی سے اُتارتے تھے، یہ تکلیف چند دنوں رہی، ایسا خیال ہوتا تھا کہ آنکھ میں ڈالی جانے والی دوا کا سائڈ ایفکٹ (ردّعمل) ہے۔ ڈاکٹر سے رابطہ کیا گیا تو انھوں نے کہا کہ دوا میں کوئی ایسی دوا نہیں ہے، جس کا ردّعمل یہ ہو، لیکن چونکہ آپریشن سے پہلے یہ تکلیف نہیں تھی اس لیے ڈاکٹر کے اس ارشاد پر اطمینان نہیں تھا۔

دوسری آنکھ کا موتیا بھی پک گیا تھا، لیکن اسی خدشہ سے ہمت نہیں ہو رہی تھی، لیکن جب حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری مدظلہٗ العالی ممبئی سے ایک آنکھ کا آپریشن کرا کر آئے اور تین ماہ بعد دوسری آنکھ کے آپریشن کے لیے ممبئی جانے کا ارادہ تھا تو حضرت مفتی صاحب نے آپ سے فرمایا کہ آئندہ آپ بھی میرے ساتھ چلیں، وہاں جدید ترین آلات سے ایسا آپریشن ہوتا ہے جس میں کوئی تکلیف نہیں ہوتی اور سارے مراحل آسانی سے گزر جاتے ہیں۔ حضرت نے کہا کہ مشورہ کرکے بتاؤں گا۔ آپ نے اپنے صاحبزادگان، اہلِ مجلس اساتذۂ دارالعلوم اور اہلِ تعلق سے بار بار مشورہ کیا، خاص اسی مشورہ کے لیے ایک بار مجھے بلایا۔

جب سب کی رائے ایک ہی ملی تو ارادہ کرلیا، مگر بار بار یہ کہتے تھے کہ اب زندگی ہی کتنی رہ گئی ہے؟ شاید میں زیادہ دن تک نہ جیوں، ایک ہی آنکھ سے کام چل جائے گا، اس لیے آپریشن کرانے کا جی نہیں چاہتا۔ ہم نے عرض کیا کہ حضرت زندگی کے بارے میں کسی کو معلوم نہیں، اگر موتیا میں تکلیف شروع ہوگئی تو مجبور ہوکر کرانا ہی پڑے گا، یا آپریشن شدہ آنکھ میں کوئی کمی واقعی ہوگئی تو کہیں مزید پریشانی کا سامنا نہ ہوجائے، اس لیے کرالیجیے۔ اس طرح راضی ہوگئے اور آپریشن کرالیا اور الحمدللہ! کامیابی ملی، کوئی پریشانی سامنے نہ آئی۔

موت کے لیے بالکل تیار:

حضرت الاستاذ کی زندگی میں ایک خاص چیز دیکھی کہ آپ موت کے لیے ہرلمحہ بالکل تیار رہتے تھے، جب کبھی طبیعت تولہ ماشہ ہوتی اور کوئی تیمار داری کرتا تو فرماتے: ہاں، کچھ سانس لینے کا موقع بڑھ گیا ہے، اب مجھ میں رہا کیا؟ کسی کو کہتے: اب ایسا محسوس ہوتا ہے کہ زیادہ دن باقی نہیں رہ گئے ہیں، زمانے سے شوگر ہے، دل کا وال کمزور پڑ گیا ہے، گردہ کمزور ہو رہا ہے، اس کی کارکردگی ڈھیلی پڑ گئی ہے، کریٹنین میں اضافہ ہو گیا ہے، شوگر کبھی اعتدال سے کافی بڑھ جاتی ہے اور کبھی گھٹ کر ساٹھ اور پچاس ہو جاتی ہے، جسم میں کمزوری زیادہ محسوس ہونے لگتی ہے، ایسا لگتا ہے کہ وقت قریب آ گیا ہے۔

(۲) ایک دن کہنے لگے کہ میں کیا ہوں؟ کچھ بھی نہیں، مروں گا اور بچے اُٹھا کر گڑھے میں ڈال آویں گے۔ میں نے کہا: نہیں حضرت! ایسا نہ کہیں، بالکل مناسب نہیں، ہمیں اس سے گھبراہٹ ہو جاتی ہے۔ ابھی تو ان شاء اللہ کافی زندگی باقی ہے، بہت سارے کام جو چھانے ہوئے ہیں، سب پورے ہوں گے، اس کے بعد ہی اللہ تعالیٰ بلائیں گے، اس پر حضرت خاموش ہو گئے۔

(۳) آٹھ سال پہلے بنگلہ دیش تشریف لے گئے، وہاں کہیں تو ہیلی کاپٹر اور کہیں مشین والے بوٹ (کشتی) پر سوار ہونے کا اتفاق ہوا، ساتھ میں ایک اور بزرگ تھے، بوٹ جو بالکل کھلا ہوا ہوتا ہے، وہ جب تیز رفتاری سے چلتا ہے تو بیٹھنے والوں کو بڑی وحشت ہوتی ہے، بعض وقت اوسان خطا کر جاتے ہیں؛ لیکن حضرت اس پر بالکل مطمئن تھے، واپسی کے بعد جب اس کا ذکر ہوا اور پوچھا گیا کہ سب لوگ اس پر گھبرائے ہوئے تھے، مگر آپ بالکل مطمئن تھے، کیوں؟ تو فرمایا: بھائی، موت جب آنی ہے آ جائے گی، اگر وہیں موت لکھی ہوتی تو آ جاتی؛ اس لیے مطمئن تھا۔

غرض یہ کہ حضرت الاستاذ موت کے لیے اپنے کو ہر وقت تیار رکھتے تھے، نہ تو کسی بندے کا حق باقی رکھتے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کے واجب احکام میں سے کچھ باقی رکھتے۔ یہی ایمانِ کامل اور مؤمنِ کامل کی علامت ہے، اگلی دنیا کے افضل و اعلیٰ ہونے پر اُن کو بالکل اطمینان ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل محبت کے بغیر یہ صفت پیدا نہیں ہو سکتی۔

اپنی علمی اور دینی خدمات پر اطمینان:

حضرت الاستاذ کے اندر یہ بات بھی محسوس ہوئی کہ آپ کو اپنی علمی، دینی اور ملی خدمات کے شرعاً صحیح اور درست ہونے کا بالکل اطمینان تھا، اپنے ان کاموں کو محض اللہ رب العزت کی رضامندی کا ذریعہ سمجھتے تھے، آپ کی ضخیم تصنیف 'شوریٰ کی شرعی حیثیت' یہ اگرچہ ایک بڑے بزرگ کے موقف کی تردید میں آپ نے تصنیف فرمائی؛ مگر اس کے ہر ورق پر آپ اجر خداوندی کی پوری امید رکھتے تھے۔ بعض وقت بعض لوگوں نے آپ کی کسی خدمت پر اعتراض کیا تو آپ نے ان کو اطمینان دلایا کہ نہیں، میں نے اس کو اللہ کی رضامندی کے لیے کیا ہے اور اللہ تعالیٰ سے پورے اطمینان کے ساتھ اجر کی امید رکھتا ہوں۔ ساتھ ہی یہ بھی ارشاد فرماتے کہ وہ ذات ہر دو عالم سے غنی اور مستغنی ہے؛ اس لیے ڈرتا بھی ہوں۔

چند نصیحتیں:

(۱) ایک بار خدمت میں حاضر ہو کر بتایا کہ حضرت الاستاذ مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری مدظلہ العالی کی نگرانی میں ''سراجی'' کی شرح لکھ رہا ہوں، تو آپ بہت خوش ہوئے اور فرمایا: مفتی صاحب کی نگرانی بڑی خوش نصیبی کی بات ہے، بیٹے! خوب محنت کرو، آج لکھ کر پھاڑ دینا بھی ترقی کا زینہ ہے، بہت لکھنے کے بعد ہی لکھنا آتا ہے، پھر تواضعاً محض سمجھانے کے لیے ارشاد فرمایا:

''میں نے بہت سی ایسی تحریریں لکھی ہیں جو میری طرف منسوب نہیں ہیں، کسی اور کے نام سے طبع ہوئی ہیں۔ آج بھی 'اہتمام دارالعلوم' کی بہت سی تحریریں میں ہی لکھتا ہوں، اس کی برکت دیکھو کہ میں آج بخاری شریف کی شرح لکھنے کے لائق ہو گیا، ایضاح البخاری کی چار جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔''

اس وقت اتنی ہی شائع ہوئی تھیں، وفات سے پہلے پہلے تک دس جلدیں آ چکی ہیں، اللہ تعالیٰ محترم دوست مولانا فہیم الدین بجنوری مدظلہ کو تکمیل کی توفیق ارزانی نصیب فرمائیں!

(۲) اسی مجلس میں یہ بھی فرمایا کہ تم مولانا سعید کے قریب رہتے ہو، ان کے اندر یہ خوبی ہے کہ اسٹیج پر تقریر سے پانچ منٹ پہلے بھی اگر ان کو کوئی موضوع دیا جائے تو اس انداز اور ترتیب سے بیان کرتے ہیں، جیسے پہلے سے انھوں نے اس کی خوب تیاری کر رکھی ہے۔ دوسری شخصیت مولانا انظر شاہ صاحب کی ہے، ان کے اندر بھی یہ خوبی ہے، تم بھی اپنے اندر یہ خوبی پیدا کرنے کی کوشش کرو، یہ بڑی بہترین خوبی ہے۔

(۳) ایک موقع سے فرمایا: غصہ کے وقت خاموش رہو، کچھ نہ بولو! اور یہ سوچو کہ اس وقت بولنا مناسب نہیں، بعد میں سوچ کر جواب دوں گا، اس کا بڑا فائدہ ہے، بعد میں سوچو گے تو انفعالی حالت میں بولنے کا نقصان سمجھ میں آ جائے گا۔

(۴) ایک بار ارشاد فرمایا کہ اگر تمہاری بات معقول اور مدلل ہو پھر بھی اس پر کوئی اعتراض کرے تو اس کا اثر نہ لو۔ □□

حضرت مولانا ریاست علی ظفرؔ بجنوریؒ۔شخصیت کے تشکیلی عناصر

تحریر: مفتی محمد ساجد قاسمی ہردوئی (استاذ تفسیر وادب دار العلوم دیوبند)

پچھلے دنوں ملتِ اسلامیۂ ہند کو جن عظیم شخصیات کی رحلت کے صدمے سے دوچار ہونا پڑا اُن میں ایک شخصیت استاذِ گرامی مرتبت حضرت مولانا ریاست علی ظفرؔ بجنوری کی ہے، جو مختصر علالت کے بعد ۲۳؍شعبان ۱۴۳۸ھ-۲۰؍مئی ۲۰۱۷ء کو دنیا سے رحلت کر گئے۔آپ کے انتقال سے آپ کے اہلِ خانہ، دارالعلوم دیوبند کے اربابِ انتظام، اساتذہ، طلبا اور آپ کے متعلقین کو گہرا رنج ہوا۔ یقیناً آپ کی وفات کاروانِ دارالعلوم کے لیے بالخصوص اور ملت اسلامیۂ ہند کے لیے بالعموم ایک ناقابلِ تلافی خسارہ ہے۔

آپ دارالعلوم کے مؤقر استاذِ حدیث، اس کی نشأۃ ثانیہ کا ایک اہم دماغ، اس کی روایات کے امین، اس کے منہاج ومزاج سے باخبر اور اس کے مسلک ومشرب کے تئیں بڑے غیور واقع ہوئے تھے۔اسی کے ساتھ آپ ایک بلند پایہ عالمِ دین، عظیم مؤلف، باکمال شاعر، شرافت ومروت کے پیکر، وقار کا کوہِ گراں، ہمدردی وغمگساری کا مجسمہ، منکسر المزاج، مال ومتاع کے حصول سے بیزار، جاہ ومنصب کی چاہت سے کوسوں دور، فراخ دل، سیر چشم اور ایک سادہ لیکن دلآ ویز شخصیت کے مالک تھے۔کہا جاتا ہے کہ آدمی کی شخصیت کی تشکیل میں موروثی پس منظر، تعلیم وتربیت، گردوپیش کے ماحول اور ذاتی تجربات کا اہم کردار ہوتا ہے۔کوئی بھی شخصیت مذکورہ عناصر سے تشکیل پاتی ہے، یہ عناصر جتنے زیادہ صحت مند، حیات افزا اور طاقتور ہوں گے اتنی ہی زیادہ طاقتور شخصیت تشکیل پائے گی۔ جب ہم آپ کی شخصیت کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ عناصر آپ کے یہاں ہمیں کچھ اس طرح ملتے ہیں۔

موروثی پس منظر

آپ کے موروثی پس منظر کو لے لیجیے، تو آپ نسبی اعتبار سے ایک شریف خانوادے کے چشم وچراغ تھے، آپ کا سلسلۂ نسب میزبانِ رسول حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے جاملتا ہے،اور یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ نسبی خصوصیات نسلوں میں منتقل ہوتی ہے۔آپ کو بھی نسبی خصوصیات سے ایک وافر حصہ ملا ہوا تھا؛ چنانچہ مہمان نوازی وکرم گستری، ہمدردی وغمگساری، شرافت ومروت اور ذکاوت وذہانت آپ کی نمایاں موروثی صفات تھیں۔

تعلیم وتربیت

والد صاحب کا سایۂ عاطفت بچپن ہی میں آپ کے سر سے اٹھ گیا تھا، آپ کے پھوپھا حضرت مولانا سلطان الحق صاحب (سابق ناظم کتب خانہ دارالعلوم دیوبند) بغرضِ تعلیم وتربیت آپ کو اپنے ساتھ دیوبند لائے، آپ نے دارالعلوم دیوبند میں آپ کی سرپرستی میں تعلیم کی تکمیل کی اور فرسٹ پوزیشن سے دورۂ حدیث کا امتحان پاس کیا۔

حضرت مولانا سلطان الحق صاحب کے بارے میں جو تذکرے سننے میں آئے ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ حضرت مدنی کے جانثاروں میں تھے، اور آپ کا ایک حلقہ تھا جس سے بہت سے اساتذہ اور طلبہ وابستہ تھے۔آپ کے فیضِ صحبت اٹھائے ہوئے دارالعلوم کے بہت سے قدیم فضلا آپ کی طلبہ کے ساتھ ہمدردی وخیرخواہی کا تذکرہ کرتے رہتے ہیں۔

حضرت مولانا سلطان الحق صاحب کو آپ سے قرابت کا تعلق تھا؛ اس لیے لازمی طور پر انھوں نے آپ کی تربیت پر خصوصی توجہ دی ہوگی۔اور حضرت مولانا سلطان الحق صاحب کی معیت اور تربیت سے آپ کو بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ آپ کے یہاں مجلسی مزاج ومذاق اور طلبہ کے ساتھ ہمدردی اور تعلق داری اسی تربیت کا اثر تھا۔

دارالعلوم میں آپ نے اپنے اساتذہ سے تحصیلِ علم کے ساتھ ساتھ بہت کچھ سیکھا ہوگا، ان میں سے شیخ الحدیث حضرت مولانا فخر الدین احمد مرادآبادیؒ صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند کی شخصیت خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔آپ دورۂ حدیث سے فراغت کے بعد اگلے سال بھی ان کے درس میں شریک ہو کر آپ کی بخاری شریف کی تقریر محفوظ کرتے رہے، جسے آپ نے بعد میں مرتب کر کے ''ایضاح البخاری'' کے نام سے شائع کیا۔

تیسری شخصیت جس کا آپ کی شعری وادبی زندگی پر بڑا اثر ہے، وہ جناب مولانا محمد عثمان کاشف الہاشمی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت ہے، آپ نے جناب کاشف صاحب سے شعرگوئی کی تربیت حاصل کی تھی۔آپ اعلی شعری وادبی ذوق رکھتے تھے، آپ اپنے اس ذوق کی بنا پر شاعری کے باب میں اپنے پیش رواکابرِ دیوبند کی صف میں نظر آتے ہیں۔

گردوپیش کا ماحول

آپ نے جس ماحول میں نشو ونما پائی، وہ ابتداءً آپ کا خاندانی ماحول اور ثانیاً دارالعلوم دیوبند کا علمی وروحانی ماحول تھا، جو اساتذۂ دارالعلوم (جو بیک وقت اساطینِ علم اور اصحابِ نسبت بزرگ تھے) کی سانسوں سے پُر تھا، ان میں سے شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، حضرت مولانا فخر الدین

احمد مرادآبادیؒ، حضرت علامہ محمد ابراہیم بلیاویؒ اور شیخ الادب حضرت مولانا محمد اعزاز علی امروہوی خصوصی طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ آدمی اپنے ماحول کی پیداوار ہوتا ہے۔اصول پسندی اور وقت کی پابندی، حق گوئی وبیباکی اور بہت سی اچھی عادتیں یقیناً آپ نے اسی ماحول سے سیکھی تھیں۔

ذاتی تجربات

جہاں تک آپ کے ذاتی تجربات کا تعلق ہے تو یقیناً وہ بہت مختلف اور متنوع ہوں گے جو کچھ اس حوالے سے میں جانتا ہوں وہ یہ ہے کہ آپ نے یتیمی کی زندگی گذاری اور تنگ دستی اور خوشحالی کے دونوں دور دیکھے ہیں، یتیمی اور تنگ دستی کے دور میں نہ معلوم کتنے ایسے ہوں گے جنھوں نے آپ سے منہ پھیر لیا ہوگا اور خوشحالی کے دور میں بہت سے ایسے بھی ہوں گے جنھوں نے آپ سے تعلقات استوار کرنے کی کوشش ہوگی۔ آپ نے کئی اداروں میں کام کیا، ان میں نہ معلوم کیسے کیسے لوگوں سے سابقہ پڑا ہوگا۔ ان تمام چیزوں سے آپ کو یقیناً بہت سے تجربات حاصل ہوئے ہوں گے۔ یہ وہ عناصر ہیں جن سے آپ کی شخصیت تشکیل پائی تھی، اور جن سے آپ ایک ممتاز حیثیت کی حامل شخصیت کہلائے۔

آپ دارالعلوم دیوبند میں استاذ مقرر ہوئے اور آپ نے مختلف درجات میں تدریس کے ساتھ نظامتِ تعلیمات، شیخ الہند اکیڈمی کی نگرانی، ماہنامہ 'دارالعلوم' کی ادارت جیسی متعدد ذمہ داریاں سنبھالیں۔ آپ پوری جانفشانی اور تندہی کے ساتھ دارالعلوم کے کاموں کو سرانجام دیتے تھے، اس پر انتظامیہ آپ کی ستائش بھی کرتا تھا۔ ایک بار آپ نے فرمایا کہ انعامی جلسے کی پوری تیاری ہم خود ہی کیا کرتے تھے، چنانچہ کتابوں کا انتخاب کرنا، طلبہ کے نام لکھنا، کتابوں کے پیکٹ بنانا وغیرہ یہ سب کام ہم خود کیا کرتے تھے۔ یاد رہے کہ اس وقت کتابوں کے انتخاب کے بعد انعامی جلسے کی مکمل تیاری دفتر تعلیمات کا عملہ کرتا تھا۔

ایک مرتبہ آپ نے مجھ سے پوچھا کہ آپ سے متعلق کتنے گھنٹے ہیں، میں نے کہا کہ پانچ گھنٹے ہیں، پھر میں نے کہا پانچ گھنٹے پڑھا کر تکان ہوجاتی ہے تو آپ نے فرمایا کہ ہاں ہوجاتی ہوگی، لیکن میں نے آپ جیسی عمر میں چھ چھ گھنٹے تک پڑھائے ہیں۔

میں نے آپ سے دورۂ حدیث میں ابن ماجہ پڑھی۔ آپ کو افہام و تفہیم کا بڑا ملکہ تھا، آپ کی زبان واضح، صاف اور ادبی چاشنی لیے ہوئے ہوتی تھی۔ آپ کبھی دورانِ درس عصرِ حاضر کے بعض فرقوں پر بڑی لطیف چوٹ کستے۔ ایک بار فرمایا کہ فلاں جماعت کے بانی کے یہاں اس طرح کے بلند بانگ دعوے ملتے ہیں لیکن اگر ان سے کہا جائے کہ اصولِ فقہ کی اصطلاحات کی ایک فہرست مرتب کردو تو ساری قلعی کھل جائے گی۔

آپ نے دارالعلوم کی نشأۃِ ثانیہ میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ دارالعلوم کے حالات معمول پر آجانے کے بعد بھی آپ مسلسل حالات پر کڑی نظر رکھتے تھے۔ میں نے اپنے زمانۂ طالب علمی میں دیکھا کہ بعض طلبہ کی کسی ہوٹل والے سے کہا سنی ہوگئی۔ شر پسند عناصر کی جانب سے اس کو لے کر طلبہ میں ایک شورش برپا کرنے کی کوشش شروع ہوگئی۔ آپ نے اس موقع پر طلبہ کو خطاب کیا اور فرمایا کہ آپ کے مخالفین کو آپ کا پرسکون ماحول اور آپ کی پڑھنے پڑھانے میں یکسوئی راس نہیں آرہی ہے۔ مجھے اس کا اندیشہ تھا کہ آپ کے پرسکون ماحول کو خراب کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ آپ بالکل مخالفین کے آلۂ کار نہ بنیں بلکہ آپ اپنے پڑھنے پڑھانے میں لگ کر اپنے مخالفین کے عزائم کو ناکام بنائیں۔ آپ کے مؤثر خطاب سے طلبہ میں پائی جانے والی شورش ختم ہوگئی۔

> بہت سے طلبہ آپ سے اخذ و استفادے کیلئے متعلق رہتے تھے۔ آپ سے ان کا یہ تعلق وقتی نہ ہوتا، بلکہ فارغ ہونے کے بعد بھی آپ سے مربوط رہتے۔ میرے علاقے کے بہت سے فضلا آپ سے زمانۂ طالب علمی میں متعلق ہوئے اور آپ سے ان کا تعلق پوری زندگی قائم رہا۔ آپ بھی ان کے اس تعلق کا بے حد خیال رکھتے تھے۔ اگر ان میں سے کسی کا کوئی عزیز دارالعلوم میں داخلے کے لیے آتا تو آپ اس کے داخلے کیلئے فکرمند رہتے اور داخلہ ہونے کے بعد اس کی سرپرستی فرماتے۔

آپ دارالعلوم کی روایات کے امین اور اس کے اصول وضوابط سے پورے طور پر باخبر تھے، جب کبھی آپ کو کسی روایت سے انحراف یا کسی ضابطے کی خلاف ورزی ہوتی ہوئی محسوس ہوتی تو آپ اس کا بلا تکلف اظہار فرمادیتے۔ آپ وقت کے بہت پابند تھے، اسباق کی پابندی کے علاوہ، امتحان گاہ میں بڑی پابندی سے حاضر ہوتے تھے، اگر طبیعت بہت زیادہ ناساز ہوتی تو رخصت کی درخواست بھیجتے تھے۔ ورنہ عام حالات میں آپ نے امتحان گاہ میں حاضر ہونے کی ہمیشہ پابندی کی۔ طبیعت کی ناسازی کی بنا پر ذمے داروں کی جانب سے اس بار امتحان سالانہ میں آپ کو اس حاضری سے مستثنیٰ بھی قرار دیا گیا، پھر بھی آپ امتحان کے آخری دن تک پابندی سے امتحان گاہ میں آتے رہے۔

تصنیف و تالیف:

آپ نے دارالعلوم دیوبند میں تدریس کے علاوہ تمام ذمہ داریوں سے سبکدوشی اختیار کرنے کے بعد اپنے وقت کو علمی کاموں کے لیے فارغ کرلیا تھا، چنانچہ 'ایضاح البخاری' کے کام کو آگے بڑھایا اور بعد میں آپ نے نوجوان فاضل جناب مولانا فہیم الدین بجنوری استاذ دارالعلوم دیوبند کو بھی اپنے ساتھ کام میں لگایا۔ الحمدللہ اب تک اس کتاب کی دس جلدیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ اسی طرح آپ نے 'الکشاف فی اصطلاحات الفنون' کی تحقیق کا بیڑا اُٹھایا۔ اس سلسلے میں بھی آپ نے جناب مولانا محمد عارف اعظمی استاذ دارالعلوم کو اپنے کام میں شریک کیا، اس کتاب کی تحقیق کا کام پورا ہوگیا تھا اور آپ نے عرض ناشر بھی لکھ کر دے دیا تھا، کتاب پریس میں جانے ہی والی تھی کہ آپ کا وقت موعود آپہنچا۔ امید ہے کہ آپ کے صاحبزادگان اوّل الذکر کتاب کو مکمل کریں گے اور آخر الذکر کتاب کو زیورِ طبع سے آراستہ کرائیں گے۔

شعر و شاعری:

آپ کو مبداءِ فیاض سے شعری و ادبی ذوق کا وافر حصہ ملا تھا۔ ظاہری اسباب میں آپ نے جناب کاشف الہاشمی جیسی ادبی و شعری شخصیت کی صحبت اُٹھائی تھی اور ان سے اس باب میں صلاح و مشورہ بھی لیا تھا۔ آپ کی شاعری پر تبصرہ کسی اعلیٰ شعری ذوق رکھنے والے ناقد کا کام ہے، مجھ جیسے شعری ذوق سے عاری شخص کا کام نہیں تاہم اتنی بات تو مجھ جیسا کم سواد بھی سمجھتا ہے کہ آپ کا مجموعۂ کلام 'نغمۂ سحر' اور ترانۂ دارالعلوم دیوبند آپ کے اعلیٰ شعری ذوق کا بین ثبوت ہیں۔ 'نغمۂ سحر' کے مقدمے میں حضرت مولانا لقمان الحق فاروقی نے جس طرح آپ کے بعض اشعار اور میرؔ، غالبؔ اور اصغرؔ کے اشعار کا موازنہ کیا ہے اس سے آپ کے شاعری کے اعلیٰ ذوق، تعبیر کی قدرت، دقیقہ رسی اور مضمون آفرینی کی بے پناہ صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

آپ نے ترانۂ دارالعلوم لکھ کر اپنی مادرِ علمی کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ اگرچہ آپ نے یہ ترانہ مسلم یونیورسٹی کے لیے لکھے گئے مجازؔ کے ترانے کی زمین میں کہا، لیکن آپ کے ترانے میں جس خوبی کے ساتھ تاریخی اشارات، مادرِ علمی کی ممتاز شخصیات کے نام اور ان کے نمایاں کردار کو سمیٹ لیا گیا ہے یہ بات کسی اور ترانے میں نظر نہیں آتی۔ ایک ایک شعر اپنے اندر ایک تاریخ لیے ہوئے ہے۔ مثلاً ترانے کا ایک شعر ہے:

> ہے عزم حسین احمدؒ سے بپا ہنگامۂ گیر و دار یہاں
> شاخوں کی لچک بن جاتی ہے باطل کے لیے تلوار یہاں

آپ نے اس شعر کے پہلے مصرعے میں حضرت مدنیؒ کی ملک کی آزادی کے لیے جدوجہد، آپ کا مغربی سامراج کے مقابلے کے لیے آہنی عزم، اس کی پاداش میں متعدد بار گرفتاری، جیلوں میں کئی کئی سال تک کے لیے سزا، اور پھر بھی آپ کا آزادی کے مطالبے سے پیچھے نہ ہٹنا، یہ سب کچھ کتنی خوبصورتی اور کتنے اختصار کے ساتھ ایک مصرعے میں ادا کیا گیا ہے۔ شعر کے دوسرے مصرعے میں یہ بھی بتادیا گیا کہ اس ادارے کے فرزندوں کا یہی امتیاز رہا ہے کہ وہ باطل کے مقابلے کے لیے ہمیشہ شمشیر براں رہتے ہیں۔

عصر کے بعد کی مجلس

عصر کے بعد آپ کی مجلس ہوتی تھی، جس میں بڑی تعداد میں اساتذہ شریک ہوتے تھے، میرا خیال ہے کہ آپ کو یہ مجلسی ذوق حضرت مولانا سلطان الحق صاحب کے یہاں سے ملا تھا اور آپ کی یہ مجلس ان کی مجلس کا امتداد تھی۔

آپ کی مجلس میں مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی، کبھی علمی موضوع پر، کبھی حالاتِ حاضرہ پر اور کبھی تفریحِ طبع کی باتیں ہوتیں۔ مجلس میں ہر ایک کو گفتگو، سوال و جواب کی پوری آزادی ہوتی، اور آپ بھی ہر ایک سے بے تکلف رہتے۔ راقم الحروف مجلس میں روزانہ حاضر نہیں ہو پاتا، کبھی ہفتہ دس دن گذر جاتے اور کبھی مہینہ، جب کافی مدت کے بعد حاضری ہوتی تو آپ یہ ضرور معلوم کرتے کہ آج کل کیا کام کر رہے ہو، جب میں اپنی مشغولیت بتاتا تو بہت خوش ہوتے اور حوصلہ افزائی فرماتے۔

خورد نوازی و حوصلہ افزائی

مجلس شوریٰ کی تجویز کے مطابق دارالعلوم کے تعارف میں حضرت مولانا ذوالفقار علی دیوبندی کی تالیف کردہ عربی کتاب الهدية السَّنيةُ في ذكر المدرسة الديوبندية کے ترجمہ کا کام راقم الحروف کو سپرد کیا گیا، ناچیز نے اس کا اردو ترجمہ مکمل کرکے شیخ الہند اکیڈمی کے حوالے کردیا، پھر مجلس نے نظرِ ثانی کے لیے مسودہ حضرت الاستاذ رحمہ اللہ اور حضرت مولانا عبدالخالق سنبھلی دامت برکاتہم کو دیا؛ چنانچہ آپ دونوں حضرات نے اس پر نظر ثانی فرمائی اور ترجمے کی بعض غلطیوں کی نشاندہی کرکے ان کی اصلاح فرمائی۔ پھر آپ نے رپورٹ میں اس ترجمہ کی تصویب فرماتے ہوئے اسے قابلِ اشاعت قرار دیا۔ مجھے آپ کی نظرِ ثانی اور اصلاحات سے کافی فائدہ ہوا اور بڑا حوصلہ ملا۔

سال رواں کے آغاز میں جب میری تازہ تربیت دی ہوئی کتاب 'تیسیر الانشاء' کا پہلا حصہ منظرِ عام پر آیا تو میں نے آپ کی خدمت میں پیش کی، آپ نے کتاب کا نام دیکھا اور اندر نحوی قواعد کی مشق دیکھی تو آپ نے فرمایا میں تو انشا کا نام دیکھ کر یہ سمجھ رہا تھا کہ آپ نے اس میں عربی میں مضمون نگاری کا طریقہ بتایا ہوگا، اس میں تو قواعد کی مشق ہے۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت پہلے اور دوسرے حصے میں نحوی و صرفی قواعد کے مطابق جملہ سازی کی مشق کرائی گئی ہے اور تیسرے حصے میں ان شاء اللہ مضمون نگاری کا طریقہ بتایا

جائے گا۔ آپ نے کتاب پسند کی اور دعائیں دیں۔

تعلق کا غیرمعمولی پاس و لحاظ:

آپ کے یہاں طلبہ کے ساتھ ہمدردی وخیر خواہی بے پناہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے طلبہ آپ سے اخذ واستفادے کے لیے متعلق رہتے تھے۔ آپ سے ان کا یہ تعلق وقتی نہ ہوتا، بلکہ فارغ ہونے کے بعد بھی آپ سے مربوط رہتے۔ میرے علاقے کے بہت سے فضلا آپ سے زمانۂ طالب علمی میں متعلق ہوئے اور آپ سے ان کا تعلق پوری زندگی قائم رہا۔ آپ بھی ان کے اس تعلق کا بے حد خیال رکھتے تھے۔ اگر ان میں سے کسی کا کوئی عزیز دارالعلوم میں داخلے کے لیے آتا تو آپ اس کے داخلے کے لیے فکرمند رہتے اور داخلہ ہونے کے بعد اس کی سرپرستی فرماتے۔ میں نے تعلق کی اتنی پاسداری آپ کے علاوہ اور کہیں نہیں دیکھی۔ اسی طرح قدیم فضلا کی جتنی بڑی تعداد کا آپ سے تعلق دیکھا وہ اور کہیں نظر نہیں آیا۔ جس کا آپ سے ایک بار تعلق قائم ہوگیا وہ پوری عمر کے لیے قائم ہوجاتا۔ آپ کے یہاں طلبہ کے لیے سامانِ کشش آپ کی غیرمعمولی خیرخواہی و ہمدردی اور بے پناہ شرافت ومروت تھی۔

عادات واخلاق

میں نے آپ کو ۱۹۹۱ء سے دیکھا ہے، اس وقت سے انتقال تک آپ کی زندگی کی ایک ہی روش اور ایک ہی انداز دیکھا، یقیناً آپ کی زندگی میں بہت سے نشیب وفراز آئے ہوں گے؛ لیکن آپ کے طور وطریق میں کبھی کوئی فرق نہیں آیا۔ آپ وقار کا کوہِ گراں تھے، بے نفسی اور تواضع آپ کی نمایاں خصوصیت تھی۔ آج کے اس مادیت کے دور میں لوگ طرح طرح سے مادی منافع حاصل کرتے ہیں اور دنیوی مال ومتاع حاصل کرنے کے لیے سرگرداں رہتے ہیں حتی کہ طبقۂ خواص میں بھی بہت سے افراد اس وبا سے متاثر معلوم ہوتے ہیں؛ لیکن آپ کو اس طرح کی تگ ودو سے بہت دور پایا؛ بلکہ ہمیں آپ اس حوالے سے ایک گوشہ نشیں زاہد مرتاض نظر آتے ہیں۔ مجھے آپ کی یہ صفت بہت متاثر کرتی تھی۔ میں اپنے دل میں کہتا تھا کہ آپ کی طرح دنیوی منافع اور مال ومتاع کی طمع سے بالاتر ہوکر اخروی اجر وثواب اور وہاں درجات کی بلندی کے علاوہ دنیا میں اپنے قیمتی وقت کو بچایا جاسکتا ہے اور اسے مفید علمی کاموں میں لگایا جاسکتا ہے۔

سنا ہے کہ آپ کی بعض موروثی جائیداد پر کچھ لوگوں نے ناجائز قبضہ کرلیا تھا، آپ نے اپنے آپ کو اختلاف ونزاع سے بچایا اور اس جائیداد کی بازیابی کے لیے کوئی جد وجہد نہیں کی؛ بلکہ اولاد کو بھی اس طرح کے نزاعات میں پڑنے سے دور رکھا۔

اللہ تعالی نے آپ کو اصابتِ رائے کی صفت سے نوازا تھا، بہت سے معاملات میں آپ سے تعلق رکھنے والے آپ سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ بعض معاملات میں دیکھا کہ آپ نے ایک جملے میں اپنی رائے کا اظہار کردیا۔ بہت سے اہم اور نازک مسائل میں آپ مصلحت کوشی سے بالاتر اور بلاخوفِ لومتِ لائم بڑی بے باکی سے اپنی رائے کا اظہار کردیا کرتے تھے۔ یہ وہی شخص کرسکتا ہے جو مخلص ہو اور جس کا دل ذاتی مفادات کی آلودگی سے پاک ہو۔ اسی طرح آپ بہت سی پریشانی میں مبتلا لوگوں کو ایک جملہ کہہ کر تسلی دے دیا کرتے تھے، اور واقعی آدمی کو تسلی ہوجاتی تھی۔ ایک مرتبہ میں اپنے بعض مسائل کو لے کر پریشان تھا، آپ کو معلوم ہوا تو ملاقات پر آپ نے ایک تسلی بھرا جملہ فرمایا: ''بیٹے! محنت کرتے رہو، محنت کرنے والے کا کوئی راستہ روک نہیں سکتا۔''

دارالعلوم دیوبند میں میرے جتنے اساتذہ ہیں، الحمدللہ وہ ایسی خصوصیات وکمالات کے حامل ہیں جو یکجا طور پر دوسروں میں خال خال ہی ملیں گی؛ مگر یہ بات بلاکسی موازنہ کے کہی جاسکتی ہے کہ بعض خصوصیات کے لحاظ سے آپ منفرد نظر آتے تھے۔

کہتے ہیں لوگ ذوقؔ دنیا سے چل بسا
کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

مثالی استاذ اور باکمال انسان

حضرت مولانا ریاست علی صاحب بجنوری رح

تحریر: مفتی محمد عفان منصورپوری

حضرت مولانا ریاست علی صاحب بجنوری نور اللہ مرقدہ ہمارے ان شفیق اساتذہ میں سے تھے، جن سے ملاقات بڑی حوصلہ بخش اور ہمت بندھانے والی ہوا کرتی تھی، اسی لیے آپ کی مجالس میں شرکت کا داعیہ برابر رہتا۔ دیوبند قیام کے دوران تو یہ سعادت بکثرت میسر آتی، لیکن تدریسی ذمہ داریوں کی وجہ سے جب دیوبند سے دور جانا پڑا تو جب بھی دیوبند آنا ہوتا، آپ کی خدمت میں نیاز مندانہ حاضری کی کوشش کی جاتی۔ ہم کوئی بھی حرکت کرتے یا کسی نئے کام میں ہماری شمولیت ہوتی اور حضرت مولانا کو اس کا علم ہوتا تو آپ سے ملاقات کے وقت انتظار رہتا تھا کہ دیکھیں کیا تبصرہ سننے کو ملتا ہے، قابلِ اصلاح بات ہوتی تو بڑے لطیف پیرایہ میں اس طرح تنبیہ فرماتے کہ محفل بھی زعفران زار ہو جاتی اور مبتلا بہ کو اپنی غلطی کا احساس بھی ہو جاتا۔ ایک مرتبہ جمعہ کے دن بعد نماز عصر خدمت میں حاضری ہوئی، دیکھتے ہی اپنے مخصوص انداز میں فرمانے لگے: ’’آؤ بھائی، آج تو خطبہ میں تم نے ہم لوگوں کو بہت ڈانٹ پلائی، تم نے بھی سوچا ہوگا کہ موقع اچھا ہے، کہہ لو جو کہنا ہے، سب کو خاموشی سے سننا ہی پڑے گا۔‘‘ مجھے تو انداز تھا کہ حضرت ضرور کچھ فرمائیں گے، اس لیے یہ جملے تعجب خیز نہیں تھے۔ بلکہ توقع کے عین مطابق تھے، کیونکہ حضرت کا کچھ نہ فرمانا خلافِ توقع تھا، بہر حال سن کر سر جھکا کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ غلطی کہاں ہوئی، حضرت نے پھر تعریفی کلمات بھی ارشاد فرمائے، بہت حوصلہ افزائی فرمائی اور نصیحت فرمائی کہ بڑوں کی موجودگی میں اس طرح کے مواقع پر خطاب کی ضمیروں اور صیغوں کے کے بجائے جمع متکلم کے صیغے اور ضمائر کا استعمال مفید اور موثر ہوتا ہے۔

بڑائی اور خود پسندی کا بھوت نکالنا آپ بہت اچھی طرح جانتے تھے، ان برائیوں سے خود بھی پاک تھے اور اپنوں کو ان برائیوں میں ملوث بھی دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ مردم شناسی کا ملکہ قدرت نے خوب عطا کیا تھا، ایک نگاہ میں تاڑ لیا کرتے تھے کہ کون کس مقصد سے آیا ہے، کیا کہنا چاہتا ہے اور کس چیز کے لیے تمہید باندھ رہا ہے؟ جانتے سب کچھ تھے، لیکن اپنے آپ کو انجان باور کراتے تھے، زیرکی، عقل مندی، اور فطانت نگاہوں سے ٹپکتی تھی، خاموشی کے ساتھ چہرے پڑھ لیا کرتے تھے، مجلس مشورہ میں بہت کم گو تھے، سب کی سننے کے بعد اخیر میں جس رائے کا اظہار فرماتے وہ سب پر بھاری ہو جاتی اور حاضرین کے لیے اس کو نظر انداز کرنا ممکن نہ ہوتا۔

بڑے خوددار اور فکر ونظر کے پختہ واقع ہوئے تھے، دلائل وشواہد کی بناء پر خلوص نیت کے ساتھ جو نظریہ قائم فرماتے، اس پر مضبوطی کے ساتھ جمے رہتے اور اپنے فیصلہ پر ایسا اعتماد ہوتا کہ پھر کوئی اپنی طرف مائل کرنے میں کامیاب نہ ہوتا، خودداری کا یہ عالم کہ ابتدائی زندگی بڑی عسرت اور تنگی میں گزری، کتابت کر کے اور چھوٹی موٹی ملازمت کے ذریعہ گزر بسر کرتے رہے، مگر مجال ہے کہ کسی کے سامنے حرف شکایت زبان پر لائے ہوں یا اپنے حالات کا اظہار کیا ہو، سخت سے سخت حالات کا ہنستے مسکراتے مقابلہ کیا اور اپنے وقار ومتانت اور سنجیدگی پر آنچ نہ آنے دی۔

آپ بلند کردار کے مالک تھے، معاملہ کی صفائی آپ کا وطیرہ تھا، غصہ کو ضبط کرنا جانتے تھے، کبھی مغلوب الغضب نہیں دیکھا گیا، مخالف ماحول کے دباؤ میں نہیں آتے تھے، مشکل حالات سے نکلنے کی راہ جانتے تھے، ہر شخص کے لیے خیر کا جذبہ اپنے دل میں پنہاں رکھنے والے تھے، بیماروں کی مزاج پرسی اور مرحومین کے اہل خانہ سے تعزیت میں دوسرں پر سبقت لے جانے والے تھے، عشاء کے بعد جلدی سو جانا اور رات کے آخری پہر میں اٹھ کر بارگاہ الٰہی میں راز و نیاز کرنا آپ کی عادات میں شامل تھا، ضعف و پیرانہ سالی کے باوجود باجماعت نمازوں کی پابندی کا حد درجہ اہتمام فرماتے تھے۔

عملیات وظائف میں بھی آپ کو کمال حاصل تھا۔ محض خدمت اور رضائے الٰہی کے جذبہ کے ساتھ اس عمل کو انجام دیتے۔ آپ کی لکھی ہوئی حروف مقطعات والی چاندی کی انگوٹھی اور نومولود کے گلے میں ڈالی جانے والی چاندی کی تختی نے بڑی شہرت حاصل کی اور اس کے استعمال سے لوگ برابر فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

خوش خطی میں بھی آپ طاق تھے، موٹے قلم کی کتابت ہو یا باریک، آپ کی تحریر کا توڑ نہیں تھا، عام طور پر باریک سے باریک نب والا قلم استعمال فرماتے اور بغیر لائن والے کاغذ پر بھی سیدھی لائن کے ساتھ اتنا نفیس لکھتے کہ جیسے موتی جڑ دیے گئے ہوں اور کمال یہ کہ بڑے زود نویس تھے، جو لکھتے وہ حرف آخر ہوتا، نظر ثانی میں کانٹ چھانٹ کی ضرورت بہت کم پڑتی تھی۔

باوزن شخصیت:

آپ کی شخصیت علمی، ادبی اور سماجی حلقوں میں بڑی وزن دار اور لائق اعتبار تھی، تواضع اور سادگی کا گرچہ آپ پیکر مجسم تھے، لیکن بزرگوں کے فیض صحبت اور علمی و عملی کمال کے نتیجہ میں سامنے والے پر آپ کا ایسا رعب پڑتا کہ وہ بچھتا چلا جاتا، کسی بڑے سے بڑے ماہر فن یا اپنے میدان کے مہار تھی سے مرعوب ومتاثر نہ ہوتے اور نہ ہی کسی پر اپنا رعب جھاڑنے کی کوشش کرتے۔

ہم جب شعبۂ افتاء میں زیر تعلیم تھے تو شام کے ایک نوجوان عالم

دارالعلوم دیوبند تشریف لائے اور طلبہ میں ان کا بیان بھی ہوا، بہت عالمانہ اور محققانہ گفتگو انھوں نے کی، اہل علم متاثر ہوئے اور معلوم ہوا کہ کئی ہزار احادیث سند ومتن کے ساتھ موصوف کو یاد ہیں، جس سے ان کے غیر معمولی قوت حافظہ کا بھی پتہ چلا، شام کو حضرت مولانا کی مجلس میں بھی ان کا تذکرہ رہا، حضرات اساتذہ نے ان کی علمی لیاقت اور خاص طور پر یادداشت کے مثالی ہونے کو بڑا سراہا، حضرت الاستاذ نے بھی ان کی قابلیت کا اعتراف کیا۔ لیکن جو حضرات محض ان کے قوت حفظ سے ضرورت سے زیادہ متاثر تھے، ان سے فرمایا: ''یہ ان کے ذوق کا کمال اور نتیجہ ہے، جس کا جو ذوق ہوتا ہے، وہ اس میدان میں محنت کر کے دوسروں پر فائق ہو جاتا ہے، غالباً ان کے علاقہ میں متن احادیث کو سند کے ساتھ یاد کرانے کا رواج ہوگا اور حقیقت بھی یہی تھی، اس زمانہ میں شام میں مرد تو مرد عورتوں میں بھی حفظ احادیث کے باقاعدہ حلقے قائم تھے۔ اسی کے مطابق انھوں نے بھی یاد کرلیا، ہمارے یہاں بھی جن علماء کا جو ذوق اور فن ہے وہ اس میں اپنی مثال آپ ہیں۔''

یہ تھا حضرت کا مزاج، بہت جلدی آپ گہرائی تک پہنچ جاتے تھے، ہر چمکتی چیز کو سونا سمجھ کر اس کی قیمت کا تعین نہیں فرماتے تھے، بڑی سوجھ بوجھ، میانہ روی اور اعتدال کے ساتھ کسی کے بارے میں رائے قائم فرماتے، اس لیے کہ وہ ان اکابر اور جبال علم کی تربیت میں رہ چکے تھے جن کے فضل وکمال، علم وعمل، صلاح وتقوی اور پارسائی و پرہیز گاری کے مقابلہ میں بعد والے تمام تر ممکنہ کمالات کے حامل ہونے کے باوجود کوتاہ قد دکھائی دیتے ہیں۔ دارالعلوم دیوبند اور اس کے اکابر سے اسی والہانہ اور پرخلوص عقیدت کی وجہ سے کوئی اور ان کی نگاہ میں جچتا نہیں تھا۔

تکلف سے احتراز:

تکلف، تصنع اور بناوٹ سے کوسوں دور تھے، جو بات معلوم نہ ہوتی، اس کا اقرار بہت جلد نہایت واضح الفاظ میں کرتے اور وعدہ کرتے کہ تحقیق کے بعد بتائیں گے، جب بات منقح ہو جاتی تو بڑی وضاحت و بشاشت سے اپنی تحقیقات کے نتائج بتاتے، ضرورت ہوتی تو دوسروں سے پوچھ لینے میں خواہ وہ ان سے کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو، مطلق تأمل نہ فرماتے۔ ایک مرتبہ احقر نے تصوف کی بعض اصطلاحات کے سلسلے میں حضرت الاستاذ سے استفسار کیا، اولا لاعلمی کا اظہار کیا، پھر غور کرنے کے بعد کچھ سرسری مفہوم بتایا، اس کے بعد دارالعلوم کے کتب خانہ میں موجود ایک فارسی کتاب کی رہنمائی کی کہ اس میں تفصیل مل جائے گی، لیکن وہ کتاب بھی دستیاب نہ ہوسکی، درمیان میں معلوم فرماتے رہے کہ مسئلہ حل ہوا یا نہیں، ہفتہ عشرہ کے بعد ایک دن حاضر خدمت ہوا، تو ڈیکس پر رکھی ہوئی ایک پرانی سی کتاب کھولی اور فرمانے لگے کہ اسی دن سے میں جستجو میں تھا، میرے ہی پاس یہ کتاب مل گئی، اس میں تفصیل موجود ہے، پھر ایک ایک اصطلاح کو واضح فرمایا۔ اللہ اکبر! ہجوم کار کے باوجود ایک ادنی، سے طالب علم کے معمولی سے سوال کے جواب پر اتنی توجہ کہ کئی روز گزرنے کے بعد بھی جب تک ڈھونڈھ نہ نکالا، مطمئن نہ ہوئے، اللہ حضرت کی قبر کو منور فرمائے۔ فخر ہے ہمیں حضرت الاستاذؒ کی ان شفقتوں اور عنایتوں پر۔

کسی مقام پر آپ اپنے لیے کوئی امتیاز نہیں چاہتے تھے، لباس، پوشاک، عادات واطوار، رفتار وگفتار سب سے سادگی جھلکتی تھی، کسی موقع پر چاہنے والے اگر آپ کے اعزاز میں کچھ اہتمام کرتے تو اس کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ جامعہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد امروہہ میں ایک پروگرام میں ہم لوگوں نے آپ کو مدعو کیا، آپ کی آمد پر اہل مدرسہ بہت شاداں اور فرحاں تھے۔ عربی درجات کے تقریبا تمام ہی اساتذہ آپ کے شاگردوں میں سے تھے، اور اسی رشتہ کی بنا پر طبیعت کی ناسازگی کے باوجود آپ نے دعوت قبول فرمالی تھی، جب کہ عام طور پر جلسوں میں شرکت سے آپ دور رہا کرتے تھے اور غالبا یہی آپ کا امروہہ کا پہلا اور آخری سفر بھی تھا۔ بہر حال آپ کے اعزاز میں کچھ دور تک سڑک کے دونوں جانب طلبہ کو کھڑا کر دیا اور مزاج کو دیکھتے ہوئے یہ تاکید کردی گئی کہ کسی طرح کا کوئی نعرہ نہ لگایا جائے، لیکن جب حضرت گاڑی سے اترے تو چہرے سے انقباض کے آثار ظاہر تھے، اس وقت تو ضبط کیا، کچھ نہیں فرمایا، مہمان خانہ تشریف لے گئے، پھر سمجھایا کہ مجھے معلوم ہے تم لوگوں نے میری محبت اور تعلق میں بچوں کو میرے اعزاز میں کھڑا کر دیا، میں اس تعلق کی قدر کرتا ہوں، لیکن سچی بات یہ ہے کہ مجھے یہ چیزیں بالکل پسند نہیں، تم یہ سمجھ رہے ہوں گے کہ لمبا چوڑا استقبال کریں گے تو 'ریاست' خوش ہو جائے گا، حالانکہ ان چیزوں سے میری طبیعت بہت متاثر ہوتی ہے اور دل پر بوجھ ہو جاتا ہے، چلو خیر اب آئندہ اس کا خیال رکھنا۔ اسی طرح کہیں ناظم جلسہ نے اگر آپ کو بلانے میں کچھ مبالغہ سے کام لیا تو اس کی اچھی کلاس لیتے تھے، مزاج میں تعلّی وتفوق نام کی کوئی چیز نہیں تھی اور نہ دوسروں میں اس کو پسند فرماتے تھے، چھوٹوں میں سے کسی کے انداز سے اگر تعلّی کی بو محسوس کرتے تو بہت اچھے انداز میں اس کو سمجھاتے، اصلاح فرماتے، کسی کی گفتگو اور طرز وانداز سے تفوق مزاجی جھلکتی تو بڑے دلچسپ انداز میں تبصرہ کرنے سے بھی دریغ نہ فرماتے۔

باکمال انسان:

استاذ محترم کی بہت بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ بہت اچھے انسان تھے، ہر طرح کے لوگوں سے ان کے خوشگوار روابط تھے اور سب کا دل رکھا کرتے تھے، خاموشی کے ساتھ کتنی بیواؤں اور ضرورت مندوں کا وہ ماہانہ تعاون کیا کرتے تھے، اللہ جانتا ہے، صاحبزادگان بتاتے ہیں کہ ایسا بھی ہوا کہ عید کے موقع پر قلت سرمایہ کی وجہ سے اہل خانہ کے لیے کپڑے نہ بن سکے، لیکن جن پریشان حال لوگوں کا تعاون فرماتے تھے، قرض لے کر ان کی ضرورتوں کو پورا کیا اور کسی پر اس کو ظاہر

بھی نہ ہونے دیا۔

مولانا محمد یوسف خاں صاحب (ناظم دفتر جمعیۃ علماء ہند) نے تو حضرت مولانا کے حوالے سے عجیب بات ذکر فرمائی جس کو سن کر اندازہ ہوتا ہے کہ خیرخواہی، ہمدردی اور سخاوت کا کیسا عظیم جذبہ تھا جو اللہ نے آپ کو ودیعت فرمایا تھا۔ معاشی اعتبار سے کمزور بعض طلبہ کی آپ کفالت فرمایا کرتے تھے، حالاں کہ ابتدا میں آپ کی زندگی بھی بڑی عسرت میں گزر رہی تھی، طلبہ کے تعاون کا طریقہ کار یہ تھا کہ اگر کوئی شخص تعویذ کے لیے آپ کے پاس آتا تو اس سے فرماتے کہ اس پتے پر اتنے روپے منی آرڈر کردو اور اپنی ضرورت لکھ دو، عمل بتا دیا جائے گا، پھر اس طالب علم کو اس عمل سے باخبر کردیتے، وہ پیسے وصول کرتا اور جواباً عمل ارسال کردیا کرتا تھا۔

وضعداری اور رواداری تو مانو آپ کی گھٹی میں پڑی تھی، جس سے ایک مرتبہ خلوص کے مراسم ہوگئے تمام عمر کے لیے اس پر مہر لگ گئی، رشتے ناتوں کا پاس ولحاظ اور اہل تعلق سے برابر رابطہ میں رہنا، ان کے دکھ درد میں شریک ہونا، ان کی فرمائشوں کو حتی الامکان قبول کرنا اور ان کی سفارشات پر توجہ دینا اخیر عمر تک آپ کے مشاغل کا حصہ رہا۔ ان چیزوں کا خیال رکھنا بڑی اہم چیز ہے، ورنہ عام طور پر آدمی جب بلندیوں کو چھوتا ہے تو پھر اسے پرانے تعلق دار کہاں یاد رہ جاتے ہیں، وہ تو اپنے معیار کے لیے نئے دوست تلاش لیتا ہے۔ لیکن حضرت مولانا کا کمال یہ تھا کہ انھوں نے پرانے رابطوں کو پرانا نہ ہونے دیا بل کہ اخیر اخیر وقت تک ان کو زندہ رکھا۔

ہمارے گھرانے سے بھی حضرت مولانا کے قدیم مراسم تھے، ہمارے تایا جان حافظ محمد موسیٰ صاحب مرحوم آپ کے ہم مجلس لوگوں میں سے تھے، ان کے سسر جناب عرفان صاحب مرحوم بھی محلّہ لال مسجد دیوبند میں آپ کے پڑوس میں رہا کرتے تھے، قریب کے سالوں میں اگرچہ ملاقات کا اتفاق کم ہوتا تھا، لیکن برابر حال چال دریافت فرماتے تھے، وہ پچھلے کئی سالوں سے بیمار رہے تو مزاج پرسی کے لیے بھی گئے، تقریباً سات مہینے پہلے انتقال کی خبر ملی تو بیماری اور کمزوری کے باوجود جنازہ میں شرکت کے لیے مظفرنگر تشریف لے گئے۔

حضرت اقدس والد صاحب مدظلہ العالی کی اصول پسندی اور زمانہ طالب علمی سے محسوس کی جانے والی شرافت اور یکسو ہوکر اپنے کام میں اشتغال کا موقع بہ موقع ذکر فرماتے، جس سے آپ کے قلبی لگاؤ اور دلی رجحان کا اندازہ ہوتا تھا۔ ہمیں بھی باضابطہ آپ کی شاگردی اختیار کرنے کا موقع اگرچہ اس وقت ملا جب ہم سال ہفتم میں پہنچے اور مشکوٰۃ شریف اول، نخبۃ الفکر اور مقدمہ شیخ عبدالحق نامی کتابیں آپ کے متعلق درس ہوئیں۔ لیکن آپ کے گھر آنا جانا اور شفقتوں سے لطف اندوز ہونے کا سلسلہ بہت پرانا ہے، جبکہ آپ محلّہ لال مسجد دیوبند میں ایک کرایے کے مکان کے بالائی حصہ میں سکونت پذیر تھے اور نیچے ایک کمرہ میں آپ کی نشست گاہ تھی، جس پر کاشانۂ رحمت کا بورڈ لگا ہوا تھا، پھر آپ کا قیام چھتہ مسجد کے قریب واقع دارالعلوم کی عمارت افریقی منزل قدیم میں ہوگیا، یہاں آکر ایک گونہ پڑوس بھی آپ کا حاصل ہوا، کیونکہ ہم لوگ بھی چھتہ مسجد سے متصل بالائی حصہ میں رہتے تھے۔ آپ کے چھوٹے صاحبزادے محترم مولانا سعدان جامی صاحب حفظ کے زمانہ سے ہی ہم درس تھے اور مجھے یاد ہے کہ تکمیل حفظ کے موقع پر ایک تہنیتی نظم بھی حضرت الاستاذ نے تحریر فرمائی تھی جس کو گھر کی ایک مجلس میں مولانا سعدان صاحب نے پڑھا بھی تھا، افسوس کہ اسے مکمل طور پر محفوظ نہ رکھا جاسکا، چند اشعار درج ذیل ہیں:

زمانہ آفریں کہتا ہے عفاں تیری ہمت کو
نہ کیوں ہم داد دیں آخر تری عمدہ ذہانت کو
فلک بھی جھوم جاتا ہے، ملک بھی رقص کرتے ہیں
فرشتے سنتے آتے ہیں تری پیاری تلاوت کو

بے مثال استاذ:

مقدمہ شیخ عبدالحق کی دل نشیں تشریح، نخبۃ الفکر کی پھیلی ہوئی بحثوں کا جامع خلاصہ اور نچوڑ، مشکوٰۃ شریف، سنن ابن ماجہ اور سنن ترمذی کی روایات پر پورے گھنٹے بے تکان، مسلسل اور جاندار گفتگو اور پھر تکمیل ادب میں البلاغۃ الواضحہ پڑھانے کا نرالا اور دلچسپ انداز میرے استاذ محترم کا ایسا تھا کہ بھلائے نہیں بھلایا جاسکتا۔ درس گاہ میں پورے سال بلاناغہ اور بروقت حاضری آپ کی مثالی تھی، گھنٹہ بجتے ہی مشکوٰۃ شریف کی درس گاہ میں تشریف لاتے اور روزانہ حاضری لیتے، نام گزرنے کے بعد اگر کوئی طالب عالم آتا تو اس کی حاضری شمار نہ کی جاتی جس کی غیر حاضری لگ گئی، لگ گئی، اب اس پر قلم نہیں چلے گا۔ ایک بار کسی طالب علم نے رجسٹر میں درج اپنی غیر حاضری کو حاضری بنانے کی کوشش کی، اگلے دن جب حضرت کی نظر اس پر پڑی تو جلال میں آگئے اور ایسے غضبناک ہوئے کہ اس سے پہلے اور اس کے بعد کبھی آپ کو اتنے غصہ میں نہیں دیکھا، فرمایا "تمہاری ہمت کیسے ہوئی رجسٹر چھونے کی، آج تم غیر حاضری کو حاضری بنارہے ہو، کل کسی کے دستخط کی نقل اتاروگے، اپنی خامیوں کو چھپانے کے لیے ناجائز طریقوں کو اختیار کروگے، خبردار اگر آئندہ سے کسی نے رجسٹر کو ہاتھ لگایا تو خیر نہیں ہوگی۔" خلاف معمول حضرت کی یہ کیفیت دیکھ کر طلبہ تو سہم گئے اور پورے گھنٹہ خاموشی چھائی رہی، درس کے اختتام پر حضرت نے پھر سمجھایا کہ اب قُویٰ پہلے جیسے نہیں رہے، سرد وگرم کو برداشت کرنے کی عادت ختم ہوگئی، شوگر کے مرض کی وجہ سے ناگوارا مور کو دیکھ کر غصہ بھی بہت آنے لگا تم لوگ کیوں ایسی حرکت کرتے ہو، جس سے میری طبیعت متاثر ہو، پھر اس طالب علم کو معاف کیا اور تشریف لے گئے، شروع سال ہی میں غیر حاضری پر آپ کے اس نوٹس کا اثر یہ ہوا کہ پورے سال وقت سے پہلے طلبہ کی حاضری یقینی ہونے لگی اور کسی

نے سال بھر رجسٹر پر قلم چلانے کی ہمت نہ کی۔

بہترین مشیر

معاملہ فہمی اور پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کے حل میں آپ طاق تھے، آپ کے مشورے بھی بہت موزوں ہوا کرتے تھے، کتنے لوگ ایسے تھے، جو اپنے خانگی، کاروباری اور دیگر مسائل میں بھی حضرت والا کے مشورے پر عمل پیرا ہوتے تھے۔ ایک صاحب کسی علاقہ میں امام اور مدرسہ میں مدرس تھے، لیکن اس علاقے کے لوگ مولانا صاحب سے مطمئن نہیں تھے اور ان کو برطرف کرنا چاہتے تھے، مگر دشواری یہ تھی کہ دارالعلوم دیوبند کے موقر اساتذہ کے توسط سے موصوف وہاں آئے تھے جس کی وجہ سے کوششیں بارآور نہیں ہو پا رہی تھیں، ذمہ داران حضرت مولانا ریاست علی صاحب مرحوم سے ملے، حالات بتائے، لوگوں کے رجحانات کا ذکر کیا اور پھر اپنی بے بسی بھی بتائی کہ ہم کوششوں کے باوجود ان کو علیحدہ نہیں کر پا رہے ہیں، آپ مسئلہ کا حل بتائیے حضرت نے فرمایا: یہ کون سا مشکل کام ہے، تمھیں ان سے یا ان کے اساتذہ سے کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں، مدرسہ میں ان سے زیادہ قابل کسی آدمی کا تقرر کرلو، سارے مسائل حل ہو جائیں گے، چنانچہ یہی ہوا، ایک دوسرے صاحب کا تقرر کیا گیا، انھوں نے محنت سے کام کیا، بنتیجتاً سابقہ مولانا صاحب از خود وہاں سے تشریف لے گئے۔

ایک مرتبہ دارالعلوم دیوبند میں ایک طالب عالم کا پاسپورٹ چوری ہو گیا، اسے اپنے ساتھی پر شک ہوا اور اس نے پاسپورٹ کی تلاشی میں اس کی الماری کا تالا توڑ دیا، ساتھی نے دارالاقامہ میں شکایت کی اور تالا توڑنے والے پر چوری کا کیس درج ہو گیا، فریقین کے بیانات لے لیے گئے، فائل تیار ہو گئی اور فریق اول کا اخراج تقریباً طے ہو گیا، اس کے والد صاحب نے حضرت مولانا کے سامنے سارے حالات رکھ کر مشورہ طلب کیا، اب کیا کرنا چاہیے، کون سی ایسی صورت اختیار کی جائے جس سے اخراج سے بچا جا سکے۔ حضرت مولانا نے باہم تنازع کرنے والے دونوں طالب علموں کو بلایا اور آپس میں صلح کرادی، پھر اس طالب سے ایک استفتاء لکھوایا، جس میں یہ پوچھا گیا تھا کہ جب فریقین باہم صلح صفائی کر لیں تو کوئی شرعاً سزا کا مستحق ہو گیا یا نہیں، دارالافتاء دارالعلوم کی طرف سے جواب آیا کہ ایسی شکل میں کسی کو سزا دینے کا شرعاً کوئی جواز نہیں ہے۔ پھر اس فتویٰ کی بنیاد پر حضرت مولانا نے ذمہ داران دارالاقامہ سے سفارش فرمائی کہ مذکورہ طالب علم کے اخراج کا فیصلہ واپس لے لیا جائے، کیونکہ دونوں معاملہ رفع دفع کر چکے ہیں اور دارالعلوم کا فتوی بھی آ چکا ہے اور فتویٰ پر اگر اراب دارالعلوم ہی عمل نہ کریں گے تو کون کرے گا۔ بہرحال ذمہ داران نے آپ کی سفارش قبول فرمائی اور داخلہ بحال ہو گیا، کوئی قانون شکنی بھی نہ ہوئی اور بحسن وخوبی معاملہ سلجھ گیا۔

ادبی مقام:

شعر وسخن کے باب میں بھی حضرت مولانا کا مقام بہت بلند تھا، ظفرؔ تخلص رکھتے تھے، قدیم اساتذہ کی سوچ وفکر کے حامل تھے، تمام اصناف سخن پر قادر ہونے کے ساتھ ساتھ تغزل اور نعت گوئی میں خاص قدرت رکھتے تھے۔ آپ کا مجموعہ کلام 'نغمۂ سحر' تو محض ایک جھلک ہے، ورنہ فی البدیہہ مختلف مواقع کی مناسبت سے آپ نے جو اشعار کہے ہیں، ان کی تعداد کہیں زیادہ ہے۔ 'ترانۂ دارالعلوم دیوبند' اور 'ترانۂ جمعیۃ علماء ہند' آپ کے عظیم شاہ کار ہیں۔

مولانا محمد یوسف خاں صاحب فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ دیوبند میں مولانا محمد عثمان صاحب سابق نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند وچیئر مین نگر پالیکا دیوبند کے مکان میں ایک شعری نشست ہوئی جس میں جگر مرادآبادی بھی تشریف لائے، حضرت مولانا ریاست علی صاحب نے بھی حضرت مولانا عثمان صاحب کاشف الہاشمیؒ کے ساتھ اس پروگرام میں شرکت کی، جگر صاحب نے ایک شعر پڑھا:

تم بھی نہ سن سکو گے صدائے شکست دل
جب خامشی ہی شرط محبت ٹھہر گئی

مولانا محمد عثمان کاشف الہاشمی صاحب نے فرمایا، اس میں مبالغہ کم ہوا ہے، پہلا مصرعہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ:

ہم بھی نہ سن سکیں گے صدائے شکست دل
جب خامشی ہی شرط محبت ٹھہر گئی

حضرت مولانا ریاست علی صاحب نے لقمہ دیتے ہوئے فرمایا، اب بھی مبالغہ پورا نہیں ہوا، پہلا مصرعہ یوں ہونا چاہیے:

دل بھی نہ سن سکے گا صدائے شکست دل
جب خامشی ہی شرط محبت ٹھہر گئی

ادب نوازوں کا مجمع حضرت مولانا کے ذہن کی اس رسائی پر سر دھنتا رہا اور حضرت جگر کو بھی آپ کی صلاحتیوں کا اعتراف کرتے ہوئے داد دینے پر مجبور ہونا پڑا۔

اردو کی طرح فارسی زبان میں بھی اشعار کہنا آپ کے لیے مشکل نہ تھا حضرت مولانا فخرالحسن صاحب مرادآبادیؒ سابق صدرالمدرسین دارالعلوم دیوبند کے سفر حج سے واپسی کے موقع پر آپ نے بزبان فارسی ایک منظوم کلام تحریر فرمایا تھا، جس کا آخری شعر یہ تھا:

شوق خواہد کہ دو چشمان ترا بوسہ دہد
اے کہ در دیدہ تر گنبد خضراء داری

شاعرانہ صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ آپ کی نثر بھی بڑی سلیس اور شیریں تھی، خوبصورت ادبی تعبیرات سے مزین جملے آپ کا رواں قلم لکھتا چلا جاتا تھا، علمی موضوعات پر لکھتے تو انداز تحقیقی اور استدلالی ہوتا۔ 'شوریٰ کی شرعی حیثیت' نامی کتاب میں اس کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے، کسی کا سوانحی خاکہ یا

حالات حاضرہ پر تبصرہ مقصود ہوتا تو پھر نثر کا رنگ کچھ اور ہی ہوتا۔ ماہنامہ دارالعلوم کی ادارت کے زمانہ میں آپ کے گہر بار قلم سے نکلنے والے اداریے اس کے شاہد ہیں۔

علمی سرمایہ:

حضرت الاستاذ نوراللہ مرقدہ کا تذکرہ ایضاح البخاری کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوگا یہ آپ کی سالہا سال کی محنتوں کا خلاصہ اور نچوڑ اور اپنے استاذ محترم کو بہترین خراج عقیدت ہے۔ بخاری شریف کی یوں تو متعدد اردو شروحات (ناقص و مکمل) بازار میں دستیاب ہیں۔لیکن موضوع کی جامعیت، تراجم ابواب پر محققانہ کلام، امام بخاریؒ کے رجحان کی وضاحت، کتاب کے کامیاب حل اور مسلک حنفیہ کی تشریح وترجمانی کی حیثیت سے 'ایضاح البخاری' کو ممتاز مقام حاصل ہے۔ کتاب کے باوزن اور معتبر ہونے کے لیے صاحب افادات حضرت شیخ فخرالدینؒ سے انتساب ہی کافی ہے۔ پھر سونے پر سہاگے کا کام حضرت الاستاذ مولانا ریاست علی صاحب علیہ الرحمہ نے فرمایا۔ آپ ایک کہنہ مشق استاذ فن اور ماہر حدیث، پختہ قلم کار اور باذوق انشاء پرداز ہونے کے ساتھ ساتھ حقیقتاً صاحب افادات کے مزاج شناس، ذوق علمی کے امین و سچے وارث اور ان کے علوم ومعارف کے شارح اور ترجمان ہیں۔ آپ نے دوسال (۷۷-۱۳۷۸ھ) حضرت شیخ کے درس بخاری میں شرکت فرما کر افادات کو قلم بند کرنے کا اہتمام فرمایا اور ہزاروں صفحات پر مشتمل گنجینۂ علم سپرد قرطاس کر کے محفوظ کر دیا اور طالبان علوم نبوت کو حضرت شیخ کے علوم سے کسب فیض کا موقع فراہم کیا۔ فجزاہ اللہ احسن الجزاء۔ حضرت الاستاذ علیہ الرحمہ نے دونوں سالوں کی تقاریر سامنے رکھ کر حضرت شیخ کے زمانے ہی میں ترتیب کا کام شروع کر دیا تھا۔ حضرت نے حرفاً حرفاً اصلاح بھی فرمائی، ترتیب ونہج پر خوشی ومسرت کا اظہار بھی کیا اور دعائیں بھی دیں۔حضرت شیخ کی زندگی میں ۱۳۰۰ (تیرہ سو) صفحات مرتب ہو کر طبع ہو چکے تھے۔

صاحب افادات کی علمی جلالت شان تو اپنی جگہ مسلم ہے ہی لیکن استاذ مرحوم کے حسن سلیقہ، انداز تفہیم اور باب سے متعلق مستند کتابوں سے مواد کی فراہمی نے شروح بخاری کا ایسا نچوڑ پیش کر دیا ہے کہ اب ایضاح البخاری کی حیثیت محض درسی افادات کی نہیں بلکہ ایک مکمل اور جامع شرح کی ہوگئی ہے۔

اب تک بفضلہ تعالیٰ ایضاح البخاری کی دس جلدیں منظر عام پر آ چکی ہیں، جلد ششم کی ترتیب سے حضرت مولانا محمد فہیم الدین صاحب بجنوری زید علمہ استاذ دارالعلوم دیوبند کی شکل میں آپ کو ایک ایسے جواں سال، ذی علم، با صلاحیت اور قابل قدر رفیق کار مل گئے تھے جنھوں نے نہ صرف حضرت الاستاذ کے متعین کردہ طرز ترتیب وتالیف کو ملحوظ رکھا ہے بلکہ خوب سے خوب تر بنانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ باری تعالیٰ کی ذات سے امید قوی ہے کہ یہ علمی سلسلہ جاری رہے گا اور جلد پایۂ تکمیل کو پہنچے گا (ان شاءاللہ)

جمعیۃ علماء ہند سے ربط

حضرت مولانا ریاست علی صاحب کو جمعیۃ علماء ہند سے فکری وابستگی شروع ہی سے رہی، حضرت مولانا سلطان الحق صاحب فاروقیؒ جو آپ کے پھوپھا تھے، پھر خسر بھی بنے اور جن کی سرپرستی میں آپ نے ازاول تا آخر نہایت کامیابی کے ساتھ تعلیمی مراحل اور ترقی کے منازل طے کیے۔ وہ حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی علیہ الرحمہ کے خاص مسترشد اور ان سے گہرا تعلق رکھنے والے تھے اور اس کا اثر پورے گھرانے پر تھا۔ پھر حضرت مولانا فخرالدین صاحب مرادآبادی علیہ الرحمہ شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند جن سے خصوصی تلمذ کا شرف حضرت الاستاذ کو حاصل رہا، وہ بھی جمعیۃ علماء ہند کے صدر باوقار تھے، اس لیے جمعیۃ علماء ہند کی تحریکات اور سرگرمیوں سے دل چسپی آپ کو برابر رہی اور حسب موقع پروگراموں میں شرکت بھی ہوتی رہی اور اسی تعلق کے نتیجہ میں آپ نے جمعیۃ علماء ہند کا ترانہ بھی تخلیق فرمایا۔

۱۰ مئی ۲۰۰۸ء کو جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ کا موقر رکن آپ کو نامزد کیا گیا، پھر اہتمام کے ساتھ آپ مجالس عاملہ میں شرکت بھی فرماتے رہے۔ ۶-۷/ مارچ ۲۰۱۱ء کو مسجد عبدالنبی میں منعقد ہونے والی مرکزی مجلس منتظمہ میں نیابت صدارت کے لیے آپ کا نام نامی پیش کیا گیا جس کو بالاتفاق منظور کر لیا گیا اور تاحیات جمعیۃ علماء ہند کے نائب صدر کے منصب پر آپ فائز رہے۔

حادثہ فاجعہ

۱۴۳۸ھ ماہ شعبان کی ۲۳ تاریخ فجر کی نماز سے قبل حضرت الاستاذ کے اچانک سانحہ ارتحال کی خبر سن کر طبیعت پر بڑا اثر ہوا، آپ کا سراپا، خوش اخلاقی، خورد نوازی، ظرافت، کسر نفسی اور محبت بھرا انداز نظروں میں گھوم گیا، وہ بیٹا عفان، بیٹا عفان کہہ کر مخاطب کرنا معمولی معمولی باتوں پر حوصلہ افزائی کے وقیع کلمات ارشاد فرما کر ہم جیسے ناکاروں کی ہمت بندھانا اور ساتھ ہی قابل اصلاح چیزوں پر شفقت بھری تنبیہ کی ایسی یادیں ستانے لگیں کہ دل بے قابو ہوگیا، ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا اور آنکھوں سے بے ساختہ آنسو بہہ پڑے۔

یہ تصور بے چین کیے دے رہا تھا کہ سفر میں ہونے کے باعث اپنے استاذ محترم کے آخری دیدار سے بھی محرومی رہے گی، رفیق محترم مولانا سعدان جامی صاحب سے ٹیلیفون پر رابطہ ہوا، تعزیت مسنونہ پیش کی، کچھ ڈھارس بندھی اور پھر مسجد نبوی میں سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ پاک پر اپنے شفیق ومہربان استاذ گرامی کے لیے دعائے مغفرت کی، اللہ پاک کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائیں اور آپ کی زریں خدمات کا اپنے شایان شان بدلہ مرحمت فرمائیں۔□□

حضرت مولانا ریاست علی ظفر بجنوریؒ-زندگی کے کچھ انمٹ نقوش

تحریر: مولانا محمد نوشاد نوری قاسمی (استاذ دارالعلوم وقف دیوبند)

بتاریخ ۲۳؍شعبان ۱۴۳۸ھ- مطابق ۲۰؍مئی ۲۰۱۷ء بروز ہفتہ حضرت مولانا ریاست علی ظفر بجنوری علیہ الرحمۃ کے انتقال سے، علم وادب، فضل وکمال، صلاح وتقوی، شرافت وذہانت، حاضر جوابی وبیدار مغزی کا وہ روشن مینار ہمیشہ کے لیے ہمارے درمیان سے روپوش ہوگیا، جس سے علم وفن کی عظمتیں قائم، اورعہد رفتہ کی یادیں تازہ تھیں، ان کا سانحۂ وفات، بلاشبہ ایک عہد کا خاتمہ، اور اقدار اور وایات، نیز فکر ونظر کی گہرائی وپختگی کے ایک ایسے مضبوط ستون کا انہدام ہے، جس کی تلافی آسان نہیں۔عربی شاعر عبدہ بن طیب نے کیا خوب کہا ہے:

فما کان قیس هلکه هلک واحد

ولکنه بنیان قوم تهدما

(ترجمہ:قیس کی ہلاکت ایک فرد کی ہلاکت نہیں، بلکہ ایک قوم کی بنیاد کا زمیں دوز ہونا ہے)

اب کسے بتائیں کہ حضرت الاستاذ عہد ساز بھی تھے اور اپنی ذات میں ایک عہد بھی، تاریخ نویس بھی تھے اور خود ایک تاریخ بھی، ان کے جاننے والے جانتے ہیں کہ ان پر کبھی کسی کا علمی رُعب قائم ہی نہیں ہوسکا، کہ وہ خود بحر زخار تھے، کمزور اور فاسد افکار ونظریات کا ان کے پاس سے گزر ممکن نہیں تھا کہ وہ فکر اسلامی کے نکتہ شناس جوہری تھے، صاف گوئی سے کوئی مصلحت مانع نہیں ہوتی تھی کہ وہ قلندرانہ مزاج رکھتے تھے۔ ان کی زندگی گوناگوں خصوصیات کی وجہ سے اس لائق ہے کہ پوری تفصیل اور سنجیدگی سے اس کا مطاالعہ کیا جائے اور اسے سرمۂ چشم بنایا جائے، خوشی کی بات ہے کہ متعدد اہلِ قلم نے اس فریضہ کو بحسن و خوبی انجام دینے کی کوشش کی ہے، یہ ممکن نہیں کہ ایک مختصر سے مضمون میں، حضرت کی زندگی کا سارا نقشہ کھینچ دیا جائے، تاہم فکر وخیال کی ادنیٰ سی حرکت سے میرے ذہن ودماغ پر، حضرت کی زندگی کے بہت سے نقوش اُبھر آئے ہیں، جن کی مختصر فہرست بھی بناؤں تو یہ گوشے لازماً اس کا حصہ ہوں گے:

(۱) بے مثال سادگی (۲) مہمان نوازی (۳) مشفقانہ مزاج (۴) فکر و خیال کی پختگی (۵) بلا کی معاملہ فہمی (۶) تحریک دیوبند کی معنویت کا گہرا ادراک (۷) باطل افکار ونظریات کی تردید میں آپ کا منہج (۸) باکمال مدرس اور خصوصیات تدریس (۹) ایک ممتاز محدث اور شارح حدیث (۱۰) شعری و ادبی خصوصیات۔ میری خواہش تو یہی تھی کہ میں زندگی کے ایک گوشہ ہی پر بھر پور لکھوں، لیکن فارسی کے شاعر نے کیا ہی خوب کہا ہے:

زفرق تابقدم ہر کجا کہ می نگرم — تمنا دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

اس لیے چند نقوش کے سرسری تذکرے سے ہی دل کی تسلّی اور حضرت کی روح کو نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کی سعادت حاصل کی جارہی ہے۔

(۱) بے مثال سادگی

حضرت انتہائی سادگی پسند، متواضع اور منکسر المزاج تھے، تکلف اور تصنع سے آپ کو طبعی بیر اور تنفر تھا، آپ کی سادگی آپ کے ہر عمل سے نمایاں تھی، لباس پوشاک، انداز بود وباش، گفتگو اور درس سبھی کاموں میں یہ سادگی نظر آتی تھی، لباس آپ کا انتہائی متواضع اور سادہ ہوتا تھا، چھوٹے دامن کا کرتا، علی گڑھی پاجامہ، اور انتہائی سادہ کپڑے کی دوپلی ٹوپی اور اخیر عمر میں ایک چھوٹی سی چھڑی آپ کی ظاہری ہیئت کذائی کا مکمل آئینہ تھی۔ علم وفن کی دیرینہ شناوری اور غوّاصی، نیز نکات اور معارف کی ہزاروں داستانیں اپنے سینے میں محفوظ رکھنے کے باوجود کیا مجال تھی کہ علمی خود پسندی کی کوئی بوبھی آپ کی گفتگو اور اندازِ زندگی سے محسوس کی جاتی، وہ درسگاہوں میں بھی بڑی خوبصورتی سے اپنے عجز کا اعتراف کرتے، اور غیر ضروری سوالات پر طرح دے جاتے، بیش تر مسائل میں، اپنی رائے پیش کرنے کے بعد، دوسرے علماء واکابرین سے بھی رجوع ہونے کا مشورہ دیتے، اپنے چھوٹوں کے کاموں کا کھلے دل سے اعتراف کرتے، اور انھیں حوصلہ دیتے، بلکہ بعض دفعہ آگے بڑھ کر مناسب کاموں کا مشورہ دیتے، نہ جانے کتنے علمی کام ہیں جو ان کے مشورہ سے انجام پذیر ہوئے۔ یہ سب ان کی فطری سادگی اور کشادگی قلب ونظر کی دلیل ہے۔

(۲) مہمان نوازی

دیوبند میں ان کی مہمان نوازی مثالی تھی، ان کے دسترخوان کی وسعت کا ہر کوئی معترف ہے، وہ اس معاملہ میں اپنے ہم عصروں میں بہت ممتاز تھے، دیوبند آنے والے کتنے ہی لوگ ایسے ہوتے جو ان کی نفاست طبیعت اور ذوق مہمان نوازی کی وجہ سے، پہلے سے ہی طے کر لیتے کہ حضرت کے یہاں قیام اور طعام کرنا ہے، اور وہ بلا تکلف حضرت سے اس خواہش کا اظہار فرماتے اور حضرت خوشی خوشی اسے گوارہ کر لیتے۔

حضرت جیسے مہمان نواز کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ مہمانوں اور ملاقاتیوں کی آمد کا کوئی خاص وقت مقرر کردیں، ان کا دروازہ ہر وقت کھلا ہوا تھا، اس لیے ان کا علمی مشغلہ بھی کافی متاثر ہوتا، لیکن وہ اسے سنت نبوی سمجھ کر انجام دیتے اور ثواب کی نیت رکھتے، ۲۰۰۹ء میں ہم لوگ تکمیل عربی ادب میں داخل تھے، ایک دن درسگاہ سے باہر نکلتے ہوئے راستے میں، ہم کچھ ساتھیوں نے رائے دی کہ ملاقات کا کوئی وقت مختص کردیا جائے، تو مسکرانے لگے اور فرمایا:

’’طبیعت اس پر آمادہ نہیں ہوتی، بد اخلاقی سی معلوم ہوتی ہے۔‘‘

(۳) مشفقانہ مزاج:

ان کے مزاج میں عجیب قسم کی شفقت اور خیر خواہی کا عنصر تھا، ان سے مل کر یہ معلوم ہوتا کہ ہم نے اپنے کسی انتہائی خیر خواہ اور مشفق آدمی کو پالیا ہے، درس کے وقت یہ شفقت اور نمایاں ہو جاتی، طلبہ کو بیٹے اور مُنّے سے ہی خطاب کرتے، ہم نے حضرت کا جو زمانہ دیکھا ہے اس میں آپ کی ذمہ داریاں چند گھنٹوں کی تدریس میں منحصر تھیں، لیکن سنا ہے کہ جب وہ ناظم تعلیمات جیسے اہم اور ممتاز عہدے پر فائز تھے تو بھی طلبہ کی خیر خواہی، اور شفقت کے ساتھ معاملات کو حل کرنے کا امتیازی انداز رکھتے تھے، ان کے کلام میں بلا کی شیرینی اور لطافت ہوتی، جس سے سننے والا غیر شعوری طور پر، حضرت کے علم و فضل اور اخلاق کا قائل ہو جاتا۔

(۴) فکرو خیال کی پختگی:

پختگیِ فکر و خیال کے باب میں وہ ایک انتہائی مستند انسان تھے، بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ دیوبند میں ایک معیار کا درجہ رکھتے تھے، ان کی باتوں میں شک و تردد کا کوئی عنصر نہیں ہوتا، وہ بڑی صفائی اور حق گوئی کے ساتھ اپنا موقف رکھتے، وہ جہاں بلائے جاتے، چلے جاتے، لیکن اپنے موقف میں کوئی لچک نہیں رکھتے، کسی بھی نظریاتی مسئلہ میں ان کی رائے، اعتدال اور صحت کے اعتبار سے حرف آخر کا درجہ رکھتی تھی، اس بات میں کسی کو شک اور تردد ہو تو ہو، لیکن حضرت سے عقل و شعور کی بیداری کے ساتھ استفادہ کرنے والے تمام حضرات اس بات پر متفق ہوں گے۔ اس درجہ پختگی کی بظاہر وجہ یہ تھی کہ وہ کوئی بھی نظریہ تقلیداً اختیار نہیں کرتے تھے، بلکہ نقلی و عقلی دلائل کی روشنی میں ہی کوئی نظریہ قائم کرتے، اس لیے انھیں اپنی بات مدلل کرنے میں کوئی تکلف نہیں ہوتا تھا، وہ برجستہ اپنے نظریات کو اس طرح مدلل کرتے کہ معلوم ہوتا یہ مسئلہ نظری نہیں، بلکہ بدیہیات میں سے ہے اور اس میں شک و شبہ پیدا کرنا اپنے عقل و شعور کی بیداری پر سوال اٹھانا ہے۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ انھیں قائل کرنا بھی آسان نہیں تھا، اس لیے کہ وہ نظریاتی مسائل میں، بڑی معروضی نگاہ رکھتے تھے، اور مسائل کے ہر گوشے پر ان کی نگاہ ہوتی تھی، وہ ایک دو جملوں میں ہی اپنا مدعا پیش کرنے کا ہنر جانتے تھے، بارہا ایسا ہوا کہ جلسوں اور سیمیناروں میں شرکاء کی اکثریت کسی ایک رائے پر زور دیتی، آپ اس رائے کے کمزور پہلو کو اُجاگر کرتے اور بعد والے تمام لوگ آپ کی تائید میں ہی عافیت محسوس کرتے۔

مجھے خوب اچھی طرح یاد ہے کہ ۲۰۱۰ء میں دارالعلوم وقف دیوبند میں اسلامک فقہ اکیڈمی کا ایک سیمینار ہوا تھا، جس کا موضوع غالباً ’مدارس اسلامیہ میں فقہ اسلامی کی تدریس منہج اور طریقۂ کار‘‘ تھا، اس سیمینار کی کسی ایک نشست میں حضرت بھی شریک تھے، اس سیمینار کی تقریباً تمام ہی نشستوں میں شرکاء نے مدارس کے نصاب میں تبدیلی اور علوم جدیدہ کو شامل کرنے کی پُر زور وکالت کی تھی، اس نشست میں بھی لوگ اسی دھارا پر بہنے لگے، معاملہ بڑا نازک ہو چکا تھا، آخر میں حضرت کو خطاب کا موقع ملا، حضرت نے فرمایا: ’’حیرت ہے کہ سیمینار کے موضوع کا مدارس کے نصاب اور علوم جدیدہ کے شامل کرنے سے کیا تعلق ہے؟ میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ شرکاء حضرات، فقہ کے منہج تدریس پر اپنے تجربات کی روشنی میں کچھ اظہارِ خیال فرمائیں گے، یا موضوع سے متعلق کسی مناسب کتاب کے شامل نصاب کرنے کی رائے اور تجویز پیش کریں گے، لیکن یہاں تو معاملہ ہی الٹا ہوا ہے، لوگ مجتہدانہ انداز میں اپنی رائے پیش کر رہے ہیں، جس کی اجازت ہر کس و ناکس کو نہیں دی جاسکتی‘‘ الفاظ میرے ہیں، لیکن مضمون یہی تھا، بعید نہیں کہ الفاظ بھی ملتے جلتے ہوں، یہ چند سادہ سے جملے تھے، جنھوں نے گم گشتہ خیال لوگوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا، دُکھتی رگ پر ایک نباض نے اپنی انگلی رکھ دی تھی، لوگ شرمندگی سے اپنی نظریں چراتے ہوئے نظر آ رہے تھے، اور بعد کے تمام لوگوں کو اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ اصل موضوع پر گفتگو کریں۔

اسی طرح یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ ۲۰۰۶ء میں، دارالعلوم دیوبند میں رابطۂ مدارس اسلامیہ کا اجلاس ہو رہا تھا، مرکزی حکومت اس وقت مدارس کی جدید کاری اور اس سے متعلق اُمور کا منصوبہ بنا رہی تھی، اہل مدارس اور بہی خواہان قوم کی نگاہیں فطری طور پر، دارالعلوم دیوبند پر جمی ہوئی تھیں، کہ یہی امت مسلمہ کی امیدوں کا مرکز، اور خطرناک حالات اور مشکل گھڑی میں اُمت کی قیادت کا فریضہ انجام دیتا رہا ہے، بہت ہی اہتمام سے اجلاس کا انعقاد ہوا، اتنی بات صاف تھی کہ مدارس کو بورڈ سے جوڑنے کی حکومتی کوشش، ایک دھوکہ اور مدارس کے نظام میں کھلی مداخلت کا مقدمہ ہے، رابطہ مدارس اسلامیہ کے جنرل سکریٹری حضرت الاستاذ مولانا محمد شوکت علی قاسمی بستوی دامت برکاتہم نے مجھے اس پر مقرر کیا تھا کہ میں حضرات مقررین کی تقاریر کو قلم بند کروں یا کم از کم خلاصۂ تقاریر اپنے الفاظ میں لکھ لوں، اس مجلس سے مجھے بھی بہت فائدہ ہوا اور دارالعلوم کے نظام تعلیم کے مزاج و مذاق کو سمجھنے کا ایک بہترین موقع میسر آیا، میں نے دیکھا کہ حضرات مقررین کے کلام میں تکرار بہت زیادہ ہے، اور اصولی طور پر باتیں دارالعلوم کے اصول ہشت گانہ، جو خود بانیٔ دارالعلوم حضرت الامام محمد قاسم النانوتویؒ کے قلم کا شاہکار ہیں۔ کے اردگرد گھوم رہی ہیں، شاید سبھی حضرات کے دِلوں میں یہ بات آ رہی ہوگی کہ اس موضوع پر کوئی ایسی بات بھر پور انداز میں ہو جائے، جو حرف آخر کا درجہ رکھتی ہو۔

شرکائے اجلاس کو یاد ہوگا کہ یہ فریضہ بہت ہی خوبصورتی کے ساتھ حضرت الاستاذ مولانا ریاست علی ظفر بجنوری رحمہ اللہ نے انجام دیا، حضرت نے ابن ماجہ شریف کی ایک حدیث کی روشنی میں، اس موضوع پر ایسی تقریر کی کہ معلوم

ہو رہا تھا کہ مدرسہ بورڈ ہی کے بارے میں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ہدایات اُمت کو دی ہیں، سننے والے حضرات عش عش کرنے لگے، انھوں نے اپنی بات بڑے ہی متواضعانہ انداز میں کہی، شروع میں ہی کہا، کہ میں تقریر کا آدمی نہیں ہوں، ہاں! میں مامور ہوں، اس لیے بولنا مجبوری ہے، علوم وفنون کے نکات تو آپ ان حضرات کے پاس تلاش کریں جو یہاں تشریف رکھتے ہیں، لیکن مجھے تو بس ایک حدیث یاد آ رہی ہے، جو اس موقع پر ہماری رہنمائی کر سکتی ہے، پھر وضاحت شروع کی۔ وہ دن ہے اور آج کا دن، اس تقریر کی لذت آج تک محسوس کرتا ہوں، اور دارالعلوم کے تعلیمی نظام پر تقلیداً نہیں، بلکہ بصیرت کے ساتھ فخر کرتا ہوں۔

(۵) تحریک دیوبند کی معنویت کا گھرا ادراک:

یہ بات لکھنے میں مجھے کوئی تامل نہیں کہ حضرت الاستاذ کو تحریک دیوبند کی معنویت، اس کی خصوصیات کا بڑا گہرا ادراک تھا اور اس وصف میں وہ اپنے بہت سے عصروں میں ممتاز تھے، حضرت مولانا سیّد ارشد مدنی دامت برکاتہم صدر جمعیۃ علماء ہند واستاذ حدیث دارالعلوم دیوبند کا یہ جملہ حضرت الاستاذؒ کی اس انفرادیت کا راز فاش کرتا ہے، مولانا فرماتے ہیں: ''مولانا (ریاست علیؒ) کی طرح دارالعلوم کو سمجھنے والا کوئی دوسرا نہیں ہے۔'' (مولانا محمد سلمان صاحب بجنوری، ماہنامہ دارالعلوم دیوبند، اٹھتے جاتے ہیں اب اس بزم سے ارباب نظر، ص۴۳)

انھوں نے تحریک دیوبند کو بڑی باریک بینی سے سمجھ رکھا تھا، اور یہ جوہر انھیں اپنے پھوپھا اور مربی سابق ناظم کتب خانۂ دارالعلوم دیوبند جناب مولانا سلطان صاحب بجنوری (جو انتہائی ذمہ دار عالم دین، بزرگوں کے صحبت یافتہ اور اپنے وقت میں دارالعلوم کے افکار ونظریات کے بے باک نمائندہ تھے) کی صحبت وتربیت سے ملا تھا، انھوں نے حضرت کی علمی اور فکری تربیت میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی، اس تربیت اور حضرت کی خداداد صلاحیت وذہانت نے انھیں علمی وفکری میدان کا کامیاب شہسوار بنا دیا تھا۔ اسلام کی تاریخ اصلاح وتجدید اور اس کے باعزیمت کرداروں کے احوال، خصوصیات اور پس منظر سے حضرت کی واقفیت بڑی گہری تھی، بالخصوص ہندوستان میں تاریخ دعوت و عزیمت کے محوری قطب حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی اور ان کے اخلاف و تلامذہ کی مجاہدانہ سرفروشیاں اور ان کی علمی، تجدیدی اور اصلاحی خدمات اور کارناموں پر وہ گہری نگاہ رکھتے تھے، شاید اسی وجہ سے تحریک دیوبند، اس کی معنویت وخصوصیات، دیگر تحریکات کے درمیان اس کے امتیاز اور عالم اسلام پر اس کے گہرے اثرات کے باب میں، وہ بہت ہی مستند محقق اور عالمِ دین تھے۔

بلاشبہ ان کی تصانیف بہت زیادہ نہیں ہیں اور انھوں نے خطابت کو بطور ایک فن اپنایا، جس سے ان کے علم وفن اور فکر وخیال کی اشاعت وفروغ کا بہتر سامان مہیّا ہوتا، لیکن انھوں نے جو کچھ بھی لکھا اور جو کچھ کہا، اس میں تحریک دیوبند اور اس کی خصوصیات کے بیان کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔

اس کی سب سے بڑی دلیل ترانۂ دارالعلوم دیوبند ہے، جو نہ صرف ان کی ادبی مہارت اور شعری پختگی کی دلیل ہے، بلکہ تحریک دیوبند سے بے پناہ عقیدت ومحبت کا شاہکار اور اس کی تاریخ وکارناموں کی شاندار خراجِ عقیدت بھی ہے، اور اس باب میں ان کے یہ اشعار، اس بات کے غماز ہیں کہ وہ فکر دیوبند کے عظیم شارح ونمائندہ، علماء دیوبند کے باعزیمت کردار کے امین، اور اس کی تعبیر وتشریح کی غیر معمولی قوت بیان رکھتے تھے۔

جب ذکر ترانۂ دارالعلوم کا آ ہی گیا ہے تو یہ بات بھی لکھ دینے میں کوئی حرج نہیں، بلکہ موقع کی مناسبت سے ضروری ہے کہ اس حقیر کو ان اکابرین کی تحریروں کے پڑھنے کا بڑا شغف رہا ہے جنھوں نے بالخصوص فکر دیوبند کی تشریح و ترجمانی کے میدان میں نمایاں کردار ادا کیا ہے، اور ایسے بزرگان کے نام اور کام سے اہل علم حضرات واقف ہی ہوں گے، لیکن یہ بات بڑی ذمہ داری اور احتیاط کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ حضرت مولانا ریاست علی ظفرؒ نے، تاریخ دیوبند اور تحریک دیوبند کی تشریح وترجمانی کے لیے، الفاظ وتعبیرات کو ایک نئی جہت دی، فرسودہ الفاظ اور رسمی الفاظ سے ہٹ کر ایسے الفاظ اور انداز کو اختیار کیا، جن میں نسیم صبح کی لطافت، خورشید جہان تاب کی حرارت، شاخوں کی لچک، خوشبو کی مہک، تلوار کی دھار، اور مجاہد کی یلغار کا عکس نظر آتا ہے، ایسا اسلوب جو زندہ اور زندگی بخش ہے، ایسا سحر البیان جو پھول کو شعلہ اور سرو کو مینارہ بنانے کی صلاحیت رکھے: ہر پھول یہاں اِک شعلہ ہے، ہر سرو یہاں مینارہ ہے۔

فکر دیوبند کی عظمت اور اس کے خوشبودار کردار کے لیے اس سے بہتر بھلا کیا تعبیر ہو سکتی ہے:

خود ساقیِ کوثر نے رکھی، میخانہ کی بنیاد یہاں
تاریخ مرتّب کرتی ہے، دیوانوں کی روداد یہاں
جو وادیِ فاراں سے اٹھی، گونجی ہے وہی تکبیر یہاں
ہستی کے صنم خانوں کے لیے، ہوتا ہے حرم تعمیر یہاں
برسا ہے یہاں وہ ابرِ کرم، اٹھا ہے جو سوئے یثرب سے
اس وادی کا سارا دامن، سیراب ہے جوئے یثرب سے
کہسار یہاں دَب جاتے ہیں، طوفان یہاں رُک جاتے ہیں
اس کاخ فقیری کے آگے شاہوں کے محل جھک جاتے ہیں

دارالعلوم کے لیے کاخ فقیری، صحن چمن، بام حرم، بزم ولی اللّٰہی مجلس مے، اخلاص کا تاج محل، چراغ نعمانی، سایۂ خلد بریں، وادیِ ایمن، قلزم عرفاں، خورشید دین احمد اور کردار اسلاف جیسی پُر شکوہ تعبیریں، کردار دارالعلوم کے بیان کے لیے: دیوانوں کی روداد، تکبیر وادیِ فاراں گل بانگ سحر، اذان آزادی، تنویر نبوت کی ضو، شمع حرم کی پرتو، یعقوب کی لے، عابد کا یقین، قاسمی فطرت، عزم

حسین احمد، رومی کی غزل، رازی کی نظر، غزالی کی تلقین، جمال انور، پیمانۂ فخر الدین، یقین کا سوز، ساز معانی کے نغمے، طیبہ کی مے، گیسوئے برہم کو سنوارنا، آواز فطرت، پروانۂ شمع نور، تعلیم کلیم طور اور انوار حرم کی تابانی جیسے انوکھے اور پرشوکت الفاظ، صرف ایک شاعرانہ خیال نہیں، بلکہ تحریک دیوبند، اس سے وابستہ شخصیات اور اس کے روشن کردار کے بیان کے لیے الہامی الفاظ ہیں، جن میں زندگی ہے، حرارت ہے، حقیقت کی صحیح منظرکشی ہے، شعرو ادب کا جادو ہے، دارالعلوم کی عظمت کو سلام ہے، دیوبند کے ہر کردار کو شاندار خراجِ عقیدت ہے، جس میں تصنع نہیں، حقیقت ہے، وہم وخیال نہیں، یقین کی روشنی ہے۔ تخیل کی یہ بلند پروازی بجائے خود اس بات کی دلیل ہے کہ اس کا لکھنے والا غیر معمولی فنکار اور دارالعلوم کی عظمت کا خوش نوا حدی خواں ہے۔

دیکھا گیا ہے کہ بعض دفعہ فکر وخیال کی پختگی کی بنیاد پر انسان کا انداز گفتگو جارحانہ اور غیر شائستہ ہوجاتا ہے، وہ مسالک و مذاہب کے بیان میں انتہائی غیر سنجیدہ اور غلو آمیز باتیں کہتا ہے، لیکن علماء دیوبند کا طرۂ امتیاز رہا ہے کہ اس باب میں ان کا دامن افراط وتفریط کے عیوب سے پاک رہا، مولانا ریاست علی ظفرؒ اس وراثت کے امین تھے، افراط وتفریط، غلو اور تعسف سے ان کا دور کا بھی واسطہ نہیں رہا، شائستگی ہی ان کی پہچان تھی، شبنمی لطافت ان کے وجود کا عنوان تھی، ان کے شاگردوں کا یہی خیال ہوگا کہ حضرت کو غصہ نہیں آتا، لیکن کبھی غصہ آ بھی جاتا تو سخت الفاظ ان کی زبان پر نہیں آتے۔

ایک دفعہ سنن ابن ماجہ کے درس میں، پانچویں گھنٹے میں تشریف لائے، طلبہ کی تعداد اس دن بہت کم تھی، لیکن گھنٹے کے اخیر تک تمام طلبہ حاضر ہوچکے تھے، حضرت کی نرم مزاجی کا طلبہ نے غلط فائدہ اٹھانا شروع کردیا تھا، حضرت نے ایک دو دن کچھ نہیں کہا، لیکن دو دن کے بعد درس کے اخیر میں ایک جملہ فرمایا، جس کی لذت آج تک محسوس کررہا ہوں، فرمایا: ”بچو! میرا خیال ہے تم پڑھنے ہی آئے ہو، اگر یہی تمھارا بھی خیال ہے تو کل سے وقت پر درس گاہ میں حاضر ہوجانا“ اس جملہ پر تمام طلبہ بہت زیادہ شرمندہ ہوئے اور دیکھا گیا کہ اگلے دن حضرت کی آمد سے قبل ہی درس گاہ طلبہ سے بھر چکی تھی۔ یہی نرم دم گفتگو، ان کا اندازِ حیات تھی، وہ کسی بھی قیمت پر، مے نوشی کے وہ آداب جو دارالعلوم نے ان جیسے تشنہ لبوں کو سکھائے ہیں انھیں کھونا نہیں چاہتے تھے، اسی لیے ادب الاختلاف کی بہت زیادہ رعایت فرماتے تھے۔

(۶) باطل افکار ونظریات کے بارے میں آپ کا موقف:

موقف سے مراد ہے کہ افکار ونظریات کی تردید میں آپ کا منہج کیا تھا؟ یہ بات بڑی نازک ہے، اور مشکل بھی، نازک اس لیے کہ حضرت نے اپنا منہج کہیں لکھا ہی نہیں، بلکہ سرے سے انھوں نے تردید اور تنقید پر باضابطہ کوئی کتاب نہیں لکھی، تو اس باب میں جو بھی لکھا جائے گا وہ ان کی مختلف تحریروں اور ان کے مزاج شناس افراد کے بیان سے استنباط کیا جائے گا، اور یہ نازک کام ہے، مشکل اس لیے کہ ہر دور میں افکار ونظریات کی تردید کے لیے مختلف طریقے حالات اور وسائل کے لحاظ سے، اختیار کیے جاتے ہیں، بلکہ ایک دور میں ہی مختلف قسم کے مظاہر اور مناہج سامنے آتے ہیں، ایسے میں کسی کا منہج تردید متعین کرنا اور اس کی خصوصیات کو بیان کرنا ایک دشوار کام ہے۔ تاہم مجھے حضرت کی زندگی کے اس پہلو سے ایک خاص دلچسپی رہی ہے، اس لیے اسے لکھنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ بلاشبہ فضلاء دیوبند میں مجموعی طور پر یہ بات قدرے مشترک کے طور پر پائی جاتی ہے کہ باطل افکار ونظریات کو قبول کرنا ان کے لیے ممکن نہیں ہوتا، بلکہ غلط افکار ونظریات کی تردید کو اپنی ذمہ داریوں کا حصہ سمجھتے ہیں، بلکہ تاریخ کی شہادت ہے کہ انھوں نے اس عمل کے لیے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے سے بھی گریز نہیں کیا ہے۔

حضرت الاستاذ نے ترانۂ دارالعلوم میں، اس باب میں دارالعلوم کے صاف ستھرے عمومی مذاق کو بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے، ان کا ماننا ہے کہ باطل کے لیے یہاں کا ہر پھول شعلہ بن جاتا ہے، اور یہ کہ:

اس بزم جنوں کے دیوانے، ہر راہ سے پہنچے یزداں تک
ہیں عام ہمارے افسانے، دیوار چمن سے زنداں تک

حضرت الاستاذ بھی اس وصف میں بہت امتیازی شان رکھتے تھے، وہ تفرد اور تجدد کی راہ پر چلنے والے لوگوں کے افکار ونظریات کو بڑے سلیقے سے رد فرماتے، جمہور اہل سنت والجماعت کے مسلک اور برصغیر میں اس کے ذوق اعتدال کی حامل ممتاز علمی، اصلاحی وتجدیدی جماعت: جماعت دیوبند کے مسلک پر بڑی مضبوطی سے قائم تھے، غلط افکار ونظریات کی تردید میں ان کا مزاج بہت ہی سادگی لیے ہوئے تھا، وہ ان کی تردید مدلل کرتے، لیکن انداز سے ایسا محسوس ہوتا کہ آپ ان افکار ونظریات کو زیادہ اہمیت نہیں دے رہے ہیں، اور باتوں باتوں میں ہی ان کی جڑیں کاٹ ڈالتے۔ ’ایضاح البخاری‘ جو اُردو زبان میں بخاری شریف کی انتہائی معیاری شرح ہے، میں اس کے بہت سے نمونے پائے جاتے ہیں، ایک دو مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں:

قبروں پر پھول چڑھانا

بریلوی حضرات اور ان کے ہم مزاج اہل بدعت نے جہاں بہت سی بدعات ایجاد کی ہیں یا ان کی وکالت کی ہے، ان میں ایک بدعت قبروں پر پھول چڑھانا بھی ہے، خوش قسمتی سے انھیں ایک حدیث مل گئی، جس میں آپؐ نے دو قبروں پر کھجور کی ٹہنی ڈالی تھی، اس اُمید سے کہ سوکھنے سے قبل تک صاحب قبر کو عذاب میں تخفیف ہوگی، اس حدیث کو امام بخاریؒ نے ”باب من الکبائر ان لا یستتر من بولہ“ کے تحت نقل کیا ہے، اس حدیث کی وضاحت کرتے ہوئے حضرت الاستاذ نے بغیر نام لیے ہوئے بڑے مدلل انداز میں اہل بدعت کی تردید کی ہے۔

حضرت لکھتے ہیں: ''اب یہ بات رہ جاتی ہے کہ قبروں پر سبزہ لگانے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اس حدیث میں آیا ہے کہ سرکارِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شاخ کے دو ٹکڑے فرمائے اور دونوں کو الگ الگ رکھ دو قبروں پر رکھ دیا اور فرمایا: لعلہ ان یخفف عنہما مالم تیبسا، اگر اس کا ترجمہ یہ کیا جائے کہ ان ٹہنیوں کے خشک ہونے سے قبل ان دونوں کے عذاب میں تخفیف ہوجائے گی، تو یہ ارشاد قبروں پر سبزہ لگانے کے موضوع سے متعلق نہیں رہتا، اور اگر ترجمہ وہ کریں جو عام طور پر علماء کررہے ہیں کہ جب تک یہ شاخیں سبز رہیں گی، اس وقت تک عذاب میں تخفیف رہے گی، تو یہ ارشاد عذاب قبر کی تخفیف اور قبروں پر سبزہ لگانے کے سلسلے میں موضوع بحث بنتا ہے۔

آگے چل کر اس سلسلے میں دو فریق ہوگئے ہیں: ایک فریق قبروں پر سبزہ لگانے یا پھول ڈالنے کے سلسلے میں اس ارشاد کو اصل بنائے ہوئے ہے، یہ حضرات کہتے ہیں کہ آپ نے سبز ٹہنیوں کو لگا کر یہ ارشاد اس لیے فرمایا ہے کہ سبز شاخیں تسبیح خداوندی کرتی ہیں، اور ان کی تسبیح کی برکت سے عذاب میں تخفیف کی توقع ہوجاتی ہے، جب سبز درخت کی تسبیح کا یہ اثر ہے تو مقبورین کے ساتھ رحمت وشفقت کا تقاضا ہے کہ ہم وہ عمل کریں جس سے ان کے عذاب میں کمی یا اس کے ختم ہوجانے کی توقع ہو، چنانچہ ان حضرات نے قبروں پر سبزہ لگانے کے سلسلے میں مختلف عمل گھڑ لیے ہیں۔''

پھر آپ نے اس مسئلہ میں اہل حق علماء کا مسلک مدلل نقل کرنے کے بعد ایک اہم نکتہ کی طرف اشارہ فرمایا، لکھتے ہیں: ''آگے یہ بات کہ یہ ان درختوں کی تسبیح کا اثر ہے یا اس سلسلے میں حدیث ساکت ہے، ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ درخت کی تسبیح سے کہیں زیادہ تو آپ کے دست اقدس کی برکت ہے، جس سے آپ نے شاخ کو چیرا ہے، اور اس کو قبر پر رکھنے یا گاڑنے کا عمل بھی فرمایا ہے، ذرا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمومی شفقت اور آپ کی سفارش کا درخت کی تسبیح سے موازنہ کیجیے، کون کہہ سکتا ہے کہ ان دونوں میں کچھ بھی نسبت ہے؟'' (مولانا ریاست علی ظفر، ایضاح البخاری، ج۲،ص:۲۶۶-۲۶۷)

اس کلام میں نہ صرف اہل بدعت کی تردید کی گئی، بلکہ ان کے دعویٰ عشق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقت بھی اُجاگر کردی گئی، کہ وہ تخفیف عذاب کے عمل کو دست نبوی کی طرف منسوب کرنے کے بجائے، ایک بے حقیقت لکڑی کی طرف منسوب کرتے ہیں، اور اس پر عاشق رسول ہونے کا دم بھرتے ہیں، اس طرح اپنے مزاج کے مطابق بڑے ہی شیریں انداز میں، رد بدعت بھی کرگئے اور اہل بدعت کو آئینہ بھی دکھا گئے، اور خاص بات یہ ہے کہ کسی کا نام لیے بغیر مسئلہ کی پوری حقیقت واضح کردی۔

رفع یدین کے مسئلہ کا خلاصہ

نماز میں رکوع میں جاتے ہوئے، رکوع سے اٹھتے ہوئے، اسی طرح سجدے میں جاتے اور اٹھتے ہوئے ہاتھوں کو تکبیر تحریمہ کی طرح اٹھانا ان مسائل میں ہے، جن میں کچھ حضرات نے اپنی دلچسپی اس قدر بڑھالی ہے کہ انھیں ایمان وکفر کا معیار قرار دے رکھا ہے، وہ کسی بھی حال میں، اختلاف عمل کو گوارہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں، شاید اسی لیے علماء دیوبند کو اپنے موقف کی وضاحت کرنے کے لیے، ان مسائل کی حقیقت اور شریعت اسلامیہ کے صحیح موقف کی توضیح کی ضرورت پڑی، حضرت الاستاذؒ نے ایضاح البخاری میں اس مسئلہ پر تقریباً ساٹھ صفحات لکھے ہیں، اور مسئلہ کی معروضی انداز میں تحقیق پیش کی ہے، اور فریقین کے دلائل کا سنجیدگی سے جائزہ لیا ہے، نیز علماء دیوبند کے حقیقی ذوق کی بھی شاندار نمائندگی کی ہے، مسئلہ کی نوعیت واضح کرتے ہوئے حضرت رقم طراز ہیں: ''حقیقت یہ ہے کہ اس مسئلہ میں دونوں فریق کے راہ اعتدال سے تجاوز کرکے مناظرانہ انداز اختیار کرنے کے سبب، یہ مسئلہ اہمیت اختیار کرگیا، پھر عصر حاضر کی ادب واحترام سے محروم ایک جماعت کی جارحیت کے سبب، ہندوستان میں اس مسئلہ کو مزید اہمیت حاصل ہوگئی، ورنہ ائمہ مجتہدین کے درمیان تو اس مسئلہ میں اختلاف محض اولی وغیر اولیٰ یا افضل ومفضول کا ہے، جن ائمہ نے رفع یدین کو راجح قرار دیا ہے، ان کے یہاں ترک رفع بھی جائز ہے، اور جن ائمہ کا مسلک مختار ترک رفع ہے، ان کے یہاں رفع یدین بھی مباح ہے، حضرت گنگوہیؒ سے اس مسئلہ میں سوال کیا گیا تو تحریر فرمایا: میرا مسلک ترک رفع کا ہے، جیسا کہ قدماء حنفیہ نے فرمایا ہے، اور طعن بندے کے نزدیک کسی پر روا نہیں کہ مسئلہ مختلف فیہا ہے، اور احادیث دونوں طرف موجود ہیں، اور عمل صحابہ بھی، اور قوت وضعف مختلف ہوتے ہیں، بالآخر دونوں معمول بہا ہیں۔ (فتاویٰ رشیدیہ، ص۲۶۴)

حضرت گنگوہیؒ کی تحریر سے اکابر دیوبند کا ذوق معلوم ہوگیا کہ یہ متقدمین کے شدت پسند طبقہ سے دور تر ہیں اور ان میں سے اعتدال پسند طبقے کے رجحانات کے حامل ہیں، جیسے چوتھی صدی کے مشہور مفسر اور حنفی فقیہ امام ابوبکر جصاص (المتوفی سن ۳۷۰ھ) نے احکام القرآن میں کتب علیکم الصیام کے تحت رویتِ ہلال پر بحث کرتے ہوئے یہ اصول بیان کیا ہے کہ عوامی ضرورت اور فرض درجہ کے احکام کے ثبوت کے لیے خبر مستفیض کی ضرورت ہے اور اگر مسئلہ مسلمانوں کی عام ضرورت سے متعلق نہ ہو اور حکم بھی فرض کے درجے میں نہ ہو تو وہاں خبر مستفیض پر انحصار نہیں، اخبار آحاد سے بھی یہ احکام ثابت ہوسکتے ہیں اور ایسے مسائل میں فقہاء کے درمیان اختلاف عموماً افضل وغیر افضل کا ہوتا ہے، پھر انھوں نے اس کی مثال میں کلمات اذان واقامت میں اختلاف، رکوع میں جاتے وقت رفع یدین، تکبیرات عیدین وغیرہ کا شمار کیا ہے۔ (احکام القرآن، ج۱،ص۲۰۳،۲۰۴) معلوم ہوا کہ فقہاء شافعیہ میں جن لوگوں نے ترک رفع پر فساد یا فقہاء احناف میں جن لوگوں نے رفع یدین پر

کراہت کی کوئی بات کہی ہے وہ بیجا تشدد پر مبنی ہے اور اکابر دیوبند کے ذوق اعتدال کے منافی ہے۔'' (ایضاح البخاری، ج۴، ص۳۲۴)

اس مسئلہ کی اتنی معتدل اور انصاف پسند تشریح سب کے بس کی بات نہیں، یہ خاص علماء دیوبند کا مزاج ہے، جنھوں نے ادب الاختلاف اور اس کے اصولوں کی غیر معمولی رعایت کی ہے۔

اس کے بعد حضرت الاستاذؒ نے بڑی تفصیل سے اس مسئلہ کی وضاحت کی، اخیر میں رقم طراز ہیں: ''مسئلہ بذات خود اہمیت کا حامل نہیں، اولی غیر اولیٰ کا اختلاف ہے، لیکن مناظرانہ انداز گفتگو نے اس کی اہمیت میں اضافہ کردیا، اس لیے پہلے فریقین کے دلائل کا منصفانہ جائزہ لیا گیا، پھر مسئلہ کی تنقیح کے لیے تاریخی شواہد پیش کیے گئے، خلاصہ یہ ہے کہ احادیث دونوں طرف ہیں، امام بخاریؒ نے رفع یدین کو ترجیح دی ہے، اور اس مسئلہ کے لیے دو روایتیں پیش کی ہیں، لیکن ان دونوں روایتوں سے کسی بھی طرح رفع یدین کا سنت مستمرہ ہونا یا آخری عمل ہونا ثابت نہیں، اس لیے یہ کہنا پڑتا ہے کہ محدثین یا ان کے اصول کے مطابق فیصلہ کرنے والے حضرت ابن عمرؓ کی روایت میں پائی جانے والی سند کی ظاہری قوت سے متاثر ہو کر رفع یدین کا سرسری اور سطحی فیصلہ کر گئے اور انھوں نے ترجیح پر استدلال سے پہلے مندرجہ بالا حقیقت اور روایت میں پائے جانے والے طرح طرح کے اضطراب واختلاف کی طرف توجہ نہیں کی، ورنہ امام مالکؒ کی طرح ان کا فیصلہ ترک رفع کا ہوتا۔

یہ تو ہوا امام بخاریؒ کے مستدلات پر لیے گئے جائزہ کا اختصار، جہاں تک اس سلسلے میں پیش کردہ حقائق کا تعلق ہے، تو ان کا خلاصہ یہ ہے کہ ترک رفع راجح ہے جس کی وجوہ مندرجہ ذیل ہیں۔'' (ایضاح البخاری، حوالہ بالا)

یہ تحریر حضرت کے غیر معمولی تفقہ، آثار و روایات میں گہری بصیرت کے ساتھ، اختلافی مسائل میں ان کے ذوق اعتدال کی ترجمان ہے، جو علماء دیوبند کا خاصہ رہا ہے۔

(۷) باکمال مدرس اور خصوصیات تدریس:

حضرت الاستاذ کا سب سے بڑا کارنامہ آپ کی خدمت تدریس ہے، آپ باکمال مدرس تھے، علوم وفنون کا استحضار مثالی تھا، بغیر مطالعہ کے سبق پڑھانا انھیں گوارہ نہیں تھا، عجیب وغریب تفہیم اور ترسیلی صلاحیت کے مالک تھے، مشکل سے مشکل مضامین کو آسان الفاظ میں سمجھا دینا ان کے درس کی عجیب وغریب خصوصیت تھی، آسان الفاظ، دلکش انداز، سلیس تعبیریں، اچھوتے اشارے موقع کے لحاظ سے علمی ظرافتیں اور خاص قسم کا اسلوب گفتگو، آپ کی تدریس کے نمایاں اوصاف تھے۔

سنن ابن ماجہ کے درس میں قدر وجبر کا مسئلہ زیر بحث تھا، ابتدا درس میں ہی فرمایا: ''آج کا موضوع مسئلہ تقدیر ہے، اس مسئلہ کو بہت سے لوگ سمجھ نہیں سکے، اور اس کی تعبیر اپنی عقل نارسا کے ذریعہ کرنا چاہی اور ٹھوکر کھا گئے، جبکہ بیش تر لوگ آج بھی یہی سمجھتے ہیں کہ یہ مسئلہ بہت مشکل اور دقیق ہے، لیکن اللہ کی قدرت کہ حضرت الاستاذ سے جب میں نے پہلی دفعہ اس مسئلہ کی تشریح سنی، اسی دن سے میرا ذہن اہل سنت والجماعت کے موقف کی معقولیت پر مطمئن ہے، میرے لیے یہ مسئلہ کبھی بھی خلجان کا باعث نہیں ہوا اور میں شرح صدر کے ساتھ کسی کو بھی یہ مسئلہ بآسانی سمجھا سکتا ہوں۔'' اور پھر مسئلہ تقدیر کی وضاحت شروع کی، نیز تقدیر کے فوائد پر ایسی شاندار تقریر کی جو نہ پہلے سنی اور نہ ہی بعد میں۔ حضرت فرماتے تھے کہ عام طور سے لوگ جبریہ اور قدریہ کے پس منظر میں مسئلہ کو سمجھنا اور سمجھانا چاہتے ہیں جبکہ معاملہ ایسا نہیں ہے، یہ مسئلہ زمانہ اور حالات کی پیداوار نہیں ہے، نصوص نے اس کی وضاحت کی ہے، اس کی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی ہے اور اس کے اسرار وحکم کا بھی تذکرہ کیا ہے۔

درس میں حضرت کی ایک خاص خوبی یہ تھی کہ آپ کی باتیں حشو وزوائد سے پاک اور معمولات سے لبریز ہوتیں، اس لیے ذہین طلبہ کے لیے آپ کا درس معلومات کا ایک خزانہ اور اسرار وحکم کا گنجینہ ہوتا تھا۔ ۲۰۰۸ء میں ہم لوگ دورۂ حدیث شریف میں تھے، تعلیمی سال کا آغاز تھا، کچھ قدیم شناسا احباب کے ساتھ ایک دن عصر کی نماز کے بعد میں کھیتوں میں تفریح کے لیے نکلا، دورۂ حدیث کے نصاب کا ذکر چھڑ گیا۔ کچھ فضلا نے سنن ابن ماجہ کے نصاب پر اعتراض کیا، اس کی گفتگو کا حاصل یہ تھا کہ اس میں موضوع احادیث بکثرت ہیں، بعض احباب نے کہا کہ اس کتاب کا نصاب صرف اس کا مقدمہ ہے، مزید کچھ ابواب ہونے چاہئیں اور گویا جتنے منہ اتنی باتیں۔ اگلے دن میں درسگاہ پہنچا، میرے دل میں شکوک وشبہات بھرے ہوئے تھے اور دل میں آرزو تھی کہ چند ایام کے بعد حضرت سے شناسائی ہو جائے گی تو ان موضوعات پر بات کروں گا۔ حضرت الاستاذؒ درسگاہ میں تشریف لائے اور مقدمۂ کتاب کی اہمیت پر ایک ایسا جملہ ارشاد فرمایا جو شاید ایک گھنٹہ کی تقریر پر بھی بھاری ہے۔ فرمایا ''یہ مقدمہ اہل سنت والجماعت کے افکار ونظریات کا ایک جامع نصاب ہے، جو احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تیار ہوا ہے۔'' یہ جملہ سنتے ہی میرے ذہن ودماغ پر ایک بجلی سی کوندگئی۔ میں خوشی سے آبدیدہ ہو گیا۔ اطمینانِ قلب کے لیے گویا ایک غیبی سامان مجھے ہاتھ لگ گیا تھا اور بعد میں اس جملہ کی حقیقت مزید کھل کر سامنے آئی۔

تکمیل ادب میں حضرت الاستاذؒ سے البلاغۃ الواضحہ کا درس متعلق تھا، دراصل اسی سبق میں ہمیں حضرت کو سمجھنے اور قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، حضرت کا یہ درس علم وفن، شعر وادب، نکتہ آفرینی اور شیریں کلامی کا باغ و بہار ہوتا تھا۔ صاحبِ کتاب نے کتاب میں قواعد بلاغت کی مشق وتمرین کے ذیل میں کثرت سے بامعنی اشعار اور حکیمانہ اقوال نقل کیے ہیں۔ حضرت کسی دن

کسی شعر یا پرحکمت محاورہ کی تشریح کرنے لگتے تو فکر وخیال کے چشمے بہنے لگتے۔ الفاظ ومعانی کے موتی رولتے اور مجلس کو زعفران زار بنا دیتے۔

اس تعلق سے بہت سے واقعات قابلِ ذکر ہیں، لیکن اختصار کے پیشِ نظر ان کو ترک کیا جا رہا ہے۔

(۸) ایک ممتاز محدث اور شارح حدیث:

حضرت ایک عظیم محدث تھے اور تمام محدثانہ عظمتوں سے متصف اُردو میں صحیح البخاری کی مایۂ ناز شرح بنام 'ایضاح البخاری' حضرت کی محدثانہ شان اور درایت حدیث میں آپ کی فنّی مہارت کی روشن دلیل ہے، ایضاح البخاری سے حضرت کی زندگی کے متعدد وہ گوشے بھی نکھر کر سامنے آجاتے ہیں، جنھیں ان کے جاننے والے نظری طور پر جانتے ہوں گے، جیسے:

(۱) خالص علمی اور دقیق مباحث کو انتہائی آسان اور ادبی رنگ وآہنگ میں پیش کرنا جہاں آپ کی تحریری صلاحیت کو واشگاف کرتا ہے، وہیں آپ کی بے پناہ تفہیمی قدرت کا بھی پتہ دیتا ہے۔

(۲) مذاہب ومسالک کے درمیان منصفانہ تقابلی مطالعہ پھر دلائل کی روشنی میں ترجیح وتصحیح کا معیار قائم کرنا آپ کی تبحر علمی، وسعت مطالعہ خداداد فہم و فراست اور ادب الاختلاف کی غیر معمولی پاسداری کے رجحان کو واضح کرتا ہے۔

(۳) تشریح حدیث میں مقام نبوت اور کلام نبوت کی شان کو ملحوظ خاطر رکھنا، اور سلف صالحین کے تذکرے میں، چشم وابرو کو فرش راہ کر دینا آپ کی سلامتی طبع روشن ضمیری اور اسلاف سے بے پناہ عشق ومحبت کا پتہ دیتا ہے۔

(۴) بالخصوص اختلافی مسائل میں حدیث کے تمام طرق کا استیعاب اور اس کی فنّی خوبیوں اور خرابیوں کا اظہار، نیز رواۃ حدیث کے مقام ومرتبہ کی تعیین اور اس کی روشنی میں حدیث کی تشریح کرنا، فن حدیث میں آپ کی عبقری شان کو نمایاں کرتا ہے۔

(۵) احادیث کی تشریح میں، علماء دیوبند کے افادات سے استفادہ اور ان کے افکار وخیالات کی، ان کے ذوق کے مطابق ترجمانی، اپنے افکار ونظریات میں ان کے تصلب اور شرح صدر کی کیفیت کو بیان کرتا ہے۔

ظاہر ہے ان کے بارے میں لوگ یہ سب جانتے ہیں، لیکن ایضاح البخاری نہ ہوتی تو ان کو ثابت کرنا مشکل ہو جاتا۔

آپ کے درس حدیث میں شاید ہی کوئی دن ایسا ہو جب ہمیں کوئی علمی نکتہ ہاتھ نہ لگتا ہو، ایک دفعہ فرمایا: سنن ابن ماجہ کا مقام صحاح ستہ کے درمیان آخری ہے، کچھ علماء انھیں صحاح ستہ میں بھی شامل نہیں کرتے، لیکن اس سے علامہ ابن ماجہ قزوینیؒ (۲۰۹ھ-۲۷۳ھ) کے مقام ومرتبہ کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا کہ وہ بھی اصحاب تصنیف محدثین کے درمیان چھٹے نمبر پر ہیں، کیونکہ انھوں نے اپنے اختیار سے، کچھ خاص مصلحت کے پیش نظر قبول حدیث کے لیے آسان شرطیں رکھیں، وہ چاہتے تو اپنے لیے امام بخاریؒ کی شرطوں کا بھی التزام کر سکتے تھے، اور ان کی سنن، صحیح البخاری کے ہم پلّہ ہوتی، محدثین نے اپنے اپنے ذوق اور مصالح کے پیش نظر، احادیث نبویہ کو ضبط کیا ہے، جس سے ان کی تصنیفات کے درمیان مقام اور مرتبے کا فرق ہوا ہے، لیکن اس سے خود محدثین کا مقام متعین نہیں کیا جاسکتا، بعید نہیں کہ امام ابن ماجہؒ، روایت اور درایت کے باب میں امام بخاریؒ کے درجے کے ہوں، بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ بعض محدثین نے سرے سے کتاب ہی نہ لکھی ہو اور ان کی فہم حدیث، مشہور محدثین سے بہت بڑھ کر ہو، اس لیے کتاب کے چھٹے نمبر پر ہونے سے صاحب کتاب کا نمبر چھ پر ہونا ضروری نہیں' او کما قال۔

صحیح بات یہ ہے کہ حضرت کی زندگی کے بہت سے گوشے ایسے ہیں، جن پر بہت بسط کے ساتھ لکھا جانا چاہیے، اور مجھے یقین ہے کہ حضرت الاستاذؒ کے تلامذہ اور متعلقین میں بہت سے ایسے اہل قلم ہیں جو اس گوہر نایاب کے کمالات و خصوصیات سے پردہ اٹھائیں گے، خلاصہ یہ ہے کہ حضرت الاستاذؒ کی شخصیت، ایک جامع ترین شخصیت تھی، اور ان کی وفات کے ساتھ، علم وفن، شعر وادب، حکمت وظرافت، فہم وفراست، رسوخ فی العلم اور تصلب فی الدین نیز مکارم اخلاق اور بہت سی خوبیوں کا ایک پیکر جمیل ہم سے رخصت ہو گیا۔

میرے مشفق ومربی استاذ حضرت مولانا محمد سلمان صاحب بجنوری دامت برکاتہم۔ جو حضرت الاستاذؒ کے فکر وفن کو سمجھنے والوں میں بہت نمایاں ہیں۔ حضرت کی جامع شخصیت کے حوالے سے بہت صحیح لکھا ہے کہ" حضرت مولانا ریاست علی صاحب نوراللہ مرقدہ' کی وفات، دارالعلوم دیوبند میں ایک عہد کا خاتمہ ہے، ان کی ذات میں اللہ تعالیٰ نے ایسے گوناگوں اوصاف جمع کردیئے تھے، جو کسی ایک فرد میں کم ہی جمع ہوتے ہیں، جس سے ان کی شخصیت میں جامعیت کی شان پیدا ہو گئی تھی۔ اگر آپ رسوخ فی العلم، قوت استنباط، دقت نظر، سلاست بیان، فکر وتدبر، اصابت رائے، سلامتی فکر، صبر وقناعت، زہد واستغناء، تقوی و پاک دامنی، جود وسخا، غریب پروری ومہمان نوازی، ادائے حقوق، عالی حوصلگی وسیر چشمی، خوش گفتاری ونرم خوئی، شفقت ومحبت، احساس ذمہ داری، ذہانت وظرافت، بھرپور خود اعتمادی کے ساتھ کامل تواضع، قوت فیصلہ، دوربینی، دیانت وامانت، اعلیٰ تدریس وخطابتیں بے مثال نظم ونثر پر مثالی قدرت، سلیقۂ زندگی، آداب مجلس کی رعایت اور سادگی بے تکلفی کا مجسمہ نمونہ دیکھنا چاہیں تو وہ حضرت مولانا کی شخصیت تھی، اور یقین فرمائیں کہ ان اوصاف میں سے کسی کا تذکرہ بھرتی کے لیے نہیں کیا گیا، بلکہ ان کی شخصیت کے طویل مطالعہ پر مبنی ہے۔" (ماہنامہ دارالعلوم، جولائی ۲۰۱۷ء، ص۴)

اللہ تعالیٰ حضرت والا کی مغفرت فرمائے، آپ کی خدمات کو قبول فرمائے اور اپنی شان کریمی کے مطابق معاملہ فرمائے۔ آمین! □□

عصرِ حاضر کی جامع کمالات شخصیت
استاذ الاساتذہ حضرت مولانا ریاست علی صاحب بجنوریؒ

تحریر: مفتی ریاست علی قاسمی رام پوری (استاذ حدیث جامعہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد، امروہہ)

موت وحیات اس کائنات کی فطرت میں داخل ہے، ذات باری کے علاوہ ہر شے فانی اور اس کا وجود عارضی ہے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بعض انسانوں کا وجود مخلوق خداوندی کو فائدہ پہنچانے کے بجائے نقصان اور ضرر پہنچاتا ہے اور ان کے جانے سے کسی کو افسوس اور حزن وملال نہیں ہوتا ہے؛ لیکن انسانوں میں بعض اشخاص وافراد بے شمار مخلوق خداوندی کو نفع اور فائدہ پہنچانے والے ہوتے ہیں اور خلقِ کثیر کی نفع رسانی کا وہ سبب اور ذریعہ ہوتے ہیں، فیض رسانی کے مختلف اور متعدد ذرائع اور ابواب ان سے متعلق ہو جاتے ہیں۔ ایسے افراد کے دنیا سے رخصت ہوجانے پر بے شمار انسانوں کو افسوس اور غم ہوتا ہے؛ کیونکہ خیر کے متعدد ابواب ایسی شخصیات کے رحلت ہوجانے سے مسدود ہوجاتے ہیں اور خلقِ کثیر کی نفع رسانی اور فیض رسانی کا سلسلہ بند ہوجاتا ہے۔

ایسی ہی صاحب عظمت اور بافیض شخصیات میں ہمارے مؤقر، محترم، مشفق استاذ، پدر روحانی، بے شمار اوصاف اور کمالات سے متصف، دارالعلوم دیوبند کے عظیم محدث، صاحبِ طرز ادیب حضرت اقدس مولانا ریاست علی ظفرؔ بجنوری نور اللہ مرقدہٗ کی ذاتِ گرامی بھی ہے جو گذشتہ روز بے شمار متعلقین، اعزہ، اقرباء، تلامذہ، فرزندان دارالعلوم دیوبند اور محبانِ دارالعلوم دیوبند کو روتا، بلکتا چھوڑ کر چلے گئے۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون، ان لِلّٰهِ مَا أَعْطٰى وَلَهٗ مَا أَخَذَ وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهٗ بِأَجَلٍ مُسَمّٰى.

آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

درج ذیل سطور میں حضرت الاستاذ کا ذکر جمیل مختصر طریقہ سے پیش کیا جارہا ہے۔

ولادت اور ابتدائی تعلیم:

آپ کا اسم گرامی ریاست علی اور والد کا نام منشی فراست علی مرحوم ہے۔ آپ کی ولادت ۹؍مارچ ۱۹۴۰ء کو شہر علی گڑھ کے محلّہ حکیم سرائے میں ہوئی جہاں آپ کے والد محترم مرحوم بسلسلۂ ملازمت قیام پذیر تھے جبکہ آبائی وطن قصبہ دھامپور کے قریب موضع حبیب والا ضلع بجنور ہے۔ اسی آبائی وطن کی نسبت سے آپ بجنوری کہلاتے ہیں۔ حبیب والا میں دورِ اکبری سے شیوخ انصار آباد ہیں۔ آپ کا سلسلۂ نسب متعدد واسطوں سے میزبانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سیّدنا حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جاملتا ہے۔ ابتدائی تعلیم قرآن کریم ناظرہ اور دینیات گھر پر رہ کر اپنے خاندان کے بزرگوں سے حاصل کی، اور ۱۹۵۱ء میں درجہ پرائمری پاس کیا۔

دارالعلوم دیوبند میں داخلہ:

اسی سال ۱۹۵۱ء کے اواخر میں اپنے پھوپھا حضرت مولانا سلطان الحق صاحب فاروقی قدس سرہٗ کے ہمراہ دیوبند تشریف لائے اور دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لے کر فارسی اور ابتدائی عربی سے لے کر دورۂ حدیث تک تعلیم حاصل کی اور تمام ہی کتبِ درسیہ از اوّل تا آخر اساتذۂ دارالعلوم سے پڑھیں۔ ۱۹۵۸ء میں دورۂ حدیث شریف سے فراغت پائی۔

اساتذۂ دارالعلوم دیوبند:

آپ کے دورۂ حدیث شریف کے اساتذۂ کرام میں فخر المحدثین حضرت مولانا سیّد فخر الدین صاحب ہاپوڑی ثم مرادآبادیؒ شیخ الحدیث وصدر المدرسین دارالعلوم دیوبند، حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب نور اللہ مرقدہٗ مہتمم دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا فخر الحسن صاحب مرادآبادی شیخ التفسیر دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا معراج الحق صاحب استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا نصیر احمد خاں صاحب بلند شہری، حضرت مولانا محمد حسین صاحب بہاریؒ، حضرت مولانا وحید الزماں صاحب کیرانویؒ، حضرت مولانا سیّد انظر شاہ صاحب کشمیریؒ، حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی دیوبندی مدظلہٗ وغیرہ شامل ہیں۔

ایضاح البخاری کی ترتیب واشاعت:

فراغت کے بعد تقریباً تیرہ سال تک اپنے مربی ومشفق استاذ فخر المحدثین حضرت مولانا سید فخر الدین صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی تربیت میں رہے اور اپنے استاذ کے درسِ بخاری میں شرکت فرما کر آپ کی تقاریر درس بخاری کو قلم بند فرماتے رہے اور متعدد سالوں کے دروس بخاری کی تقاریر علیحدہ علیحدہ محفوظ رکھتے رہے، پھر اپنے استاذ گرامی کی اجازت ومشورہ سے اس کو مرتب کر کے شائقین علوم حدیث کے استفادہ کے لیے شائع کرنے کا سلسلہ شروع فرمادیا، جس کا طریقہ کار یہ تھا کہ تمام سالوں کی تقاریر کو سامنے رکھ کر نیز شروح بخاری اور متعلقہ کتب کا مطالعہ فرما کر ایک مقالہ مرتب کیا جاتا تھا پھر حضرت مولانا

لقمان الحق صاحب فاروقی بجنوریؒ سابق استاذ دارالعلوم دیوبند اس کی مراجعت فرماتے تھے پھر حضرت فخر المحدثینؒ پوری تقریر از خود سماعت فرماتے اوراس کی اصلاح کراتے یا بعض دفعہ مسودہ اپنے پاس رکھ لیتے اور اپنے قلم سے اصلاح کرتے تھے۔ حضرت فخر المحدثین نوراللہ مرقدہٗ کی حیاتِ طیبہ میں تقریباً تیرہ سوصفحات کا مسودہ نظرِ ثانی اور تصحیح اور حضرت کی اصلاح کے بعد منصۂ شہود پر جلوہ نما ہوا اور شائقین علوم نبوت اس سے استفادہ کرنے لگے؛ لیکن حضرتؒ کی حیاتِ طیبہ میں اس بابرکت کام کی تکمیل نہ ہوسکی اور حضرت فخر المحدثین نوراللہ مرقدہٗ چند ماہ کی علالت کے بعد ۲۰؍صفر ۱۳۹۲ھ مطابق ۵؍اپریل ۱۹۷۲ء کو دارالعلوم دیوبند کی مسند حدیث، منصب صدارت تدریس کو چھوڑ کر اپنے مولائے حقیقی سے جاملے اور حضرت کے وصال کے بعد بھی حضرت مولانا لقمان الحق صاحب فاروقی نوراللہ مرقدہٗ کی معاونت اور اشتراک سے 'ایضاح البخاری' کی ترتیب وتسوید کا مبارک سلسلہ چلتا رہا اور قسط وار اس کی اشاعت بھی ہوتی رہی۔ پھر ۱۴۰۸ھ میں حضرت مولانا لقمان الحق فاروقی نوراللہ مرقدہٗ کے وصال کے بعد تنہا حضرت الاستاذ مولانا ریاست علی صاحب نوراللہ مرقدہٗ کی ذات گرامی ہی اس مبارک سلسلہ کے تمام مراحل (ترتیب، تسوید، مراجعت، کتابت، تصحیح، طباعت اور اشاعت) کوانجام دینے لگی؛ لیکن دارالعلوم دیوبند کے تدریسی اور انتظامی امور میں بے پناہ مشغول رہنے کی وجہ سے اس کام میں قدرے سستی اور تاخیر ہوتی رہی، بالآخر حیات مبارکہ کے آخری سالوں میں دارالعلوم دیوبند کے جواں سال فاضل، ذی استعداد عالم اور استاذ دارالعلوم دیوبند مولانا فہیم الدین صاحب بجنوری مدظلہ کا تعاون حضرت الاستاذ کو اس عظیم اور مبارک سلسلہ کو آگے بڑھانے کے لیے حاصل ہوا اور اس مبارک کام میں پیش رفت ہوئی۔ ترتیب وتسوید اور مراجعت کا کام مولانا فہیم الدین صاحب مدظلہ کرتے اور حضرت الاستاذ اس پر گہری نظر سے مطالعہ کرنے کے بعد اصلاح کرتے تھے، اس طرح تقریباً دس عظیم جلدیں ایضاح البخاری کی مرتب ہوکر شائع ہوچکی ہیں۔

امید ہے کہ حضرت والا کے معاون اور شریک کار مولانا فہیم الدین صاحب بجنوری اس سلسلہ کو مزید تیزی سے آگے بڑھا کر پایۂ تکمیل تک پہنچائیں گے، آج ایضاح البخاری حضرت الاستاذ نوراللہ مرقدہٗ کی حیاتِ جمیلہ کا امت مسلمہ کے لیے عظیم عطیہ اور لازوال کارنامہ ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کارنامہ کو تاقیامت زندہ وتابندہ رکھے اور امتِ مسلمہ کو زیادہ سے زیادہ استفادہ کی توفیق عطا فرمائے۔

فراغت دارالعلوم کے بعد کا شغل:

دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد آپ کے پھوپھا حضرت مولانا سلطان الحق صاحب نوراللہ مرقدہٗ سابق ناظم کتب خانہ دارالعلوم دیوبند نے اپنی دختر سعید اختر سے آپ کا نکاح کردیا اور آپ نے دیوبند میں قیام فرما کر کتابت کو ذریعۂ معاش کے طور پر اختیار کیا۔ بعد میں مکتبہ رحمت کے نام سے ایک اشاعتی اور تجارتی مکتبہ بھی قائم فرمایا جس سے 'تاریخ اسلام' مصنفہ مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی اور 'سیرتِ رحمۃ للعالمین' مصنفہ مولانا سیّد محمد سلیمان صاحب سلمانؔ منصوری پوری کی اشاعت عمل میں آئی۔ چاندی کی انگوٹھی کا کاروبار بھی تھا، جس پر حروفِ مقطعات کندہ ہوتے تھے جو تاحیات جاری رہا۔ درمیان میں الجمعیۃ بک ڈپو میں کچھ عرصہ ملازمت بھی کی جس کو بعد میں چھوڑ دیا۔

حضرت مولانا وحید الزماں صاحب کیرانویؒ کے معاون مہتمم منتخب ہونے کے بعد مستقل ناظم مجلس تعلیمی منتخب کیا گیا۔ آپ کے دورِ نظامت میں تعلیمات میں کافی اصلاحات عمل میں آئیں اور آپ نے شعبۂ تعلیمات کو بہت حد تک چست، فعال و متحرک رکھا اور طلبہ و اساتذہ یکساں طور سے آپ کے دورِ نظامت میں شاداں، فرحاں اور مطمئن رہے۔ آپ شعبۂ تعلیمات میں مسائل کا انبار جمع کرنے سے گریز کرتے تھے اور پیش آمدہ مسائل کو چٹکیوں میں حل فرماتے تھے۔

دارالعلوم دیوبند میں تقرر:

۱۳۹۱ھ مطابق ۱۹۷۱ء کو دارالعلوم دیوبند میں عربی مدرس کی حیثیت سے تقرر ہوا اور حضرت والا نے ابتدائی اور متوسطات عربی کتب کے علاوہ درجہ علیا کی کتب میں مشکوۃ شریف، شرح نخبۃ الفکر، ابنِ ماجہ شریف، ترمذی شریف اوّل کا عرصہ دراز تک درس دیا۔ البلاغۃ الواضحہ آپ کے ذوق کی کتاب تھی، اس کا تاحیات آپ درس دیتے رہے۔ حضرت مولانا سعید احمد اکبرآبادی نوراللہ مرقدہٗ کے وصال کے بعد کچھ عرصہ حجۃ اللہ البالغۃ کا بھی درس دیا جس کو بعد میں دوسرے اساتذۂ کرام کی جانب منتقل کردیا۔ آپ کا درس عام فہم اور علمی مواد سے بھرپور ہوتا تھا اور مشکل گتھیوں کو سلجھانا آپ کے لیے انتہائی آسان تھا۔ طلبہ عزیز آپ کے درس سے مطمئن ہوکر اپنی قیام گاہوں کی جانب واپس ہوتے تھے اور دلچسپی سے حاضر ہوتے تھے۔ راقم السطور کو حضرت سے ابنِ ماجہ شریف پڑھنے کا شرف

حاصل ہے۔ دورانِ درس عصرِ حاضر کے مسائل پر بھی سیر حاصل گفتگو فرماتے تھے۔ طلبہ کے اشکالات واعتراضات کو پوری توجہ سے سماعت فرماتے اور خندہ پیشانی سے ان کو حل فرماتے۔ طلبہ کے عمدہ کاموں کی حوصلہ افزائی اور نامناسب کاموں پر تنبیہ فرماتے تھے۔

ناظم مجلس تعلیمی اور دیگر مناصب پر تقرر:

اجلاسِ صد سالہ کے بعد دارالعلوم دیوبند میں قضیہ نامرضیہ پیش آنے کی وجہ سے انتظامیہ کی تبدیلی ہوئی تو اس کے بعد اوّلاً آپ کو نائب ناظم مجلس تعلیمی اور حضرت مولانا وحید الزماں صاحب کیرانوی نوراللہ مرقدہٗ کے معاون مہتمم منتخب ہونے کے بعد مستقل ناظم مجلس تعلیمی منتخب کیا گیا۔ آپ کے دورِ نظامت میں تعلیمات میں کافی اصلاحات عمل میں آئیں اور آپ نے شعبۂ تعلیمات کو بہت حد تک چست، فعال ومتحرک رکھا اور طلبہ واساتذہ یکساں طور سے آپ کے دورِ نظامت میں شاداں، فرحاں اور مطمئن رہے۔ آپ شعبۂ تعلیمات میں مسائل کا انبار جمع کرنے سے گریز کرتے تھے اور پیش آمدہ مسائل کو چٹکیوں میں حل فرماتے تھے۔ راقم السطور کے تین سالہ زمانۂ طالب علمی میں حضرت والا ہی ناظم تعلیمات رہے اور تعلیمات کے تعلق سے آپ کی جدو جہد اور کاوش کو قریب سے مشاہدہ کرنے کا موقع ملا۔

شیخ الہند اکیڈمی کے ڈائریکٹر کے منصب پر تقرر

بعد میں حضرت والا کو مجلس شوریٰ نے شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم کا ڈائریکٹر اور نگراں مقرر فرمایا اور ناظم مجلس تعلیمی کے عہدہ کے لیے حضرت الاستاذ مولانا قمرالدین صاحب گورکھپوری مدظلہٗ کا انتخاب فرمایا اور اکیڈمی سے وابستہ ہوکر آپ نے 'مجلسِ شوریٰ کی شرعی حیثیت' کے نام سے بلند پایہ کتاب تصنیف فرمائی جو اپنے موضوع پر منفرد کتاب تھی اور اس وقت کے حساس مسئلہ سے متعلق تھی۔ اس وقت کے تمام ہی محققین اور مؤقر علمائے کرام نے اس کتاب کی ترتیب وتصنیف پر آپ کو مبارکباد پیش فرمائی اور دعاؤں سے نوازا۔ مجلسِ شوریٰ میں آپ کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا۔ بلاشبہ حضرت والا کی مذکورہ تصنیف سے مجلسِ شوریٰ کی شرعی اور عرفی حیثیت اور بالادستی کو سمجھنے میں عوام وخواص کو خوب مدد ملی اور غلط فہمیوں کا ازالہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ اس کتاب کے افادہ اور اس سے استفادہ کو عام وتام فرمائے، آمین۔

دوسری طرف کئی صاحبِ قلم حضرات کی متعدد کتابیں بھی آپ کے زیر نگرانی اکیڈمی سے شائع ہوکر مقبول ہوئی۔ بعد میں حضرت والا نے اس عظیم ذمہ داری سے استعفیٰ دے دیا اور تصنیف وتالیف اور درس وتدریس کے لیے اپنے آپ کو یکسو کرلیا جو آپ کی طبیعت اور عادت تھی۔ اس کے باوجود متعدد مواقع پر حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب نوراللہ مرقدہٗ مہتمم دارالعلوم دیوبند کے کاموں میں برابر آنجناب تعاون فرماتے رہے۔ متعدد مواقع پر آپ کو قائم مقام مہتمم حضرت مہتمم صاحب کی غیر موجودگی میں بنایا جاتا تھا اور آپ اس عظیم ذمہ داری کو نبھاتے رہے۔ مجلسِ شوریٰ نے بارہا آپ کو نائب مہتمم کا منصب تفویض کرنا چاہا مگر آپ برابر معذرت فرماتے رہے۔ ایک موقع پر فدائے ملت حضرت مولانا سیّد اسعد مدنی نوراللہ مرقدہٗ آپ کے دولت کدہ پر تشریف لے گئے اور نائب مہتمم کا عہدہ قبول کرنے پر اصرار کیا مگر اس کے باوجود آپ نے انکار فرمادیا۔

تصنیف وتالیف:

مبدأ فیاض نے آپ کو تحریر وتقریر اور تصنیف وتالیف کا صاف ستھرا ذوق اور سلیقہ عطا فرمایا تھا چنانچہ آپ کے گہربار قلم سے 'ایضاح البخاری' اور 'شوریٰ کی شرعی حیثیت' جیسی عظیم الشان کتابیں وجود میں آئیں اور اسلامی لائبریریوں میں ان کو عظیم مقام حاصل ہوا اور علمائے کرام نے ان سے استفادہ کرکے اپنے علم میں اضافہ کیا۔ شعر وشاعری اور ادب کا آپ کو ربّ ذوالجلال نے بہت عمدہ ذوق عطا فرمایا تھا، چنانچہ ترانۂ دارالعلوم دیوبند آپ کی تخلیق کا عظیم شاہکار ہے جس میں آپ نے اپنے مادرِ علمی کو بہترین انداز میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے اور اشعار میں اس کی عظمتوں اور رفعتوں کا اعتراف کیا ہے۔ آج تک کسی بھی ادارہ کے فرزند نے اس سے بہتر خراجِ عقیدت اپنی مادرِ علمی کو پیش نہیں کیا ہے۔ اس کے علاوہ آپ کا منظوم کلام کا مجموعہ 'نغمۂ سحر' کے نام سے شائع بھی ہوچکا ہے۔ آپ نے تقریباً دوسال رسالہ 'دارالعلوم' کے ایڈیٹر کے فرائض بھی انجام دیئے اور اس کے اداریے لکھ کر اہلِ علم سے خراجِ تحسین وصول کیا۔ بعد میں یہ ذمہ داری آپ نے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی مدظلہٗ استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند کو سپرد فرمادی تھی۔

جمعیۃ علماء ہند سے تعلق اور وابستگی:

جمعیۃ علماء ہند سے حضرت والا کا تعلق طبعی اور فطری تھا۔ آپ کے پھوپھا حضرت مولانا سلطان الحق صاحب فاروقی بجنوریؒ حضرت شیخ الاسلام مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ کے عاشق، گرویدہ اور دلدادہ تھے اور جمعیۃ علماء ہند کی خدمات کے واقعات اپنے پھوپھا صاحب سے بچپن ہی سے سنتے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ آپ کے مؤقر استاذ ومربی فخر المحدثین حضرت مولانا سیّد فخرالدین احمد صاحب شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند جمعیۃ علماء ہند کے صدر تھے اور آپ خادمانہ حیثیت سے حضرت والا کے ساتھ جمعیۃ علماء ہند کی مجلسِ منتظمہ، مجلسِ عاملہ اور دیگر پروگراموں میں شرکت فرماتے تھے اور جمعیۃ علماء ہند کی خدمات کو بہ چشم خود بچپن میں آپ نے ملاحظہ فرمایا تھا جس کی وجہ سے جمعیۃ علماء ہند سے آپ کو قلبی لگاؤ تھا اور تاحیات یہ تعلق قائم رہا۔ چنانچہ فدائے ملت مولانا

سیّد اسعد مدنی نوراللہ مرقدہٗ کے دورِ صدارت میں بھی جمعیۃ علماء ہند کے اہم علمی پروگراموں کی نظامت آپ ہی فرمایا کرتے تھے۔ ترانۂ جمعیۃ علماء ہند کی تخلیق بھی آپ کے اسی تعلق اور قلبی لگاؤ کا مظہر ہے۔ اس ترانہ میں آپ نے جمعیۃ علماء ہند کو بہترین انداز میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے اور جمعیۃ علماء ہند کی خدمات اور اس کے اکابر کی عظمتوں کا حسین انداز میں اعتراف کیا ہے۔ فدائے ملتؒ کی وفات کے بعد حیاتِ مستعار کے آخری سالوں میں دو ٹرموں کے اندر جمعیۃ علماء ہند کے نائب صدر بھی رہے اور مجلسِ عاملہ اور دیگر پروگراموں میں حتی المقدور شرکت فرماتے رہے۔ آپ کے مشورے جمعیۃ علماء ہند کے بزرگوں کی نگاہ میں انتہائی وقیع تصور کیے جاتے تھے۔

اوصاف حمیدہ:

آپ کا اہم وصف مردم سازی اور کام کرنے والوں کی حوصلہ افزائی تھا، کتنے ہی اہلِ علم کو آپ نے اپنے ساتھ کام میں لگا کر کامیاب مصنف بنا دیا، زندگی کے آخری مراحل میں متعدد علماء و اساتذہ دارالعلوم آپ کی نگرانی میں اہم تصنیفی اور تحقیقی کام میں مصروف تھے۔ مولانا عارف جمیل صاحب استاذ دارالعلوم دیوبند کو ''کشاف اصطلاحات الفنون'' کی تحقیق وتعلیق میں مصروف کردیا تھا۔ مولانا فہیم الدین صاحب بجنوری ''ایضاح البخاری'' کی ترتیب میں معاون اور شریک کار رہتے۔ مولانا اشتیاق احمد صاحب قاسمی ادبی کاموں میں آپ کے معاون رہتے تھے؛ چنانچہ ''کلیات کاشف'' ماضی قریب میں مولانا اشتیاق احمد قاسمی دربھنگوی کی تحقیق وتعلیق کے بعد حضرت والا نے شائع فرمائی جو حضرت مولانا محمد عثمان کاشف الہاشمی صاحب تفسیر 'ہدایت القرآن' کا منظوم کلام ہے۔ اس کے علاوہ بھی متعدد علماء کرام کو مختلف کاموں میں لگا رکھا تھا کوئی عالم یا مدرس دیوبند سے باہر کے آتے اور اپنا کوئی کام پیش کرتے تو اس کو دیکھ کر انتہائی مسرت کا اظہار کرتے تھے، اصلاح طلب امور کی جانب متوجہ فرماتے اور وقیع کلمات میں تقریظ لکھ کو حوصلہ افزائی فرماتے اور حوصلہ افزا دعاؤں کے ساتھ رخصت فرماتے تھے جس سے آنے والا شاداں وفرحاں واپس لوٹتا جس کا مشاہدہ کرنے والے ہزاروں کی تعداد میں آج بھی موجود ہیں۔ عصر کے بعد آپ کی مجلس ہوتی جس میں اساتذۂ دارالعلوم کے علاوہ دیگر مدارس کے علماء کرام دیوبند سے باہر کے مہمان اہلِ علم، طلبۂ عزیز اور ذمہ دارانِ مدارس شرکت فرماتے اور پیچیدہ مسائل، علمی اشکالات اس مجلس میں رکھے جاتے۔ حاضرین مجلس اس پر سنجیدہ تبصرہ فرماتے اور پھر اس کا حل فرماتے اور سبھی حاضرین کی حضرت والا کی جانب سے چائے کی ضیافت بلاناغہ جاری رہتی اور ضیافت کو اپنے لیے سعادت عظمیٰ سمجھتے تھے۔ کتنے ہی غریبوں، یتیموں، بیواؤں کا ماہانہ آپ کے یہاں بندھا ہوا تھا جو پابندی کے ساتھ پہنچتا تھا اور اس میں کبھی تخلف نہ ہوتا تھا۔ بارہا ایسا بھی ہوا کہ عید اور دوسرے خوشیوں کے مواقع پر اپنی اولاد کے کپڑے نہ بنائے اور ان کو سمجھا دیا؛ مگر غرباء کی امداد واعانت میں ناغہ نہ ہوا:

خدا بخشے بڑی ہی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

راقم السطور سے حد درجہ محبت فرماتے تھے۔ طالب علمی کے زمانہ میں بندہ کو مضمون نویسی کی جانب متوجہ فرمایا۔ آج جو بھی لکھنے لکھانے کا معمولی شوق ہے یہ حضرت ہی کا مرہون منت ہے۔ طالب علمی کے دور میں بندے نے تقلید کے موضوع پر ایک مضمون بغرض اصلاح لکھ کر دکھایا۔ حضرت والا نے بہت زیادہ حوصلہ افزائی فرمائی اور فوراً ہی حضرت مولانا کفیل احمد صاحب علویؒ کو آئینہ دارالعلوم میں اشاعت کے لیے دینے کا حکم فرمایا اور اس پر سفارشی کلمات بھی تحریر فرمادیے۔ عالمی اجلاس تحفظ ختم نبوت دارالعلوم کے موقع پر بندہ کو مقالہ لکھنے کا حکم فرمایا پھر متعدد مراحل میں اس کی اصلاح فرمائی اور طلبہ کی نشست میں اس کو پڑھنے کے لیے منظور فرمایا۔ ہر موقع پر اپنی یا اپنے مکتبہ کی مطبوعہ کتاب ضرور پیش فرماتے تھے اور دیوبند پہنچنے پر ناشتہ یا کھانے کے لیے ضرور مدعو فرماتے۔ نیز آزمائشی حالات آنے پر مکمل رہنمائی فرماتے اور ضروری مشوروں سے نوازتے تھے۔ ۲۲؍شعبان ۱۴۰۶ھ کو بندہ کی دورۂ حدیث شریف سے فراغت کے دو روز بعد میرے والد محترم کا انتقال ہوگیا۔ بندہ نے حضرت والا کو خط لکھا اور ایصالِ ثواب ودعا مغفرت کی درخواست کی۔ اس کے بعد شوال ۱۴۰۶ھ میں دارالافتاء میں داخلہ کی غرض سے دارالعلوم دیوبند حاضری ہوئی تو ملاقات کے بعد بہت زیادہ شفقت کا معاملہ فرمایا اور مزید ارشاد فرمایا کہ تم اپنے والد کے انتقال کا زیادہ احساس نہ کرنا؛ کیوں کہ دنیا سے ہر ایک کو جانا ہے اور ہم کو اپنا والد ہی تصور کرتے رہنا اور جو ضرورت ہو اس کو بلاتکلف بتلانا۔ اس کو پورا کرنے کی حتی المقدور کوشش کی جائے گی۔ اس کے بعد سے برابر تاحیات حضرت والا کی شفقت پدری اس ناچیز کو حاصل رہی۔ اللہ تعالیٰ حضرت والا کو جنت الفردوس میں اعلیٰ سے اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔

امراض، وفات، نمازِ جنازہ اور تدفین:

حضرت والا کچھ عرصہ سے مختلف امراض میں مبتلا تھے۔ ممبئی میں آنکھ کا آپریشن بھی ہوا۔ دل کا عارضہ بھی لاحق تھا، شوگر بھی کم وبیش ہوتی رہتی تھی، اس کے علاوہ بھی متعدد امراض لاحق تھے۔ علاج بھی برابر جاری رہتا تھا اور علاج کے ساتھ ساتھ تمام معمولات درس وتدریس، تصنیف وتالیف، عصر کے بعد کی مجلس، مہمانوں سے ملاقات، واردین وصادرین کے مسائل کو سننا اور ان کو حل کرنا، بدستور جاری تھے، گذشتہ شوال میں زیادہ بیمار ہوئے، عیدالاضحیٰ تک درس میں حاضری بھی برائے نام رہی؛ لیکن محرم الحرام سے درس حدیث

اور دوسرے اسباق حسب معمول جاری رہے اور مقررہ نصاب ماہ رجب تک مکمل کرایا۔ سالانہ امتحانات کے موقع پر تمام ایام میں حاضری ہوتی رہی؛ مگر وقت موعود آچکا تھا۔ بالآخر سالانہ امتحانات کی تعطیل میں جمعہ کا دن گزار کر ہفتہ کی رات میں تہجد کی نماز سے فراغت کے بعدِ صبح صادق کے وقت تقریباً چار بجے مؤرخہ ۲۳؍شعبان ۱۴۳۸ھ مطابق ۲۰؍مئی ۲۰۱۷ء کو داعیِ اجل کو لبیک کہا اور اپنے مولائے حقیقی سے جاملے۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔

کئی روز سے حضرت والا کی برابر یاد آرہی تھی۔ فون کرنا چاہتا تھا؛ مگر نہ کرسکا۔ ہفتہ کی صبح دیوبند حاضر ہوکر ملاقات کا ارادہ تھا، صبح کو فون کے ذریعہ معلوم ہوا کہ حضرت دارالبقاء کی جانب رحلت فرماگئے۔ اب ملاقات ممکن نہیں ہے، صرف جسدِ خاکی کی زیارت ہی ہوسکے گی۔ جنازہ میں شرکت کا نظام بنایا اور جامع مسجد امروہہ کے اساتذۂ کرام کے ساتھ دیوبند حاضری ہوئی۔ جسد خاکی کی زیارت کی اور تقریباً ۳۵؍سال کی یادیں دماغ میں گھومنے لگیں۔ بعد نمازِ ظہر حضرت الاستاذ امیر الہند مولانا قاری محمد عثمان صاحب منصور پوری دامت برکاتہم استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند وصدر جمعیۃ علماء ہند کی امامت میں نمازِ جنازہ ہوئی اور ''قبرستانِ قاسمی'' میں تدفین عمل میں آئی، اس کے بعد غم ناک آنکھوں، غم زدہ دل کے ساتھ امروہہ واپسی ہوئی۔

آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے

اولاد واحفاد اور پس ماندگان:

حضرت والا کی اہلیہ محترمہ (امی جان) کا چند سال قبل مختصر علالت کے بعد انتقال ہوگیا تھا۔ اولاد میں تین صاحب زادگان: مولانا محمد سفیان صاحب قاسمی، مولانا قاری محمد عدنان صاحب قاسمی، مولانا مفتی محمد سعدان صاحب قاسمی ہیں۔ اوّل الذکر کاروبار کرتے ہیں، ثانی الذکر امریکہ میں رہتے ہیں، موصوف نے اپنے والد کی بہت زیادہ خدمت کی ہے۔ ثالث الذکر معہد الانور میں مدرس ہیں اور دورۂ حدیث تک کی کتابیں پڑھاتے ہیں اور ماشاء اللہ تمام ہی فرزندان نیک صالح، خوش اخلاق اور ملنسار ہیں۔ پوری زندگی اپنے والد مرحوم کی اطاعت فرماں برداری میں گزاری۔ اس کے علاوہ آپ کے متعلقین، رشتہ دار، اعزہ، اقرباء، تلامذہ بھی آپ کے پس ماندگان میں شامل ہیں۔ خاص طور سے برادر محترم مولانا محمد سلمان صاحب بجنوری استاذ دارالعلوم دیوبند ان کے فرزندانِ اور اہل خانہ بھی آپ کے پس ماندگان میں شامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ تمام ہی پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے اور حضرت والا کو اعلیٰ علیین میں اعلیٰ سے اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ قبر مبارک کو نور سے منور فرمائے اور مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند کو آپ کا نعم البدل عطا فرمائے۔ (آمین) □□

حضرت مولانا ریاست علیؒ کی آخری شام تحفظ ختم نبوت کے نام

تحریر: مولانا شاہ عالم گورکھپوری

استاذ الاساتذہ حضرت مولانا ریاست علی صاحب بجنوری رحمۃ اللہ علیہ کا شماراُن کی حیات میں ہی اُن عبقری شخصیات میں ہوتا رہا ہے،جن کی پیداوار اب بہت کم ہوگئی ہے۔حضرت مولانا کی حیات کے مختلف گوشوں پر اب لکھا بھی جانے لگا ہے اور ابھی مدتوں لکھا جائے گا لیکن میرا خیال یہ ہے کہ اخیر میں تھک ہار کر اہل خرد یہی کہیں گے کہ:

لکھ کے سب کچھ، لکھیں گے اہلِ دل

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

راقم سطور کو بھی حضرتؒ سے شرف تلمذ حاصل ہے،حدیث شریف کی مشہور و متداول کتاب'ابنِ ماجہ شریف' راقم نے حضرت سے پڑھی ہے۔سبق میں احادیثِ مبارکہ کے معانی و مفہوم کو نہایت سلیس،دل میں اتر جانے والے چھوٹے چھوٹے جملوں میں بیان کرنے کا حضرت کا ایک منفرد ہی انداز تھا۔اس خوبی نے استاذ محترم کی جو قدر و منزلت دل میں پیدا کی وہ کبھی بھی بھلائی جانے والی نہیں ہوسکتی ہے۔

راقم سطور کی شعبۂ تحفظ ختم نبوت میں تقرری کے بعد بہت سے ایسے مراحل آئے کہ حضرت کے مفید مشوروں نے مستقبل کو نہ صرف یہ کہ صحیح سمت دی بلکہ زندگی کو جلا بخشنے میں آئندہ بھی کام آتے رہیں گے۔بہت کم لوگوں کو یہ بات معلوم ہوگی کہ تحفظ ختم نبوت کے موضوع اور خدمات سے حضرت کو والہانہ و مخلصانہ دلچسپی تھی،موضوع کے تعلق سے بعد نماز عصر مجلس میں عموماً گفتگو حاضرین اور سامعین کو ملحوظ رکھ کر ہی ہوتی تھی لیکن حضرت جب تنہا ہوتے تو ہمارے موضوع سے جس شغف و محبت کا اظہار فرماتے میں سمجھتا ہوں کہ ان کی نیکیوں میں تنہا صرف یہی ایک نیکی اُن کی نجات اخروی کا ضامن ہے۔

ایک دفعہ خانقاہ کی مسجد سے ظہر کی نماز پڑھ کر نکل رہے تھے،بندہ نے سلام و مصافحہ کیا،حضرت کا عمومی طور پر یہ معمول نہیں تھا کہ مصافحہ میں دیر تک ہاتھ پکڑے رہیں،اُس دن خلافِ معمول ہاتھ پکڑے چلتے رہے اور گفتگو بھی فرماتے رہے،راستے میں ایک جگہ کھڑے ہوکر فرمانے لگے مولوی شاہ عالم،تم جس کام میں لگے ہوئے ہو یہ بڑا عظیم اور بابرکت کام ہے،مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے جب میں تم کو دیکھتا ہوں،یہ کام تو عین مقصد ہے۔حضرت کا مشفقانہ انداز دیکھ کر راقم سطور نے کچھ کہنے کی جرأت کی تو فرمانے لگے تم لگتا ہے کچھ کہنا چاہتے ہو۔میں نے عرض کیا حضرت آپ کی حوصلہ افزائی سے مجھے خوشی ہوئی ہے،بندہ بھی اس کو دینی خدمت تصور کرتا ہے اس لیے لگا رہتا ہے۔فرمانے لگے۔میاں!تم نے دیکھو اس خدمت کی برکت سے میری بھی اصلاح کردی،واقعی اس کی صحیح تعبیر یہی ہے کہ یہ کام نہیں دینی خدمت ہے۔اس تعبیر میں اس کی عظمت ہے،کام تو اور بھی بہت ہیں،اس عظیم خدمت کو دینی خدمت ہی کہنا چاہیے۔میں نے تکلّفاً اپنی تعبیر پر معذرت چاہی تو فرمانے لگے نہیں تم نے جو کہا وہی صحیح ہے،معذرت کی ضرورت نہیں۔لفظ'کام' سے اس کی عظمت میں تخفیف کا احساس ہوتا ہے اس کی عظمت کے لحاظ سے'دینی خدمت' کہنا ہی مناسب ہے۔ہمارے تمام بڑے بلاوجہ تھوڑی اس خدمت سے قلبی شغف رکھتے تھے۔

ہمارے قارئین لفظ'کام اور خدمت' کے مابین نسبت اور معنی کو سمجھ سکتے ہیں کہ دونوں میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہے۔لیکن حضرت کا جو انداز تھا وہ میں محسوس کر رہا تھا کہ میری زبان سے بے ساختہ یہ جملہ کیا نکلا؛تحفظ ختم نبوت کے ایک مخلص عاشق زار کے لیے وجد و جذب کا ذریعہ بن گیا کہ وہ اس خدمت کو لفظ'کام' سے جو'خدمت' کے مقابلہ میں استعمال کے اعتبار سے قدرے فروتر لفظ ہے تعبیر کرنا بھی نامناسب سمجھتے تھے۔چنانچہ اس کے بعد جب بھی اس موضوع پر گفتگو ہوتی تو لفظ'خدمت' سے ہی تعبیر فرماتے تھے۔گفتگو کے مابین راقم سطور نے چاہا کہ حضرت اپنے دولت کدہ تشریف لے چلیں تو بیٹھ کر بات ہوتی رہے مگر آگے بھی نہیں بڑھتے اور درخواست کے باوجود راقم سطور کے غریب خانہ پر جو چار چھ قدم کے ہی فاصلے پر واقع تھا بیٹھنے کے لیے تیار نہیں،بس کھڑے کھڑے تقریباً ۱۵ منٹ تک نہایت والہانہ انداز میں گفتگو فرماتے رہے

کتاب'اسلامی عقائد و معلومات' کی ترتیب کے درمیان بندہ کو جب بھی کسی تعبیر میں کچھ شک و شبہ ہوتا تھا تو معمول یہ تھا مجلس میں چلا جاتا تھا اور اپنا مقصد ذکر کرتا،حضرت ذرا بھی اس کو اپنے لیے بار نہ محسوس کرتے اور نہ صرف یہ کہ متبادل مناسب تعبیر کی طرف رہنمائی کرتے تھے بلکہ کبھی کبھی تو حاضرین مجلس کے درمیان اس کو موضوع سخن بنادیتے جس سے حاضرین بھی خوب لطف اندوز ہوتے اور کبھی کبھی تو مطلوبہ تعبیر کو بڑی کتابوں میں دیکھنا و رلغت وغیرہ سے اس کی تصویب کرنے میں پوری پوری مجلس ہی اسی کے نذر ہوجاتی تھی۔

ایک بڑی خوبی کی بات یہ تھی اور اس میں بندہ اپنے لیے کوئی تخصیص نہیں سمجھتا

بلکہ عام شرکائے مجلس کے ساتھ یہی معمول دیکھتا تھا کہ جب بھی کوئی مسئلہ لے کر حاضر ہوتا تو اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود کبھی جھنجھلانے یا اکتانے کا نام ونشان تک نہ ہوتا بلکہ ایسا تاثر ملتا کہ شاید ہمارے کام کے لیے حضرت خالی بیٹھے ہوئے ہیں اور پوری بشاشت اور تفصیل سے ہر بات کو سن رہے ہیں اور گفتگو میں حصہ لے رہے ہیں، البتہ گفتگو کا ماحصل اور حضرت والا کا جواب اتنا مختصر اور جامع ہوتا کہ سامنے والے کی لمبی سے لمبی گفتگو سمٹ کر خود بخود مختصر ہوجاتی تھی۔ مسئلہ حل کرنے کے بعد بھی حوصلہ افزائی اس قدر فرماتے تھے اگلے دن بھی کوئی سوال پوچھنے میں ذرا بھی کسی کو جھجک محسوس نہیں ہوتی تھی۔ بارہا فرماتے تھے، بیٹے! تم عقائد کے موضوع پر لکھنے پڑھنے میں لگے رہتے ہو مجھے خوشی ہوتی ہے، لگے رہو اللہ برکت دیں گے۔ کبھی فرماتے: بھائی یہ بڑھیا ہے، تم تسلسل کے ساتھ بس اپنے ہی موضوع ومقصد پر ڈٹے رہتے ہو، یہ اچھی بات ہے، اس سے فائدہ ہوگا۔ حضرت کے یہ جملے ایسے شفقت آمیز لیکن مزاحیہ انداز لیے ہوئے ہوتے کہ اہل مجلس لطف اندوز بھی ہوتے اور بندہ کے لیے حوصلہ افزائی بھی ہوجاتی تھی۔

یہی وہ مشفقانہ انداز تھا جس نے راقم سطور کو اس قدر جری بنادیا تھا کہ ایک دفعہ کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت کی زیر نگرانی ماہ شعبان میں منعقد ہونے والے تربیتی کیمپ میں بیان اور شرکت کے لیے درخواست کرڈالی۔ پہلے تو حضرت نے اس درخواست پر مجلس کو قہقہہ زار بنادیا، پھر فرمانے لگے، بیٹے! میں کیا بیان کروں گا یہ تو میرا موضوع بھی نہیں، تم اس کے شہ سوار ہو لگے رہو، میں تو بس یہیں سے دعا کروں گا۔ میں نے لہجہ میں کچھ شفقت محسوس کرتے ہوئے مزید اصرار کیا تو بالآخر شرکت کے لیے درخواست قبول فرمالی اور فرمانے لگے چلو کل اس پر گفتگو کریں گے۔ اگلے دن تو میری خوشی کی انتہا نہ تھی اگلے دن پھر مجلس میں پہنچا تو فرمانے لگے، اچھا موضوع طے کرو۔ راقم سطور نے بتایا کہ حضرت؛ آج کل یہ عام وباسی محسوس ہورہی ہے کہ اہل علم اور علماء بھی علم عقائد اور کلام کے ساتھ حد درجہ بے اعتنائی برتنے لگے ہیں، فقہ، تفسیر، حدیث، عربی زبان وادب وغیرہ میں طلباء بھی خوب دلچسپی لیتے ہیں لیکن عقائد اور علم کلام میں دلچسپی نہیں لیتے۔ یہ سن کر حضرت نہایت رنجیدہ ہوئے اور فکر مند ہوئے۔ فرمانے لگے "یہ بات تو بڑی کمی کی ہے، دین میں اصل تو عقیدہ ہی ہے، اچھا تم بتاؤ اس کے اسباب کیا ہوسکتے ہیں؟" بندہ ناچیز نے یہ خیال کرکے کہ چلو اچھا سوال حضرت نے پوچھا ہے اس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ اگر اپنی سوچ وفکر میں کجی، کمی ہوئی تو آج اس کی اصلاح بھی ہوجائے گی، مغرب بعد کا وقت تھا حاضرین مجلس بھی جاچکے تھے، بے دھڑک بندہ نے اپنی فکر حضرت کے سامنے رکھی تو نہ صرف یہ کہ اس کی تائید فرمائی بلکہ بعض کوتاہیوں پر افسوس کرنے لگے اور ازالہ کے تدبیریں بھی حضرت بتانے لگے۔ فرمانے لگے تم شکستہ دل مت ہونا، بس اپنا کام، کام سے لگے رہنے کا ہے۔ اس کے بعد کیمپ میں شرکت کو بخوشی منظور فرمالیا۔ پھر تو تاریخ گواہ ہے کہ حضرت کا جوگرہ کشا بیان ہوا وہ حاضرین وسامعین کے لیے بلا شبہ ایک نعمت غیر مترقبہ تھا۔ اس بیان کو راقم سطور نے موبائل ٹیپ کے ذریعہ محفوظ کرلیا، حضرت مولانا محمد سالم جامعی صاحب مدظلہ ایڈیٹر الجمعیۃ کے اصرار پر وہ بیان بذریعہ قلم قارئین الجمعیۃ دہلی کی خدمت میں پیش ہے۔

اخیر میں ایک بات اور عرض کرتا چلوں کہ سال رواں شعبان ۱۴۳۸ھ کے تربیتی کیمپ میں بھی حضرت نے بیان کرنا قبول فرمالیا تھا، انتقال سے پہلے والے دن یعنی جمعہ کے دن بعد نماز جمعہ بھی تربیتی کیمپ اور ختم نبوت کے موضوع پر گفتگو رہی، مسجد کے نکلتے وقت مصافحہ میں پکڑلیا، دریں اثنا مفتی عبداللہ حمدان سلمہ چھڑی ہاتھ میں دے رہے تھے، مسجد میں ہی ٹھہر کر فرمانے لگے؛ میری طبیعت ٹھیک نہیں مجھے بڑی شرمندگی ہوتی جب تمہاری درخواست کو ٹالتا ہوں لیکن مجھے تمہاری اس خدمت سے خوشی بہت ہوتی ہے، میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے لگتا ہے چل چلاؤ کا وقت ہے۔ عصر بعد گھر آجاؤ وقت طے کریں گے۔

عصر کے بعد مجلس میں مغرب تک مکمل گفتگو ختم نبوت کے موضوع پر ہی ہوئی، مجلس میں ایک صاحب نے عرض کیا کہ حضرت عقائد اور علم کلام ایک ہے یا دوفن ہیں۔ حضرت نہایت جوشیلے انداز میں وضاحت فرمانے لگے کہ یہ دوالگ الگ موضوع ہیں۔ پھر بعد نماز مغرب متصلاً مخاطب ہوئے کہ سال گذشتہ کا پورا بیان مجھے سناؤ تاکہ مضمون میں تکرار نہ ہو۔ راقم سطور نے اس کا مکمل خلاصہ سنادیا لیکن یہ نہیں بتایا کہ میرے پاس ٹیپ ریکارڈ میں محفوظ ہے۔ اس دوران سینہ میں کچھ درد کی شکایت بھی فرماتے رہے، اسی دوران حضرت کے پوتے مفتی عبداللہ حمدان ابن مولانا محمد سفیان قاسمی صاحب نے کچھ دوا دینے کو کہا تو فرمانے لگے میرے گھٹنے میں دوا لگاؤ، وہ دوا لگاتے رہے، اور نہایت بشاشت سے حضرت مجھ سے گفتگو فرماتے رہے، یعنی راقم سطور کو ذرا بھی اس کا احساس نہ تھا کہ یہ آخری گفتگو اور آخری شام ہے۔ جب بندہ واپس ہونے لگا تو پھر حضرت نے فرمایا کہ اس سال موضوع کیا رہے گا۔ بندہ نے عرض کیا کہ حضرت! تخصیص کوئی نہیں اگر پچھلے سال والا مضمون پھر آجائے تو ہم خدام کو مزید ذہن نشین ہوجائے گا اور علماء وذمہ داران مدارس بھی عقائد و علم کلام کی تعلیم کو اپنے مدارس میں رائج کرنے پر توجہ دینے لگیں گے۔ حضرت فرمانے لگے؛ ٹھیک ہے ان شاء اللہ طبیعت ٹھیک رہی تو میں صبح ۹ بجے تک آجاؤں گا اور ایک گھنٹہ بیان کرکے واپس آجاؤں گا، تم اپنا پروگرام چلاتے رہنا۔ پھر فرمانے لگے میرے پاس کتابیں ہیں میں دیکھ لوں گا راقم نے عرض کیا کہ

"الانتباہات المفیدہ" لا کردے دوں؟ فرمانے لگے ہے میرے پاس ہے میں دیکھ لوں گا، شرح مواقف اور تفتازانی کی مقاصد کا بھی ذکر آیا، فرمانے لگے ٹھیک ہے دیکھ لوں گا۔ بات یہ ہے کہ تمہارے کیمپ کے شرکاء میں سے بعض علماء کل آئے تھے اور تمہارے بیان کی بڑی زور دار تعریف کر رہے تھے۔ حضرت یہ فرماتے ہوئے مسکرا بھی رہے تھے اور بندہ بھی اس مسکراہٹ سے لطف اندوز ہو رہا تھا، چہرہ حسب معمول کھلِا ہوا تھا، ذرا بھی کسی آنے والے حادثہ کی خبر نہیں دیتا تھا، گفتگو کے انداز میں بھی کوئی تغیر نہیں آواز میں بھی کسی ضعف یا نقاہت کا کوئی اثر نہیں؛ دریں اثناء بندہ نے مسرت آمیز انداز میں رخصتی کا سلام و مصافحہ کیا اور صبح ہونے سے پہلے ہی خبر آ گئی کہ اس بیان کا انتظار، اب انتظار ہی رہے گا۔ تحفظ ختم نبوت کی خدمت کے مخلص و ہمدرد سے اب قیامت میں ہی ملاقات ہوگی۔ گویا محبّ تحفظ ختم نبوت کا یہ آخری دن اور آخری شام مکمل ختم نبوت کے نام وقف تھا جو خدا کی ذات کریمی سے صد فیصد امید بلکہ یقین کامل ہے کہ سفر آخرت کے لیے مقبول توشہ اور مرقد کے لیے نزول رحمت خداوندی کا سبب ہوگا۔ اب جب کسی صبح حضرت بیدار ہوں گے تو چونکہ زندگی بھر وہ وقت اور وعدہ دونوں کے پابند تھے؛ سرھانے رکھی کتابیں یاد آئیں گی، تحفظ ختم نبوت کا تربیتی کیمپ ضرور یاد آئے گا، لیکن وہاں تو دنیا بدل چکی ہوگی اب یہ سب تو نہ ہوگا؛ ہاں! انشاء اللہ ایفاء وعدہ کے طور پر زبان پر ختم نبوت کا ترانہ اور صاحب ختم نبوت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی اس صفت خاص کا ورد ضرور ہوگا۔ وہاں اب "مقاصد" اور شرح مواقف یا انتباہات جیسی کتابیں تو نہ ہوں گی نہ ان کے اوراق ہوں گے، اب تو بذات خود مقبولان بارگاہ خداوندی، صاحبِ مقاصد اور صاحبِ شرح مواقف؛ استقبال کے لیے کھڑے ہوں گے ایک طرف مجدد ملت صاحب انتباہات مفیدہ بھی لپک رہے ہوں گے کہ اسلامی عقائد پر ٹوٹ پڑنے والے خطرناک فتنوں کے دور میں عقائد کو تحفظ فراہم کرنے کی فکر میں خود کو گھلانے والے میرے عظیم سپوت! آؤ تم نے اپنی حیات مستعار کے آخری، دن، آخری شام، آخری رات بلکہ آخری سانس تحفظ ختم نبوت کی فکر میں لگائے ہیں، اب تو صاحب ختم نبوت صلی اللہ علیہ وسلم کا جھنڈا ہے، ہم ہیں تم ہو اور حضرت صدیق اکبرؓ سے لے کر اب تک کے صلحاء کی معیت ہے۔ اب کتاب نہیں ان صلحاء کے دیدار سے اپنی تشنگی بجھاؤ، فَا دْخُلی فِی عِبادِی وَادْخُلِی جَنَّتِی.

مفتی عبداللہ حمدان سلّمہٗ نے بتایا کہ راقم کی واپسی کے بعد شب میں دس بجے مفتی حمدان سے 'احکام اسلام عقل کی نظر میں الانتباہات المفیدہ' طلب فرمایا اور اس ارادے سے کہ بیان سے قبل صبح میں کسی وقت مطالعہ کریں گے اپنے سرہانے رکھ کے لیٹ گئے۔ پھر شب میں کسی وقت اٹھے اور نماز تہجد ادا فرمائی اس کے بعد چند ہی لمحوں میں سفر آخرت پر روانہ ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون:

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

حضرت کے انتقال کی خبر ملتے ہی کیمپ کے تمام شرکاء سوگوار ہو گئے، حضرت کی تشریف آوری کا وقت ۹ بجے تھا اس وقت حضرت تو نہیں آ سکے؛ حضرت کے نام ایصال ثواب میں پوری مجلس مصروف ہوگئی اور اس مجلس کو تعزیتی مجلس میں بدل دیا گیا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے حضرت کو اپنا قرب نصیب فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔

اپنے قارئین کرام سے گذارش کروں گا کہ وہ لوگ جو حضرت کی مجلس میں بیٹھے اور اُن کے لب ولہجہ کے اتار چڑھاؤ سے مانوس ہیں ان کو تو پڑھنے اور سمجھنے میں تو کوئی دشواری نہ ہوگی لیکن جو لوگ حضرت کے لب و لہجہ سے آشنا نہیں ان کو چاہیے کہ ٹھہر ٹھہر کر پڑھیں انشاء اللہ ہر بات سمجھ میں آئے گی۔ اس لیے کہ بندہ کی کوشش یہ رہی ہے کہ تمام مضامین حضرت کے ہی جملوں میں من و عن آئیں۔ البتہ کہیں کہیں ربط پیدا کرنے کی غرض سے ناگزیر مقامات پر چند الفاظ بڑھانے کی مجبوری ہوئی ہے لیکن وہ الفاظ بھی بیان سے ہی مفہوم و ماخوذ ہیں۔ اسی طرح سے علامات ترقیم اور پیراگراف کا بڑھانا تحریر کے لیے ناگزیر تھا جس سے سلاست کے ساتھ پڑھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ اس کلپ کو نقل کرنے اور کاغذ پر لانے میں جناب ماسٹر محمد احمد صاحب، نیوز انچارج مرکز التراث الاسلامی دیوبند اور عزیز محترم جناب مولانا محمد چاند منصوری صاحب متعلّم شعبۂ تحفظ ختم نبوت دار العلوم کا میں بیحد ممنون ہوں کہ ان احباب نے بڑی عرق ریزی سے اس کو نقل کیا، پھر کمپوز کر کے میرے حوالے کیا جس سے ترتیب میں کافی سہولت ہوئی، مولانا اسعد اللہ صاحب بستوی سے بھی تصویب و تصحیح میں تعاون ملا۔ فجزاھم اللہ خیراً۔

بیان حضرت مولانا ریاست علی بجنوری صاحبؒ:

تحفظ ختم نبوت تربیتی کیمپ کی گیارہویں نشست

۲۴ شعبان ۱۴۳۷ھ مطابق یکم جون ۲۰۱۶ء بروز بدھ صبح ۸ بجے

الحمدللہ والصلوۃ والسلام علی رسولہ الکریم وعلی آلہ وصحبہ اجمعین. اما بعد! فاعوذباللہ من الشیطان الرجیم.

بسم اللہ الرحمن الرحیم.

اُدْعُ اِلیٰ سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ وَجَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ ط اِنَّ رَبَّکَ ھُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِیْلِہٖ وَھُوَ أَعْلَمُ بِالْمُھْتَدِیْنَ. (نحل ۱۲۵) او کما قال تبارک و تعالیٰ.

عزیزانِ گرامی قدر اور تربیتی کیمپ کے احباب انتظام! بلا کسی تکلف کے یہ عرض ہے کہ آپ کا پروگرام نہایت مرتب انداز میں، مختلف موضوعات

اوران کی تفسیر سے متعلق چل رہا تھا اور آپ اُس سے استفادہ بھی کررہے تھے کہ مولانا شاہ عالم صاحب گورکھپوری نے اِس پروگرام کونظر بد سے بچانے کے لیئے ایک پروگرام اِس ناچیز کا بھی رکھ دیا۔ جب ماں اپنے بچے کونظر بد سے بچانا چاہتی ہے تو اُس کے ماتھے پر ایک کالا ٹیکہ لگا دیتی ہے تا کہ نظر لگانے والے کی نظر وہاں رک جائے اور نظر نہ لگے؛ تو بالکل اسی طرح یہ میرا درمیان میں آنا ہے۔

مجھے حکم یہ تھا کہ مجھے کچھ دیر بیان کرنا ہے اور میری درخواست یہ تھی کہ مجھے کوئی عنوان دے دیجیے؛ مگر کوئی عنوان انھوں نے نہیں دیا اور میں نے بھی سوچنے کے لیئے بہت ذہن پر زور دیا مگر کوئی خاص بات سمجھ میں نہیں آئی؛ سوائے اس ایک آیت کے جو میں نے پڑھی ہے۔ کیوں کہ آپ فرق باطلہ میں سے ایک بہت بڑے فرقہ یعنی قادیانیت کے رد کے سلسلے میں تربیت کے ایک پروگرام میں شرکت کررہے ہیں اور یہ محض ؛ایک ہی فتنہ نہیں ہے بلکہ اب تو فتنے ہی فتنے ہیں جو روز اول سے، اب ذرا بڑھ گئے ہیں۔

ایک تو ہے اللہ تعالیٰ کا قرآن کریم میں انسان کے مقصد تخلیق کا بیان مقصد تشریعی ؛ یعنی یہی شریعت چاہتی ہے تو وہ تو ہے عبادت اور ایک ہے انسان کا مقصد، مقصد تخلیق تکوینی، تکوینی مقصد کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا کہ وَلَوْشَآءَ رَبُّکَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً (ہود۱۱۸) بہت آسان تھا اللہ تعالیٰ تمام انسانوں کو ایک امت بنا دیتا، سب کے عقائد ایک، سب کے اعمال ایک، سب کا طرز فکر ایک ہوتا مگر اللہ نے یہ نہیں چاہا؛ بلکہ ''وَلا یَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِیْنَ'' انسان برابر ایک دوسرے سے فکر ونظر کا اختلاف کرتے رہیں گے۔ اور آگے بڑھ کر ہے ''وَلِذٰلِکَ خَلَقَهُمْ'' کہ اللہ تعالیٰ کا مقصد تخلیق ہی یہ ہے کہ وہ اختلاف کریں، مگر یہ مقصد تخلیق تشریعی نہیں تکوینی ہے۔

مولانا شبیر احمد عثمانی صاحبؒ لکھ رہے ہیں حاشیہ میں آپ لوگ پڑھتے ہی ہوں گے کہ یہ مقصد تخلیق تکوینی ہے؛ منشاء یہ ہے کہ انسان تکوینی طور پر اختلافِ فکر ونظر کے باوجود اپنے کسب اور اختیار سے وہی راستہ اختیار کرے جس سے اللہ تعالیٰ راضی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ جس راستہ سے راضی ہے اسی کے لئے اس نے پیغمبروں کو بھیجا ہے۔ اور آخری پیغمبر علیہ السلام کو جو میں نے آیت پڑھی ہے اس میں یہ حکم دیا جارہا ہے کہ آپ صراطِ مستقیم کی دعوت دیں تین انداز میں۔ بالحکمة، حکمت سے مراد ہے استدلال کے ساتھ؛ کتاب اور سنت سے استدلال کریں، عقل سے استدلال کریں، نقل سے استدلال کریں جو موضوع ہے۔ مثلاً توحید کا موضوع ہے تو توحید پر آپ استدلال کیجیئے ؛نقل سے بھی کیجیئے اور عقل سے بھی کیجیئے۔ اور نقل میں وہ بھی ہے جو مثلاً توحید کے لئے ''لَوْ کَانَ فِیْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَ تَا'' (انبیاء۲۲) کہ اگر ایک سے زائد معبود ہوں تو دنیا کو کچھ دن بھی برقرار رہنے کا امکان بھی نہیں ہے۔ اس لیے کہ وہ دونوں ''وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰی بَعْضٍ'' (مومنون۹۱) ایک دوسرے سے اختلاف کریں گے؛ تو یہ نقل بھی ہے اور عقل بھی ہے۔

یا مثلاً رسالت کا موضوع ہے تو رسالت یہ بھی ایک امر ضروری ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اس کا وجود تو ہے بالکل بدیہی ؛ کہ ایک ذات ہے جس نے اس پوری کائنات کو بنایا۔ بہت آسان ہے اللہ تعالیٰ کو جاننا؛ ہوائیں چلا رہا ہے، انسان کی زندگی کا سارا ساز وسامان اس نے اس دنیا میں پیدا کررکھا ہے، روشنی پیدا کرتا ہے، تاریکی پیدا کرتا ہے، سورج کو حکم دیتا ہے نکلنے کے لئے ؛ اللہ کو پہچاننا تو بہت آسان ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ بندوں سے کیا چاہتا ہے؟ تو اس بات کا جاننا بندوں کے لئے ممکن نہیں ہے، اس کو بتانے کے لیے رسالت کی ضرورت ہے۔ تو حکمت کے معنیٰ ہیں کہ آپ صراط مستقیم کی دعوت دیں استدلال کے ساتھ؛ صراط مستقیم کی دعوت دیں دلائل قطعیہ کے ساتھ؛ ایسے دلائل کے ساتھ کہ جس کو سننے کے بعد انسان اُن کے قبول کرنے پر اپنے آپ کو دل کی گہرائی کے ساتھ آمادہ کرلے؛ یہ ہے باالحکمة.

پھر کہہ رہے ہیں ''بالموعظة الحسنة'' یہ استدلال تو علمی ہوا؛ لیکن کبھی کبھی ضرورت پڑتی ہے؛ بہت اخلاص کے ساتھ دل سوزی کے ساتھ ایسی بات بیان کرنے کی کہ جس سے انسان آپ کے بیان کردہ مضمون کو غور سے سنے۔ یعنی آپ پچھلی امتوں کے اوپر گذرنے والے احوال کا ذکر کریں کہ جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے احکام کو قبول کیا تھا اُن کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے یہ انعامات رہے ؛ جنھوں نے اللہ تعالیٰ کے احکام کو قبول نہیں کیا تھا اُن کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا یہ عذاب نازل ہوا۔ پچھلی امتوں کے احوال کا ذکر کرنا، پچھلے انبیاء کے احوال کا ذکر کرنا اور بتلانا، احکام شرعیہ پر عمل کرنے کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے جو جو وعدے کیے ہیں اُن کا ذکر کرنا، جو وعیدیں بیان کی ہیں اُن کا ذکر کرنا، فضائل کا ذکر کرنا یہ سب موعظۂ حسنۃ میں آتا ہے؛ تو آپ بتائیں گے کہ آپ عشاء کی نماز جماعت سے پڑھ لیں اور فجر کی نماز جماعت سے پڑھ لیں تو اللہ تعالیٰ ساری رات عبادت میں شمار کرتا ہے تو رسول کے اس بتانے سے بہرحال انسان کو عشاء اور فجر کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھنے کا داعیہ پیدا ہوگا، یہ سب موعظة حسنة ہیں۔

پھر اس کے بعد ارشاد خداوندی ہے ''جادلهم با لتی هی احسن'' کہ اس موعظة حسنة کے بعد اگر یہ نوبت آجائے جدال کی؛ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مخاطب ضد پر آمادہ ہوتا ہے اور وہ استدلال کے باوجود نہیں مانتا، دل سوزی اور اخلاص کے ساتھ اور پچھلی امتوں کے ساتھ گذرنے والے جو واقعات ہیں ان کے باوجود توجہ نہیں کرتا؛ تو پھر آپ کو اس سے جدال کرنا

ہے،اس سے گفتگو کرنی ہے۔اور گفتگو کرنی ہے ایسی جس کا نام جدال ہے مگر قرآن کہہ رہا ہے’’**جادلھم بالتی ھی احسن**‘‘آپ کو جدال کرنا ہے اُس انداز سے جو بہتر ہو۔اور بہتر کے کیا معنیٰ ہیں؟ بہتر کے معنیٰ یہ ہیں کہ جدال ہونا چاہیے اس انداز میں جس میں کوئی کسی کے ساتھ تشدد اختیار نہ کرے؛کوئی کسی کے ساتھ جارحیت کا عمل اختیار نہ کرے؛ کوئی کسی کے ساتھ عزت کے اور عزتِ نفس کے خلاف بات نہ کرے؛ بات چیت میں زبان خراب نہ ہونے پائے جسے سبّ وشتم کہتے ہیں اس کی نوبت نہیں آنی چاہیے۔ورنہ وہ’’**بالتی ھی احسن**‘‘ نہیں رہے گا۔بلکہ **بالتی ھی احسن** کے معنیٰ یہ ہیں کہ کلام میں جتنی خوبیاں ہوسکتی ہیں،مثبت انداز میں گفتگو ہو؛ بات جو پیش کی جارہی ہے اس کو سلیقہ کے ساتھ پیش کیا جائے،اور اس میں کوئی اس طرح کی بات کہ جس سے فریق ثانی کو اپنی عزت نفس کے خلاف محسوس ہوتا ہو؛ ایسا کوئی لفظ یا ایسا کوئی جملہ نہیں آنا چاہیے۔

آپ لوگ (شرکائے تربیتی کیمپ) چونکہ ان تمام فرقہائے باطلہ کے رد کے سلسلے میں اپنے آپ کو تیار کر رہے ہیں؛ اور آپ کا کام صراط مستقیم کی ہی دعوت دینا ہے جو پیغمبر علیہ السلام کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ پیغمبر علیہ السلام کے کسی بھی طرز عمل میں کہیں کوئی جارحیت یا کوئی شدت پسندی یا کوئی ایسی نامناسب بات نہیں ملتی۔

حدیث میں ایک واقعہ مذکور ہے کہ ایک شخص آیا اور اس نے پیغمبر علیہ السلام کو سلام کیا اور سلام کیا لفظ’السام علیکم‘ کے ساتھ۔سام کے معنیٰ موت کے آتے ہیں،تو حضرت عائشہؓ نے اس کو یہی لفظ دہرا دیا کہ’’**السام علیک و علیٰ فلان**‘‘ کہ تجھ پر اور تیرے فلاں پر یعنی باپ دادا کا نام لیا کہ اس پر سام ہو۔تو پیغمبر علیہ السلام نے حضرت عائشہؓ سے کہا کہ عائشہ یہ کیا؟ تو حضرت عائشہؓ نے کہا کہ آپؐ نے سنا نہیں کہ اس نے کیا کہا؟ تو پیغمبر علیہ السلام نے حضرت عائشہؓ صدیقہ کو جو جواب دیا وہ سننے کے قابل ہے۔آپ نے فرمایا عائشہ تم نے وہ نہیں سنا جو میں کہہ رہا ہوں۔یعنی میں یہ کہہ رہا ہوں کہ تمھیں اُس کا لفظ نہیں دہرانا تھا؛ اور پھر آپؐ نے جو نصیحت کی وہ حدیث کی کتابوں میں موجود ہے۔آپؐ نے کہا کہ’’**علیکِ بالرفق یا عائشہ**‘‘ عائشہ نرمی اختیار کرو۔ **علیک بالرفق یا عائشة فانه ما كان من شيء الا زانه.** نرمی جہاں شامل ہوجائے گی حسن بڑھ جائے گا۔**و لا نزع من شئ الا شانہ**، اگر نرمی کہیں سے ختم کردی جائے تو اس میں عیب پیدا ہوجائے گا(مشکوٰۃ باب الرفق والحیاء)۔یہ ہے پیغمبر علیہ السلام کا’’**جادلھم بالتی ھی احسن**‘‘۔آپؐ جواب دے سکتے تھے؛ جواب دینا یہ آنے والے کے سخت کلامی کی بنیاد پر جائز تھا، درست تھا، مگر پیغمبر علیہ السلام کا طریقہ یہ نہیں ہے۔

آپ نے حضرت عائشہ کو سمجھایا کہ حضرت عائشہ کہہ رہی ہیں کہ آپ نے نہیں سنا جو یہ کہہ رہا ہے تو حضرت عائشہؓ سے پیغمبر علیہ السلام نے فرمایا کہ اے عائشہ تم وہ نہیں سن رہی ہو جو میں کہہ رہا ہوں؛ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ تمھیں اس طرح نہیں بولنا چاہیے۔

پیغمبر علیہ السلام کا طریقہ اپنی بات کو پیش کرنے کے سلسلے میں ایک حکمت کا ہے کہ وہ دلائل اور حجت اور عقل اور نقل اس سے جو کچھ بھی اس مضمون کو مرتب کرنے کے لئے ہوسکتا ہے اس کو پیش کریں یا پھر دوسرا طریقہ موعظت کا ہے کہ اخلاص ودل سوزی کے ساتھ اس مضمون کو قبول کرنے کے لئے بیان کریں، یعنی اس کے فضائل بیان کریں، جب وہ قبول نہ کرے تو نقصانات بیان کریں اور خدانخواستہ نوبت جدال کی آجائے تو طریقہ ہونا چاہیے’’**بالتی ھی احسن**‘‘

لیکن ایک بات اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ آپ جس سلسلے میں غور وفکر کرنے کے لئے بیٹھے ہیں اور جو چیز حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اس سلسلے میں یعنی صراط مستقیم کی کیا پہچان ہے اور صراط مستقیم سے جو ہٹتے ہیں ان کے ہٹنے میں کس طرح ہم اس کو پہچانیں گے؛ تو اس سلسلے میں سابق شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا فخر الدین صاحبؒ کی بات مجھے یاد ہے کہ ایک دن عصر بعد بیٹھے تھے حضرت، ایک صاحب مولانا سید ارشد حسن کانپوری تھے، اب انتقال کر گئے ہیں وہ مظفر نگر میں رہتے تھے، پھر دیوبند میں رہنے لگے تو انھوں نے اسی موضوع کو کہ صراط مستقیم کی پہچان کیا ہے اور صراط مستقیم سے انحراف کرنے والوں کے بارے میں آسانی کے ساتھ کوئی طریقہ اگر ہو تو بتائیں؟ اس موقع سے حضرت نے مختصر سی بات کہی تھی، اس کو آپ لوگ سن لیں اور سمجھ لیں تو پہچان بھی ہوجائے گی اور اس کا سلیقہ بھی محسوس ہوجائے گا۔

حضرت نے کہا کہ دیکھئے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے جو چیزیں منقول ہیں وہ کل دو عدد ہیں۔ایک ہے قرآن کریم اور ایک ہے حدیث پاک۔قرآن کریم تو اللہ کا کلام ہے جو پیغمبر علیہ السلام پر نازل ہوا اور پیغمبر علیہ السلام نے اپنی طرف سے کسی طرح کی تبدیلی کے بغیر اسے مسلمانوں تک پہنچا دیا۔کفار نے فرمائش کی کہ آپ اسے تھوڑی سی ہماری رعایت میں ترمیم فرما دیں، یعنی قرآن کریم میں ایک مضمون ہے کہ آپؐ اس میں تھوڑا بہت تبدیلی کا عمل اگر کرلیں فلاں فلاں چیز میں، جو بھی ان کفار کا دعویٰ رہا ہو، مگر پیغمبر علیہ السلام نے فرمایا کہ: قُلْ مَا يَكُونُ لِيٓ أَنْ أُبَدِّلَهُ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيٓ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰٓ إِلَيَّ (یونس۱۵) کہ میں اپنی طرف سے کیسے کر سکتا ہوں اور یہ کہ میں نے تمہارے درمیان اپنی عمر گذاری ہے اور اس عمر کو تم جانتے ہو کہ میں نے کس طرح اللہ تعالیٰ کی امانت کو تم تک دیانت داری کے ساتھ پہنچایا ہے’’**افلا تعقلون**‘‘ تو تم مجھ سے کیسے امید رکھتے ہو کہ میں کوئی

تبدیلی وغیرہ کرسکتا ہوں۔ تو قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے جو بھی پیغمبر علیہ السلام کو پہنچایا؛ الفاظ اور معانی کے ساتھ بعینہٖ پیغمبر علیہ السلام نے امت تک پہنچادیا، ان الفاظ کا نام تو قرآن کریم کی عبارت ہے۔ اور معانی جو پیغمبر علیہ السلام نے بیان کیے ہیں وہ بیشتر احادیث میں ہیں۔

قرآن کریم اور احادیث بھی پیغمبر علیہ السلام سے پوری طرح منقول چلی آ رہی ہیں اور امت نے نہایت محنت کے ساتھ اِن دونوں نصوص سے جو عطر کشید کیا ہے وہ تین عدد ہیں۔ ایک ہے علم فقہ اور **العِلمُ بالاحکامِ الشرعیة معَ أدلتها التفصِیلیة** ۔ یہ سب قرآن کریم اور احادیث پاک کا عطر ہے۔ اور قرآن کریم کی عبارت سے یا حدیث پاک کی نصِ عبارت سے مضمون تک پہنچنے کا جو طریقہ اختیار کیا گیا وہ کتابوں میں بالکل وضاحت کے ساتھ درج ہے جس کو آپ اصول کہتے ہیں۔ عام کی دلالت اپنے معنیٰ مرادی پر کیسی ہوگی اور خاص کی دلالت کیسی ہوگی، عام مخصوص منہ البعض کی دلالت اپنے معنیٰ مرادی پر ظنی ہوگی یہ سب اصول ہیں۔ قرآن کریم کی عبارت سے اور حدیث پاک کی عبارت سے مضمون تک پہنچنے کے لئے جو طریقے ہیں وہ اصول فقہ میں موجود ہیں۔

یہ اصول فقہ کیا ہے؟ یہ آپ کی جو علم بیان ہے اور علم بلاغت ہے اس کی گویا ایک مذہبی شکل ہے۔ یعنی یہ الفاظ سے معانی تک پہنچنے کا طریقہ ہے۔ الفاظ سے معانی تک پہنچنے کا جو طریقہ عام ہے وہ علم بیان ہے اور جو خاص طریقہ ہے یعنی شریعت کے سمجھنے کا وہ اصول فقہ ہے۔ اصول فقہ میں حنفیہ کے یہاں بھی مکمل تدوین ہے اور شوافع کے یہاں بھی مکمل تدوین ہے اور حنابلہ کی بھی مکمل تدوین ہے اور جس کے یہاں یہ تدوین نہیں ہے اسے یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنے فقہ کو مرتب کرے۔ یہ ہمارے محدثین ہیں تو محدثین کے یہاں اصول فقہ مرتب ہوا نہیں ہے، یہ جو کچھ کرتے ہیں اپنے طور پر کرتے ہیں۔ امام ترمذی کہتے ہیں کہ ''الفقہاء اعلم بمعانی الحدیث'' کہ فقہاء یہ حدیث پاک کے معنیٰ کو زیادہ جانتے ہیں، کتاب الجنائز میں لکھا ہوا ہے۔

بہرحال ایک فقہ ہے اور اُس فقہ کو یعنی کہ قرآن اور حدیث کے الفاظ سے عملی زندگی کے مسائل کو؛ کہ کیسے نماز پڑھیں گے، کیسے روزہ رکھیں گے، کیسے بیع وشرا کریں گے، کیسے غلام کو آزاد کریں گے، کیسے غلام کو خریدیں گے، کیسے فلاں کام کریں گے، جتنے بھی زندگی کے کام ہیں، تو یہ فقہ ہے۔ اور ایک ہے علم کلام۔

حضرتؒ یہ کہتے تھے کہ دو تو ہیں بنیادیں: (۱) قرآن (۲) حدیث اور تین ہیں ان کی روحیں، تین ہیں ان کے عطر۔ ایک ہے فقہ، یعنی احکام عملیہ سے متعلق۔ اور ایک ہے عقائد؛ یعنی آپ کیا نظریہ اختیار کریں گے؟ آپ کو کیا عقیدہ اختیار کرنا چاہیے؟ اور جو یہ علم العقائد ہے اس کو ثابت کرنے کے لئے جو دلائل مرتب کیے گئے ہیں وہ ہے علم کلام۔ علم کلام اور علم عقائد ایک نہیں ہیں۔ حضرتؒ یہ کہتے تھے کہ تین عطر ہیں، ایک فقہ اور ایک ہے کلام، مگر کلام کے معنی یہ ہیں کہ کلام ایک تو ہے عقیدہ اور ایک ہے اُس عقیدہ کو دلائل عقلیہ سے ثابت کرنا۔ **علم یشتمل علی حِجَج المسائل او علی حجج العقائد الایمانیه بالدلائل العقلیه** دلائل عقلیہ سے عقائد ایمانیہ کو ثابت کرنے والا فن یہ علم کلام کہلاتا ہے۔

میرے عزیزو! تم لوگوں کو سب سے زیادہ ضرورت اسی فن کو مہارت کے ساتھ حاصل کرنے کی ہے اگر فرق باطلہ سے بات کرنی ہے۔ اور تمھیں اعمال کے سلسلے میں بھی بات کرنی ہے تو فقہ اور اصول فقہ کی بھی ضرورت ہے لیکن اصل جو زیغ وضلال ہے وہ تو عقیدے میں آتا ہے، عقیدہ میں زیغ و ضلال آئے گا اس کو صحیح طور پر پیش کرنے کا سلیقہ یہ تو علم کلام پیش کرے گا۔

قرآن کریم ہے تو قرآن کریم کے بارے میں چند باتیں نہایت واضح طور پر سب جانتے ہیں کہ یہ اللہ کا کلام ہے اگر کوئی شخص اس کو اللہ کا کلام نہیں جانتا تو اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ اللہ کا کلام ہے اور اس کا پڑھنا اس کے الفاظ کا ادا کرنا ہر حرف پر دس نیکی کا ثواب دیتا ہے۔ اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کوئی جماعت یہ کہتی ہے کہ سمجھ کر پڑھنے پر ثواب ملے گا، بغیر سمجھے نہیں ملے گا تو اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ اس نے جو عقیدہ متوارث چلا آ رہا تھا؛ اس میں ترمیم کردی۔

قرآن کریم کے بارے میں یہ بات ہے کہ اس میں پیغمبر علیہ السلام نے فرمایا کہ اس میں تفسیر بالرائے نہیں ہوگی ''**من قال فی القرآن برأیه واصاب فقداخطا**''، فرمایا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ اگر کوئی شخص قرآن کریم میں اپنی رائے سے کہتا ہے، اپنی رائے سے کہنے کے معنی یہ ہیں کہ اس نے پہلے سے ایک رائے طے کرلی، پھر قرآن کریم کی آیت سے استدلال شروع کردیا جبکہ اصل یہ تھا کہ الفاظ سے معانی تک پہنچنے کا جو فن مرتب کیا گیا ہے جسے اصول فقہ کہتے ہیں، جس کی صحت کا تجربہ ہوچکا ہے اس کو اس نے حاصل نہیں کیا۔ وہ اپنے طور پر تفسیر کررہا ہے۔

بعض لوگ ایسے ہیں، یہ کہتے ہیں کہ صاحب! ہم تو قرآن کریم پڑھتے ہیں اور قرآن کریم کو پڑھنے کے بعد مخلا بالطبع ہوکر ہمارے دل پر جو وارد ہوتے ہیں، ہم ان مضامین کو بلاکم وکاست کاغذ پر نقل کردیتے ہیں؛ یہ تفسیر بالرائے ہے۔ اس لیے کہ تم نے الفاظ سے معانی تک پہنچنے کے لئے جو صحیح طریقۂ کار تھا جو اصول فقہ میں درج ہے اس کو تو اختیار نہیں کیا؛ اس پر دھیان دیتے نہیں اس کو جانتے بھی نہیں؛ نہ تم نے جاننے والوں کے فن سے استفادہ کیا؛ نہ تم میں یہ قابلیت ہے کہ خود مرتب کرسکو اور تم یہ کہہ رہے ہو کہ ہم قرآن

پڑھیں گے اور قرآن کریم کے الفاظ سے جو معانی ہمارے دل پر نازل ہوں گے؛ ظاہر سی بات ہے کہ جومضامین آپ کے اوپر نازل ہوں گے، جب کہ آپ، ان الفاظ سے صحیح معانی تک پہنچنے کے طریقے سے واقف نہیں ہیں تو وہ غلط ہوں گے۔ اس لئے قرآن کریم اور حدیث پاک تو ہوئے اصل اور ان کے بارے میں کچھ ہیں ایسے نظریات کہ جن پر امت روزاول سے متفق ہے، تو اب اُن نظریات کو شرعی طور پر ثابت کرنے کے لئے اِن کے لئے دلائل مہیا کرنے کے لئے جو علم وفن ہے یہ علم کلام ہے۔

علم کلام کی جو بہت سی موٹی موٹی معتبر کتابیں ہیں جیسے علامہ سعد الدین تفتازانی کی شرح مقاصد ہے؛ بہت موٹی کتاب ہے، تمام اصول اس میں موجود ہیں یا اس سے آسان ہے میر سید شریف کی شرح مواقف؛ اس کی بہت آسان عبارت ہے پڑھتے رہو سمجھتے رہو۔ لیکن ہم لوگ تو اس طرح کی مطول کتابوں کو پڑھنا نہیں چاہتے مطول کتابوں کو فرصت بھی چاہتا ہے صلاحیت بھی چاہتا ہے لیکن لیکن ہم تو اردو بھی نہیں پڑھتے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو ایک دفعہ علی گڑھ میں بلایا اور وہاں طلبہ نے کچھ فرمائش کی کہ آپ فلاں فلاں مسائل پر کچھ بیان کردیں تو حضرت نے چند اصول بیان کیے، شریعت کے لیے عقلی اصول اور گھر آ کر اُن کو مرتب کر دیا، تو وہ جو مرتب کردہ اصول ہیں وہ مرتب کردہ اصول ''الانتباہات المفیدۃ'' کے نام سے بازار میں ملتے ہیں، سوسوا سو صفحہ کی کتاب ہے۔ اس میں حضرت نے چند اصول لکھے ہیں۔ مثلاً حضرتؒ کہتے ہیں کہ ''ہر وہ چیز جو ممکن عقلی ہو اور مخبر صادق اس کی خبر دیتا ہو اس کا یقین کرنا ضروری ہے''۔ یہ ایک اصول ہے، شرح مواقف میں بھی ہے شرح مقاصد میں بھی ہے، حضرت نے اردو میں اسے منتقل کردیا۔ اور ایسے ایسے آٹھ دس اصول مرتب کیے۔ مثلاً انھوں نے کہا ''کسی چیز کا سمجھ میں نہ آنا دلیل اس کے غلط ہونے کی نہیں ہے'' کسی نے کہا کہ میری سمجھ میں نہیں آیا؛ بھائی تمہارے سمجھ میں نہیں آیا تمہاری سمجھ کا وہ معیار ہی نہیں ہے جو اس بات کو سمجھ سکو، کیوں کہ کسی چیز کا سمجھ میں نہ آنا یہ دلیل اس کے غلط ہونے کی نہیں ہے۔ ایک اصول بتایا آپ نے کہ ''ہر وہ چیز جو ممکن عقلی ہو''۔ پیغمبر علیہ السلام نے کہا کہ میں رات آسمان پر گیا تھا صبح کو لوگوں نے آپس میں گفتگو کی، حضرت ابوبکر صدیقؓ سے کہا کسی نے کہ وہ آپ کے جو صدیق حمیم ہیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم؛ سنا رات کیا کہا انھوں نے؛ وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ میں رات آسمان پر گیا تھا اور وہاں فلاں فلاں چیز دیکھ کر آیا ہوں۔ ابوبکر صدیقؓ نے ان سے پوچھا کہ وہ کہہ رہے ہیں؟ انھوں نے کہا کہ کہہ رہے ہیں، تو کہا کہ کہنا ان کا ٹھیک ہے۔ یعنی ایک سیکنڈ توقف نہ کیا۔ وجہ کیا ہے کہ ہر وہ چیز جو ممکن عقلی ہو اور مخبر صادق اس کی خبر دے اس کا ماننا ضروری ہے۔ آسمان پر کسی انسان کا جانا محال نہیں ہے ممکن ہے اور مخبر صادق کہ زندگی بھر اس نے کبھی جھوٹ نہیں بولا وہ خبر دے رہا ہے؛ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اسی اصول کے مطابق جواب دیا کہ پھر تو وہ صحیح کہہ رہے ہیں۔

یہ اصول مثلاً آپ کو معلوم ہے کہ فلاں جگہ یہ واقعہ پیش آیا، کوئی نہایت حیرت انگیز بات پیش آ گئی کسی گاؤں میں مثلاً، اور کچھ لوگوں نے آ کے بتایا بھی کہ فلاں جگہ یہ بات پیش آ گئی تو آپ بتانے والے کے بارے میں یہ تو جاننا چاہتے ہیں کہ یہ سچا ہے کہ جھوٹا ہے۔ اگر اس کے بارے میں معلوم ہو کہ یہ خرافاتی انسان ہے تو آپ کا دل کبھی نہیں مانتا لیکن اگر آپ کے نہایت قابل اعتبار بزرگوں میں کوئی شخص وہ بات بیان کرے تو یقین کریں گے کہ بھائی ٹھیک ہے یہ کہہ رہے ہیں تو ٹھیک ہوگا۔ کیا بات ہے بس یہی کہ اگر کوئی چیز ممکن عقلی ہو یہ ہے صغری اور مخبر صادق اس کو بتائے تو نتیجہ یہ ہے کہ اس کا ماننا ضروری ہے۔ پیغمبر علیہ السلام نے کہا خدا ایک ہے، ٹھیک ہے یہ تو بدیہی بات ہے۔ لیکن پیغمبر علیہ السلام نے فرمایا کہ خدا کی یہ صفات ہیں، اب مخبر صادق ہے بات جو بتا رہا ہے ممکن ہے اس لیے کا ماننا ضروری ہے۔

ایک تھے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلفاء میں حکیم محمد مصطفیٰ صاحب، ان کے نام سے دواخانہ مصطفائی میرٹھ میں قائم ہے، انھوں نے انتباہات مفیدہ کی شرح لکھی، اس کا نام تھا ''حل الانتباہات المفیدۃ'' حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں سے رسائل نکلتے تھے ''النور'' نکلتا تھا اور ''الہادی'' نکلتا تھا تو حکیم مصطفیٰ کا وہ مضمون الہادی میں قسط وار چھپتا تھا۔ حکیم محمد مصطفیٰ نے علم کلام کے ان اصولوں کی شرح بھی کی ہے اور ان کی تطبیق بھی دیدی ہے۔ یعنی ایک اصول سے انھوں نے مثلاً دس مسائل ثابت کر کے دکھادیئے، اجراء کردیا، یہ کتاب حل الانتباہات المفیدہ کے نام سے پہلے چھپی تھی پھر اس کے بعد پاکستان میں چھپی تو اس کا نام رکھ دیا ان لوگوں نے اسلام اور عقلیات، مولانا محمد تقی صاحب کے کتب خانہ سے چھپی تھی اب دارالعلوم دیوبند نے اس کا ترجمہ کرایا ہے ''الاسلام والعقلانیۃ'' کے نام سے۔ (حل الانتباہات المفیدہ بھی دارالعلوم نے چھاپ رکھی ہے)

تو بہر حال میں یہ کہہ رہا تھا کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے علم کلام کے چند اصول ''الانتباہات المفیدہ کے نام سے اردو زبان میں اتنے آسان انداز میں مرتب کر دیئے اور ان کو ایک ایک جگہ دو دو جگہ اجراء بھی کردیا، اب حضرت ہی کی زندگی میں حضرت کے خلیفہ نے ان کی تشریح کردی اور تشریح کے ساتھ اس کا اجراء کردیا کہ ایک اصول لکھا اور اس کے نیچے دو چار جزئیات اجراء کرنے کے بعد کر دیے۔ اگر آپ غور وفکر کے ساتھ الانتباہات المفیدہ پڑھ لیں تو علم کلام میں آپ کو اتنی دست رس ہو جائے گی کہ جو عقائد ہیں ان

عقائد کو عقلی طور پر ثابت کرنے کا ایک سلیقہ پیدا ہوجائے گا۔

تیسری بات جو حضرت کہتے تھے تیسرا جو روح ہے تصوف ہے (میں بیان کر رہا ہوں مولانا فخرالدین صاحبؒ کا ملفوظ مع شرح کے) پیغمبر علیہ السلام سے دو چیزیں منقول ہیں ایک قرآن، ایک حدیث اور امت کے قابل قدر دماغوں نے، نہایت بڑے لوگوں نے اس سے تین عطر کشید کیے ہیں۔ ایک فقہ جو احکام عملیہ بتاتا ہے مع ادلہ تفصیلیہ، دوسرا کلام جو عقائد ایمان کو عقائد اسلام کو ثابت کرتا ہے دلائل عقلیہ سے جس کا کچھ ٹکڑا میں نے انتباہات کے ذریعہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور تیسری جو روح ہے وہ ہے تزکیۂ اخلاق، جو پیغمبر علیہ السلام نے گنوائے تھے۔ ایک آیت ہے تزکیہ کے لیے انسان کو فلاں فلاں اوصاف حمیدہ سے متصف ہونا چاہیے، اگر ان اوصاف حمیدہ سے متصف ہونے میں کوئی کمی ہے تو وہ تصوف یعنی تزکیۂ اخلاق کا جو فن ہے اس فن کے ذریعہ اپنے آپ کو آراستہ کرے۔

حضرت یہ کہتے تھے کہ پانچ چیزیں ہیں، ان پانچ چیزوں میں اگر آپ کسی فرد کو جانچنا چاہتے ہیں اور کسی جماعت کو جانچنا چاہتے ہیں تو آپ یہ دیکھئے کہ ان پانچ میں آپ کے ساتھ ہے مکمل؛ یعنی قرآن کریم اور قرآن کریم کے بارے میں جو اجماعی نظریات ہیں اُن نظریات میں یہ امت کے ساتھ چل رہا ہے۔ روز اوّل سے جو عبداللہ ابن مسعودؓ کا خیال تھا وہی اس کا ہے جو ابو ہریرہؓ کا خیال تھا وہی اس کا ہے، جو امام اعظم کا تھا وہی اس کا ہے، جو امام غزالی کا تھا وہی اس کا ہے، اگر یہ امت کے ساتھ چل رہا ہے تو یہ ہمارا ہے اور اگر کہیں بدل گیا مثلاً اس نے کہا کہ قرآن کریم کو بے سمجھے پڑھنا ثواب نہیں ہے ؛لگا دیجیے کانٹی آپ کہ یہ ہمارا نہیں ہے۔ کہتا ہے قرآن کریم کے نازل ہوئے چالیس پارے؛ دس پارے غار سرمن رآہ میں بارہویں امام لیکر چلے گئے ؛لگا دیجیے کانٹی کہ یہ ہمارا نہیں ہے، قرآن کریم میں کوئی تبدیلی نہیں ہے۔ حدیث پاک ہے؛ حدیث پاک کے سلسلے میں کوئی شخص کہتا ہے محدثین نے انتہائی محنت کی اور محنت کر کے انھوں نے مدون کر دیا پورا کہ حدیث پاک سمجھنے کا یہ فن ہے اور حدیث پاک کے جانچنے کا یہ فن ہے۔ اب اگر کوئی شخص ان مدون کردہ امت کے فنون سے انحراف کرتے ہوئے کوئی نئی بات کہتا ہے تو لگا دیجیئے کانٹی کہ یہ ہمارا نہیں ہے۔

ان سے کشید کردہ تین عطر فقہ کے بارے میں ایک شخص کہتا ہے کہ یہ فقہ ناتمام ہے اور اس اصول فقہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے جو سمجھ میں آئے گا وہی کریں گے ؛اگر اس طرح کا خیال ظاہر کرتا ہے تو اس کے معنیٰ ہیں کہ وہ آپ کے ساتھ نہیں ہے۔ یہی بات عقائد میں ہے، جو مدون عقائد ہیں، روز اول سے، ان عقائد میں اگر کوئی اختلاف کرتا ہے مثلاً صحابہ کا مسئلہ آ رہا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے صحابہ کو کچھ نہ کہو **الصحابة كلهم عدول**، آپ نے یہ کہا کہ یہ میری قابل اعتماد جماعت ہے اور اس جماعت سے ساتھ حسن عقیدت فریضہ ہے، جو صحابہ کرام پر تنقید روا رکھتا ہے اس پر لگادو کانٹی کہ وہ ہمارا نہیں ہے۔ جو تصوف کا انکار کرتا ہے لگادو کانٹی کہ ہمارا نہیں ہے۔ تو پہچان تو یہ ہے بھائی۔

حضرت نے یہ بات کہی کہ کون شخص صراط مستقیم پر ہے اس کے لئے پانچ چیزوں کو رکھیے ذہن میں۔ قرآن، حدیث، فقہ، کلام اور تصوف، جو ان تمام چیزوں کے سلسلے میں امت کے ساتھ چلا آ رہا ہے عہد رسالت سے اب تک۔ اور یہ جو دیوبند ہے اس کا کمال ہی یہ ہے کہ انھوں نے اپنی طرف سے ایک بھی نظریہ پیدا نہیں کیا ہے۔ یہ طبقہ، رسالت کا یا صحابہ کرام کا جو طرز فکر چلا آ رہا ہے اسی کا ترجمانی کرنے والا ایک فرقہ ہے۔

اب اگر ان پانچ چیزوں میں کوئی نئی رائے اختیار کر رہا ہے تو آپ کیسے اس سے نبرد آزما ہوں گے؟ تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ بالحکمہ اور بالموعظۃ الحسنۃ، وجادلہم بالتی ہی احسن طریقہ تو ہوگا ہی۔ اس موضوع پر کام کرنے والے عموماً جتنے حضرات ہیں اگر **جادلهم بالتي** ہی احسن سے ہٹتے ہیں وہ اپنی بات کو قبول کرانے کے سلسلہ میں ناکام ہیں بلکہ اپنے اوپر الزامات آنے کے سلسلے میں بھی ناکام ہیں کہ۔ (زبان کی شدت کے سبب) جتنے لوگ آج کل جیل میں بھی ہیں سب مظلوم ہیں، یعنی مسلمان کبھی کوئی ایسا کام نہیں کرتا جو امن کے خلاف ہو، اسلام تو امن ہی کا مذہب ہے لیکن ان حضرات کی تقریر کا جو طریقہ ہے وہ جدال جادلہم بالتی ہی احسن سے ہٹ کر ہے یعنی امن پسند ہیں مگر زبان سے ایسی بات کہہ دی جس کی بنیاد پر کسی شخص کو موقع مل گیا گرفت کا؛ یعنی جب حقیقت کھلے گی تو یہ معلوم ہوگا کہ اس کا کوئی قصور نہیں تھا وہ بری ہو گیا لیکن سردست تو پریشان ہے، کیوں پریشان ہے اسی جدال بالتی ہی احسن سے پوری طرح عمل نہ کرنے کی بنیاد، پر اور یہ کہ جدال بالتی ہی احسن کے طریقہ پر کام کرنا یہی فریق ثانی کو اپنی بات پر مطمئن کرنے اور قبول کرنے کے لیے آمادہ کرنے والی چیز ہے۔

تو پہچان تو اس طرح ہوگی کہ امت کے پاس پیغمبر علیہم السلام سے جو یہ چیزیں آئی ہیں اور اس سے امت نے جو عطر کشید کیا گیا ہے آپ اس معیار پر جانچئے اپنے کو بھی اور ان جماعتوں کو بھی۔ اگر جماعتیں اس معیار پر پوری نہیں اترتیں یا کوئی فرد اس معیار پر پورا نہیں اترتا تو اس کے معنیٰ ہیں کہ وہ اہل السنۃ والجماعۃ سے نہیں ہے اور جہاں اس نے انحراف کیا ہے اس انحراف سے

نمٹنے کے لیئے استدلال کرنا پڑے گا آپ کو علم کلام سے، علم کلام میں جو اصول بیان کیے گئے ہیں حقائق شرعیہ کو ثابت کرنے کے لیے ان اصول میں کوئی نہ کوئی اصول عقلی طور پر آپ کی بات کو ثابت کرنے کے لیے یقیناً مل جائے گا۔ شاید انتباہات المفید ہ میں ہی مل جائے۔ اور پیش کرنے کا طریقہ وہ ہونا چاہیے جو قرآن کریم میں آرہا ہے کہ ہونا چاہیے وہ حکمۃ کی بنیاد پر یعنی استدلال علمی ہو یا موعظۃ حسنۃ کی بنیاد پر کہ بات افہام وتفہیم کی ہو، ثواب وعقاب کی ہو، فضائل کی ہو، امم سابقہ اور پچھلے لوگوں کے قبول کرنے پر انعامات اور نہ کرنے پر عذاب خداوندی پر مشتمل ہو اور اگر بالفرض گفتگو جدال کی اور مناظرے کی آجائے مناظرے بھی کر لیجیے آپ۔

مناظرہ کا ایک دور تھا جس میں چلتا تھا اور آج بھی کہیں کہیں ضرورت پڑ سکتی ہے لیکن یہ بات طے ہے کہ مناظرہ اپنی بات کو دوسرے شخص سے قبول کروانے کے سلسلے میں مفید نہیں ہے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو قبول حق کے سلسلے میں ناکام قرار دیا ہے۔ یعنی یہ واقعہ ہے، البتہ کہیں کہیں اپنے لوگوں کے اطمینان کے لیے مناظرہ کرنا پڑتا ہے۔ اگر آپ مناظرہ سے ہٹ جائیں گے تو یہ ہوگا کہ فریق ثانی یہ کہے گا کہ ان کے پاس اپنی بات کو ثابت کرنے کے لیے کوئی دلیل ہی نہیں ہے؛ مجبوراً مناظرہ کرنا ہی پڑتا ہے۔ لیکن دعوت کے سلسلے میں نہیں ہے وہ، یعنی مناظرہ تو اپنے لوگوں کو مطمئن کرنے کے لیے مجبوری کا کام ہے ورنہ دعوت کے سلسلے میں اپنے مضمون کو دوسرے آدمی سے قبول کرانے کے لیے یا تو حکمت چاہیے یا موعظۃ حسنہ چاہیے یا جدال احسن چاہیے۔

میرے بھائیوں گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ پانچ فن ہیں اور ان پانچ فنوں کے ذریعہ آپ کسی شخص کا اہل سنت والجماعت میں سے ہونا، یا اب سے لے کر قیامت کسی کے صراط مستقیم پر ہونا جان سکتے اور اس جاننے کے سلسلے میں جو اصول مقرر ہیں ان کو سمجھنا آسان ہے اور اگر اس کا انحراف آپ کو محسوس ہو رہا ہے، اس کو بچانے کے لیئے علم کلام کی مدد سے استدلال پیش کرنا ہے۔ اور اگر استدلال پیش کرنے کی نوبت آتی ہے تو اس نوبت میں آپ کو وہ تین کام جو قرآن کریم کہہ رہا ہے ایک بالحکمۃ، موعظۃ حسنہ اور جدال بالتی ہی احسن، ان سے استفادہ کرنا ہوگا۔ اگر آپ اس طرح کام کرتے ہیں تو ان شاء اللہ یہ ختم نبوت والا مضمون اس سلسلے میں بھی اور اس کے علاوہ جتنے بھی فتنے ہیں اور آج کل تو فتنے بہت زیادہ پھیل رہے ہیں ان سب کے لیے مفید ہوگا۔

ایک تو خدا ہدایت دے سعودیہ سرپرستی کر رہا ہے غیر مقلدوں کی، وہ اپنے آپ کو اہل حدیث کہتے ہیں یعنی سعودیہ خود اس سے ساری دنیا میں لوگ ناراض ہیں مگر وہ کر رہا ہے سرپرستی، پتہ نہیں کیا بات ہے۔ میں نے کہا اپنے بڑوں سے کہ بھائی اس سلسلے میں اس کو متوجہ کرو مگر ابھی تک یہ لوگ متوجہ کرتے بھی ہیں مگر کھل کر نہیں کر رہے ہیں۔ یہ سعودیہ سخت غلطی کر رہا ہے حکومت اُن کی سرپرستی کر رہی ہے اور وہ صراط مستقیم سے انحراف کر کے کام کر رہے ہیں، صراط مستقیم سے انحراف کے معنیٰ یہ ہیں کہ جو چیزیں عہد رسالت سے ثابت ہیں کہ مثلاً تراویح ہے ۲۰ رکعت، ان حرمین سے کسی وقت وہ ۸ رکعت نہ کرا دیں، یہ گویا چل رہا ہے۔

قادیانیت کا فتنہ تو فتنہ ہی تھا لیکن یہ غیر مقلدیت کا فتنہ بھی بہت عام ہو رہا ہے اور بھی نئے نئے فتنے پیدا ہو رہے ہیں جنھیں آپ نے مولانا شاہ عالم صاحب کی زبانی سنا ہوگا، جن میں شکیل بن حنیف ہے، میں تو جانتا نہیں کون صاحب ہیں، وہ پتہ نہیں لوگ کیسے ہیں کیسے مانتے ہیں کمزور باتوں کو بھی دھیان سے سن لیتے ہیں اور ان کے ماننے والے پیدا ہو جاتے ہیں کہ یہ جو اور فرقے ہیں، خوارج کا تھا شیعوں کا تھا تو یہ فتنے تو پرانے ہیں اور چلے آرہے ہیں اور جو اس دور کے فتنے ہیں مودودیت ہے ہی، غیر مقلدیت ہے ان تمام کا تعاقب اسی طرح ہوگا کہ آپ دیکھئے کہ ان پانچ چیزوں میں کہاں کہاں اختلاف ہے اور جہاں جہاں اختلاف ہے اس کو مدلل کرنے کے لیے آپ علم کلام سے مدد لیں اور جو تین طریقے ہیں ان تین طریقوں کے مطابق اس کو پیش کریں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو بھی توفیق عطا فرمائے مجھ کو بھی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

مجھے نہ تو تقریر کرنے کا سلیقہ ہے اور یہ مولانا شاہ عالم کا اصرار ہے اور (مسرت آمیز لب و لہجے میں) اصرار کیا اِنھوں نے میرے بلڈ پریشر کو بڑھانے کی ایک ترکیب سوچی ہے یہ مجھ سے کہہ دیتے ہیں کہ فلاں کام کرو تو میرا بلڈ پریشر بڑھ جاتا ہے؛ تو یہ چاہتے ہیں کہ بلڈ پریشر بڑھا رہے (سامعین اس انداز خسروانہ سے خوب لطف اندوز ہوتے رہے)۔ اللہ تعالیٰ اِن کو ترقیات عطا فرمائے، مجھے بہت خوشی ہے کہ اتنا بڑا پروگرام ہو رہا ہے اور آپ لوگ پوری دلچسپی کے ساتھ حصہ لے رہے ہیں سن رہے ہیں، سمجھ رہے ہیں مگر دعوت کا جو طریقہ ہے میں چاہتا تھا کہ یہ بات میں عرض کروں کہ تشدد سے اپنے آپ کو بچائیں، استدلال تو نہایت صاف ہو، تشدد سے پاک ہو۔ اخلاص اور دلسوزی کے ساتھ اپنی بات پیش کریں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو دین حنیف کی خدمت اور دین حنیف کو پھیلانے کی توفیق عطا فرمائے اور ہر طرح کے شرور وفتن سے محفوظ فرمائے اور دین کو بھی محفوظ رکھے۔ و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔ ◻◻

مقبول جو ہوں شاذ ہیں، قابل تو بہت ہیں

ایک انسان ساز شخصیت کی کچھ یادیں

تحریر: مولانا محمد تبریز عالم حلیمی قاسمی (خادم الحدیث والافتاء دارالعلوم حیدرآباد)

دارالعلوم دیوبند بلا شبہ ایک چمن ہے، ایک ایسا چمن جس کے پھولوں سے دنیائے علم وعمل میں خوشبو ہے، واقعی اِس چمن کا ہر پھول ایک شعلہ اور ہر سرو ایک مینارہ ہے اور واقعتاً اس خاک کے ذرّے ذرّے سے شرر بیدار ہوتے ہیں اور ایسا اِس وجہ سے ہے کہ دارالعلوم دیوبند کی سب سے بڑی شناخت اخلاص اور تقویٰ ہے، اس کی ظاہری و باطنی تعمیر میں یہی روح کارفرما ہے، اس کے درو دیوار میں بے لوثی اور للّٰہیت کی مہک بسی ہوئی ہے۔

جیسے چراغ کی روشنی کی جہت طے کرنا مشکل ہے ٹھیک اسی طرح بعض چیدہ شخصیات کی علمی وعملی زندگی کی سمت طے کرنا بعض دفعہ مشکل ہوجاتا ہے، بات اگر علم وہنر کے گہوارے سے تعلق رکھنے والی مقبول اور ہردل عزیز شخصیت کی ہو تو یہ کام خاصا دشوار ہوجاتا ہے، افلاک کے تاروں سے بلند تر مقام کی حامل شخصیت پر خامہ فرسائی کے لیے مولانا ابوالکلام آزاد، عبدالماجد دریابادی اور شورش کاشمیری جیسے انشا پرداز کا قلم درکار ہے، ورنہ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا کا شکوہ دامن گیر ہوجانا یقینی امر ہے۔

میرے اور مجھ جیسے لاکھوں شاگردوں کے استاذِ محترم، مشفق ومکرم حضرت مولانا ریاست علی بجنوری نور اللہ مرقدہٗ سابق استاذِ حدیث وسابق ناظم تعلیمات دارالعلوم دیوبند کی نورانی، بافیض، مردم ساز، خدا رسیدہ اور مختلف الجہات شخصیت کا سانحۂ ارتحال واقعتاً دارالعلوم دیوبند کے لیے ایک بڑا خسارہ ہے، اگرچہ ان کی وفات کی وجہ سے دارالعلوم دیوبند اور کائنات کا نظام مختل نہیں ہوگا، اگرچہ اِس مینارۂ نور کی تابانی وضوفشانی ماند نہیں پڑے گی؛ لیکن شمس وقمر کی فطری روشنی میں بھی تاریکی کا احساس ختم ہونا دارالعلوم دیوبند سے تعلق رکھنے والے ایک طالب علم کے لیے مشکل ضرور ہے، علم وعمل اور شرافت ونجابت کے پیکر، اکابرِ دیوبند کا پرتو، ایک تابندہ علمی شخصیت، جمال وکمال کا مظہر، روایاتِ اکابر کا عنوان، علم وفضل، دانش وبینش اور فکر وتدبر کی علامت، اپنے اساتذہ کے علوم کے شارح، علم وادب کا حسین سنگم، دارالعلوم دیوبند کی علمی اور تاریخی روایتوں کے پاسبان، یتیموں اور بیواؤں کے کفیل، طلبہ کے خیر خواہ کو قلب ودماغ سے نکالنا اور فراموش کرنا ممکن نہیں۔

فروغِ شمع جو اَب ہے، رہے گی رہتی دنیا تک
مگر محفل تو پروانوں سے خالی ہوتی جاتی ہے

حضرت الاستاذ مولانا نور عالم خلیل امینی رئیس التحریر مجلّہ ’الداعی‘ عربی واستاذ ادبِ عربی دارالعلوم دیوبند نے ایک جگہ لکھا ہے: ”کسی بڑے اور اہلِ کمال میں سب سے بڑا وصف اس کی تواضع اور خاکساری ہی ہوسکتی ہے، یہ تمام صفات کی ماں، ساری خوبیوں کی جڑ اور اچھائیوں کا سرچشمہ ہے، اِس کے بغیر ہر بڑائی برائی ہے اور اس کے ساتھ ہر عیب چشم پوشی کے لائق ہے، بڑوں کی بڑائی کے لیے یہ سب سے قیمتی تاج ہے، اگر کوئی بڑا اِس سے عاری ہے تو وہ بڑا ہو ہی نہیں سکتا۔“

حضرت الاستاذ مولانا ریاست علی بجنوری نور اللہ مرقدہٗ کی ذات میں تواضع وخاکساری کی صفت حد درجہ تھی، کیا چھوٹے کیا بڑے سبھی اِس کے قائل ہیں، کوئی اِس کا منکر نہیں، آپ اپنی تحریروں میں اپنے نام کے ساتھ کوئی امتیازی لقب نہ لکھتے تھے نہ پسند فرماتے تھے، شناخت کے لیے عموماً ’خادم تدریس دارالعلوم دیوبند‘ کا سادہ سا جملہ لکھا کرتے تھے، اپنے لیے صدارت یا کرسیِ صدارت کو قطعی پسند نہیں فرماتے تھے، مجلس میں کہیں بھی بیٹھ جایا کرتے تھے، مجلس میں پاؤں پھیلا کر نہیں بیٹھتے تھے، عموماً پیالے میں پانی نوش فرماتے تھے، سادہ لباس زیب تن فرماتے تھے، لباس کی سادگی ایسی کہ جو شخص پہلے سے متعارف نہ ہو وہ وضع قطع سے فیصلہ نہیں کرسکتا تھا کہ یہی مولانا ریاست علی بجنوری ہیں، یہی ’شوریٰ کی شرعی حیثیت‘ کے مصنف ہیں، یہی ترانۂ دارالعلوم کے خالق ہیں، یہی ایک پختہ کار اور منفرد حیثیت کے شاعر ہیں اور یہی ماضی میں ماہنامہ دارالعلوم کے مدیر اور تعلیمات کے ناظم رہ چکے ہیں اور اب یہی اپنے استاذِ محترم کی تقریرِ بخاری بنام ’ایضاح البخاری‘ شائع کر رہے ہیں اور یہی وہ ممتاز شخص ہیں جن کی اصابتِ رائے، بروقت مفید مشوروں، ہوش مندی اور دور اندیشی سے دارالعلوم دیوبند، جمعیۃ علماء ہند، ادارۃ المباحث الفقہیہ اور دیگر وابستگانِ علم وادب مستفید ومستفیض ہوتے رہتے ہیں اور یہی وہ روشنی ہیں جنھوں نے اندھیروں میں چراغ جلائے ہیں، علمی کام کرنے والے اساتذہ

کی ایک کھیپ تیار کردی ہے اور یہی وہ یکتائے زمانہ شخص ہیں جنھوں نے قطروں کو دریا بنایا ہے، یقیناً کسی شخص کی شخصیت میں اتنی ساری صفات وخصوصیات پنہاں ہوں اور وہ انھیں ظاہر نہ ہونے دے، اِسی کا دوسرا نام خاکساری اور تواضع ہے؛ قدرت نے رفعت وشہرت اور قدر ومنزلت کو اِسی تواضع سے مربوط کیا ہے، اِسی تواضع وخاکساری کے خمیر سے فلک کے تاروں سے بلند تر مقام بنتا ہے، جو حضرت کے حصہ میں آیا اور خوب آیا، سچ ہے ؎

کہ دانہ خاک میں مل کر گلِ گلزار ہوتا ہے

دارالعلوم دیوبند میں سہ سالہ طالب علمی کے دور میں حضرت الاستاذ کو دور سے ہی دیکھنے اور پڑھنے کا موقع ملتا رہا، بعد کے حالات نے ثابت کیا کہ اِس دوران حضرت سے عدمِ قربت میری بدنصیبی کا حصہ تھی؛ البتہ معین مدرسی کے دو سالوں میں کبھی کبھار حضرت کی مجلس میں حاضری کا موقع ملتا رہا، وہ حاضری میری خوش نصیبی کا حصہ تھی، دورانِ طالب علمی کی بدنصیبی خوش نصیبی میں اس وقت تبدیل ہوئی جب دارالعلوم حیدرآباد کی تدریسی ملازمت کا موقع ملا اور ہر سال شوال میں مدرسہ کے کام سے دارالعلوم دیوبند حاضری ہوتی رہی، طالب علمی اور معین مدرسی کا زمانہ گذار کر دارالعلوم دیوبند سے جانے کے بعد لگاتار سات سالوں تک دیوبند جب بھی حاضر ہوا حضرت الاستاذ سے ملنے کا شرف ملتا رہا، ہر سال اِس احساس میں اضافہ ہوتا رہا کہ حضرت الاستاذ میں پدرانہ شفقت کا عنصر غالب ہے، وہ اپنے دل میں اپنے طلبہ کے تئیں درد رکھتے ہیں، حافظہ اور ذاتی ڈائری سے بیتے دنوں کی کچھ یادوں کو زندگی دے کر دلی تسلی کا سامان فراہم کرتا ہوں، ان واقعات ومشاہدات میں ایک طالب علم کے لیے عبرت وموعظت کا کافی سامان ہے۔

● حضرت کی زندگی 'ہٹو بچو' کی کیفیت سے کوسوں دور تھی، اپنی بڑائی اور اپنا امتیاز نمایاں کرنے کا جذبہ نہ کے درجہ میں تھا، جس سال حضرت مولانا فدائے ملت حضرت مولانا سیّد اسعد مدنیؒ کا انتقال ہوا، میں دارالعلوم میں نووارد تھا، جنازے کی نماز دارالعلوم میں ادا ہورہی تھی، ازدحام کافی تھا، حضرت کو دیکھا اکیلے، کنارے طلبہ کی پچھلی صف میں کھڑے ہیں، ساتھ میں نہ کوئی خادم نہ کوئی اور، میں بہت متاثر ہوا کہ اس پائے کا محدث اکیلا کنارے کھڑا ہے۔ وہ عموماً تنہا ہی ہوتے تھے، اس سادہ انسان کی سادہ زندگی کا منظر نگاہوں میں آج بھی تازہ ہے، آج وہ راستہ، وہ گلی، وہ موڑ، وہ زینہ، وہ مسندِ درس اور وہ درودیوار ماتم کناں ہیں، انھیں سادگی کا ایسا تاج محل اب کبھی دکھائی نہیں دے گا۔

● ۱۴۳۴ھ کی بات ہے، دارالعلوم حاضری کے موقع سے حضرت کی مجلس میں حاضری ہوئی مختصر بات چیت ہوئی، میں شروع سے ہی کم گو ہوں، میں نے ڈرتے ہوئے حضرت سے اپنی بیمار اہلیہ کی خاطر تعویذ کی درخواست کی، حضرت فوراً تیار ہوگئے اور کہا کل کو لے لینا۔ دوسرے دن حاضر ہوا، اختتامِ مجلس پر میں نے یاد دلایا تو کہا: بیٹے! میں بھول گیا کل کو آتے ہی یاد دلانا، حضرت کا بیٹے کہنے کا انداز اِتنا نرالہ اور مخلصانہ ہوتا تھا کہ دل تھوڑی دیر کے لیے بھول جاتا تھا کہ وہ کہاں ہے، وہ آواز آج بھی کانوں میں رس گھولتی معلوم ہورہی ہے، خیر دوسرے دن حاضر ہوا، فوراً اپنے ہاتھ سے لکھ کر تعویذ عنایت فرمایا، یہ معاملہ صرف میرے ساتھ خاص نہیں تھا؛ بلکہ ہر کس وناکس حضرت کے تعویذات سے فائدہ اٹھاتا تھا۔ آپ کسی کو منع نہیں کرتے تھے اور نہ ہی اس تعویذ پر کچھ عوض لیتے تھے۔ تعویذات وعملیات سے وابستہ افراد کا عالم، عامل، پابند شریعت، متبع سنت، صدقِ مقال واکل حلال کا حامل ہونا نہایت ضروری ہے۔ حضرت کے یہاں یہ خصوصیات بدرجہ اتم موجود تھیں، اصلی خاتم مقطعات، مدنی تختی اور لوح عزیزی جیسے تعویذات جو حضرت مدنیؒ، حضرت تھانویؒ، شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ اور شیخ احمد بن علی بونیؒ کے قابلِ اعتماد مجرب تعویذات میں ہیں، ہمارے اکابر واسلاف نے ایک خاص ضابطہ کے تحت اس پہلو سے فائدہ اٹھانے کے طریقے بتلائے ہیں جس میں اجازت کو شرط قرار دیا گیا ہے، حضرت کو اِس سلسلے کا معتبر ترین آدمی مانا جاتا تھا، شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ سے حضرت مولانا کے پھوپھا مولانا سلطان الحق صاحبؒ سابق ناظم کتب خانہ دارالعلوم دیوبند کو اوران سے حضرت نور اللہ مرقدہٗ کو اجازت تھی، حضرت نے اِس فیض کو عام کرنے کے لیے 'کاشانۂ رحمت' نامی ایک ادارہ بھی قائم فرمایا تھا، یہ ادارہ آج

حضرت الاستاذ مولانا ریاست علی بجنوری نور اللہ مرقدہٗ کی ذات میں تواضع وخاکساری کی صفت حد درجہ تھی، کیا چھوٹے کیا بڑے سبھی اِس کے قائل ہیں، کوئی اِس کا منکر نہیں، آپ اپنی تحریروں میں اپنے نام کے ساتھ کوئی امتیازی لقب نہ لکھتے تھے نہ پسند فرماتے تھے، شناخت کے لیے عموماً 'خادم تدریس دارالعلوم دیوبند' کا سادہ سا جملہ لکھا کرتے تھے۔

بھی عملیات کی شرائط اور تعویذات کے آداب کو پورا کر کے ان تبرکات سے عوام الناس کو مستفید کر رہا ہے۔

● ستمبر۲۰۱۲ء کی بات ہے، حضرت کے صاحبزادے مولانا سفیان صاحب نے ہماری دعوت کی، جس کی تقریب یوں ہوئی کہ میں جن صاحب (مفتی اسعد اعظمی صاحب سابق استاذ دارالعلوم حیدرآباد) کے ساتھ دیوبند آیا تھا وہ مولانا سفیان صاحب کے دوست تھے، انھوں نے ان کی دعوت کی تو میری بھی ہوگئی، رات کے کھانے میں دسترخوان پر حضرت بھی تشریف فرما تھے، مجھے بڑی خوشی ہوئی، کھانا آیا، حضرت نے اپنی قیام گاہ اور ملاقاتی کمرہ کی تعمیر اس انداز کی کرائی ہے کہ مطبخ سے نیچے کی جانب ایک متوسط سائز کی کھڑکی حضرت کے ملاقاتی کمرہ میں کھلتی ہے۔ ٹرالی نما لکڑی کا ایک متوسط سائز کا تختہ ہوتا تھا، اسی پر کھانا، برتن اور ضروری اشیاء بڑے سلیقے سے رکھ کر کمرے کی جانب کھسکا دی جاتی ہے، بہت آسانی اور کم وقت میں سارا سامان کمرے میں آجاتا تھا، وہیں پاس میں دسترخوان ہوتا تھا۔ بہرحال کھانا پروسا گیا، حضرت کے ساتھ اول وآخر ہم طعامی کا یہ شرف ایک ایسا شرف ہے اور ایک ایسی یاد ہے جسے ہمیشہ سمیٹ کر رکھوں گا اور جس کی یادیں ہمیشہ قلب وجگر اور ذہن ونظر میں تازہ رہیں گی۔ حضرت اور ان کے صاحبزادے نے بڑے ہی اخلاص واکرام کا مظاہرہ کیا، کھانے کے دوران ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ ہوا یہ کہ دسترخوان پر جہاں میں بیٹھا تھا وہ اصلاً راستہ تھا اور میرے پیچھے حضرت کے سونے کے لیے ایک تخت رکھا ہوا تھا۔ چونکہ سب لوگ دسترخوان پر تھے، باہر سے کوئی آنے والا نہیں تھا؛ اس لیے میں اسی راستہ پر بیٹھ گیا تھا اور میری پیٹھ تخت سے لگی ہوئی تھی، حضرت نے معمولی مقدار میں کھانا لیا اور اٹھ گئے، اِس کی وجہ غالبًا یہ تھی کہ ہمیں حضرت کی وجہ سے تکلف ہو رہا تھا، ان کی غیر موجودگی میں بے تکلفی رہے گی، یہ بھی ایک سیکھنے کی چیز تھی جو میں نے سیکھی، حضرت کو ہاتھ دھونے کے لیے باہر جانا تھا، میں نے محسوس کیا حضرت دسترخوان پر ہاتھ دھونا مہمان نوازی کی توہین سمجھ رہے ہیں، خیر حضرت اٹھے، تھوڑی دیر ٹہل کر تخت پر بیٹھ گئے جیسے کچھ کام ہو، میری توجہ اس جانب سے ہٹ گئی، تھوڑی دیر کے بعد تخت پر کھڑے ہو کر دوسری جانب گئے اور ہاتھ دھو لیے، حضرت دارالعلوم کے موقر استاذِ حدیث ہونے کے ساتھ خود میرے استاذ تھے، گھر اور دسترخوان انھیں کے تھے اور چاہتے بلکہ یہ ان کا حق تھا کہ وہ مجھے یا اپنے صاحبزادے کو حکم دیتے کہ ذرا راستہ دینا؛ لیکن واہ رے اخلاق وتواضع کا پیکرِ مجسم، گھٹنے کا درد برداشت کر لیا، ادنیٰ درجہ کے مہمان کی معمولی زحمت برداشت کرنا گوارہ نہیں کیا، اور سنیے! کھانے کے بعد تھوڑی دیر گفتگو ہوئی، کہنے لگے آپ لوگ عصر بعد آئے تھے میں پہچان نہیں سکا تھا، بعد میں سوچا، ملیں گے تو معذرت کروں گا، اِس جملے میں ادب وتہذیب، شفقت ومحبت، اخلاص واپنائیت، تواضع وانکساری کا مضمون سمٹتا ہوا نظر آیا۔

اِس واقعہ نے مجھے اتنا متاثر کیا کہ دورانِ طالب علمی حضرت کے تعلق سے قلب وذہن میں جو غلط فہمیاں تھیں، یک لخت سب کافور ہوگئیں؛ بلکہ جمعیۃ علمائے ہند کے جھگڑے میں جب طلبہ کے درمیان گرماگرم بحث ہوتی تھی اور حضرت الاستاذ کا تذکرہ ہوتا تو بعض طلبہ حضرت کے خلاف بہت سی باتیں کہتے تھے۔ ''ریاست کی سیاست'' جیسے جملے اکثر کانوں میں پڑ ہی جاتے تھے، میری بدنصیبی اور حرماں نصیبی تھی کہ میں اس جملے کی خاموش یا زبانی تائید وتصدیق کی حماقت کر بیٹھتا تھا اور شاید یہ بدنصیبی ہی کا نتیجہ تھا کہ دورانِ طالب علمی حضرت کے پاس جانے کی توفیق نہ ملی، اور ایک مرتبہ جب میں نے اپنا تعارف کرایا کہ میں نے آپ سے 'البلاغۃ الواضحۃ' پڑھی ہے اور دو سال معین مدرسی کے شعبہ میں خدمت کی ہے تو حضرت نے فرمایا: بیٹے تم کبھی آتے نہیں تھے، اس وقت مجھے بہت شرمندگی ہوئی تھی؛ لیکن اس جملے میں، میں نے شکوہ کے ساتھ اپنائیت کی خوشبو بھی محسوس کی تھی، خیر مذکورہ واقعہ کے بعد میں نے حضرت کو ایک خط لکھا اور اس میں اپنی حماقت پر شرمندگی کا اظہار کرتے ہوئے تہہِ دل سے معافی کی درخواست کی، آئندہ سال جب حضرت سے ملاقات ہوئی اور میں نے معافی اور معافی نامہ کا تذکرہ کیا تو ایسی طرح دے گئے کہ جیسے وہ معافی نامہ پڑھا ہی نہ ہو؛ حالانکہ وہ معافی نامہ حضرت کے پاس پہنچا تھا؛ لیکن کیا کیجیے سامنے والے کو شرمندگی اور ندامت سے بچانا اخلاقِ عالیہ کا حصہ ہے، حضرت نے اسی عادت واخلاق کی ایک مثال پیش کی۔

امسال شوال میں دیوبند حاضر ہوا تو دل میں ایک کسک سی محسوس ہوئی، کچھ کھو جانے کا شدید احساس ہوا، ایک روز اتفاقاً مولانا سلمان صاحب بجنوری نقشبندی مدیر ماہنامہ 'دارالعلوم' سے ملاقات ہوئی، مولانا حضرت نور اللہ مرقدہٗ کے گھر تشریف لے جا رہے تھے، مجھ سے کہا اگر وقت ہو تو آئیے وہیں بیٹھ کر باتیں کریں گے، موقع غنیمت جان کر ساتھ ہو گیا، حضرت کے اسی ملاقاتی کمرے میں ہم لوگ بیٹھے، میرِ مجلس کے بغیر مجلس کی رونق وروشنی کیا ہوتی ہے جو ہوگی۔ ہر طرف غم واداسی کا منظر تھا، کمرے کی ہر چیز بزبان حال کہہ رہی تھی۔

ہمیں جب نہ ہوں گے تو کیا رنگِ محفل
کسے دیکھ کر آپ شرمایئے گا

حضرت کے صاحبزادے مولانا سعدان صاحب سے ملاقات ہوئی، انھوں

نے اپنے والد کے انداز کی ضیافت فرمائی اور حضرت کی یادوں کو تازہ کیا۔

اِس سے پہلے بغرضِ ایصالِ ثواب مزارِ قاسمی گیا، قبرِ اطہر کی زیارت کی، حسبِ توفیق ایصالِ ثواب کیا، دل تڑپ گیا، غموں کے بادل چھا گئے، پچھلے سال حضرت بقیدِ حیات تھے، ابھی فروری میں مدراس فقہی سمینار میں ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا، آج سب کو رُلا و تڑپا کر محوِ خواب ہیں، واقعی موت واحد ایسی حقیقت ہے جس کو لوگ افسانہ سمجھا کرتے ہیں؛ جبکہ وہ کسی کو بھی کسی وقت آدبوچتی ہے، حضرت کی قبر پر ایک شعر لکھا ہوا پایا جس میں واقعیت وعبرت کا کافی سامان ہے ۔

آفتابِ علم ہے اور خاک کی آغوش ہے
آہ اقدارِ سلف کا پاسباں خاموش ہے

راقم الحروف کو حضرت الاستاذ کی ایک چیز بہت متاثر کرتی تھی، وہ یہ کہ حضرت کہنہ مشق شاعر ہونے کے باوجود شعر وشاعری کو اپنا مشغلہ بنانے کے بجائے، درس وتدریس اور بالواسطہ یا بلا واسطہ تصنیف وتالیف کو پیشہ بنائے ہوئے تھے، شعر وشاعری کے مزاج کو ہمیشہ مغلوب رکھا، درس وتدریس کے مذاق کو نمایاں رکھا، بحیثیت ایک مدرس کے مجھے یہ چیز بہت اچھی اور قابلِ تقلید لگتی تھی، آج واقعہ یہ ہے کہ مدارس میں بہت سے اساتذہ نے درس وتدریس کو ثانوی حیثیت دے رکھی ہے، دیگر مصروفیات کو اولیں درجہ دیا ہوا ہے، جس کا نقصان جگ ظاہر ہے۔

حوصلہ افزائی وذرہ نوازی:

ربیع الثانی ۱۴۳۶ھ کی بات ہے، میں نے اپنی کتاب 'اسلام کا نظامِ سلام ومصافحہ' کے لیے حضرت سے تقریظ لکھنے کی درخواست کی، حضرت کا انتخاب میری ان سے قلبی عقیدت ومحبت کا نتیجہ تھا، حضرت نے ضعفِ بصارت کے باوجود خود اپنے قلم سے ایک مختصر مگر جامع تقریظ لکھ کر عنایت فرمائی جو میری کتاب کے لیے باعثِ زینت ہونے کے ساتھ ایک ناتجربہ کار اور کم علم مؤلف کی حوصلہ افزائی کا ذریعہ تھی، مزید براں جب کتاب چھپی تو کسی دوسرے صاحب نے میری کتاب ان تک پہنچادی، مجھے اس کا علم نہیں تھا، شوال میں جب دیوبند حاضری ہوئی، میں کتاب لے کر حضرت کے پاس پہنچا، دیکھتے ہی پہچان گئے اور کہا اچھا سلام والے ہیں، بھائی تم نے تو تفصیلی کتاب لکھ ڈالی، اگر مجھے معلوم ہوتا کہ کتاب اتنی ضخیم ہوگی تو میں لمبی تقریظ لکھتا، مزید فرمایا: اس جمعہ کو خانقاہ مسجد میں مجھ سے تقریر کا مطالبہ ہوا تو میں نے تمہاری کتاب دیکھ کر تقریر کردی، یہ حوصلہ افزائی کا ایسا انداز تھا جو اپنے اندر درسِ عبرت کا وسیع مفہوم رکھتا ہے، حضرت میں حقیقت بیانی کی صفت بھی خوب تھی، بیجا تعریف اور بے جا تنقید کے عیب سے خالی تھے، کہنے لگے بیٹے! کتاب کی ضخامت تمہارے مقصود کے خلاف ہے، کیوں کہ تمہارا مقصد یہ ہے کہ لوگوں میں سلام کرنے کا رواج عام ہو؛ لیکن اتنی ضخیم کتاب عموماً لوگ عمل کے جذبہ سے نہیں پڑھتے، کتاب ۵۰۲ صفحہ کی ہے۔

ذرہ نوازی کا ایک واقعہ اور پڑھیے، دارالعلوم حیدرآباد میں غالباً ششماہی کی تعطیل میں ایک دوست کے ہاتھ حضرت کے لیے نہایت معمولی ہدیہ بھیجا، حضرت نے قبول فرمایا اور دعاؤں کے ساتھ حضرت نانوتویؒ کی ایک کتاب 'قبلہ نما' بھیجوائی، خردنوازی کے اِس واقعہ سے راقم بے حد مسرور ہوا اور یہ سوچنے لگا کہ بڑے لوگ بلا وجہ بڑے نہیں ہوتے۔ اِسی طرح ایک مرتبہ ایک دوست کے واسطے سے اپنی اہلیہ کے لیے دعائے صحت کی درخواست کی، حضرت نے نہ صرف یہ کہ دعا فرمائی؛ بلکہ اپنے ہاتھ سے کچھ یونانی دواؤں کا نام اور طریقۂ استعمال لکھ کر بھیجا، بیتے دنوں کی یہ وہ یادیں ہیں جو حافظہ کا حصہ ہیں، یادوں کے یہ اجالے، ہمیشہ چراغِ رہ گذر کا کام دیتے رہیں گے۔

حضرت الاستاذ میں تدریس کا رنگ یقیناً غالب تھا، انھوں نے تدریس کو مضبوطی کے ساتھ تھاما تھا، اسی لیے ان کا اندازِ تدریس سب سے نرالا تھا، بات سے بات نکالتے چلے جاتے تھے، ادب میں 'البلاغۃ الواضحہ' کا درس بڑا ہی دلچسپ ہوتا تھا، پورے سبق میں طلبہ کو ایسا مصروف رکھتے کہ طلبہ خود ہی کتاب حل کر لیتے تھے، ایک باکمال مدرس کی پہچان ہے کہ وہ دورانِ درس طلبہ کو مصروفِ عمل رکھے، زبان میں ایسی چاشنی تھی کہ مزہ آجاتا تھا، تدریس کے ساتھ ساتھ تصنیف وتالیف کا صاف ستھرا ذوق تھا، تحقیقی مزاج کے مالک تھے،

انھوں نے تدریس کو مضبوطی کے ساتھ تھاماتھا، اِسی لیے ان کا اندازِ تدریس سب سے نرالا تھا، بات سے بات نکالتے چلے جاتے تھے، ادب میں 'البلاغۃ الواضحہ' کا درس بڑا ہی دلچسپ ہوتا تھا، پورے سبق میں طلبہ کو ایسا مصروف رکھتے کہ طلبہ خود ہی کتاب حل کر لیتے تھے، ایک باکمال مدرس کی پہچان ہے کہ وہ دورانِ درس طلبہ کو مصروفِ عمل رکھے۔

علم میں عمق زیادہ تھا، فخر المحدثین حضرت مولانا سید فخر الدین صاحب کا بخاری شریف کا سبق حضرت کی تحقیق وتعلیق کے ساتھ شائع ہورہا ہے، یہ کتاب 'ایضاح البخاری' آپ کے وسعت علم، گہرے مطالعہ اور حدیث پر اچھی نظر رکھنے کا پتہ دیتی ہے۔ 'شوریٰ کی شرعی حیثیت' آپ کے تحقیقی مزاج، منفرد اسلوب اور بلند خیالی کی شاہ کار ہے، حضرت مولانا قاضی اطہر صاحب مبارک پوریؒ لکھتے ہیں:

''اِس کتاب کے مصنف جناب مولانا ریاست علی صاحب بجنوری مدرس وناظم تعلیمات دارالعلوم دیوبند نے نہایت تحقیق وتلاش سے ان مسائل پر سیر حاصل بحث کی ہے اور کتاب وسنت، فقہ وفتاویٰ اور علماء کے آراء واقوال کے قدیم وجدید ماخذوں کو کھنگال کر ایک نہایت سنجیدہ اور باوقار کتاب مرتب کی ہے، شوریٰ اور اہتمام سے متعلق حصہ خاص طور سے مصنف کی تلاش وتحقیق کا شاہ کار ہے۔'' (شوریٰ کی شرعی حیثیت، ص ۱۳)

اللہ تعالیٰ نے حضرت الاستاذ کو شعر گوئی کا ملکہ بھی خوب عطا فرمایا تھا، حضرت نے ادب کی راہوں پر یقیناً نئے پھول کھلائے ہیں، ترانۂ دارالعلوم حضرت کی آسان، روح پرور شاعری کا بے مثال نمونہ ہے، ہر مصرعہ اور شعر میں صدیوں کی تاریخ اور حقائق وروایات کو سمیٹ کر رکھ دیا ہے، آپ کس پائے کے شاعر تھے، اِس کے لیے ایک اقتباس پڑھیے۔ مولانا لقمان الحق صاحب فاروقی مرحوم سابق شیخ الحدیث امداد الاسلام میرٹھ وسابق مدرس دارالعلوم دیوبند 'نغمہ سحر' میں لکھتے ہیں:

''ادبِ اردو کے بے استعدادی، بے ہمتی اور کم نگاہی کے اس دور میں بھی کبھی کبھی کوئی شخصیت اس طرح سامنے آجاتی ہے کہ جیسے قدرت نے اسے اجنبیوں کے درمیان کچھ مدت کے لیے بھیج دیا ہو یا پھر یہ کہ یہ کوئی ایسا پھول ہے جو یکا یک صحرا میں کھل گیا ہے اور اپنی رعنائیوں سے لطف اندوز ہوتا ہوا ایک روز خود ہی شریک قافلۂ بہار ہوکر رخصت ہوجائے گا یا پھر یہ کوئی ایک چراغ ہے جو خود بخود جل اٹھا ہے؛ لیکن حد نظر تک اس چراغ کے سوا روشنی کے کوئی آثار نہیں یا پھر یہ کوئی ایسی کشتی ہے جو ایک متلاطم اور موّاج محیطِ اعظم میں تنہا اندھیری رات میں بہتی چلی جارہی ہے۔ ریاست علی ظفر بجنوری ادبِ اردو کی سرزمین پر ایسے ہی لالۂ صحرائی یا شعر وسخن کے بحر متلاطم میں ایک تنہا کشتی کی طرح ہیں، انھوں نے علمائے دیوبند کی طرح شعر وسخن کو زندگی کے کسی موڑ پر مشغلہ کے طور پر اختیار نہیں کیا؛ لیکن اس کے باوصف قطعات، رباعیات، غزلوں اور نظموں کا یہ دل آویز مجموعہ ادب اردو میں ایک وقیع اضافہ سمجھا جائے گا۔'' (نغمہ سحر، ص ۹)

اب جبکہ حضرت مولاناؒ کی شاعری کا تذکرہ زیر قلم آہی گیا، چند اشعار بطور نمونہ کے لکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ حمد ہو یا نعت، غزل ہو یا ترانہ حضرت نے ہر موضوع پر دادِ تحسین حاصل کی ہے؛ لیکن محبت کے مضمون کا ایسا دلنشیں اور حقیقت پسندانہ تجزیہ اور تعریف، حقیقی اور مجازی محبت کا تقابل اِس انداز سے پیش فرمایا ہے کہ وہ اشعار پڑھنے کے بعد مجھ جیسے بے ذوق طالب علم بھی عش عش کرنے لگتا ہے ؎

محبت ماورائے این وآں ہے	محبت حاصلِ کون ومکاں ہے
محبت عام ہے سارے جہاں پر	محبت کے لیے سارا جہاں ہے
محبت سے بشر محسودِ کوکب	محبت کی زمیں بھی آسماں ہے
محبت دیدۂ ظاہر سے پنہاں	محبت چشمِ باطن پر عیاں ہے
محبت ابتدائے جذب ومستی	محبت انتہائے عارفاں ہے
محبت شعلہ بار وشعلہ پرور	محبت لذتِ دردِ نہاں ہے
محبت انصرام و ضبط عالم	محبت ارتباطِ قلب وجاں ہے
محبت سے جبین چرخ زرتاب	محبت سجدہ گاہِ کہکشاں ہے

محبت ہے ہمارا ذوقِ سجدہ
محبت ان کا سنگِ آستاں ہے

محبت کی مثبت حقیقت بیانی کے بعد اخیر میں موجودہ دور کے تناظر میں محبت کی منفی معنویت کو کچھ یوں بیان کیا ہے:

ہوس کہلا رہی شاعروں سے
محبت ایک سعی رایگاں ہے

حضرت کی دوراندیشی کے تعلق سے ایک اقتباس پڑھیے۔ مولانا اختر شاہ قیصر صاحب رقم طراز ہیں: ''مولانا دوراندیشی، دور بینی اور بیدار ذہن کے مالک ہیں، ہر معاملہ کے اطراف وجوانب پر نظر رکھتے ہیں، بات کہاں سے چلی اور کہاں تک پہنچے گی فوراً سمجھ لیتے ہیں، قوتِ فیصلہ بھی خوب ہے، رائے اور مشورہ بڑا نکھرا اور ستھرا ہوتا ہے، معاملہ فہم، معاملہ شناس، ان کی نگاہیں وہاں سے آگے بھی کام کرتی ہیں جہاں دوسروں کی آنکھیں کام کرنا چھوڑ دیتی ہیں۔'' (جانے پہچانے لوگ، ص: ۶۳)

اللہ تعالیٰ حضرت کو اپنی شایانِ شان بدلہ عطا فرمائے اور دارالعلوم دیوبند کے اِس بڑے خسارے اور خلا کو پر فرمائے اور ہمیں ان کے نقش قدم کا راہی بنائے، آمین۔

اکیلا ہوں مگر آباد کر دیتا ہوں ویرانہ
بہت روئے گی میرے بعد میری شامِ تنہائی

□□

محدث دوراں ادیب عصر حضرت مولانا ریاست علی صاحب بجنوریؒ

تحریر: مولانا محمد مسیح اللہ قاسمی (استاذ ادب وفقہ جامعہ عربیہ خلیلیہ امہٹہ پیر، ضلع سہارنپور)

حضرت شیخ مولانا عبدالحق صاحب نوراللہ مرقدہٗ کے سانحہ ارتحال کا زخم ابھی بھرا نہیں تھا کہ اچانک حضرت الاستاذ مولانا ریاست علی صاحب بجنوری نوراللہ مرقدہٗ کی وفات کی خبر صاعقہ بن کر دل پر گری، کچھ دیر کے لئے دل ودماغ پر عجیب سی کیفیت طاری رہی، چشم تصور میں ان کا نورانی سراپا، ان کی چال ڈھال، ان کا انداز بیان، نرالی شان کا درس، مشکل سے مشکل مسئلہ کو چٹکیوں میں حل کرنے کی استعداد، پہاڑوں جیسا عزم، سادگی، تواضع، ایثار، ہمدردی، خیرخواہانہ جذبات، مشفقانہ برتاؤ گردش رہے تھے، بلا شبہ وہ ہمارے ان اکابرین کے سچے جانشین تھے جنھوں نے دارالعلوم دیوبند کے منہج کی آبیاری اور پاسبانی کا فریضہ انجام دیا۔ بارہا طوفان اٹھے (حضرت والا کی شخصیت کے اندر ان طوفانوں کے طلاطم کو سکون پذیر کرنے کا بے مثال جوہر تھا)، حضرت والا جب اٹھتے تو کیا مجال کہ طوفان نہ دبے، بالکل ایسا محسوس ہوتا کہ آندھیوں نے گرد وغبار کا سمندر زمین سے اٹھا کر فضا میں پھیلا دیا ہو، اچانک مینہ برسے، اور گرد وغبار چھٹ پڑے، فتنے اٹھتے، طلبہ میں اشتعال پیدا ہوتا، اچانک حضرت الاستاذ دارالحدیث یا مسجد رشید میں وارد ہوتے، اور اس موضوع پر خطاب فرماتے، گرچہ حضرت والا کوئی رسمی واعظ یا خطیب نہیں تھے مگر حقیقی اور مسحور کن خطابت انھیں کا حصہ تھا، حقیقی خطیب وہی ہے جو مجمع کو اپنی زور بیانی کے ذریعہ اپنے مضبوط موقف کو تسلیم کرنے پر مجبور کردے۔ ادھر شگفتہ اور میٹھی زبان سے گفتگو بارش کی طرح اترنی شروع ہوئی، ادھر فتنہ فرار کی راہ دیکھنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دارالعلوم کا تعلیمی ماحول حسب سابق بلکہ اس سے زیادہ بہتر تابناک مستقبل کی طرف رواں دواں ہوگیا۔

احقر نے ایک مرتبہ جد امجد عارف باللہ حضرت مولانا شاہ عظیم الدین صاحب قاسمی نوراللہ مرقدہٗ سے حضرت الاستاذ کی اس خصوصیت کا تذکرہ کیا، اور متعدد واقعات گوش گزار کئے، تو تبصرہ کرتے ہوئے حضرت جد امجدؒ نے فرمایا، معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کا اخلاص اعلیٰ درجہ کا ہے، یہ سب اُسی کی برکت ہے۔

انتظامی صلاحیت:

اللہ رب العزت نے آپ سے بہت کام لیا، آپ کو ہر میدان میں خدمت کا جوہر عنایت کیا گیا تھا، ایک میر کارواں کے لئے ان صلاحیتوں کی احتیاج ہے، وہ سب آپ کو عنایت کی گئی تھی، آپ ناظم تعلیمات بھی رہے، نیابت اہتمام، شیخ الہند اکیڈمی کی صدارت بھی فرمائی، ہر شعبہ میں مثالی خدمات انجام دیں، ان کے عہد نظامت کو دیکھ کر لگتا تھا کہ ان کی دارالعلوم دیوبند کی تدریسی، تعلیمی، مسلکی، مزاج پر گہری نگاہ ہے، وہ اکابر کے تدریسی مزاج اور مذاق سے بخوبی واقف تھے، اور اس کی افادیت کے قائل بھی، چنانچہ ایک مرتبہ یہ بندہ حاضر خدمت ہوا، تو فرمایا کتنے اسباق متعلق ہیں؟ عرض کیا، حضرت پانچ تھے، مگر تدریسی سال کا آخر ہے، اس لئے ایک کتاب کا نصاب مکمل ہو چکا ہے، باقی بھی الحمدللہ تکمیل کے قریب ہیں، بہت مسرت کا اظہار فرمایا، اور ہدایت فرمائی کہ اگر کتاب پہلے مکمل ہو جائے تو پھر طلبہ کو مشکل مقامات اور غیر مانوس ابحاث کی اسی ساعت میں نشاندہی کر کے تکرار کراؤ، اور خود ان کے تکرار کو سنو، اس سے ان کے اندر تدریسی صلاحیت پیدا ہوگی، حوصلہ کھلے گا، دارالعلوم دیوبند کے کچھ اکابر کا مزاج یہ تھا کہ اگر کتاب مقررہ وقت سے پہلے مکمل ہو جاتی تو اُسی کو از سر نو شروع کرا دیتے، اور یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ نصابِ مقررہ کی تکمیل باعث خیر وبرکت ہے، ابتدائی کتابوں کے آموختہ پر توجہ دو، اس سے تمہارا مزاج تو کتابی ہوگا ہی، طلبہ بھی کتابوں پر عبور حاصل کر پائیں گے۔ درج ذیل نصائح، حوصلہ افزا اور ہمتوں کو جلا دینے والے ہیں، حضرت الاستاذؒ کو حوصلہ افزائی کا یہ خاص وصف اللہ نے عنایت فرمایا تھا، بعض اوقات سبق کے درمیان بھی مختصر جملوں میں بڑی نصیحت اور گہری بات کہہ جاتے، اکثر ظریفانہ انداز پر بولتے، مگر اس میں حکمت وموعظت پنہاں ہوتی، آپ کی ظرافت طبعی صرف طلبہ کے درمیان ہی نہیں تھی، بلکہ اساتذہ کی محفل ہو یا پھر انتظامیہ کی مجلس، ہر جگہ اپنی ظریفانہ افتادِ طبع کے لئے جانے پہچانے جاتے۔

علم حدیث کی خدمت:

مختلف علوم وفنون کی خدمات کے ساتھ اللہ رب العزت نے آپ سے علم حدیث کی خدمت کا عظیم الشان کام لیا، ایضاح البخاری کے نام سے بخاری شریف کی شرح جو حضرت مولانا سید فخر الدین صاحب سابق شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند کی درسی تقریر ہے، آپ نے اس کی ترتیب وتہذیب فرمائی، جس کا اکثر حصہ منصۂ شہود پر آ گیا، خدا کرے، باقی بھی جلد از جلد ہمارے فائدے کا سامان بنے، آخری مراحل میں آپ نے اس عظیم الشان کارنامے میں جواں سال عالم دین مولانا فہیم الدین بجنوری کو اپنا معاون بنالیا تھا، تاکہ اپنی زندگی میں یہ کام پایہ تکمیل کو پہنچ جائے، یہ سوغات بھی بلاشبہ آپ کے لئے صدقہ جاریہ ہے۔ اسی طرح ابن ماجہ اور ترمذی شریف کی تدریس کی ذمہ داری آپ

کی سپرد رہی۔ جس کی طلباء میں مقبولیت آپ کی جدو جہد کا بین ثبوت ہے۔

ذوقِ ادب:

حضرت الاستاذ کواللہ رب العزت نے ان تمام خصوصیات کے ساتھ ذوقِ ادب بھی عنایت کیا تھا، وہ جہاں نثر پرمکمل دسترس رکھتے تھے، وہیں شعر گوئی ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، نثر اور نظم دونوں پر حضرت نے لکھا اور بے مثال لکھا، نغمہ سحر، شوریٰ کی اہمیت، تحقیق کشاف اصطلاحات الفنون، ایضاح البخاری شرح بخاری آپ کے ذوقِ ادب کی شاہکار رہے۔

ملّی سرگرمیاں:

علمی خدماتِ جلیلہ کے ساتھ ساتھ ملّی سرگرمیوں میں بھی آپ نے حصہ لیا، اور جمعیۃ علماء ہند کے پلیٹ فارم پر صف اول کے قائدین میں شامل رہے، کئی مرتبہ نائب صدر منتخب کئے گئے، چنانچہ جس طرح علمی حلقوں میں آپ کی رخصتی پر زبردست خلاء محسوس کیا گیا، اسی طرح ملّی سطح پر بھی آپ کی رحلت پر کسک محسوس کی گئی۔

حالاتِ درس:

ترمذی شریف جلد اول کئی سالوں سے آپ سے متعلق تھی، جس کا درس نہایت بشاشت اور پابندی سے جاری رہتا تھا، احقر کو آپ سے ترمذی شریف پڑھنے کا اتفاق ہوا، آپ کا درس کیا تھا، لطائف ونکات سے بھری محفل، محدثانہ شان، دارالحدیث تحتانی میں رونق افروز ہوتے، اور عبارت خواں کو اشارہ کرتے، وہ اگر عبارت غلط پڑھتا، تو تصحیح فرماتے، اگر دوبارہ غلط پڑھتا تو ظرافت کے ساتھ مخصوص انداز میں فرماتے، بھائی! قاری صاحب رات بھر مطالعہ کرکے آئے ہیں، ہم سوکر آئے ہیں، ہوسکتا ہے اس لئے ہم نے غلط بتلادیا ہو، کبھی جمعرات میں طلبہ چھٹی کی پرچی سامنے کردیتے، تو پھر حضرت والا فرماتے اچھا تو تمھیں رخصت چاہئے، چلو بھائی عبارت پڑھو، عبارت خواں پڑھ کر فارغ ہوتا، تو حضرت فرماتے، بھائی قاری صاحب نے عبارت بڑی زوردار اور خوبصورت پڑھی ہے، ان کی عبارت خوانی سے جی تو رخصت کو چاہتا نہیں، پھر قاری صاحب کی محنت جو انھوں نے عبارت کے سلسلہ میں کی ہے، ان کی محنت کا ضیاع ہوگا، ان کا بھی دل دکھے گا، لہٰذا ان کے جذبہ کی قدر کرتے ہوئے پڑھ لو، بعض اوقات امام ترمذی مسائل پر تبصرہ کرتے ہوئے کسی حدیث کی اسناد کو اپنے مسلک کے لئے مضبوط کرتے اور احناف کے موافق احادیث پر اسناد کو قوی کرنے کا وہ اہتمام نہ کرتے، تو حضرت الاستاذ تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے، بھائی یہ دیکھو، ان کے مسلک کے موافق ہے۔ اس پر تو اسناد زبردست ہے، اور جو ہمارے مسلک کے موافق ہے، وہاں بچ کر نکلنے کی کوشش کررہے ہیں۔ پھر از خود اسناد کو بیان فرماتے۔

سوانحی خاکہ:

آپ کی پیدائش بتاریخ ۲۸ رمحرم الحرام ۱۳۵۹ھ کو علی گڑھ کے محلّہ سرائے میں ہوئی، جہاں آپ کے والد ماجد منشی فراست علی صاحب بسلسلہ ملازمت مقیم تھے، آبائی وطن حبیب والا بجنور ہے، آپ نسلاً حضرت ابوایوب انصاریؓ کی اولاد میں سے تھے، ابتدائی تعلیم گھریلو ماحول میں ہوئی، والد محترم کا سایہ سر سے اٹھ گیا، بڑے بھائی وراثت علی صاحب کی زیرنگرانی ہائی اسکول تک تعلیم حاصل کی، اسی دوران آپ کے پھوپھا حضرت مولانا سلطان الحق صاحبؒ ناظم کتب خانہ دارالعلوم دیوبند نے آپ کی خداداد صلاحیتوں کو بھانپتے ہوئے اپنے ہمراہ دیوبند لے جانے کا فیصلہ کیا، چنانچہ آپ ان کے ہمراہ دیوبند تشریف لے آئے اور درسِ نظامی کی ابتدائی کتابیں مختلف اساتذہ سے پڑھیں، ۱۳۷۸ھ میں دورۂ حدیث سے اعلیٰ نمبرات کے ساتھ فراغت حاصل کی، فراغت کے بعد ایک عرصہ تک جمعیۃ علماء ہند کے دفتر میں ناظم نشرواشاعت رہے، پھر دیوبند تشریف لے آئے، مختلف تدریسی اور اشاعتی اداروں سے وابستگی رہی، ۱۳۹۱ھ میں دارالعلوم دیوبند میں تقرر ہوا، درجاتِ وسطیٰ کی کتابیں آپ سے متعلق کی گئیں، جن کا آپ نے جلالتِ شان کے ساتھ درس دیا، آپ کو مجلس شوریٰ نے لیاقت واستعداد کی بنیاد پر ترقی دی، تو آپ نے معذرت فرمادی، مگر بالاتفاق آپ کو علیاء کا استاذ مقرر کردیا گیا، اور تعلیمی شعبہ جات کی ذمہ داری بھی تفویض ہوئی، کچھ عرصہ تک شیخ الہند اکیڈمی کے نگراں رہے، اور دارالعلوم کے نائب مہتمم بھی۔ ابھی چند سالوں سے آپ کی صحت اتنی اہم ذمہ داریوں سے مانع بن چکی تھی، اس لئے آپ نے معذرت کے ساتھ صرف اسباق اور تصنیف وتالیف پر اپنے آپ کو منحصر فرمالیا تھا۔

مرضِ وفات:

آپ طویل عرصہ سے شوگر کے موذی مرض میں مبتلا تھے، کچھ عرصہ پہلے گردوں اور قلب کے عوارض نے بھی آگھیرا تھا، ۲۳ رشعبان ۱۴۳۸ھ مطابق ۲۰ رمئی ۲۰۱۷ء بروز شنبہ کا سپیدۂ سحر نمودار ہوا، اور علم وعمل کا یہ ماہتاب رحمت حق کے بادلوں میں چھپ گیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اسی دن بعد نمازِ عصر امیر الہند حضرت مولانا قاری عثمان صاحب منصورپوری مدظلہٗ استاذ دارالعلوم دیوبند وصدر جمعیۃ علماء ہند کی اقتداء میں ہزاروں علماء، صلحاء، طلبہ کے جم غفیر کی موجودگی میں نمازِ جنازہ ادا کی گئی۔ مدارس میں تعطیل کے باوجود اتنی بڑی تعداد کا شریک جنازہ ہونا عنداللہ مقبولیت اور محبوبیت کی دلیل ہے۔ مزارِ قاسمی کے ایک گوشہ میں سپردِ خاک کردیا گیا۔ زبانِ حال سے بے ساختہ نکلا:

اے خطۂ فردوس کے راہی تو پلٹ آ
رحلت پہ تیری غلغلۂ آہ وفغاں ہے

□□

عالم، دانشور، شاعر — مولانا ریاست علی ظفرؔ بجنوریؒ

تحریر: مولانا فاروق اعظم قاسمی (جے این یو،نئی دہلی)

دنیا میں بہت سے قابل لوگ ہیں لیکن ان کی قابلیت متعدی بھی ہو جائے ضروری نہیں ہے۔ آدمی کے شخصی ارتقا میں والدین کے بعد سب سے بڑا رول استاذ کا ہوتا ہے۔ بہترین معلم وہی کہلاتا ہے جو تعلیم کے ساتھ شاگردوں کی تربیت کا بھی خاص خیال رکھے۔ استاذ کی قابلیت کا انحصار بہت زیادہ پڑھا لکھا ہونے پر نہیں ہے بلکہ ایک معمولی مکتب کا استاذ بھی عظیم ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اس کی بنیاد اس بات پر ہے کہ ایک مدرس کے اندر جتنے بھی علم و ہنر کے گن ہیں انھیں وہ اپنے شاگردوں کے اندر کس قدر اور کس سلیقے سے انڈیل کے اپنے جیسا ایک مفید شہری بنا سکتا ہے۔ اگر یہ اوصاف ایک معلم کے اندر ہیں تو یہ بات یقین کی حد تک کہی جا سکتی ہے کہ وہ صحیح معنوں میں ایک عظیم استاذ ہے۔

درس کی پابندی کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں۔ اسکول و مدرسے سے اخراج کا خوف، امتحان میں شرکت پر پابندی کا ڈر، ڈانٹ اور مار پٹائی کا خوف، استاذ کی ذاتی سختی اور رعب کا اثر، والدین کی سختی، کچھ کر گزرنے کا جذبہ اور مخلص و باہنر استاذ کی پرتاثیر تدریس وغیرہ وغیرہ۔ لیکن میرے خیال میں آخر الذکر سبب انتہائی مضبوط اور ٹھوس ہے۔ اگر ایک استاذ پورے خلوص و ہمدردی اور علم و معلومات کے بھرپور ذخیرے کے ساتھ درس گاہ میں حاضر ہوتا ہے اور انتہائی سبک و شیریں اسلوب کے ذریعے متعلقہ اسباق کو طلبہ کے ذہن و دماغ میں پیوست کر دیتا ہے تو پھر طلبہ کے اندر کسی خارجی دباؤ اور خوف کے بغیر پڑھنے لکھنے کا شوق پیدا ہو جاتا ہے اور وہ علمی و عملی میدان میں بلندیوں کو چھونے لگتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ بچوں کو کسی میدان میں آگے بڑھنے کے لیے سب سے کارگر ہتھیار اس کا جذبۂ شوق ہے۔

استاذِ محترم مولانا ریاست علی ظفر بجنوری مرحوم بھی ہمارے ان ہی اوصاف کے حامل اساتذہ میں سے ایک قابل، ماہر، فاضل اور مخلص و مربی استاذ تھے۔ ان کا درس کیا تھا، گویا مجنوں کو لیلیٰ کے دیدار کی بے کلی ہو۔ ہم درسوں کو ان کے گھنٹے کا شدت سے انتظار رہتا۔ سالِ ہفتم میں ہمیں وہ مشکوٰۃ کا درس دیتے تھے۔ سچ پوچھیے تو دارالعلوم میں ایک سے بڑھ کر ایک استاذ تھے اور ہیں اور اپنے اپنے میدان میں حذاقت و مہارت رکھتے تھے لیکن جتنے شوق و لگن سے مولانا ریاست صاحب کے درس کی پابندی احباب کرتے، اتنی شاید کسی اور استاذ کے درس کی نہیں کرتے۔

درالعلوم میں رواج ہے کہ درس حدیث سے قبل حدیث کی عبارت خوانی ہوتی ہے پھر اساتذہ درس دیتے ہیں۔ اس عبارت خوانی کے لیے بہت سی شرائط ہوتی ہیں۔ مثلاً قواعد کی کوئی غلطی نہیں ہونی چاہیے اور آواز بلند و خوبصورت ہو۔ طلبہ کو بڑا شوق ہوتا عبارت خوانی کا لیکن بہت سے بے چارے پہلی شرط پر تو کھرے اترتے لیکن دوسری یا تیسری میں پھنس جاتے تو استاذ محترم اس قدر شفقت و محبت سے اصلاح فرماتے کہ اصلاح بھی ہو جاتی اور طالب علم کو پشیمانی بھی نہیں ہوتی۔ ان کا اندازِ درس انتہائی عالمانہ و فاضلانہ ہوتا اور ساتھ ہی ادبیت سے بھرپور چھوٹے چھوٹے جملے، بہت واضح و مختصر گفتگو، اسلوبِ بیان میں آبشاری، نہ کہیں اٹک پھٹک اور نہ کہیں بے اعتمادی کا کوئی شائبہ۔ شروع سے آخر تک ایک ہی رفتار اور ایک ہی انداز۔

ایک مرتبہ دورانِ درس ایک حدیث میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کا ذکر آیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کو 'یا بُنَیَّ!' سے خطاب فرمایا تو حضرت نے اس کا اتنا خوب صورت ترجمہ کیا کہ آج تک وہ منظر نگاہوں کے سامنے ہے۔ حضرت نے پچکار کر فرمایا 'بیٹے۔ متّے۔' مت پوچھیے کہ اس ترجمے میں کس قدر گیرائی اور جامعیت تھی۔ ہم تمام طلبا بے حد محظوظ ہوئے۔ مشکوٰۃ شریف میں جب 'باب الطب' آیا تو اس میں 'مشروم' کا ذکر آیا۔ حدیث میں 'مشروم' کو آنکھوں کے لیے بہت مفید بتایا گیا ہے۔ لیکن حضرت نے اس کے ضمن میں نکتے کی ایک بات یہ فرمائی کہ اس سبزی میں یقیناً صد فی صد آنکھوں کا علاج ہے لیکن اپنی طبیعت سے اس کا استعمال مت کرنا۔ کسی حکیم حاذق سے پوچھ کر ہی اس کا استعمال مفید ہوگا ورنہ نقصان کی صورت میں انسان شبہ میں پڑ سکتا ہے۔ پھر اپنے صاحبزادے کا ایک واقعہ بیان فرمایا کہ جب وہ چھوٹا تھا تو بیمار پڑا اور سخت بیمار پڑا۔ اس وقت ڈاکٹر کا رواج دیوبند میں کم اور حکیم کا زیادہ تھا۔ ایک حکیم سے تشخیص کرائی گئی، بجائے فائدہ کے مرض نے مزید شدت اختیار کر لی۔ ایک دوسرے حکیم سے دکھایا گیا۔ اس نے بھی من و عن وہی دوائیں دیں جو پہلے چل رہی تھیں۔ بس فرق یہ ہوا کہ خوراک آدھی کر دی۔ بچے کو دوا دی گئی اور وہ ماشاءاللہ اچھا ہو گیا۔

اسی طرح جب مشکوٰۃ کا 'باب الشعر والادب' آیا تو درس مکمل ہونے کے بعد حضرت الاستاذ سے میں نے عربی میں ایک پرچی پر لکھ کر یہ درخواست کی کہ اس مناسب موقع سے حضرت اپنے کلام سے نوازیں تو حضرت نے ایک چھوٹی سی تقریر فرمائی۔ اشعار تو سنانے سے معذرت کر دی تاہم فرمایا کہ میں

بھائی کاشف الہاشمی کی نگرانی میں شاعری کرتا تھا لیکن جب سے تدریس حدیث کی ذمہ داری میرے کاندھوں پر آئی تو میں نے تقریباً شاعری چھوڑ دی ہے۔ پھر ترانۂ دارالعلوم دیوبند کے بارے میں فرمایا کہ بیٹے یہ مسلسل دو ماہ کی عرق ریزی اور بھائی کاشف الہاشمی صاحب کی سرپرستی میں تیار ہوا تھا۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ لوگ خود اپنے آپ کو گناہوں سے اور فتنوں سے بچالیں یہی بہت بڑی بات ہوگی۔ تو میں نے سوال کیا کہ حضرت کیا وہ زمانہ آ گیا؟ فرمانے لگے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی سوال کیا گیا تھا انھوں نے جواب دیا کہ ابھی نہیں۔ پھر ذرا توقف کے بعد فرمایا: میں بھی کہتا ہوں کہ ابھی وہ زمانہ نہیں آیا۔

حضرت الاستاذ نے فضیلت کے آخری سال (دورۂ حدیث) میں ہمیں ابن ماجہ شریف پڑھائی، یہاں کا رکھ رکھاؤ بھی دیدنی تھا تاہم درسِ مشکوٰۃ کی بات ہی کچھ اور تھی۔

بہت کم لوگوں کو علم ہوگا کہ حضرت تعبیر خواب کے بھی ماہر تھے۔ ایک بار میں نے ڈرتے ڈرتے ان سے اپنے ایک خواب کا ذکر کیا تو حضرت نے بڑی خوب صورت تعبیر بتائی، مسکرائے اور دعائیں بھی دیں۔

آج سے گیارہ سال قبل (۲۰۰۶ء) میں جب مشکوٰۃ شریف کا طالب علم تھا تو میں نے حضرت کی شاعری پر ایک مختصر مضمون لکھا تھا جو ماہنامہ 'دارالعلوم' دیوبند کے دسمبر ۲۰۰۶ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ شاید حضرت اس مضمون کو پڑھ کر ہی مجھے پہچان گئے تھے لیکن مجھے اس کا صحیح علم بہت بعد میں ہوا۔

اکتوبر ۲۰۱۳ء میں میری تیسری کتاب 'تخلیق کی دہلیز پر' (ادبی مضامین کا مجموعہ) منظر عام پر آئی۔ حضرت پر لکھا مذکورہ مضمون بھی اس کتاب میں شامل کیا گیا تھا۔ میں نے بہت سے احباب و اساتذہ کی خدمت میں کتاب پیش کی۔ دیوبند گیا، وہاں بھی کئی اساتذہ کو پیش کیا لیکن براہِ راست حضرت مولانا کی خدمت میں کتاب پیش کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ چنانچہ استاذ محترم مولانا محمد سلمان بجنوری صاحب کے توسط سے کتاب حضرت کی خدمت میں پہنچی۔ حضرت کی شفقت و محبت کی بات تھی کہ انھوں نے کتاب کا مطالعہ کیا اور مجھے فون کیا۔ ۱۶/ مارچ ۲۰۱۴ء کی دوپہر بارہ سوا بارہ بجے کا یہ خوشگوار حادثہ ہے۔ یقین جانئے کہ مجھے اپنی سماعت پر یقین نہیں ہو رہا تھا اور ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ موبائل میرے کپکپاتے ہاتھوں سے زمین پر گر پڑے گا۔ بڑی مشکل سے خود پر قابو پایا۔ ساڑھے پانچ منٹ کی گفتگو ہوئی تھی۔ بات سے فارغ ہونے کے فوراً بعد میں نے اسے اپنی ڈائری میں قلم بند کر لیا تھا جو آج میرے لیے تبرک بھی ہے اور یادوں کا سرمایہ بھی۔ وہ مواصلاتی گفتگو ذیل میں پیش ہے:

حضرت: بیٹے! آپ فاروق اعظم بول رہے۔

میں: جی! آپ؟

حضرت: میں دیوبند سے ریاست علی ظفر بول رہا۔ مولانا سلمان کے بیٹے نے تمھاری کتاب 'تخلیق کی دہلیز پر' لا کر دی، اب میں تمھیں مبارک دوں یا شکریہ ادا کروں؟! میرے ترانے (ترانۂ دارالعلوم دیوبند) سے تم نے پہلا شعر لیا ہے جب کہ ترانے کا سب سے مضبوط شعر مولانا فخر الدینؒ والا ہے۔

رومی کی غزل، رازی کی نظر، غزالی کی تلقین یہاں
روشن ہے جمالِ انور سے پیمانہ فخر الدین یہاں

میں: جی بیت الغزل کی طرح بیت الترانہ۔

حضرت: بیٹے بیت القصید کہو۔ بیٹے تم نے بہت اچھا کام کیا ہے۔ خاص طور پر شیخ (شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ) کی 'فضائلِ اعمال' پر۔

میں: جی حضرت! اپنے اسلاف کا جنھوں نے تواضع میں اپنی زندگی گزاری لیکن آج انھیں تاریخ بدری کا صلہ دیا جا رہا ہے۔ ان کے نام و کام کو اجاگر کرنا میرا عزم ہے۔

حضرت: خدا تمھارے علم و عمل میں برکت دے۔ حضرت کی آپ بیتی پر بھی کچھ ہونا چاہیے۔ بیٹے تم کون سے سال میں یہاں (دیوبند) تھے۔

میں: حضرت ۲۰۰۷ء میں فراغت ہوئی ہے۔

حضرت: میرا خیال ہے پہلے بھی یہ مضمون (کتاب میں شامل حضرت پر تحریر کردہ میرا مضمون) کہیں شائع ہوا تھا؟

میں: جی حضرت! ماہنامہ 'دارالعلوم' دیوبند میں شائع ہوا تھا۔

میں: حضرت! اپنی دعاؤں میں بندے کو یاد رکھیے گا۔ السلام علیکم!!

حضرت: وعلیکم السلام!!

ویسے تو یہ ایک معمولی گفتگو ہے لیکن اس کے بین السطور میں ایک استاذ کی شفقت، محبت، مروت اور اپنائیت کے ساتھ اصلاح کے قیمتی موتی اور مفید مشورے سے بھی نوازا گیا ہے۔ ایسے ہی ان جملوں میں حضرت الاستاذ کی طرف سے ایک حقیر شاگرد کے لیے ہمت افزائی کی ایڑ بھی ہے اور دعاؤں کا توشہ بھی۔

حضرت ایک خوب صورت شخصیت کے مالک تھے۔ بظاہر انتہائی سادہ لباس و سادہ مزاج تھے لیکن اس نحیف الجثہ میں ایک مضبوط دل اور صحت مند دماغ بھی بستا تھا۔ حضرت نے ان دونوں کا ایسا متوازن استعمال کیا کہ دانشوری ان کے امتیازات کا حصہ بن گئی۔ اگر انھیں دو دماغوں کا ایک آدمی قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس کی بہترین مثال دارالعلوم دیوبند اور جمعیۃ علماء ہند دہلی ہے، ہر دو اداروں میں ان کی انتظامی امور کی رہنمائیوں، مشوروں اور فیصلوں

کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ حضرت اپنے طویل تجربے اور غور وفکر کی روشنی میں جو بھی موقف اختیار کرتے بلا خوف تردید اس کا اظہار فرماتے اور اپنے اسی موقف پر قائم بھی رہتے۔ بہت سے حضرات انھیں مولانا 'سیاست' کہا کرتے تھے۔ میرے نزدیک اس لفظ 'سیاست' کے دونوں پہلو معتبر ہیں۔ مثبت بھی منفی بھی۔ مثبت پہلو تو اسی لیے کہ جو خصوصیت اوپر بیان کی گئی اور جہاں منفی پہلو کی بات ہے تو یہ اظہر من الشمس ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شاعر و کاہن اور مجنون کہا گیا تو اس کے ایک امتی کو کوئی نادان اگر کوئی غیر مناسب لقب دے دے تو اس سے کیا بگڑتا ہے؟! چاند چاند ہی رہتا ہے اور چاند پر تھوکنے والا اپنے چہرے کو خود آلودہ کرتا ہے۔

فراغت کے بعد اپنے ابتدائی دور میں وہ الجمعیۃ بک ڈپو کے منیجر بھی رہے۔ بعد میں شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند کے ڈائریکٹر اور ماہنامہ 'دارالعلوم' کے مدیر بھی بنائے گئے۔ پھر دارالعلوم کے سب سے اہم شعبہ تعلیمات کی نظامت بھی آپ کے سپرد ہوئی۔ آپ دارالعلوم کے نائب مہتمم اور جمعیۃ علماء ہند کے نائب صدر کے عہدے پر بھی فائز رہے۔ اولاً تو آپ عہدۂ ومنصب سے اجتناب کرتے تھے لیکن جب ذمہ قبول کر لیتے تو پورے اخلاص کے ساتھ متعلقہ اداروں کے مفاد کے پیش نظر اقدامات کرتے اور اس کا خاطر خواہ نتیجہ بھی برآمد ہوتا۔ اس سلسلے میں ۱۹۸۰ء کے بعد دارالعلوم کے لرزتے قدموں کو قرار عطا کرنے میں حضرت الاستاذ کا بڑا حصہ رہا ہے۔ ایسے ہی جب انھوں نے تعلیمات کی نظامت سنبھالی تو کئی ایسی اصلاحات کیں جو بہت کارگر ثابت ہوئیں اور آج تک وہ برقرار ہیں۔ ان کی انتظامی صلاحیت، ان کی قوت ارادی، ان کی قوت فیصلہ، سخت سے سخت حالات میں بھی جبیں پر شکن نہیں۔ کوئی گھبراہٹ نہیں، انتہائی آسانی کے ساتھ چٹکیوں میں مشکل سے مشکل مسئلے کو حل کرنا ان کے اندر کے دانشور کو بتاتا تھا۔

حضرت الاستاذ کے مطالعے کی وسعت، علم حدیث میں ان کی گہرائی و گیرائی، ان کا طریقۂ استدلال، ان کی نکتہ سنجی، ان کی فقہی نظر اور انداز بیان ہر ایک سے ان کی قابلیت کی روشنی پھوٹتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ 'ایضاح البخاری' اور 'کشاف اصطلاحات الفنون' (قاضی محمد اعلیٰ تھانوی) کی تحقیق و تنقیح آپ کی علمی قدرآوری کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ 'شوریٰ کی شرعی حیثیت' اپنے موضوع پر ایک شاہکار اور ان کی اردو نثر کا اعلیٰ نمونہ ہے اور آپ کی فلسفیانہ اور پیامی شاعری کا کچھ غیر معمولی اندازہ 'نغمۂ سحر' (مجموعۂ کلام) سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

مولانا کاشف الہاشمی صاحب گرچہ عمر میں آپ سے سات سال بڑے تھے لیکن دارالعلوم میں دونوں ہم درس تھے۔ وہ ایک طرح سے حضرت الاستاذ کی شاعری کے استاذ تھے۔ ایک ایک مصرعہ، الفاظ وحروف اور فصاحت و بلاغت پر ہاشمی صاحب کی گہری نظر تھی۔ وہ شاعر ہی نہیں استاذ شاعر تھے۔ ان ہی کے زیر سایہ استاذ علیہ الرحمہ نے فن شاعری میں بالیدگی پیدا کی۔ کاشف صاحب مشاعروں میں نہیں جاتے تھے لیکن مشاعرے میں باذوق طلبہ کی شرکت ہوا کرتی تھی اس لیے کہ اس وقت تک مشاعرہ اتنا بازارو نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ حضرت الاستاذ ایک بار مشاعرے سے واپسی میں کاشف صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے، پھر کیا، اصلاح سخن شروع ہوگئی۔ حضرت فرماتے ہیں:

''ایک مرتبہ دیوبند میں آل انڈیا مشاعرہ ہوا۔ ہم لوگ آخر شب میں مشاعرے سے واپس ہو رہے تھے۔ حضرت کاشف الہاشمی مشاعروں میں نہیں جاتے تھے اور وہ ان دنوں بازار جامع مسجد کے ایک مکان میں کرایہ دار تھے۔ ہم لوگ وہیں سے گزر رہے تھے۔ خیال ہوا کہ اگر جاگ رہے ہوں تو ملاقات کرلیں، ہم لوگ پہنچے تو معمول کے مطابق بیدار ہو چکے تھے اور وضو کر رہے تھے۔ پوچھا مشاعرے سے واپسی ہو رہی ہے۔ حضرت جگر مرادآبادی نے کیا پڑھا؟ ہم نے سنایا:

وہ سبز ننگ چمن ہے جو لہلہا نہ سکے
وہ گل ہے زخم بہاراں جو مسکرا نہ سکے
نہ جانے آہ کہ ان آنسوؤں پہ کیا گزری
جو دل سے آنکھ تک آئے مژہ تک آ نہ سکے

کہنے لگے، ٹھہرو! کیا تمھیں محسوس ہوتا ہے کہ دوسرے شعر کا پہلا مصرعہ کمزور ہے اور دوسرا طاقتور، ہم نے کہا: ہاں! ایسا تو ہے۔ کہنے لگے: اگر ہم جگر صاحب کے مضمون کو اس طرح ادا کریں:

پگھل گئے ہیں کہاں کو کبانِ شعلہ مزاج
کہ دل سے آنکھ تک آئے مژہ تک آ نہ سکے

ہم نے کہا کہ اب پہلا مصرعہ زیادہ طاقتور ہوگیا۔ پھر ہم نے پوچھا کہ آنسو کے لیے کوکبِ شعلہ مزاج کی تعبیر بالکل نئی معلوم ہوتی ہے۔ کہنے لگے کہ نظر سے تو میری بھی نہیں گزری۔'' (کلیات کاشف الہاشمی، ص: ۲۵-۲۶)

ترانۂ دارالعلوم کا ایک شعر جسے حضرت الاستاذ بیت النشید قرار دیتے تھے، وہ پہلے یوں موزوں ہوا تھا:

رومی کی غزل میں ڈھلتی ہے غزّالی کی تلقین یہاں
روشن ہے جمال انور سے پیمانۂ فخر الدین یہاں

کاشف الہاشمی مرحوم نے دارالعلوم دیوبند کے مزید ایک امتیازی وصف کا اضافہ کرتے ہوئے یوں اصلاح کی:

رومی کی غزل، رازی کی نظر، غزّالی کی تلقین یہاں

روشن ہے جمالِ انور سے، پیمانۂ فخر الدین یہاں

اس اضافے سے دارالعلوم کے امتیازات کی ترجمانی بھی ہوگئی اور اس بات کی طرف بھی اشارہ ہوگیا کہ دوسرے مصرعے کے دونوں افراد ان امتیازات کے حامل بھی ہیں اور دوسرا پہلے کا خوشہ چیں بھی۔

حضرت الاستاذ کو اقبال رنگ شاعری کے انتہائی مضبوط شاعر کا شف الہاشمی کی شفقت وتربیتِ سخن حاصل رہی، انھوں نے شاعری کم کی لیکن انتہائی شاندار و پائیدار اور مثبت و تعمیری شاعری کی۔ ترانۂ دارالعلوم کے چند شاہ کار اشعار پیش ہیں:

یہ علم و ہنر کا گہوارہ، تاریخ کا وہ شہ پارہ ہے
ہر پھول یہاں ایک شعلہ ہے، ہر سرو یہاں مینارہ ہے

جو وادیِ فاراں سے اٹھی، گونجی ہے وہی تکبیر یہاں
ہستی کے صنم خانوں کے لیے ہوتا ہے حرم تعمیر یہاں

مہتاب یہاں کے ذروں کو ہر رات منانے آتا ہے
خورشید یہاں کے غنچوں کو ہر صبح جگانے آتا ہے

اسلام کے اس مرکز سے ہوئی تقدیس عیاں آزادی کی
اس بامِ حرم سے گونجی ہے سو بار اذاں آزادی کی

عابد کے یقین سے روشن ہے سادات کا سچا صاف عمل
آنکھوں نے کہاں دیکھا ہوگا، اخلاص کا ایسا تاج محل

کہسار یہاں دب جاتے ہیں، طوفان یہاں رک جاتے ہیں
اس کاخِ فقیری کے آگے شاہوں کے محل جھک جاتے ہیں

یہ ایک صنم خانہ ہے جہاں، محمود بہت تیار ہوئے
اس خاک کے ذرے ذرے سے، کس درجہ شرر بیدار ہوئے

اس بزم جنوں کے دیوانے، ہر راہ سے پہنچے یزداں تک
ہیں عام ہمارے افسانے، دیوارِ چمن سے زنداں تک

سو بار سنوارا ہے ہم نے اس ملک کے گیسوئے برہم کو
یہ اہلِ جنوں بتلائیں گے، کیا ہم نے دیا ہے عالم کو

ہر موج یہاں اک دریا ہے، اک ملت ہے ہر فرد یہاں
گونجا ہے ابد تک گونجے گا آوازۂ اہلِ درد یہاں

یوں سینۂ گیتی پر روشن اسلاف کا یہ کردار رہے
آنکھوں میں رہیں انورِ حرم، سینے میں دلِ بیدار رہے

مزید چند اشعار:

محبت ترجمانِ رازِ ہستی — محبت چشمِ قدرت کی زباں ہے
محبت التہابِ برقِ ایمن — کلیم طور کا عزم جواں ہے

ہر اک بہار نے آ کر تری شہادت دی
چمن چمن سے ملا ہے تیرا پیام مجھے
ظفرؔ نہ پوچھ، قیامت ہے وہ نظر جس نے
سکھادیا ہے تمنا کا احترام مجھے

رُت بدلے گی پھول کھلیں گے، جام مجھے چھلکانے دو
جام مجھے چھلکانے دو، کونین کو وجد میں آنے دو

وہ موج، رنگ و نور گلستاں کہیں جسے
وہ روئے تابناک کہ قرآں کہیں جسے
موجِ نشاطِ بادہ سے خم ہو گیا ہے خُم
وہ کفر ہے کہ غیرت ایماں کہیں جسے

اڑا ہے لے کے مجھے صرف میرا ذوقِ سجود
کوئی ہزار پکارا کرے 'انا المعبود'
جنوں کے ہاتھ ہے اب آبروعبادت کی
بنادیے ہیں خرد نے ہزارہا معبود

ان اشعار سے ایک عظیم شاعر کی اعلیٰ اقدار شاعری کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ان کی شاعری میں تغزل بھی ہے اور فکر کی زیریں آنچ بھی۔ موضوعاتی تنوع بھی ہے اور ساتھ ہی زبان و بیان کی شیرینی اور اسلوب وادا کی ندرت بھی۔ ظفرؔ بجنوری کی شاعری میں میر کی لے، غالب کا رنگ اور اقبال کے آہنگ کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ چوں کہ شاعر کا تعلق دبستان دیوبند کی شاعری سے ہے اس لیے انھوں نے کبھی شاعری کو پیشہ نہیں بنایا۔ دارالعلوم دیوبند کا خلق کردہ مشہور و مقبول ترانہ حضرت الاستاذ کے اشہبِ قلم اور نتیجۂ فکر کا عمدہ نمونہ ہے۔ زمین تو ضرور آپ نے مجاز کی اختیار کی لیکن کبھی کبھی 'یہ میرا چمن...' سے تفوق حاصل کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اس ترانے کے بعد ملک کے قابلِ ذکر درجنوں مدارس نے اسی انداز و پیٹرن پر اپنے ترانے تیار کیے یا کرائے۔ ترانۂ دارالعلوم کے ساتھ ترانۂ جمعیۃ علمائے ہند اور ترانۂ جامعہ امام انور کے خالق بھی آپ ہی ہیں۔ اس طور پر عالم، دانشور اور شاعر کی تثلیث سے آپ کی شخصیت بنتی ہے۔

حضرت الاستاذ مولانا ریاست علی ظفر بجنوریؒ انتہائی خوش مزاج،

شفقت سے پیش آنے والے اور محبت کرنے والے ایک خوب صورت انسان تھے۔کسی سے بات کرتے، چھوٹا ہو یا بڑا، بڑی نرمی کے ساتھ کرتے۔ ان کی ڈانٹ میں بھی بڑا پیار ہوتا تھا۔ان کی گفتگو میں طنز و مزاح بھی کا رنگ ہوتا لیکن بھرپور لطافت کے ساتھ۔ زمانۂ طالب علمی میں ایک مرتبہ حضرت کی مجلس میں شرکت کا موقع ملا اور بھی کئی اساتذے تشریف فرما تھے۔ بات کسی عربی 'فعل' کے باب کی چل رہی تھی۔ اتنے میں علامہ جمال صاحب (استاذ دارالعلوم دیوبند) کی آمد ہوئی۔ حضرت نے بلاساختہ فرمایا: یہ آیا جمال، یہ بتائے گا۔اس وقت تو میری ہنسی نکل گئی۔ بڑی مشکل سے ضبط کرپایا لیکن یہ جملہ طنزیہ تھا یا مزاحیہ، فیصلہ میرے لیے بڑا دشوار تھا۔خیر اساتذہ اور حاضرین مجلس خوب محظوظ ہوئے۔ وفات سے چند ماہ قبل جب ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو علیک سلیک کے بعد میں نے پوچھا: حضرت! طبیعت کیسی ہے؟ فرمانے لگے: بھئی بس ٹھیک ہے، اب میں تاج تغزل کا آبدار موتی تو رہا نہیں۔ مجھے ہنسی بھی آئی، تعجب بھی ہوا اور رشک بھی آیا۔تعجب اس کا کہ مجھ جیسے ایک ادنیٰ شاگرد ہی کے الفاظ سے انھوں نے خیریت بتائی جو انھیں یاد تھے اور رشک اس لیے کہ اس نام 'تاج تغزل کا آبدار موتی' سے میں نے حضرت کی ذات وصفات پر اپنی آڑی ترچھی لکیروں کا طومار جمع کیا تھا جسے حضرت نے پہلے بھی پسند فرمایا تھا اور اب بھی اپنی ادا سے محبت و شفقت کا اظہار فرمارہے تھے۔

گزشتہ مارچ ۲۰۱۷ء میں میرا دیوبند جانا ہوا۔ راستہ چلتے مولانا اشتیاق احمد قاسمی (استاذ دارالعلوم دیوبند) سے ملاقات ہوگئی۔ مولانا ہی کی زبانی معلوم ہوا کہ کلیات کاشف شائع ہوگئی ہے اور حضرت الاستاذ کی نگرانی میں انھوں نے ہی مرتب کیا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ حضرت نے اپنی مجلس میں کئی بار تمھیں یاد کیا ہے۔اس لیے آئے ہو تو ملاقات ضرور کرلینا۔ یہ میرے لیے شرف کی بات تھی۔ دراصل حضرت چاہتے تھے کہ کلیات پر میں بھی کچھ تحریر کروں۔ بہرکیف میں خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت نے انتہائی شفقت ومحبت سے نوازا۔ چائے پلائی، تقریباً آدھے گھنٹے تک مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ دہلی، جے این یو کے ماحول اور اس کے دیگر جہات پر گفتگو ہوتی رہی۔ میں نے کہا: حضرت! ملک کے معروف ادبی رسائل میں کلیات پر تبصرے آنے چاہئیں۔ حضرت نے تائید کی۔ دراصل یہ مجموعہ حضرت مولانا کے استاذ سخن مولانا محمد عثمان کاشف الہاشمیؒ کا مجموعہ کلام ہے جو ایک مدت سے حضرت نے سنبھال رکھا تھا۔ آخر میں مولانا اشتیاق صاحب کے تعاون سے اسے شائع کرسکے۔خیر استاذ محترم نے اپنی خوب صورت موتی جیسی تحریر سے دعا و دستخط کے ساتھ ایک نسخہ عطا کیا اور کچھ مزید نسخے برائے تبصرہ بھی دیے۔ میں نے انھیں ماہنامہ 'آج کل' نئی دہلی اور ماہنامہ 'اردو دنیا' نئی دہلی جاکر ان کے مدیران کے حوالے کیا۔حسن اتفاق کہیے، اردو دنیا والے نے اس پر تبصرہ لکھنے کی ذمہ داری میرے ہی سپرد کردی۔ میں نے خلاف معمول چند دنوں بعد ہی تبصرہ تحریر کرکے اردو دنیا کو ارسال کردیا۔تبصرہ اب تک اپنے نمبر کا منتظر ہے۔افسوس کہ حضرت الاستاذ کی نظر کرم سے یہ تبصرہ محروم رہا۔

چلتے چلتے میں نے انھیں یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ عنقریب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کا اشتہار آنے والا ہے۔آپ 'خریداری کتب' کے کالم کے تحت کتاب جمع فرمادیں۔اگر منظور ہوگئی تو طباعت پر آیا صرفہ واپس آجائے گا۔انھوں نے آمادگی کا اظہار کیا۔مئی کے مہینے میں جب اشتہار آیا تو میں نے انھیں اطلاع دی اور مولانا اشتیاق صاحب کو بھی آگاہ کیا۔ اتفاق سے وہ کہیں کے لیے آمادۂ سفر تھے اس لیے کئی بار حضرت الاستاذ سے بذریعہ موبائل گفتگو کا موقع ہاتھ آیا۔ حضرت کو سمجھنے میں کچھ دشواری ہوئی تو میں نے فارم ڈاؤن لوڈ کرکے انھیں ارسال کردیا تھا۔ بروز بدھ ۱۷رمئی ۲۰۱۷ء کی شام چھ بجے استاذ محترم کا فون آیا۔ کہنے لگے: بیٹے جیسا تم نے کہا تھا وہ میں نے انٹرنیٹ سے نکلوالیا ہے۔ مولوی اشتیاق ان دنوں سفر پر ہیں۔ وہ آجائیں تو طے کرلیں گے کہ کس کے نام سے فارم پُر کیا جائے۔ میں نے عرض کیا کہ چونکہ مرتب کی جگہ مولانا اشتیاق صاحب کا نام ہے اس لیے ان ہی کے نام سے فارم پر کیا جائے گا۔ بقیہ کتاب کی منظوری کے بعد رقم اپنی سابقہ جگہ پر چلی جائے گی۔ حضرت مطمئن اور خوش ہوئے اور دعاؤں سے نوازا۔ اللہ کے سوا کوئی عالم الغیب نہیں۔کیا معلوم تھا کہ یہ ملاقات آخری ملاقات ثابت ہوگی اور صرف تین روز کے بعد ہی حضرت الاستاذ ہمیشہ کے لیے مجھ جیسے ہزاروں معنوی اولاد کو یتیم کرجائیں گے۔۲۰رمئی ۲۰۱۷ء کو علی الصباح استاذِ محترم اپنے مالکِ حقیقی سے جاملے۔ اللہ باقی، سب فانی۔ مجھے بڑا دھچکا لگا۔ اپنے رنج وغم کے اظہار کے لیے میرے پاس چند ٹیڑھے میڑھے الفاظ کے سوا کچھ نہیں۔ یہ خاکہ یا مضمون نہیں بلکہ اسے میرے غم کے بوجھ کو ہلکا کرنے کا ایک وسیلہ چاہیے۔ان کے سایۂ عاطفت سے محرومی ضرور ہوگئی ہے لیکن ان کی باتیں، ملاقاتیں اور البیلی ادائیں ہمیشہ یاد رہیں گی اور بطور خاص ان کی گفتگو کی مٹھاس اِس وقت بھی کانوں میں رس گھول رہی ہے اور اس کی شیرینی آگے بھی محسوس ہوتی رہے گی۔

میں ان سے ایک باضابطہ انٹرویو بھی کرنا چاہتا تھا۔حضرت نے ہامی بھی بھرلی تھی لیکن...اب یہ تمنا کبھی پوری نہیں ہوسکے گی۔ رمضان المبارک میں پھر دیوبند جانا ہوا۔ حضرت کی خدمت میں پھر حاضری ہوئی لیکن ان کی بیٹھک میں نہیں، مزار قاسمی میں۔سلام کیا اور گفتگو کے بغیر واپس آگیا۔اللہ ہم سب کو ان کا نعم البدل عطا کرے اور ان کے درجات بلند فرمائے۔ □□

حضرت مولانا ریاست علی بجنوریؒ کی تصنیف—ایک جائزہ

تحریر: مولانا محمد اللہ خلیلی قاسمی فیض آبادی (دارالعلوم دیوبند)

حضرت مولانا ریاست علی صاحب بجنوری رحمۃ اللہ علیہ ایک جید عالم دین، نکتہ رس محدث، باصلاحیت استاذ، بے مثال ادیب و شاعر اور گوناگوں خوبیوں کے مالک تھے۔ تقوی و دیانت داری، رأفت و رحمت، ذکاوت و ذہانت، اصابت رائے و معاملہ فہمی، مہمان نوازی و غریب پروری اور حسن اخلاق و تواضع آپ کی نمایاں خصوصیات تھیں۔ آپ کے انتقال سے دارالعلوم کی علمی و فکری تاریخ کا ایک باب بند ہوگیا۔

حضرت مولانا کی تدریسی زندگی پینتالیس برسوں پر محیط ہے۔ آپ نے ہزاروں طالبان علوم اسلامیہ کو علوم نبوت کی روشنی سے منور کیا۔ آپ کا درس بہت مربوط، عام فہم، سبک رفتار اور مقبول ہوتا تھا۔ تدریس کے ساتھ ساتھ ماہنامہ دارالعلوم کی ادارت کی ذمہ داری بھی انجام دی اور شیخ الہند اکیڈمی کے ڈائریکٹر بھی مقرر کیے گئے۔ ۱۹۸۵ء میں آپ کو مجلس شوریٰ نے مجلس تعلیمی کا ناظم (ناظم تعلیمات) مقرر کیا، اس منصب پر آپ پانچ سال تک فائز رہے۔ دارالعلوم میں آپ کا دورِ نظامت بہت مثالی تھا۔ نازک حالات میں دارالعلوم کے تعلیمی نظام کو سنبھالا دینا اور اسے ترقی کی بلندیوں پر پہنچانا آپ کا تاریخی کارنامہ ہے۔ حضرت مہتمم صاحب وغیرہ ذمہ داران کی غیر موجودگی میں اکثر آپ کو قائم مقامی یا نیابت اہتمام کے فرائض انجام دینے پڑتے۔ مجلس شوریٰ نے آپ کو مستقل طور پر نائب مہتمم کے عہدہ کی پیشکش کی لیکن انھوں نے معذرت ظاہر کی۔ گزشتہ چالیس سالوں کے دوران انھوں نے دارالعلوم کی انتظامیہ کو اپنے صائب مشوروں اور بروقت رہ نمائی سے بڑی طاقت بخشی۔ اسی لیے بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ آپ جدید دارالعلوم کے معماروں میں تھے۔

تصنیفی یادگاریں:

تدریسی و انتظامی ذمہ داریوں کے ساتھ آپ نے اہم علمی و تصنیفی سرمایہ بھی چھوڑا۔ 'ایضاح البخاری' آپ کے اعلیٰ علمی و ادبی ذوق کا شاہ کار ہے اور اردو کی شروح بخاری میں ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ آپ نے اصول فقہ کے موضوع پر حضرت مولانا نعمت اللہ اعظمی کے ساتھ مشترکہ طور پر 'تسہیل الاصول' لکھی جو دارالعلوم میں سال چہارم میں داخل درس ہے۔ اسی طرح 'مقدمۂ تفہیم القرآن کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ' مکتبہ دارالعلوم سے شائع ہوچکی ہے۔ اخیر زمانے میں حضرت مولانا علامہ محمد اعلی التھانوی کی مشہور آفاق کتاب 'کشاف اصطلاحات الفنون' پر مولانا عارف جمیل صاحب مبارک پوری کے ساتھ تحقیقی کام بھی کیا جو پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا ہے۔ اسی طرح ہونہار شاگردوں کی مدد سے خلاصۃ التفاسیر (مؤلفہ مولانا فتح محمد تائب لکھنوی، متوفی ۱۳۲۷ھ/ ۱۹۰۹ء) کی تدوین و تحقیق کا کام انجام دیا۔ یہ دونوں اہم کتابیں عنقریب منظر عام پر آنے والی ہیں۔ آپ علم و عمل میں بلند مقام پر فائز ہونے کے ساتھ ساتھ شعر و ادب میں اعلیٰ ذوق کے حامل تھے جس کا زندہ ثبوت دارالعلوم دیوبند کا شہرۂ آفاق 'ترانہ' ہے جو ایک لازوال ادبی شہہ پارہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ شاعری میں ظفر تخلص فرماتے تھے۔ آپ کا مجموعۂ کلام 'نغمۂ سحر' کے نام سے شائع ہوچکا ہے۔ آپ کا کلام ضخامت اور قامت میں کہتر ہونے کے باوجود قدر و قیمت کے اعتبار سے بہت 'بہتر' ہے۔ کوثر و تسنیم سے دھلی ہوئی زبان اور سلیس و رواں کلام کا یہ مختصر مجموعہ بھی آپ کو مستند شعراء کی صف میں شمار کرانے کے لیے کافی ہے۔ اسی طرح مولانا محمد عثمان کاشف الہاشمی کا شعری مجموعہ بھی آپ کی کاوشوں سے منظرِ عام پر آیا۔

'شوریٰ کی شرعی حیثیت' شاندار تحقیقی کارنامہ

'شوریٰ کی شرعی حیثیت' حضرت مولانا کی نہایت اہم تصنیف ہے جو اپنے موضوع پر ایسی اچھوتی، بسیط اور مدلل کتاب ہے جس سے کتاب خانے خالی ہیں۔ یہ کتاب اولاً ۱۴۰۸ھ مطابق ۱۹۸۷ء میں حضرات اکابر (حضرت مفتی محمود حسن گنگوہیؒ، حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب بجنوری سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا معراج الحق صاحب سابق صدرالمدرسین دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا نصیر احمد خان بلند شہری سابق شیخ الحدیث و صدرالمدرسین دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا قاضی اطہر مبارک پوری رحمہم اللہ) کی تقریظات و تصدیقات کے ساتھ شائع ہوئی اور اب بھی مکتبہ دارالعلوم سے شائع ہورہی ہے۔ اس وقت میرے سامنے محرم الحرام ۱۴۳۵ھ مطابق نومبر ۲۰۱۳ء کا ایڈیشن موجود ہے جو چار سو آٹھ صفحات پر مشتمل ہے۔ حضرت مولانا کی یہ کتاب مدارس عربیہ کے نظام کار، ان کے دستور اساسی، رجسٹریشن، وقف اور دیگر تمام امور و معاملات میں شوریٰ کی شرعی حیثیت کی تفصیلات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں مدارس اسلامیہ کی مجالسِ شوریٰ، اہتمام، مالیت اور جائیداد وغیرہ کے بارے میں شرعی احکام مفصل اور محقق طور پر بیان کیے گئے ہیں۔

دارالعلوم دیوبند میں ۱۹۸۰ء کے بعد مہتمم اور مجلس شوریٰ کے درمیان شدید اختلاف پیدا ہوا، جس کی وجہ سے بعض حلقوں کی طرف سے ایک نیا مسئلہ بڑی

شدت کے ساتھ اٹھایا گیا کہ ان مدارس کی مجلس شوریٰ اور ان کے مہتمم کی باہمی حیثیت کیا ہے؟ نیز مدرسہ کے مہتمم اور مدرسہ کی مجلسِ شوریٰ کے درمیان کس نوع کا تعلق ہے، ان میں سے کون حاکم ہے اور کون محکوم، بعض جگہ تو شوریٰ نے مہتمم کو اتنا پابند کر دیا ہے کہ وہ کوئی کام شوریٰ سے پوچھے بغیر نہیں کرسکتا، اور نہ شوریٰ اس کے لیے کوئی ضابطہ بناتی ہے کہ جس کے تحت مہتمم کام کرلیا کرے۔ چھوٹی چھوٹی چیزوں میں سخت دشواری پیش آتی ہے۔ بعض جگہ مہتمم نے شوریٰ کو بالکل ہی بے حیثیت کر دیا ہے اور خود مختاری کا پورا پورا اعلان کردیا ہے کہ کسی کام میں شوریٰ سے پوچھنے اور معلوم کرنے کی ضرورت نہیں، بلکہ شوریٰ ہی بیکار اور کالعدم ہے۔ دارالعلوم کے اختلاف کے پس منظر میں حضرت مولانا مسیح اللہ خان جلال آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک رسالہ 'رسالۂ اہتمام وشوریٰ' لکھا جس میں مہتمم کو اصل اور شوریٰ کو تابع قرار دیا گیا اور دارالعلوم کے دستور اساسی کو غیر شرعی بتایا گیا۔

چنانچہ دارالعلوم دیوبند نے صورتِ حال کی نزاکت کے پیش نظر اس موضوع کی تحقیق وتنقیح کے لیے حضرت مولانا کا انتخاب کیا۔ حضرت مولانا نے نہایت تحقیق وتلاش سے ان مسائل پر کتاب وسنت، فقہ وفتاویٰ اور علمائے کرام آراء واقوال کے قدیم وجدید مآخذ کو کھنگال کر نہایت سنجیدہ اور باوقار کتاب مرتب کی۔ مولانا نے موضوع کے متعلق تمام گوشوں کو فقہی عبارات سے مدلل کیا اور ہر جگہ ایسی دل نشیں گفتگو کی ہے کہ مسئلہ پر شرح صدر ہوجاتا ہے۔ کتاب کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ حضرت مؤلف کو مضامین کی ترتیب اور بسط دلائل میں خصوصی درک حاصل تھا۔ پوری کتاب اتنی متانت اور سنجیدگی سے لکھی گئی ہے کہ کہیں مجادلانہ یا ادعائی حتی کہ محجیبانہ انداز بھی نہیں اپنایا گیا، بلکہ زیر بحث مسئلہ کا صرف معروضی جائزہ لیا گیا۔

اس کتاب میں اولاً مدارس عربیہ کے نظام کار کی تشریح کی گئی ہے اور اکابر کے ارشادات کی روشنی میں یہ واضح کیا گیا ہے مدارس عربیہ کے عہدہ داروں میں کس منصب کی کیا شرعی حیثیت ہے۔ پھر شوریٰ کا شرعی مقام واضح کیا گیا ہے۔ شوریٰ کا مسئلہ چونکہ اس تحریر کا بنیادی نقطۂ بحث تھا اس لیے اس موضوع کے تمام پہلوؤں کا مبسوط جائزہ لیا گیا ہے اور بتلایا گیا ہے کہ عہد رسالت اور خلافت راشدہ میں شوری کا طرز عمل اور دائرۂ کار کیا تھا۔ پھر قرآن وحدیث اور فقہ اسلامی میں شوری کے لیے پائی جانے والی حقیقتوں کو پیش کیا گیا ہے اور یہ بات پوری طرح واضح اور ثابت کردی گئی ہے کہ مدارسِ عربیہ میں شوریٰ کی بالادستی شبہ سے بالاتر ہے۔ ان خالص علمی اور تحقیقی مضامین کے درمیان، شوریٰ کی بالادستی کا انکار کرنے والے نقطۂ نظر کے دلائل کا بھی پوری سنجیدگی سے جائزہ لیا گیا ہے جس سے غلط فہمیوں کے ازالہ میں پوری مدد ملتی ہے۔ اسی کے ساتھ مدارس کے دستور اساسی اور سوسائٹی ایکٹ کے تحت رجسٹریشن کے مسئلہ کو بھی منقح کیا گیا ہے۔ رجسٹریشن پر کیے جانے والے اعتراضات جائزہ لیا گیا ہے۔

اسی سلسلہ کا دوسرا اہم مسئلہ یہ تھا کہ یہ مدارس فقہائے کرام کی اصطلاح کے مطابق وقف ہیں یا وقف نہیں ہیں۔ حضرت مولانا نے اس کتاب میں مسئلۂ وقف کو خوب وضاحت سے بیان کیا ہے کہ کن شرائط کے ساتھ وقف صحیح ہوتا ہے مدرسہ کی ہر چیز کو نہ وقف کہا جاسکتا ہے اور نہ ہر چیز کے وقف ہونے سے انکار کیا جاسکتا ہے۔ جو جائداد وغیرہ فقہی ضابطہ کے تحت وقف ہے اس پر وقف کے احکام لاگو ہوں گے کہ بیع وغیرہ کے ذریعہ اس کی ملکیت کسی کو منتقل نہیں کی جاسکتی اور ان کی حفاظت پوری طرح واجب ہوگی۔ لیکن جو اشیاء فقہی قاعدہ کے تحت وقف نہیں، بلکہ ملکِ مدرسہ میں داخل ہیں، ان پر وقف کے احکام نافذ نہیں ہوں گے، البتہ مدرسہ کی ضروریات ان سے پوری کی جائیں گی۔ مہتمم یا شوریٰ ایسی کسی چیز کو اپنی ذاتی ملک قرار دینے کا مجاز نہیں۔ اس کتاب سے آپ کی فقیہانہ شان نمایاں ہوتی ہے جو عمومی طور پر لوگوں پر آشکارا نہیں تھی۔

اس کتاب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ حضرت مولانا نے اس کتاب کو لکھنے کے بعد حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا معراج الحق صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ بالاستیعاب پڑھ کر سنائی اور ان حضرات اکابر کے مشوروں کے مطابق اس میں حک وفک کیا۔ اس کے بعد اس کتاب کی نقول کو متعدد اہل علم (حضرت مولانا منظور احمد نعمانی وحضرت مولانا قاضی زین العابدین میرٹھی رحمہما اللہ تعالیٰ اراکین مجلس شوری دارالعلوم دیوبند) اور اساتذۂ دارالعلوم (حضرت مولانا نعمت اللہ اعظمی، حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالن پوری اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی قاسمی مدظلہم العالی) کو پیش کی جس کو ان حضرات نے ملاحظہ فرما کر اپنے نوٹس لکھے۔ اس کے بعد مجلسِ مناقشہ منعقد کی گئی اور تبادلۂ خیالات کے بعد اصلاحات کی گئیں۔ حضرت مولانا محمد عثمان کاشف الہاشمی اور حضرت مولانا حکیم عزیز الرحمٰن اعظمی رحمہما اللہ کو بھی اس کتاب کی کاپی پیش کی گئی اور انھوں نے بھی اس پر مکمل اعتماد کا اظہار فرمایا۔ حضرت مولانا ریاست علی بجنوری رحمۃ اللہ علیہ نے اس کتاب میں ان تمام حضرات کا ذکر کیا ہے جن سے انھوں نے اس کتاب کی ترتیب کے دوران استفادہ، تبادلۂ خیالات یا اور کسی طرح کی مدد لی، حتی کہ انھوں نے خوردوں کے تعاون کا بھی بہت فراخ دلی کے ساتھ کا اظہار کیا ہے جو آپ کے اعلیٰ اخلاق کی واضح دلیل ہے۔

اس کتاب کی تیاری میں حضرت نے جہاں تفسیر وحدیث اور فقہ اسلامی کے امہات کتب سے استفادہ کیا ہے وہیں کچھ معاصرا اور ماضی قریب کے اہل علم کتابوں سے بھی استفادہ کیا ہے جیسے حضرت مولانا عبیداللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ کی 'التمہید لائمۃ التجدید' اور 'مواقف المسترشدین'، شیخ عبدالوہاب خلاف کی 'اصول الفقہ'، شیخ محمد خضری بک کی 'اصول الفقہ' اور 'تاریخ التشریع الاسلامی'،

شیخ ابوزہرہ مصری کی 'اصول الفقہ' اور 'تاریخ المذاہب الاسلامیۃ' اور قدیم مآخذ میں 'الأحکام السلطانیۃ' (مؤلفہ شیخ ابوالحسن علی بن حبیب البصری الماوردی متوفی ۴۵۰ھ)، 'الأحکام السلطانیۃ' (مؤلفہ قاضی ابویعلیٰ الفراء، متوفی ۴۵۸ھ)، 'الموافقات' اور 'الاعتصام' (شیخ ابواسحاق الشاطبی الغرناطی المتوفی ۷۹۰ھ)، 'جامع الرموز' (مؤلفہ شیخ شمس الدین محمد خراسانی قہستانی متوفی ۹۶۹ھ)، 'کشف الاسرار' (مؤلفہ علامہ عبدالعزیز بخاری متوفی ۷۳۰ھ) وغیرہ۔ مراجع کی فہرست میں ۹۵ (پنچانوے) کتابوں کا ذکر موجود ہے۔

شوریٰ کے نظام کی اہمیت اور اس کی عصری معنویت

خیرالقرون میں منصب خلافت سے لے کر ماتحت امارتوں تک مناصب کی تقسیم، اموری کی تنفیذ وتعمیل کا معاملہ وامرھم شوریٰ بینھم کی اساس پر قائم رہا۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ بنیاد کمزور ہوتی چلی گئی اور اسلامی حکومت میں شورائیت اور اہلیت کی جگہ وراثت کا عمل جاری ہوگیا۔ خیارِ امت اور علمائے کرام نے روز اول ہی سے اس غلطی کا ادراک کرلیا تھا، انھوں نے اس کی اصلاح کی کوششیں بھی کیں، لیکن اسلامی حکومتیں وراثت کے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکیں۔ بہرحال علمائے کرام سلاطین کے خلاف کام کرنے کے بجائے شورائیت کے واجبِ کفایہ کو اپنے علم وحکمت کے دبستانوں میں لاگو کیا اور شوریٰ کی بالادستی و سرپرستی کا عمل جاری کیا۔ حضرات علمائے کرام نے شوریٰ کی زیرسرکردگی میں علوم وفنون کی جوگراں قدر خدمات انجام دی ہیں وہ اسلامی کتب خانہ کی صورت میں موجود ہیں۔ جہاں جہاں اسلامی حکومتیں قائم رہیں علمائے کرام اپنی پسندیدہ روش پر قائم رہے، انھوں نے سلاطین سے کوئی سروکار نہیں رکھا اور شوریٰ کے ذریعہ کتاب وسنت کی طرف مراجعت کرکے غیر منصوص مسائل کے شرعی احکام کو مدون کرتے گئے اور علوم اسلامیہ کا ایک قابل قدر ذخیرہ جمع کردیا۔

ہندوستان میں مسلم حکومت کی تحلیل کے بعد جب مدارس اور دینی مراکز سے اقتدار اسلامی کی سرپرستی ختم ہوگئی تو انھوں نے ملت اسلامیہ کی بقا وتحفظ کی خاطر مدارس اسلامیہ کا نظام مرتب کیا۔ اکابرین نے اس نظام کو شوریٰ کی بنیادوں پر استوار کیا۔ یہ دیدہ ور اور ژرف نگاہ اکابر اسلامی تعلیمات، اس کے مزاج ومذاق اور مقاصد شریعت کے سلسلہ میں خداداد بصیرت اور زہد وتقویٰ کی صفات سے مزین تھے۔ انھوں نے اس نظام میں شوریٰ کو وہی مقام دیا جس کی وہ مستحق تھی۔

یہی وجہ ہے کہ دارالعلوم کی تاریخ میں ایسا بھی نازک موقع آیا جب سرپرستِ دارالعلوم (حکیم الامت حضرت مولانا اشرف تھانوی رحمۃ اللہ علیہ) اور مجلسِ شوریٰ کے درمیان اس طرح کا مسئلہ پیش آیا اور دیانت وامانت کے اس عہد زریں میں اکابر نے عملی طور پر اس قضیہ کو اس طرح حل کردیا کہ سرپرست نے شوریٰ کے سامنے اپنا استعفا پیش کردیا جو شوریٰ کی بالادستی کے اعتراف کے ساتھ اختلاف کو ختم کرنے کا ایک نہایت کامیاب اور قابل تقلید حل تھا۔ کاش کہ اسی اعلیٰ نمونہ کی دیگر مواقع پر بھی پیروی کی گئی ہوتی تو دارالعلوم بہت بڑی آزمائش سے بچ گیا ہوتا، لیکن **ماشاء الله کان وما لم یشأ لم یکن وھو الحکیم الخبیر.**

دارالعلوم دیوبند کی تاریخ کے طالب علم کو صاف طور پر یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ دارالعلوم کی نمایاں خصوصیات میں دو چیزیں نہایت اہم ہیں؛ ایک دارالعلوم کا عوامی چندہ کا نظام قائم کرنا، اس کو مستحکم اور منظم کرنا، دوسرے مدرسہ کو مجلس شوریٰ کے تحت قائم کرنا۔ حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے اصول ہشتگانہ میں بھی یہ دونوں خصوصیات بہت نمایاں طور پر نظر آتی ہیں۔ یہ دونوں عناصر دراصل تحریک مدارس کی روح ہیں اور ان بنیادوں میں کمزوری سے یہ نظام کمزوری اور لاقانونیت کی نذر ہوجائے گا۔ ان خصوصیات سے بانیان دارالعلوم کی دوربینی وژرف نگاہی کا بھی انکشاف ہوتا ہے کہ دنیا میں جمہوری دور کی آمد کی آہٹ انھوں نے کتنی پہلے محسوس کرلی تھی اور جمہوری بنیادوں پر اسلامی اداروں کو قائم کرکے دنیا کے سامنے بہترین نمونہ بھی پیش کردیا تھا۔

شوریٰ کا یہ نظام ہندوستان جیسے ملک میں مسلمانوں کے لیے کسی نعمتِ عظمیٰ سے کم نہیں۔ یہ کتاب اہل مدارس کے لیے بہت کام کی ہے، اگر ارکانِ شوریٰ اور نظماء ومہتمم حضرات شرعی حدود میں رہ کر مدارس کے نظم ونسق کو چلائیں تو ان کے مابین ناگوار واقعات نہیں پیش آئیں گے۔ آج کے پرفتن اور ہوائے نفسانی کے غلبہ کے دور میں اداروں اور جماعتوں کو شخص واحد کی امارت و قیادت میں دینے اور بڑی بڑی جماعتوں اور عظیم الشان اداروں میں عملی طور پر وراثت کی روایت پڑنے کی صورت میں بااختیار اور ہیئت حاکمہ کی حیثیت رکھنے والی مجلس شوریٰ کے قیام اور اس کے ذریعہ طے شدہ ہدایات پر عمل بہت سے فتنوں اور مکروہات سے حفاظت کی ضمانت ہے۔

اگرچہ یہ کتاب ایک وقتی ضرورت اور عارضی حالات کے پس منظر میں لکھی گئی، لیکن اس کے مضامین میں بڑی آفاقیت اور وسعت ہے۔ یہ موضوع اس وقت جتنا اہم اور ضروری تھا، آج اس کی ضرورت واہمیت دوچند ہوگئی ہے؛ کیوں کہ ایک طرف مدارس کو خارجی فتنوں کا سامنا ہے اور دوسری طرف بہت سی داخلی کمزوریاں اس نظام میں درآئی ہیں:

فرد را ربط جماعت رحمت است — جوہر او را کمال از ملت است
ناتوانی با جماعت یار باش — رونقِ ہنگامۂ احرار باش
حرز جان کن گفتۂ خیر البشر — ہست شیطان از جماعت دور تر
فرد وقوم آئینۂ یک دیگر اند — سلک و گوہر کہکشان و اختر اند
فرد می گیرد ز ملت احترام — ملت از افراد می یابد نظام

(رموز بےخودی، علامہ اقبالؒ) □□

آہ! رشکِ شعروسخن — حضرت مولانا ریاست علی ظفرؔ بجنوریؒ

تحریر: مولانا محمد مجیب الدین قاسمی

سادہ سا کاٹن کا کرتہ، علی گڑھ پاجامہ، دو پلی ٹوپی، قدرے چھوٹا قد، خوبصورت چہرہ، چمکدار آنکھیں، اُجلا رنگ، آنکھوں پر چشمہ، سفید گھنی داڑھی، مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے، نہایت سادگی اور وقار کے ساتھ ۱۹۹۸ء میں دارالعلوم رحمانیہ کی مسجد کے افتتاح کے موقع پر شہر حیدرآباد کی تاریخی مکہ مسجد میں ہزاروں لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے پہلی مرتبہ میں نے حضرت الاستاذ کو دیکھا، میں اس وقت دارالعلوم رحمانیہ میں منعقدشدہ ریاستی مسابقۃ القرآن میں شرکت کے لیے آیا ہوا تھا، پھر دارالعلوم رحمانیہ کی طالب علمی کے زمانہ میں وقتاً فوقتاً حضرت کے دیدار سے مشرف ہونے کا موقع ملتا رہا اور بالآخر ۲۰۰۷ء میں ازہر ہند دارالعلوم دیوبند میں حضرت سے 'سنن ابن ماجہ' پڑھنے کا شرف حاصل ہوا، اپنے لاکھوں شاگردوں کی علمی تشنگی بجھانے اور عملی فکری بالیدگی کو پروازِ بلند عطا کرنے والے، تاجِ تغزل کے آبدار موتی، جن پر شعرو سخن ناز کرتا ہے اور ہر لفظ ان کے قلم سے وجود میں آنے کو اپنے باعث صد افتخار سمجھتا ہے وہ آبدار گوہر نایاب اپنی خدماتِ جلیلہ سے اُمت کے ایک بڑے طبقے کو سیراب کرنے کے بعد اس عالم فانی سے عالم جاویدانی منتقل ہوگیا، جس سے میری مراد، ترانۂ دارالعلوم دیوبند کے خالق، مایہ ناز استاذ، اُردو ادب میں ممتاز مقام ومرتبہ کے حامل، نائب صدر جمعیۃ علماء ہند، محدث دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا ریاست علی صاحب ظفرؔ بجنوری رحمۃ اللہ علیہ ۲۲؍شعبان المعظم ۱۴۳۸ھ مطابق ۲۰؍مئی ۲۰۱۷ء بروز ہفتہ علی الصبح مختصر علالت کے سبب تقریباً ۷۵ برس کی عمر میں انتقال فرما گئے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

آپ کے انتقال سے علمی فضا مغموم ہوگئی اور اس خبر سے علماء اور طلبہ کے علاوہ پوری دنیا میں پھیلے ہوئے آپ کے تلامذہ اور عوام وخواص میں غم کی لہر دوڑ گئی۔ مولانا مرحوم دارالعلوم دیوبند میں ممتاز اُردو ادیب، کہنہ مشق سہل شستہ اسلوب کے ماہر مدرس تھے، سادہ طرز کی گفتگو کے عادی اور بہترین مشیر ہونے کے ساتھ طرزِ زندگی نہایت سادہ اور عام سا تھا، یقیناً مولانا کا انتقال وہ عظیم خسارہ ہے اور ایسا خلا ہے جس کا پر ہونا ناممکن نہ سہی مگر مشکل ضرور ہے۔ مولانا ریاست علی بجنوریؒ تقریباً گزشتہ ۴۵ سال سے دارالعلوم دیوبند میں بحیثیت مدرس اپنے علمی واصلاحی اور تربیتی خدمات انجام دے رہے تھے، مولانا کا شمار دارالعلوم دیوبند کے اُن اساتذہ میں ہوتا ہے جو دارالعلوم دیوبند کے قضیہ سے پہلے دارالعلوم میں مدرس کی حیثیت سے موجود تھے۔ ۱۹۸۰ء کے بعد دارالعلوم کی علمی وانتظامی ترقی میں آپ کا زبردست کردار رہا ہے، دارالعلوم دیوبند کے تحریراُمور کی ذمہ داریوں کے ساتھ مولانا مرغوب الرحمٰن صاحبؒ کے دور میں آپ دارالعلوم کے کلیدی عہدوں پر فائز رہے اور طویل مدت تک شعبۂ تعلیمات کے ناظم کی حیثیت سے ذمہ داریاں انجام دیں، مولانا مرحوم کا اُردو ادب سے کافی گہرا رشتہ تھا۔ آپ ترانۂ دارالعلوم دیوبند 'یہ علم وہنر کا گہوارہ، تاریخ کا وہ شہ پارہ ہے' اور ترانۂ جمعیۃ علماء 'یہ اہلِ یقیں کی جمعیۃ' کے خالق ہیں جو اپنی مثال آپ ہے۔ یہ ترانہ ایسا ہے کہ اسے پڑھتے اور سنتے ہوئے ایک عجیب وغریب کیف وسرور طاری ہو جاتا ہے، ایسا لگتا ہے کہ اس ترانہ کے الفاظ الہام کے مانند ہماری سماعت اور ذہن ودل پر نازل ہورہے ہوں، مولانا نے اس ترانے کی بحر، وزن اور قافیہ بندی تک میں ایسی ہنروری اور دیدہ ریزی سے کام لیا ہے کہ ہر مصرعہ اور مصرعے کا ہر لفظ نہایت چست درست اور معنویتوں کی کائنات اپنے اندر بسائے ہوئے ہے، شعری استعارات وکنایات کو اس خوبی سے برتا ہے کہ دل جھوم اُٹھتا ہے۔

مولانا مرحوم اپنے استاذ محترم حضرت مولانا فخر الدین صاحبؒ مراد آبادی نور اللہ مرقدہٗ کے دروسِ بخاری کے مرتب بھی ہیں جو 'ایضاح البخاری' کے نام سے منظرِ عام پر آچکی ہے اور اب تک اس کی تقریباً دس جلدیں منصۂ شہود پر آچکی ہیں، حضرت کو تصنیف وتالیف کا بڑا زبردست شوق تھا، 'نغمۂ سحر' آپ کا ایک شعری مجموعہ بھی منظرِ عام پر آیا ہے۔

گزشتہ نصف صدی پر محیط آپ کی دینی، علمی، اصلاحی اور تربیتی خدمات کے سبب آج پورے عالم میں آپ کے ہزاروں شاگرد قال اللہ اور قال الرسول کے نعرے بلند کررہے ہیں، جو بالیقین آپ کے لیے صدقۂ جاریہ ہیں۔ عام سا رہن سہن اور سادہ زندگی مولانا کا خاصہ تھا، مولانا مرحوم عہدِ حاضر کے بلند پایہ بزرگ اور معتبر ادیبوں میں صفِ اوّل کی حیثیت کے حامل تھے، دارالعلوم دیوبند کی خدمات کے ساتھ ساتھ آپ نے جمعیۃ علماء کے پلیٹ فارم سے بھی اعلیٰ خدمات انجام دی ہیں اور تادم آخر آپ جمعیۃ علماء کے نائب صدر کے طور پر مختلف سماجی واصلاحی کاموں میں حصہ لیتے رہے ہیں۔

آپ کی قابلِ ذکر خصوصیت یہ ہے کہ فی الوقت دارالعلوم دیوبند کے اکثر اساتذہ کا شمار آپ کے شاگردوں میں ہوتا ہے، آپ میں احساسِ مروّت اور خردنوازی بہت نمایاں تھی، جب بھی کوئی طالب علم آپ سے ملاقات کے

اشتیاق میں آپ کے گھر پہنچتا تو حضرت بڑے بے تکلف ہوکر بات کرتے اور آنے والے کی بات کو بغور سن کر صحیح مشورہ دیتے، چنانچہ اکثر طلبہ عصر بعد حضرت کے گھر جایا کرتے اور آپ اپنے پاس آنے والے ہر مہمان کی خاطر خواہ ضیافت فرماتے۔ سرما کے دِنوں میں بطورِ خاص چائے کا فنجان ضرور پیش کیا جاتا، آپ کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی تھی کہ آپ مؤثر عامل تھے، چنانچہ آپ کا نقش کردہ لوح جو چاندی کی انگوٹھی میں نصب کرکے لوگ استعمال کرتے اور اس کی برکات سے مستفید بھی ہوتے، آپ اپنے شاگردوں سے بہت محبت سے پیش آتے اور ان کے حوصلوں کو بلند فرمایا کرتے تھے، آپ کا کوئی شاگرد کتاب کا مسودہ لاکر پیش کرتا تو حضرت اپنی قیمتی تقریظ سے لکھنے والے کو داد وتحسین دیتے اور اس کی ہمّت افزائی فرماتے اور کسی بھی کتاب پر آپ کی تقریظ اس کی مقبولیت کے لیے کافی مانی جاتی تھی، مولانا مرحوم کافی عرصہ سے مختلف امراض میں مبتلا تھے، مگر علاج ومعالجہ کے سہارے وہ مسلسل دارالعلوم دیوبند میں درس وتدریس کی خدمات انجام دے رہے تھے، ویسے تو حضرت کی طبیعت آپ کی اہلیہ مرحومہ کے انتقال کے بعد سے بجھ سی گئی تھی، لیکن دارالعلوم کی محبت اور اس سے وابستگی کے لیے آپ نے اپنے معمولات میں کوئی تبدیلی آنے نہیں دی، مولانا مرحوم کا انتقال دارالعلوم دیوبند اور جمعیۃ علماء کے ایک باب کا خاتمہ ہے۔

مولانا مرحوم کی زندگی ابتدا تا انتہاء علم وحکمت، درس وتدریس، تعلیم و تعلّم کی مکمل داستان ہے، آپ ۹؍مارچ ۱۹۴۰ء کو علی گڑھ میں پیدا ہوئے، آپ کے والد کا نام فراست علی تھا، آپ کا آبائی وطن محلّہ حبیب والا، ضلع بجنور ہے، ابتدائی تعلیم کی تکمیل کے بعد آپ اپنے پھوپھا مولانا سلطان الحق بجنوری (ناظم کتب خانہ دارالعلوم دیوبند) کے ہمراہ فقط گیارہ سال کی عمر میں ۱۹۵۱ء میں دارالعلوم دیوبند پہنچے، سات سال تک تعلیم حاصل کرکے ۱۹۵۸ء میں دورۂ حدیث سے فراغت حاصل کی اور دورۂ حدیث شریف میں پہلی پوزیشن حاصل کی، اس کے بعد بھی اپنے استاذ ومربی حضرت مولانا فخرالدین مرادآبادی کی آغوشِ تربیت میں ۱۳؍سال رہ کر استفادہ کیا، ۱۹۷۲ء میں دارالعلوم دیوبند میں مدرس مقرر ہوئے، کچھ برسوں تک تدریس کے ساتھ ساتھ ماہنامہ 'دارالعلوم' کی ادارت کی ذمہ داری انجام دی، ۱۹۸۰ء سے حدیث کا درس آپ سے متعلق ہوا اور مسلسل ۳۷ سال تک درسِ حدیث دیتے رہے۔ ۱۴۰۵ھ میں دارالعلوم کی مجلسِ شوریٰ نے آپ کو مجلسِ تعلیمی کا ناظم مقرر کیا، آپ نے اپنے زمانۂ نظامت میں قابلِ قدر اصلاحات کیں، مثلاً امتحان داخلہ کو تحریری طور پر منظّم کیا، امتحان ششماہی کو باقاعدہ مستحکم کیا اور تمام امتحانوں میں امیدواروں کے نام کے بجائے کوڈ نمبر کی بنیاد ڈالی۔ ۱۴۰۸ھ میں آپ شیخ الہند اکیڈمی کے نگراں مقرر ہوئے، آپ کے دور میں شیخ الہند اکیڈمی سے متعدد معیاری اور علمی کتابیں شائع ہوئیں جن میں خود آپ کی لکھی ہوئی کتاب 'شوریٰ کی شرعی حیثیت' بھی شامل ہے، ۱۴۱۲ھ میں آپ کو دارالعلوم کا نائب مہتمم مقرر کیا گیا، حضرتِ والا نے ان تمام ذمہ داریوں کو بحسن خوبی انجام دیا، لیکن جب عمر اور صحت نے ضعف ونقاہت کی طرف قدم بڑھائے تو آپ نے یکے بعد دیگرے ان ذمہ داریوں سے سبکدوشی اختیار کرتے ہوئے صرف درس وتدریس ہی کو اپنا مشغلہ بنایا۔

اخیر دور میں آپ سے ترمذی شریف جلد اوّل کا کچھ حصہ بھی متعلق رہا، آپ کا درس دارالعلوم میں انتہائی مقبول اور دلفریب ہوا کرتا تھا، آپ کے درس کی خصوصیت یہ تھی کہ آپ کے اندازِ بیان سے ادنیٰ طالب علم بھی آسانی سے مرادِ حدیث کو سمجھ جاتا تھا، اُردو ادب کے ساتھ ساتھ عربی ادب میں بھی آپ کو دسترس اور یدطولیٰ حاصل تھا، چنانچہ حضرت سے جن شاگردوں نے 'البلاغۃ الواضحۃ' پڑھی ہے وہ اس سے بخوبی واقف ہیں۔

اللہ تعالیٰ حضرتِ والا کو غریقِ رحمت فرمائے اور آپ کے ہزاروں شاگردوں کو آپ کے لیے صدقۂ جاریہ کا ذریعہ بنائے، آمین:

کڑے سفر کا تھا مسافر تھکا ہے ایسا کہ سوگیا ہے
خود اپنی آنکھیں تو بند کرلیں ہر آنکھ لیکن بھگوگیا ہے

□□

ایک بلند مرتبہ انسان

تحریر: مولانا محمد یوسف خاں قاسمی (ناظم جمعیۃ علماء ہند)

مدینۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی مکان میں امیر المومنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ صحابہ کرام کی ایک جماعت کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ آپؓ نے ساتھیوں سے فرمایا کہ آج ہم میں سے ہر ایک اپنی محبوب اور پسندیدہ تمنا ظاہر کرے۔ یہ سن کر شرکائے مجلس میں سے ایک صاحب بولے: ''میری تمنا تو یہ ہے کہ یہ دُکان سونے سے بھر جائے اور اسے خدا کی راہ میں خرچ کردوں۔'' دوسرے صاحب بولے: ''میری تمنا یہ ہے کہ یہ گھر موتیوں سے بھر جائے اور میں تمام موتی اور جواہرات اللہ کی راہ میں صدقہ کردوں۔'' اس کے بعد تمام حاضرین صحابہ کرامؓ نے اپنی اپنی تمناؤں کا اظہار کیا۔ آخر میں امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ''میری تمنا تو یہ ہے کہ یہ گھر ابوعبیدہ بن جراحؓ، معاذ بن جبلؓ اور سالم مولی ابی حذیفہؓ جیسے امین، وفاشعار، صاحب علم و بصیرت اور اہلِ عزیمت افراد سے بھر جائے تا کہ اعلائے حق کی مہم تیز سے تیز تر ہوجائے۔

واقعہ بھی یہی ہے کہ قوم کے اچھے افراد ہی بیش قیمت گوہر ہوا کرتے ہیں اس لیے کہ کسی بھی سلامتی، کسی پیغام کی اشاعت اور کسی قوم کی اجتماعی زندگی صالح اور کام کے افراد کی ہی مرہونِ منّت ہوتی ہے۔ اس طرح کام کا انسان ہر دولت سے بڑی دولت اور ہر بیش قیمت چیز سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔ ایسا شخص جب وجود میں آجاتا ہے تو وہ بسا اوقات سینکڑوں ہزاروں بلکہ پوری قوم پر بھاری ہوتا ہے۔

مادرِ گیتی ہر دَور میں اپنے سینے سے انسانی شکل میں ایسے ہیرے جواہرات پیدا کرتی رہی ہے، جنھوں نے اس بزم ہستی کو اپنے زہد و تقویٰ اور فکر و عمل کی سوغات دی۔ ان عظیم ہستیوں میں اوّلین درجہ تو حضرات انبیائے کرام کو حاصل ہے جنھوں نے انسانوں کو ان کے مقصدِ حیات سے آگاہی بخشی۔ ان کے بعد وہ حضرات علمائے کرام ہیں جو ان کے حقیقی وارث بھی کہلاتے ہیں اور جنھوں نے اللہ کی عطا کردہ توفیق سے اپنے علم و عمل اور زہد و تقویٰ کے تقدس سے اس عالم ہستی کو روشن کیا۔ ایسی ہی صالح اور نیک شخصیتوں میں صاحبِ تذکرہ استاذ الاساتذہ حضرت مولانا ریاست علی ظفؔر بجنوریؒ بھی ہیں جنھوں نے اپنی علمی و عملی جدوجہد، اپنے زہد و تقویٰ، اپنی تواضع و انکساری اور عاجزی و بے نیازی کے وہ نقوش قائم کیے جو آنے والی نسلوں کے لیے انشاء اللہ مشعلِ راہ ثابت ہوں گے۔

حضرت مولانا ریاست علی ظفؔر بجنوری رحمہ اللہ کی وفات سے علمی دنیا و دینی حلقوں میں جو گہرا خلا پیدا ہوا ہے، اس کا پُر ہونا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ وہ علم و تقوی، اخلاق و انکسار کے اعتبار سے جامعیتِ کاملہ کے مالک تھے۔ مولانا نے میخانۂ 'امداد' کے جرعات معرفت کو جس 'فخرِ حدیث' ساقی کے جام سے نوش فرمائے تھے، اس کا پرتو آخری سانس تک ان کے چشمۂ فیض سے جاری رہا اور ہر تشنہ کام بقدر ظرف و پیمانہ سیراب و شاداب ہوتا رہا۔

حضرت مولانا ہمارے ان شفیق سرپرستوں میں سے تھے، جن سے ملنا جلنا حوصلہ بخش اور روح و قلب کو اطمینان رسانی کا ذریعہ ہوا کرتا تھا۔ آپ فطری طور سے بزم علم و عرفان کی شمع روشن اور محفل ارشاد و ہدایت کے صدر نشیں تھے، لیکن عصرِ حاضر کے رجحانات علم و فضل، فوقیت و کمال کی نمود و نمائش کا دور تک کوسوں پتہ نہیں تھا۔ اس راقم السطور نے جب ۱۹۵۹ء میں شعبۂ فارسی میں داخلہ لیا، اس وقت حضرت مولانا ریاست علی صاحب دورۂ حدیث سے چند ماہ پہلے ہی فارغ ہوئے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ انھوں نے امتیازی نمبرات سے دورۂ حدیث کا امتحان پاس کیا تھا۔ دارالعلوم دیوبند کا یہ وہ سال تھا جس میں حضرت علامہ فخر الدین صاحب مرادآبادیؒ شیخ الحدیث کی مسند پر متمکن تھے اور اسی سال وہ جمعیۃ علماء ہند کے صدر بھی بنے۔ مولانا مرحوم کو حضرت علامہ فخر الدین صاحب رحمہ اللہ سے اس قدر علمی و روحانی لگاؤ تھا کہ انھوں نے مسلسل دو سال (۱۳۷۷ھ و ۱۳۷۸ھ) حضرت شیخؒ کے درسِ بخاری میں شرکت فرما کر ان کے افادات کو قلم بند کرنے کا اہتمام فرمایا اور ہزاروں صفحات پر مشتمل گنجینۂ علم 'ایضاح البخاری' تیار کر کے طالبان علوم نبوت کو حضرت شیخ کے علوم سے کسب فیض کا موقع فراہم کیا۔ یہ کتاب موضوع کی جامعیت، تراجم ابواب پر محققانہ کلام، امام بخاریؒ کے رجحان کی وضاحت، کتاب کے کامیاب حل اور مسلک حنفیہ کی تشریح و ترجمانی کی حیثیت سے ممتاز مقام رکھتی ہے۔

مولانا ریاست علی صاحب کو مبدا فیاض نے بے پناہ صلاحیت سے نوازا تھا، عام طور پر ساتھی طلبہ اپنے ساتھی کی صلاحیتوں کے بہت کم معترف

ہوتے ہیں لیکن یہ میرا اپنا مشاہدہ ہے کہ ان کے ہم سبق بھی ان کے علم وفضل اور خدا داد صلاحیتوں کے نہ صرف معترف تھے بلکہ ان کی بے پناہ درسی استعداد، معاملہ فہمی اور دوررس نگاہ کے مداح بھی تھے، وہ جہاں اور جس محفل میں ہوتے، اپنی شناخت رکھتے تھے اور کوئی بڑے سے بڑا شخص بھی ان کو نظر انداز کرنے کی جسارت نہیں کرسکتا تھا۔

انھوں نے اپنے لیے جس راہ کا انتخاب کیا، اس میں انھوں نے اپنے معاصرین کو بہت پیچھے چھوڑ دیا تھا، وہ پوری طرح علمی سمندر کے غواص تھے۔ علمی نکتے اور باریکیاں صف بستہ ان کے سامنے کھڑی نظر آتیں اور ہر ایک کی خواہش ہوتی کہ وہ مجھے اپنے مافی الضمیر کی ادائیگی کے لیے منتخب کرلیں، مگر وہ بندۂ خدا تو اس شعر کا مصداق تھا:

کہ فروتنی است نشان رسیدگان کمال
کہ چوں سوار بمنزل رسد پیادہ شود

عاجزی، انکساری اور فروتنی ان کا خاص وصف تھا جس میں وہ اپنے معاصرین میں ممتاز نظر آتے تھے۔ وہ عہد حاضر کی خودنمائی کے فریب سے محفوظ تھے اور اپنے لیے سامان امتیاز فراہم کرنے والوں سے ان کو سخت کوفت ہوتی تھی۔ عہد عالم گیر کے شاعر نواب امتیاز خاں خالص نے زندگی کے ایک ہی پہلو کا مطالعہ کیا تھا اور اس نقطۂ نظر سے انھوں نے معاصر سماج کو دیکھا تو سب کو لیلائے دولت اور اقتدار کا ہی قیس ومجنوں پایا۔ مگر شاید اس نے ایسے بندگان اخلاص وانکسار کی زندگیوں کا جائزہ نہیں لیا جو شہرت ونا موری، عزت ووجاہت سے دور بھاگتے ہیں اور کسی بھی مرحلے پر اپنی قربانی اور جدوجہد کی قیمت وصول نہیں کرتے۔ یقیناً یہ ایک بہت بلند معیار ہے، جو ہر شخص کو حاصل نہیں ہوتا۔

ملک دنیا تن پرستاں را حلال
ما غلام ملک عشق بے زوال

باوزن شخصیت:

آپ کی شخصیت بڑی مؤثر اور باوزن تھی حالانکہ آپ تواضع اور سادگی کا پیکر مجسم تھے، لیکن بزرگوں کے فیضِ صحبت اور علمی وعملی کمال کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے آپ کی شخصیت میں ایسا اثر پیدا فرمادیا تھا جس سے سامنے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا تھا۔ کسی بڑے سے بڑے ماہرِ فن اور اپنے میدان کے شہسوار سے کبھی مرعوب نہ ہوتے بلکہ عجیب بات یہ تھی کہ لوگ ان کی سادگی کے باوجود ان کے سامنے زانوئے ادب طے کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔

جوہر انسانیت:

یہ آج ایک واقعی حقیقت ہے کہ دنیا اہلِ فضل وکمال سے کبھی خالی نہیں رہی اور آج بھی اس دنیائے آب وگل میں ایسے افراد کی کمی نہیں ہے، جن کے فضل وکمال کی ایک دنیا معترف ہے۔ مگر جو چیز آج نایاب ہے وہ جوہرِ انسانیت ہے۔ راقم السطور کا بار بار کا مشاہدہ ہے کہ حضرت مولانا مرحوم تمام تر علمی اور انسانی خصوصیات کے ساتھ ساتھ انسانیت کے بہت اونچے مقام پر فائز تھے، یہ محض عطیۂ خداوندی تھا جو بہت ہی خوش نصیب لوگوں کے حصے میں آتا ہے:

یہ مرتبہ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دار ورسن کہاں

اسی جوہرِ انسانیت کا کمال تھا کہ آپ ہمیشہ لوگوں کی مدد کے لیے پیش پیش رہتے تھے۔ خیرخواہی، ہمدردی اور سخاوت کا بڑا جذبہ تھا جو اللہ نے آپ کو ودیعت فرمایا تھا۔ معاشی اعتبار سے کمزور بعض طلبہ کی آپ برابر کفالت فرماتے رہتے تھے، حالانکہ ابتداء میں آپ کی زندگی بھی بڑی عسرت میں گزری تھی۔

فراست اور خودداری کے پیکر:

مولانا مرحوم اپنے متعلقین اور مخلصین میں تلوار بے نیام تھے، کسی بھی معاملے میں ان کی فہم وفراست کا جواب نہیں تھا، کہنے والے کے کہنے سے پہلے ہی وہ مالہٗ اور ماعلیہ کو بخوبی سمجھ لیا کرتے تھے اور ان کی بات ہر معاملے میں حرف آخر سمجھی جاتی تھی۔ بڑے خوددار اور فکر ونظر کے پختہ واقع ہوئے تھے، دلائل وشواہد کی بنا پر خلوص نیت کے ساتھ جو نظریہ ایک بار قائم فرمالیتے، اس پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہتے، انھیں اپنے فیصلہ پر ایسا اعتماد ہوتا کہ پھر کوئی اپنی طرف مائل کرنے میں کامیاب نہ ہوتا، خودداری کا یہ عالم تھا کہ حالانکہ ابتدائی زندگی بڑی عسرت اور تنگی میں گزری، کتابت کرکے گزربسر کرتے رہے، مگر مجال ہے کہ کسی کے سامنے حرف شکایت زبان پر آجائے یا کسی بھی طرح اپنے حالات کا اظہار ہوجائے، سخت سے سخت حالات کا ہنستے مسکراتے مقابلہ فرماتے اور اپنے وقار ومتانت اور سنجیدگی پر آنچ نہ آنے دیتے تھے۔

باکمال ادیب:

وہ صرف درسی علوم کے میدان کے ہی شہسوار نہیں تھے، بلکہ جس عنوانِ زندگی پر بھی انھوں نے قلم اٹھایا اس کا حق ادا کردیا، درسی خصوصیات ہوں یا نظم ونثر کی محفل وہ ہر جگہ ممتاز ویکتا ہی نظر آتے۔ میرا خود اپنا مشاہدہ

ہے کہ وہ نظم، نعت ومنقبت، سہرے رخصتی، تقریظات اور ترانے تسلسل کے ساتھ لکھتے تھے۔ وہ فی البدیہہ اور زود گو تحریروں کے لیے جانے جاتے تھے۔ ''نغمۂ سحر' میں جواُن کی کم عمری کی کاوش ہے، انھوں نے جو کچھ کہا ہے، وہ آج حقیقت بن کر سامنے آرہا ہے۔ ترانۂ دارالعلوم، ترانہ جمعیۃ اور ان جیسی بہت سی منظوم کاوشیں ان کی ادنی مگر حقیقی صلاحیتوں کا شاہکار ہیں۔ ۱۹۵۶ء میں جب ان کی عمر صرف ۱۶ رسال تھی، کسی کہنہ مشق شاعر نے 'محبت ایک سعی رائیگاں' کے عنوان سے پوری غزل کہہ ڈالی تھی۔ شاعر نے بہترین ادب کے سانچے میں محبت کی خوب تنقیص کی تھی، جبکہ معرفت وخودی کے حصول کے لیے محبت کو اول دروزاہ کہا گیا ہے۔ اپنی کم عمری کے باوجود مولانا مرحوم نے محبت کی حقیقت ومعنویت پر چند جامع اشعار لکھے، جس میں ایک شعر شاعر کے خلاف اپنے طنز کے اعتبار سے کافی بھاری تھا۔ انھوں نے کہا:

ہوس کھلا رہی ہے شاعروں سے
محبت ایک سعی رائیگاں ہے

وفات حسرت آیات:

۲۳ رشعبان کو کسی کے ٹیلی فون سے ان کی وفات کی اطلاع ملی تو ایسا لگا کہ وہ درخت کر گیا جو دہائیوں سے ہمیں سایہ دے رہا تھا اور جہاں سے رفاقت، انسیت اور محبت کی خوشبو آتی تھی۔ جنازے میں شرکت کے لیے راقم السطور بہت ہی بوجھل قدموں کے ساتھ دیوبند گیا اور اپنے ایک مشفق اور کرم فرما ہم عصر مگر فرید العصر عالم دین کو الوداع کہہ کر پھر دہلی واپس آگیا۔

آج وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں مگر ان کا دکھلایا ہوا راستہ اور ان کی حیات کے نقوش ایسے زریں باب ہیں جن سے ہر عام وخاص کو جینے کی ادا ملتی ہے۔ ایسی عظیم شخصیتیں اپنے کارناموں کی وجہ سے زندہ و پائندہ رہتی ہیں جو موجودہ اور آنے والی نسلوں کے لیے منارۂ نور اور زندگی کی شب بیاباں میں قندیل رہبانی کا کام کرتی ہیں۔

مولانا مرحوم کے تعلق سے بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے، اہلِ قلم اور ان کے متعلقین ان کی حیات کے مختلف پہلوؤں پر لکھیں گے مگر یہ راقم اسی پر اکتفاء کرتا ہے کہ: بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری:

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنجہائے گرانمایہ کیا کیے

دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور ہم خدام و پسماندگان کو اس عظیم صدمے کو برداشت کرنے کی قوت سے نوازے، آمین۔ ☐☐

حیراں ہوں، دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں

تحریر: مولانا محمد یاسین جہازی گڈاوی

دارالعلوم دیوبند کے استاذ حدیث حضرت مولانا ریاست علی ظفر صاحب بجنوری ۲۰ رمئی، بروز سنیچر علی الصباح دیوبند میں انتقال فرماگئے۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔

اکابرین کے ساتھ تعلق کی نوعیتیں الگ الگ ہوتی ہیں، راقم کے لیے یہ فخر کی نسبت ہے کہ ان کے سامنے زانوے تلمذ طے کرنے کا شرف حاصل رہا ہے۔ جس کے شواہد پیش خدمت ہیں۔

دارالعلوم دیوبند کے طالب علم ہونے کی نسبت سے استاذ ہونے کے علاوہ حضرت مولانا ریاست علی ظفر صاحب بجنوری نوراللہ مرقدہ سے کچھ اور بھی رشتہ تھا۔ اور اس رشتہ کی روداد یہ ہے کہ جب حضرت مولانا منیر الدین صاحب گڈاوی کا تقرر دارالعلوم دیوبند میں ہوا، تو شروعاتی زمانے میں ان کا قیام حضرت مولانا نوراللہ مرقدہ کے کمرہ میں رہا۔ یہ کمرہ مسجد قدیم کے شمالی حصے سے متصل بالائی منزل پر واقع ہے۔ اس کی خصوصیت یہ تھی کہ یہ صرف ایک کمرہ نہیں تھا، بلکہ حضرت مولانا نوراللہ مرقدہ کا ذاتی کتب خانہ بھی تھا، جس میں مختلف علوم وفنون کی ہزاروں کتابیں قرینے سے رکھی ہوئی تھیں۔ ایک دن ایسا ہوا کہ دارالعلوم دیوبند کے ایک ساتھی طالب علم جناب مولوی جہاں گیر صاحب نے - جو مولانا کے طعام کے ذمہ دار تھے - ایک دن مجھ سے کہا کہ کل جمعہ کی مناسبت سے مولانا کے کمرے کی صفائی کرنی ہے، تو تھوڑا ساتھ دینا پڑے گا، اسی بہانے سے مولانا سے ملاقات بھی ہوجائے گی۔ چنانچہ راقم نے اس کا جواب ہاں میں دیا۔ اور اگلے دن ان کے ہمراہ مولانا کے کمرے کی صفائی کا فریضہ انجام دینے چلا گیا۔ ناتجربہ کاری دیکھیے کہ صفائی کی دھلائی میں کافی کتابیں اور قدیم اخبارات زد میں آگئے۔ پھر انھیں دھوپ میں ڈالا گیا۔ جب انھیں اپنی جگہ پر رکھنے کا وقت آیا تو کافی بے ترتیبی ہوگئی۔ اس پر مولانا نے کہا کہ اگر ترتیب کے مطابق رکھا جاتا تو بہتر ہوتا، کیوں کہ مولانا نوراللہ مرقدہ نے اپنی ضرورت اور ترتیب کے مطابق انھیں رکھا تھا۔ اس پر راقم نے یہ عندیہ دیا کہ ان شاء اللہ آپ اجازت دیں، تو میں ساری کتابیں فن کے اعتبار سے مرتب کردوں؟ مولانا نے نہ صرف اجازت دی؛ بلکہ دعا دیتے ہوئے کمرے کی ایک چابی بھی عنایت فرمادی۔ اس کے بعد ہوا ایسا کہ راقم از سرنو کتابیں ترتیب دینے لگا، جب کچھ نایاب کتابوں اور مولانا نوراللہ مرقدہ کے ذاتی مطالعے کی کتابوں پر لکھے ان کے نوٹ پر نظر پڑی، تو مولانا کی سبھی کتابوں کو پڑھنے کا ایسا شوق ہوا کہ پھر ترتیب کم اور مطالعہ زیادہ ہوتا تھا۔ مولانا کے شذرات کے مطالعے سے ان کی عظمت کا سکہ میرے دل پر بیٹھ گیا اور مولانا سے مجھے گہری عقیدت ہوگئی۔

مولانا نوراللہ مرقدہ چوں کہ علیا کے استاذ تھے، اس لیے نیچے کے درجات میں تو نہیں؛ البتہ دورہ حدیث شریف میں ابن ماجہ شریف پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔ مولانا کے درس میں جب اختلاف مذاہب پر کلام ہوتا تھا، تو حنفیت کی حقانیت اور اس کے اقرب الی النصوص ہونے کا یقین بڑھتا چلا جاتا تھا، جو مولانا مرحوم کے تبحر علمی اور مہارت حدیث کا عملی مظہر تھا۔ بعد ازاں جب دورہ حدیث سے فراغت کے بعد تکمیل ادب عربی کے شعبہ میں داخل ہوا، تو یہاں مولانا نوراللہ مرقدہ سے البلاغۃ الواضحۃ متعلق تھی۔ چنانچہ حضرت وقت کی پابندی کے ساتھ درس میں تشریف لاتے تھے اور عبارت خوانی کے بعد تشریح متن فرماتے۔ پھر ہر سبق کے تحت دی گئی مشقوں کو حل کرنے کے لیے کہتے ہوئے شیریں دہن سے محبت وشیفتگی سے لبریز یہ جملہ ارشاد فرماتے کہ ''بیٹا! جاری کرنا''۔ پھر روحانی فرزند اپنی اپنی سمجھ کے مطابق قواعد کو منطبق کرنے کی کوشش کرتے۔ اگر کوئی شخص مکمل اجرا کردیتا، تو دوسرا جملہ اس کے لیے یہ فرماتے کہ ''شاباش بیٹا!'' پھر کسی دوسرے طالب کی علم کی طرف نظر دوڑاتے۔ پھر اسے کہتے ''بیٹا! اب آپ جاری کرنا''۔ پھر وہ اپنی سمجھ کے مطابق کرتا۔ اگر کوئی طالب علم قواعد کا اجرا نہیں کرپاتا، تو ناراض نہیں ہوتے تھے؛ بلکہ جزوی سہارا دیتے۔ اور اس طرح سے اجرا مکمل کرادیتے۔ جب اجرا مکمل ہوجاتا، تو ہر چند کہ اس میں زیادہ اجرا مولانا نوراللہ مرقدہ ہی کی طرف سے ہوتا تھا، اس کے باوجود، اس کو شاباشی دیتے اور کہتے ''شاباش بیٹا!''۔ کبھی ایسا ہوتا کہ ایک ہی طالب علم سے ایک ہی اجرا کو کئی کئی مرتبہ کہلواتے اور اس کے باوجود وہ نہیں کرپاتا، تو ناراض بالکل نہیں ہوتے تھے، بلکہ یہ فرماتے کہ سمجھ میں تو آہی گیا ہے، بس تھوڑا اور زور لگانے کی ضرورت ہے۔ مولانا کا یہ انداز درس اتنا موثر تھا کہ غبی سے غبی طالب علم بھی فن سے روشناس ہوئے بغیر نہیں رہتا تھا۔ مولانا کی سادگی اور تواضع تو گویا ضرب المثل تھی، اس سلسلے کے دو واقعے، جن کو راقم نے بذات خود دیکھا ہے، پیش کرتا ہوں۔

ہمارے زمانے میں تکمیل ادب کا جو شعبہ تھا، وہاں اساتذہ کرام کی چپل رکھنے کی ایک مخصوص جگہ تھی۔ اور اساتذہ عموما اپنے جوتے یا چپل وہیں اتارتے تھے۔لیکن مولانا نوراللہ مرقدہ عموما وہاں نہیں اتارتے تھے، بلکہ اس کے نیچے اتارتے تھے، جہاں سبھی طالب علموں کے جوتے چپل ہوتے تھے۔ مولانا نوراللہ مرقدہ عموما ہوائی چپل پہن کر آتے تھے۔ایک دن ایسا ہوا کہ حسب معمول حضرت نے اپنی ہوائی چپل نیچے اتاری۔ایک طالب علم آیا۔ اس نے دیکھا کہ جہاں پر اساتذہ کی چپلیں رہتی ہیں، وہ جگہ خالی ہے اور مولانا مرحوم تشریف فرما ہیں،تو اس نے نیچے سے ایک قیمتی اور خوبصورت چپل اٹھا کر اوپر رکھ دیا، جو یہ سمجھ رہا تھا کہ اتنی قیمتی اور نمایاں چپل تو مولانا ہی کی ہوگی۔ جب درس سے فراغت کے بعد واپس ہونے لگے تو مولانا نے اوپر ایک قیمتی چپل دیکھا،تو مسکراتے ہوئے فرمایا کہ میری چپل کہاں ہے بھائی؟ یہ چپل تو اتنی قیمتی ہے کہ میرے لیے ہدیہ بھی موزوں شخص کے لیے نہیں ہوگا۔ یہ سن کر چپل والے طالب علم نے کہا کہ حضرت اسے قبول فرمالیں ،تو حضرت نے جواب دیا کہ بھائی جوانی میں کبھی ایسی قیمتی چیز پہننے کا شوق نہیں ہوا،تو اب بڑھاپے میں اس کی کہاں گنجائش ہے۔پھر فرمایا کہ جس طالب علم نے میری چپل سمجھ کر اس چپل کو یہاں رکھا ہے، وہ اگر میرے کرتے کو دیکھ لیتے تو انھیں غلط فہمی نہیں ہوتی۔ پھر نیچے اپنی چپل دیکھ کر حضرت نے خود ہی اٹھائی اور اسے پہن کر درس گاہ سے روانہ ہو گئے۔

جمعیۃ علماء ہند کے شعبہ مباحث فقہیہ سے وابستگی کی نسبت سے ایک دن حضرت مولانا نوراللہ مرقدہ کی خدمت میں دیوبند حاضر ہوا۔شعبہ کا کام یہ تھا کہ اکابرین محترم حالات کے مطابق کوئی موضوع تجویز فرمائیں گے،جس پر جمعیۃ سیمینار کرے گی۔اس تعلق سے دیگر اساتذۂ دارالعلوم کے ساتھ حضرت نوراللہ مرقدہ کی خدمت میں بھی حاضری ہوئی۔عصر کے بعد مولانا مرحوم کے مکان پر اساتذہ دارالعلوم کی پر رونق محفل سجی ہوئی تھی۔اساتذہ حضرت مولانا سے گفتگو میں مصروف تھے کہ موقع پر ناچیز نے بھی اپنی بات رکھی۔اور ساتھ میں شعبہ کی طرف سے جاری خط کو بھی حضرت والا کی خدمت میں پیش کیا۔ خط پڑھ کر حضرت نے حوصلہ افزا کلمات کے ساتھ ساتھ اپنا پورا تعاون دینے کا وعدہ کیا۔ مجھے بعد میں احساس ہوا کہ جب یہ ایک مستقل کام تھا،تو حضرت سے پہلے ملاقات کا وقت لے لینا چاہیے تھا،لیکن پیشگی کسی اطلاع کے بغیر حضرت کے پاس گیا،تو نہ ناگواری کا اظہار فرمایا اور نہ ہی عدم تعاون کا عذر پیش کیا؛ بلکہ تعاون اور دعا دونوں سے نوازا۔اسے حضرت نوراللہ مرقدہ کے تواضع کے علاوہ کیا عنوان دیا جاسکتا ہے۔

جمعیۃ علماء ہند کے تعلق سے حضرت دفتر تشریف لایا کرتے تھے،تو گاہے بگاہے نیازی کا شرف حاصل ہوتا رہتا تھا۔اور ہر مرتبہ خلوص وللہیت سے لبریز دعاوں سے نوازتے تھے۔آج جبکہ حضرت کی ذات ہمارے درمیان نہیں ہے،تو ایسا محسوس ہورہا ہے کہ دعاوں کے تعلق سے بھی کتنا خلا پیدا گیا ہے۔

پھر ایک دن ایسا ہوا کہ واٹس ایپ دیکھ رہا تھا کہ دمادم پیغامات آنے لگے، اور تقریبا ہر پیغام یہی خبر دے رہا تھا کہ حضرت نوراللہ مرقدہ اس دارفانی سے رحمت الٰہی کی آغوش میں چلے گئے،انا اللہ وانا الیہ راجعون۔ پہلے یقین سا نہیں آیا،لیکن خبر کے تواتر نے یقین کرنے پر مجبور کیا اور شکستہ خاطر کے ساتھ ہمیں پڑھنا پڑا کہ بیشک ہم سب اللہ ہی کے لیے ہیں اور اسی کے پاس لوٹ کر جائیں گے۔

کچھ لمحے بعد دفتر جمعیۃ علماء ہند کے ذمہ داروں نے یہ فیصلہ کیا کہ یہاں سے ایک وفد جنازے میں شرکت کے لیے جائے گا،جس میں مولانا معز الدین صاحب ،مولانا محمد یوسف صاحب، مولانا محمد عرفان صاحب، مولانا کلیم الدین صاحب اور ناچیز کا نام شامل کیا گیا۔پھر یہ وفد دیوبند کے لیے روانہ ہوگیا۔اور تقریبا ڈیڑھ بجے دارالعلوم پہنچا۔مسجد قدیم میں ظہر کی نماز کے بعد علی الفور احاطہ مولسری میں نماز جنازہ پڑھی گئی۔ جمعیۃ علماء ہند کے صدر حضرت مولانا قاری سید محمد عثمان صاحب منصور پوری استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند نے امامت کی۔ بعدازاں جنازہ قبرستان قاسمی میں لایا گیا اور اس عظیم ہستی کو ہمیشہ ہمیش کے لیے نظروں سے اوجھل کر دیا گیا۔

جمعیۃ علماء ہند کی تعزیتی نشست میں اکابرین کے تاثرات

۲۵ رمئی ۲۰۱۷ء، بروز جمعرات جمعیۃ علماء ہند کے دفتر واقع آئی ٹی او نئی دہلی میں مولانا محترم اور مولانا ازہر صاحب رنچوی کے لیے ایک تعزیتی اجلاس رکھا گیا،جس میں جمعیۃ علماء ہند اور دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ نے شرکت کی۔اس اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے جمعیۃ علماء ہند کے جنرل سکریٹری مولانا محمود مدنی صاحب نے خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ ان دونوں شخصیات کی وفات دارالعلوم دیوبند اور جمعیۃ علماء ہند سمیت پوری ملت اسلامیہ کے لیے بڑا خسارہ ہے۔تعزیتی اجلاس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مرنے والی شخصیات کی خصوصیات کا تذکرہ کیا جائے تاکہ ہم ان سے رہ نمائی حاصل کریں۔موجودہ دور میں ان بزرگوں کے کردار سے روشنی حاصل کرکے آگے بڑھنے کی ضرورت ہے۔حضرت مولانا ریاست علی صاحب ایک مخلص مشیر اور سادگی کے پیکر تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ۲۰۱۳ء میں امن عالم کانفرنس دیوبند میں منعقد ہوئی۔مولانا ریاست علیؒ صاحب نے بہت ہی جامع بات کہی کہ ''اسلام مذہب امن واعتدال ہے اور دیوبندیت مسلک امن واعتدال ہے''، یہ جملہ بہت چھوٹا ہے لیکن کافی جامع ہے۔مولانا مدنی نے اپنا خطاب جاری رکھتے ہوئے کہا کہ مولانا ریاست علی کے تواضع وانکساری کی میں شہادت دیتا ہوں۔مولانا نوراللہ مرقدہ جمعیۃ علماء

ہند کے نائب صدر تھے،اس لیےتعزیت کے ہم زیادہ مستحق ہیں۔

حضرت مفتی ابوالقاسم نعمانی صاحب مہتمم دارالعلوم دیو بند نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ مولانا ریاست علیؒ سادہ طبع اور مستحکم رائے والے انسان تھے۔ ان کی تالیف ایضاح البخاری ایسا گراں قدر کارنامہ ہے کہ اگر کوئی اور چیز نہ ہوتی، تو صرف یہ کتاب ان کی عظمت ظاہر کرنے کے لیے کافی تھی ۔انھوں نے کہا کہ مختلف مجلسوں میں ان سے گفتگو کا موقع ملا، میں نے کبھی ان کو زود رائے اور پژمردہ نہیں دیکھا۔ وہ ہمیشہ آخر میں رائے دیتے تھے اور مسکراتے رہتے۔ حضرت مولانا سلمان بجنوری صاحب استاذ دارالعلوم دیو بند نے کہا کہ مولانا ریاست علیؒ ورع اور تقوی کے انسان تھے، تواضع کا یہ عالم تھا کہ ان کو اگر اعزاز دیا جاتا تو دلی تکلیف ہوتی تھی ، وہ ہمیشہ عہدوں اور مسندوں سے گریز کرتے تاہم وہ اعلی درجہ کے خود اعتماد تھے۔ مولانا سلمان بجنوری صاحب نے ایک واقعہ سنایا کہ ان کے صاحبزادے نے عید کے موقع پر کپڑا کے لیے رقم مانگی، مگر ان کے پاس نہیں تھی ۔ اگلے دن چند لفافوں میں رقم ڈال رہے تھے ، اسی لڑکے نے دیکھ لیا، حضرت نے بلایا اور کہا بیٹے تم سے کیا چھپانا یہ رقم ضرورت مند بیواؤں اور یتیموں کے لیے ہے، جسے ہر سال عید کے موقع پر دیتا ہوں ،اس بار اپنے پاس نہیں تھی تو بیس ہزار قرض لے کر ان کو دے رہا ہوں ۔مولانا قاری شوکت علی صاحب استاذ دارالعلوم دیو بند نے کہا کہ مولانا ریاست علی صاحب کی شخصیت ہشت پہلو تھی ۔ وہ شخصیت ساز ،خرد نواز اور نفع رساں انسان تھے ، ایضاح البخاری ان کے فکر کی پختگی کا خارجی ثبوت ہے۔ اس موقع پر مولانا مفتی راشد اعظمی صاحب دارالعلوم دیو بند نے کہا کہ ان دونوں ہستیوں کے قریب قریب ہی مدت میں رخصت ہو جانے سے گہرا صدمہ پہنچا ہے ۔ انھوں نے اپنے دلی جذبات کا اظہار کرتے ہوئے غالب کا یہ شعر پیش کیا کہ ’’حیراں ہوں، دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں۔ مولانا متین الحق اسامہ صاحب صدر جمعیۃ علماء صوبہ اتر پردیش نے اپنے خطاب میں اپنی چند یادوں اور ان اکابر کے انداز تربیت پر روشنی ڈالی۔ اس اجلاس میں مولانا مرحوم کے صاحب زادے مولانا عدنان صاحب نے بھی خطاب کیا اور اپنے والد محترم کے حسن سلوک کا تذکرہ کیا۔ جمعیۃ علماء ہند نے اپنے اس تعزیتی اجلاس میں ایک تعزیت نامہ بھی پیش کیا، جسے اس کے سکریٹری مولانا حکیم الدین صاحب قاسمی نے پڑھ کر سنایا۔ اس کے متن کا وہ حصہ جو حضرت مولانا سے متعلق پیش خدمت ہے۔

حضرت مولانا ریاست علی ظفرؒ صاحب بجنوری

حضرت مولانا ریاست علیؒ کو اللہ تعالی نے گراں قدر علم و فضل کی دولت سے نوازا تھا، علمی بصیرت ،فکر رسا، تعمق نظر، ادبی ذوق، تحقیق و تفتیش کا وہ شوق عطا فرمایا تھا، جس نے آپ کو یکتائے روزگار بنا دیا۔ معاملہ فہمی اور رسائی فکر کا وہ جوہر آپ کو میسر ہوا تھا جو ہر پیچیدہ معاملے کی گتھی کو آسانی سے سلجھا دیتا ہے۔ حضرت والا نے ۱۹۷۲ء سے تا م واپسیں پینتالیس سالوں تک دارالعلوم دیو بند میں استاذ حدیث کی ذمہ داری بحسن وخوبی انجام دی ۔اس طویل مدت تک درس وتدریس میں ہزارہا تشنگان علوم آپ کے سرچشمہ فیض سے بلاواسطہ فیضیاب ہوئے ۔آپ جیسے کریم النفس، مشفق استاذ اور رفیق عمل کا سایہ بڑی سعادت اور ان کی وفات بڑی محرومی اور عظیم نقصان ہے ۔آپ علم حدیث وفقہ کے بڑے عالم ہونے کے ساتھ اردو زبان وادب کے بہترین قلم کار وادیب بھی تھے۔ آپ کی شاعری کا مجموعہ ’’نغمہ سحر‘‘ ایک عمدہ کاوش ہے، اس کے علاوہ ’’ایضاح البخاری‘‘ ’’شوری کی شرعی حیثیت‘‘ سے تشنگانِ علوم دہائیوں سے فیض حاصل کر رہے ہیں۔ آپ کا لکھا ہوا دارالعلوم کا ترانہ نہایت جامع ومقبول ہے، اس میں دارالعلوم کی خصوصیات ، مقصد تاسیس ،تاریخی واقعات کو بہت عمدگی سے پیش کیا گیا ہے، اس کے علاوہ آپ نے جمعیۃ علماء ہند پر بھی بہترین ترانہ لکھا ہے۔

جمعیۃ علماء ہند، آپ کی محبوب جماعت رہی ۔شروع میں جمعیۃ علماء ہند کے دفتر سے وابستہ رہے، پھر بعد میں دارالعلوم دیو بند چلے گئے، لیکن اس کے باوجود جمعیۃ سے آپ کا تعلق قائم رہا۔ آپ سال ۲۰۱۱ء سے جمعیۃ علماء ہند کے مسلسل نائب صدر منتخب ہوتے رہے۔ جمعیۃ علماء ہند نے آپ کی رہ نمائی اور سرپرستی سے ہر موقع پر روشنی حاصل کی اور آپ کے مدبرانہ مشوروں پر عمل کر کے وقار وعظمت اور قومی اعتماد کا بلند مقام حاصل کیا۔

جمعیۃ علماء ہند کا یہ اجلاس آپ کی علمی ودینی وملی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے، وفات پرملال کو **موت العالم موت العالم** کی صحیح تصویر قرار دیتا ہے اور آپ کے تمام متوسلین اور پسماندگان سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔ ہم سب دست بدعا ہیں کہ اللہ تعالی آپ کو اپنی مرضیات سے نوازے اور روح پرفلاح کو جنت الفردوس میں قیام اعلی عطا فرمائے اور انبیاء وصادقین کا رفیق بنائے (آمین)

ان دونوں حضرات کے یکے بعد دیگرے چلے جانے سے یقینی طور پر ہم سب یتیمی محسوس کر رہے ہیں، لیکن رضائے مولیٰ بر ہمہ اولیٰ کو اپنے لیے صبر و سکون بناتے ہوئے ان کے حق میں دعا گو ہیں کہ

اللھم ارحمھم و اغفر لھم و عافھم و اعف عنھم و اکرم نزلھم و وسع مدخلھم و اغسلھم بالماء و الثلج و البرد و نقھم من الذنوب والخطایا کماینقی الثوب الأبیض من الدنس اللھم جاذھم بالحسنات احساناً و بالسیئات عفوا و غفراناً۔□□

تعلیم و تربیت کے مخلص نگہبان اسلاف کی پاکیزہ روایتوں کے امین

حضرت مولانا ریاست علی بجنوری

تحریر: مولانا محمد رحیم الدین انصاری (ناظم دارالعلوم حیدرآباد)

اگر ہم چند دہائی پیچھے مڑکر دیکھتے ہیں تو دوسری ہی دنیا معلوم ہوتی ہے۔ نہ ویسے لوگ رہے نہ وہ انسانی وتہذیبی اعلیٰ اقدار، نہ وہ آداب معاشرت دکھائی دیتے ہیں اور نہ ویسی قدریں۔ اساتذہ، والدین اور بزرگوں کی عزت واحترام کی اعلیٰ قدریں مٹتی جارہی ہیں، تعلیمی ڈھانچے بدلتے رہے ہیں، نظامِ معاشرت اور عروسِ تہذیب نئے نئے چولے بدل رہی ہیں۔ صداقت، عدالت، شرافت اور شجاعت کے جدید معنی کچھ اور ہیں۔ مجھ سے مفتی اشتیاق احمد قاسمی صاحب اور حضرت مولانا ریاست علی بجنوری صاحب کے صاحبزادے نے خواہش کی کہ مولانا ریاست علی بجنوری علیہ الرحمہ کے تعلق سے کچھ لکھوں، یہ کام مجھ جیسے کم سواد اور کم علم کے بس کی بات نہیں۔ یہ تو ان اہلِ قلم حضرات کا فریضہ اور ذمہ داری ہے جنھوں نے اپنے مقالات قلم بند کیے اور مضامین لکھے اور جنھیں شخصیت نگاری اور سوانح عمری سپردِ قلم کرنے پر دست گاہ حاصل ہے اور جو حقیقی معنی میں حضرت مولانا ریاست علی بجنوری علیہ الرحمہ کے علمی مرتبہ کا کما حقہٗ علم رکھتے ہوں، جن کا اشہبِ قلم قرطاسِ ابیض پر اپنی رفتار وگفتار کی جولانیاں دکھاتا ہو تو لطف مطالعہ بھی ہوگا اور طرزِ ادا اور اسلوبِ نگارش کے مزے بھی لوٹ سکیں گے۔ مجھ بے بساط سے توقع نہیں کی جاسکتی کہ میں اس سلسلے میں موضوع سے پوری طرح انصاف کرسکوں گا، جو کچھ بھی میرا قلم لکھے اس خصوص میں یہی کہوں گا کہ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔

میرا بچپن حیدرآباد کے پرانے شہر میں گذرا ہے اور میری ابتدائی تعلیم بھی پرانے شہر کے سرکاری مدارس میں ہوئی ہے؛ اس لیے میں ایسی زبان نہیں لکھ سکتا جس میں چشمِ شریں کا زیروبم ہو یا شبنم کا رقصِ نم، اس میں آپ کو نہ تتلی کا رقص ناز نظر آئے گا، نہ غزالہ کا حسن رم، نہ الفاظ میں موتی کی آب ملے گی نہ بیان میں گل کی مہک، مجھے اپنی بے بضاعتی اور ہیچ مدانی کا پوری طرح احساس ہے۔

اب جبکہ قرعۂ فال میرے نام پر ہو تو اس کا فرض چکانا ہی پڑے گا، اور مجھے اتنا تو بتانا ہی پڑے گا کہ حضرت مولانا ریاست علی بجنوری علیہ الرحمہ کون تھے، کیا تھے، کیسے تھے اور کیا کیے؟

آپ ایک سچے معلم ومدرس تھے، خود ان کی شخصیت ان کے اسلوب درس کی طرح مختلف پھولوں کے عطر کا مجموعہ، اہل دل کے دلوں کی تپش، شبوں گداز، شعروادب کے قلم کا ساز، اہل فکروعمل کا ذوقِ جستجو اور مجاہدین کی روح عمل یہ سب کچھ ان کی ذات میں اس طرح جمع ہوگیا کہ ان کی شخصیت سب سے منفرد اور سب سے ممتاز ہوگئی تھی، اس میں جامعیت بھی تھی اور اعتدال بھی، جمال بھی تھا اور کمال بھی:

مثلِ خورشید سحر فکر کی تابانی میں
شمعِ محفل کی طرح سب سے جدا سب کا رفیق

مبدأ فیاض نے ممدوح مکرم کو بیشمار کمالات وخوبیوں سے نوازا تھا، وہ جہاں ایک متبحر صاحب نظر عالم، دیدہ ور فقیہ، عظیم محدث ومفسر، صاحب طرز ادیب، بے مثال معلم ومدرس اور بلند پایہ شاعر تھے، وہیں عملی دنیا میں زہد وتقویٰ، انابت الی اللہ، تواضع وانکساری، حلم وبردباری، بے نفسی وخداترسی، رحم لی وہمدردی جیسی عظیم ملکوتی صفات ان کی ذات میں اس طرح پیوست تھی جیسے گلوں میں خوشبو، آفتاب میں روشنی، بندگانِ خدا سے الفت ومحبت، ہمدردی وکرم گستری، آں محترم کی طبیعت اور دونوں جہانوں میں ان کی کامیابی کی سرخروئی کی فکروتڑپ، بے تابی وبے قراری فطرت بن گئی تھی۔

مولانا کی شخصیت ہشت پہل ہیرا تھی انھوں نے بہت سی خصوصیات اور کمالات کو اپنے اندر جمع کرلیا تھا، حب نبویؐ میں مولانا ہمیشہ سرشار رہتے، کھانے پینے میں، لباس اور وضع قطع میں سنتوں کا خیال فرماتے، میں نے کبھی انھیں کسی کی غیبت کرتے ہوئے نہیں سنا، اور نہ اپنے سامنے کسی کی غیبت کرنے دیتے، وعدہ خلافی کا تو خیال بھی نہیں کیا جاسکتا تھا، مولانا کی شاعری پر عشق رسالت مآبؐ کی مہر لگی ہوئی تھی۔

کوئی عالم، مصنف، اہل قلم، داعی، فقیہ، محدث، قائد دینی، مصلح اجتماعی، خواہ کتنا ہی قد نکالے محض علم واطلاع کے بل بوتے پر اور صرف ذہانت وذکاوت، عقل وعبقریت، دورنگاہی وروشن خیالی کے سہارے اپنے کام میں برکت کا نور، مقبولیت کی سحرکاری وقدرافزائی اور پسندیدگی کی جاذبیت پیدا نہیں کرسکتا، اگر اس کے کام کا خمیر خون جگر، نور تقویٰ، تب وتاب اخلاص، بیتابیِ عشق رسول، سرشاریٔ محبت الٰہی، لذت سحرخیزی، ذوق عبادت اور شوق ریاضت سے نہ اٹھا ہو، یہی وہ چیز ہے جو کسی عمل کو صاحب عمل کے لیے اور خلقِ خدا کے لیے

ذریعۂ فائدہ رسانی اور باعث حیات جاودانی بنادیتی ہے۔

واقف ہوا گر لذت بیداری شب سے
اونچی ہے ثریا سے بھی یہ خاک پُراسرار

مذکورۃ الصدر صفات کی حامل وہ ذات گرامی کون ہے، جی ہاں، وہ مجسم عبادت وریاضت، زہد واستغناء اور خوفِ آخرت اور خشیت الٰہی کا پیکر، صلاح وتقوے کا ماہتاب، اسلاف کی پاکیزہ روایتوں کا امین، جادۂ عشق وفا کا بے باک پاسبان، سرمایہ تعلیم وتربیت کا مخلص نگہبان اور ہمہ گیر شخصیت حضرت مولانا ریاست علی بجنوری کی ذات گرامی تھی۔ متعدد بار راقم الحروف کو مولانا محترم کی مجلسوں میں شریک ہونے کی سعادت نصیب ہوئی ہے، راقم الحروف کی دعوت پر مولانا مرحوم دارالعلوم حیدرآباد کے جلسۂ ختم بخاری شریف وتکمیل حفظ قرآن مجید میں بھی تشریف لا چکے ہیں۔

مولانا کی نجی محفلیں ہوں یا پند ونصائح کی محفلیں جب زبانِ حق بیان کھلتی تو وہ علمی جواہر پارے بکھیرتے کہ آنکھیں خیرہ اور دل ششدر رہ جاتے، اہل شعور کہہ اٹھتے:

علومِ دین پر اللہ اکبر اتنی قدرت ہے
زباں میں کوثر وتسنیم کی شامل حلاوت ہے

جس طرح ذہانت وفراست اور تعلیم وتعلم میں مولانا کی ایک انفرادی شان تھی اسی طرح شعروشاعری میں اپنا خاص مقام رکھتے تھے؛ چنانچہ دارالعلوم دیوبند کا ترانہ اس کی اعلیٰ ترین مثال ہے، اللہ کے رسولؐ کے بارے میں منقول ہے کہ آپ کے پاس آنے والا ہر شخص یہ محسوس کرتا تھا کہ آنحضوؐر مجھ سے زیادہ محبت کرتے ہیں، یہی حال حضرت مولانا کا تھا آنے والے سے مسکرا کر ملتے تھے، اس کی تواضع فرماتے تھے، مولانا محترم کی پوری زندگی ورع وتقویٰ، عزم واستقلال اور زہد واستغناء سے عبارت تھی، دنیا اور متاع دنیا کی طرف کبھی آپ کی نگاہ نہیں اٹھی، مال ودولت، جاہ ومرتبہ کی ذرا بھی محبت آپ کے دل میں نہیں تھی۔

رفقاء اور ہم عصروں کا اکرام

انسان کی عظمت وبزرگی اور اس کے قد کی بلندی کا راز یہ ہے کہ جس طرح وہ اپنے بزرگوں کے تقدس اور ادب واحترام کے پاس ولحاظ کو سعادت اور خوش بختی تصور کرتا ہے، اسی طرح اپنے چھوٹوں پر شفقت ومحبت، رحم دلی ومہربانی کی فرحت بخش چادر ڈال کر ان کی تعمیر وترقی کے لیے ہر وقت کوشاں رہتا ہے، جناب موصوف کی تمام مجلسوں میں انسانیت کی یہ صفت نمایاں طور پر محسوس ہوتی تھی، وہ اپنے ہم جنسوں اور رفقاء سے ٹوٹ کر محبت کرتے تھے، عام آدمی کے ساتھ بھی آپ کا رویہ انتہائی کریمانہ ہوتا تھا، اس کے کیف آگیں لمحات پر اظہارِ مسرت کے ساتھ نا مساعد حالات پر دل گرفتہ اور بے قرار ہو جاتے تھے، اور بلاامتیاز تمام انسانوں کے تابناک مستقبل کے لیے ہمیشہ فکر مند اور بے تاب نظر آتے تھے۔ مہمان نوازی میں پورے دارالعلوم دیوبند میں اُن کا کوئی مثیل نہیں تھا، اُن کی مہمان نوازی کو دیکھ کر عربوں کی مہمان نوازی کی یاد تازہ ہو جاتی تھی، افراد چاہے کتنے ہی ہوں وہ تواضع میں فرق آنے نہیں دیتے، حتی کہ مقروض ہوکر بھی مہمان نوازی کا حق ادا فرماتے تھے، مہمان نوازی کی اسی اعلیٰ وصف کی وجہ شاید اللہ تعالیٰ نے انھیں خادم الحرمین الشریفین کا مہمانِ خصوصی بنا کر اپنے دربار میں بلایا اور مولانا علیہ الرحمہ حج مبرور سے بہرہ ور ہوئے۔

بہت جی لگتا تھا صحبت میں ان کی
وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے

بلند پایہ محقق و مصنف

اردو زبان وادب کے حوالے سے موصوف ان مسلم محققین کے زمرے میں شامل ہیں جن کی تحریر فصاحت وبلاغت، لطافت وجاذبیت، دلکشی ورعنائی کے لحاظ سے امتیازی شناخت رکھتی ہے، آپ کا صاف ستھرا اعلیٰ ادبی ذوق، فکر کی گہرائی، تخیل کی بلند پروازی، قلب کا سوزِ دروں وہ عطیۂ الٰہی ہے جو ہر شخص کو حاصل نہیں ہوتا، آپ نے خداداد لیاقت وصلاحیت، مطالعہ کی وسعت، علم کی گہرائی وگیرائی کے ساتھ ساتھ خیال کی ندرت وانفرادیت، جملوں کی فصاحت، الفاظ کی بلاغت، جاں نواز متنوع پیرایۂ بیان، اسلوب کی طرح داری، طرزِ ادا کی جادو بیانی، خوبصورت تشبیہات اور عمدہ استعارات سے مرقع تحریروں کے ذریعے یہ ثابت کردیا کہ تحریر وتقریر کے میدان میں زبان وقلم کے اصول وضوابط اور اس کے اسرار ورموز کے مولانا علیہ الرحمہ شناور تھے؛ چنانچہ ان کی مؤلفہ کتاب ''ایضاح البخاری'' اس کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔

حضور اکرمؐ سے صحابہ اکرامؓ نے سوال کیا کہ سب سے اچھا آدمی کون ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا: مَنْ طَالَ عُمُرُهُ وَحَسُنَ عَمَلُهُ (جس کی عمر لمبی ہو اور اعمال نیک ہو) حضرت مولانا ریاست علی بجنوری علیہ الرحمہ کو اللہ تعالیٰ نے دونوں چیزیں عطا فرمائی تھیں، مولانا کے اعمال وافعال خلوص وللّٰہیت کے آئینہ دار تھے، انھوں نے اپنی پوری زندگی ایک مردِ مومن کی طرح اور قلندرانہ طریقہ سے گزاری، نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پرواہ، نہ عہدے کی طمع نہ دولت کی خواہش اور نہ شہرت کی آرزو، انھوں نے اپنے دامن کو حرصِ دنیا سے آلودہ ہونے نہیں دیا، وہ ہمیشہ حق پسند، حق شناس، حق گو، حق نوشت اور حق

سرشت رہے؛ اس لیے وہ ہمیشہ جری اور بے باک بھی تھے، کوئی چیز ان کو حق بات کہنے سے نہیں روک سکتی تھی، وہ لومتِ لائم کی پرواہ نہیں کرتے تھے، وہ جس بات کو صحیح سمجھتے اسی کے طرف دار اور علمبردار ہوا کرتے تھے، مولانا علیہ الرحمہ کے اوصافِ حمیدہ بہت ہیں، ان کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ وہ ہمیشہ تعصب اور تنگ نظری سے بلند تھے، اعتدال اور میانہ روی ان کے مزاج اور سرشت میں داخل تھی، نہ کسی مسلک سے تعصب نہ کسی ادارے، نہ کسی تنظیم وجماعت کے لیے تنگ دلی اور نہ اس کے خلاف کینہ پروری، یہ وہ صفت ہے جو نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہے، ہمارے معاشرے میں اعتدال پسندی اور میانہ روی کی صفت تقریباً عنقا ہے، حال یہ ہے کہ جو شخص جس ادارے، جس مسلک اور جس تنظیم سے خود کو وابستہ کر لیتا ہے وہی اس کے لیے کامل حق اور صداقت کا معیار بن جاتا ہے، دوسرے ادارے یا تنظیم کی تعریف کرنے اور اس کا اعتراف کرنے کے لیے اس کا ظرف وسیع نہیں ہوتا ہے۔

صبروشکیبائی کا مظہر

مولانا علیہ الرحمہ کی ممتاز صفات میں ایک اہم صفت گردشِ لیل ونہار کے صبر آزما و حوصلہ شکن مراحل میں صبروشکیبائی اور حلم وبردباری تھی؛ چنانچہ اہلیہ محترمہ کے انتقال کے بعد راقم الحروف نے بھی ان سے ملاقات کی، مولانا مرحوم نے اس وقت بھی انتہائی صبروضبط کا مظاہرہ فرمایا، اس کے علاوہ زندگی کے اس سفر میں کیسی کیسی خاردار وادیاں آئیں، مخالفین کی جانب سے طنزوتعریض کی چٹانیں سدِراہ بنیں، ناگہانی امراض کے مختلف جانکاہ طوفان سامنے آئے؛ مگر صبرورضا کے اس مسافر کے پائے ثبات میں کسی مقام پر بھی لغزش پیدا نہیں ہوئی، اپنے مشاہدات اور تجربات کی روشنی میں یہ حقیر راقم مکمل اعتماد اور وثوق سے کہہ سکتا ہے کہ سنگین سے سنگین تر خونچکاں حالات میں جب انسان مایوسیوں کی خوفناک تاریکیوں میں ڈوب کر حواس کھو بیٹھتا ہے، موصوف ان جاں گسل لمحات میں بھی جس طرح صبروضبط اور تحمل وبردباری سے کام لیتے تھے، تقدیر پر کامل ایمان کے نتیجے میں جس طرح حوادثات سے راضی بہ رضا رہتے تھے، یہ انھیں کا حصہ تھا، عام آدمی سمجھ ہی نہیں سکتا تھا کہ آپ کی ذات کے نہاں خانے میں رنج والم کے کس قدر جگرخراش طوفان چھپے ہوئے ہیں۔ متعدد مرتبہ میں نے دیکھا کہ بار بار مخالفین کے ضرر رساں اور اذیت رساں اعمال وکردار سامنے آئے؛ مگر اس حلم وبردباری اور صبرورضا کے پیکرِ جمیل نے نہ صرف یہ کہ خموشی اختیار کر کے اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیا؛ بلکہ خلوت وجلوت کی کسی محفل میں بھی حرفِ شکوہ زبان پر آنے نہیں دیا کہ خالق کے علاوہ مخلوق کے سامنے رازہائے دلِ شکستہ کے انکشافات کو وہ کسی بھی حالت میں سودمند نہیں سمجھتے تھے اور یہی وہ وصف تھا جو آپ کو دیگر اہلِ علم وعمل سے ممتاز کرتا ہے۔

مولانا علیہ الرحمہ کا ایک اور وصف جو بہت کم کسی میں پایا جاتا ہے وہ مولانا مرحوم کا استغناء ہے، حضرت سہیل بن سعدیؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے جناب رسول کریمؐ کی خدمت مبارکہ میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ اے اللہ کے رسولؐ! مجھے کوئی ایسا عمل بتلایئے جو مجھے اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی اور لوگوں کی نظروں میں بھی محبوب بنا دے تو آپؐ نے فرمایا کہ ”ازْهَدْ فِي الدُّنْيَا يُحِبُّكَ اللّٰهُ وَازْهَدْ فِيمَا أَيْدِي النَّاسِ يُحِبُّوكَ“ (دنیا سے بے رغبتی اختیار کرو اللہ تعالیٰ تمھیں اپنا محبوب بنائے گا اور لوگوں کے مال ودولت سے نظریں پھیر لو تو لوگوں کے نزدیک بھی محبت اور قدرومنزلت کی نگاہ سے دیکھے جاؤ گے۔ ابن ماجہ:۳۰۲) واقعہ یہ ہے کہ زہد واستغناء سے متصف ہوئے بغیر لوگوں کے قلوب متوجہ ہو ہی نہیں پاتے، جہاں ذرا سی لالچ کا شبہ ہوا دینی ودنیوی منصب کی عزت داغدار ہو جاتی ہے اور جب طبیعت میں استغناء ہوتا ہے تو یہی دنیا جس کے لیے در در کی ٹھوکریں کھائی جاتی ہیں، انسان کے قدموں میں آ کر گرتی ہیں:

خدا کے نیک بندوں کو فقیری میں حکومت میں
زرہ کوئی اگر محفوظ رکھتی ہے تو استغناء

مولانا مرحوم کے انتقال کی خبر سن کر ایسا محسوس ہوا کہ شاخِ گل سے پھول ٹوٹ کر گر گیا، کوئی مرغ خوش نوا شاخ پر بیٹھا چہچہایا اور اڑ گیا، ایک مردِ صالح رخصت ہوا، انھوں نے بڑی جاں فشانی اور سرگرمی اور خلوص کے ساتھ تادمِ آخر دارالعلوم دیوبند اور اس کے طلبہ کی خدمت کی تھی، دارالعلوم دیوبند کی تاریخ نامکمل کہلائے گی جس میں حضرت مولانا ریاست علی ظفرؔ بجنوری علیہ الرحمہ کی خدمات کا تذکرہ نہ ہو، یہ ان کی خدمات ہی کا فیض ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے فضلاء نہ صرف ہندوستان بھر میں پھیلے ہوئے ہیں؛ بلکہ سارے عالم میں پھیلے ہوئے ہیں، افسوس وہ شخصیت اور پردرد آواز جو نصف صدی تک دارالعلوم دیوبند کی چہار دیواری میں بلند ہوتی رہی ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی۔

زندگانی تھی تیری مہتاب سے تابندہ تر
خوب تر تھا صبح کے تارے سے بھی تیرا سفر
مثلِ ایوانِ سحر مرقد فروزاں ہو تیرا
نور سے معمور یا خاکی شبستاں ہو تیرا

ربِ کریم تو اپنے اس محبوب بندے کو بے پایاں رحمتوں اور نوازشات سے سرفراز فرما، جنت الفردوس میں انبیاء، شہداء وصالحین کی معیت عطا فرما، اُن کے نقشِ قدم پر چلنے کی ہم لوگوں کو توفیقِ ارزانی نصیب فرما! آمین۔ □□

سُونا سُونا سا لگے ہے یہ چمن تیرے بغیر

تحریر: مولانا عبدالرزاق قاسمی امروھی (خادم: جامعہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد امروہہ)

کون تھے وہ؟ قدو قامت متوسط، جسم ہلکا پھلکا بیماروں میں گھلا ہوا، چہرہ تابناک اوراس پراٰثار معصومیت، رنگ نہایت اجلا، گھنی ڈاڑھی، جبیں کشادہ، آنکھیں بڑی جن سے بلا کی ذہانت ٹپکتی ہے، سراور ڈاڑھی کے بال سفید و نورانی، لباس اونچا کرتہ، اونچا پائجامہ اور دوپلی ٹوپی، حق گوئی وحق طرفی میں بے باک، نرمی و بربادی مانند حریر و دیباج، نفیس وپاکیزہ طنز ومزاح کے مالک، علم کا بحر زخار ہونے کے باوجود عاجزی وانکساری میں یکتا، گفتگو کریں توشبنم کی ڈھنڈک اور شہد کی مٹھاس محسوس ہو، مجلس علم وتحقیق کی ہو یا شعروسخن کی محفل سیاست کی ہو یا علم وادب کی آپ ہی میر مجلس، دانشوروں کی مجلس کے دانشور، جوہر شناس اور صلاحتوں کے قدرداں، ہر چھوٹے کی حوصلہ افزائی ان کا مشن، تنگ نظری وتنگ ظرفی سے کوسوں دور، خودنمائی وخودغرضی سے بالکل ناآشنا، اکابر کے علمی ذخیرہ کی اشاعت اور حفاظت کے بے پناہ شوقین و سچے امین، سادگی میں اسلاف کی تصویر، تلامذہ کی سادہ اور ہمدردانہ انداز میں نرالی تربیت کرنے والے، ازہر ہند دارالعلوم دیوبند کے محدث کبیر، طالبانِ علوم نبوت کے لیے بے پناہ مشفق، مہمان نوازی میں بے مثال، بڑے مہذب و پاکیزہ انسان، زیرک، سمجھدار اور حلقہ یاراں میں ابریشم کی طرح نرم۔ ان جیسے شمائل وخصائل، عادات واخلاق کو اپنے دل و دماغ کے نہاخانوں میں ترتیب دیں اور پھر جو تصویر آپ کے ذہن و دماغ میں ابھرے پھر اس پر بلاکسی تامل کے لکھ دیں: حضرت مولانا ریاست علی صاحب بجنوری نوراللہ مرقدہٗ۔

حضرت مولانا ریاست علی صاحب علیہ الرحمہ کی زندگی ازاول تاآخر درس وتدریس اور علم وتحقیق سے عبارت ہے، اگر عالم باکمال کے لقب سے آپ کو یاد کیا جائے تو بالکل بجا ہوگا، کیونکہ حقیقی متبحر عالم وہی ہے جس سے گفتگو کرتے ہوئے انسان پر اپنا جہل واضح ہو جائے اور جن لوگوں نے آپ کو قریب سے دیکھا ہے اور آپ کی مجلسوں میں بیٹھنے اور استفادہ کرنے کا جن کو موقع ملا ہے وہ جانتے ہیں کہ حضرت مولانا ریاست علی صاحب بجنوری نوراللہ مرقدہ اس کا مصداق تھے، مشکل سے مشکل مسئلہ کا حل اور اس کی روح تک پہنچ کر اس کی گرہ کشائی کا خاص ملکہ اللہ نے آپ کو عنایت فرمایا تھا۔

ابھی کل ہی کی بات محسوس ہوتی ہے کہ حضرت مرحوم کو دارالعلوم دیوبند کی دارالحدیث، موقوف علیہ اور عربی ادب کی درسگاہوں میں آتے جاتے صبح وشام دیکھا جاتا تھا، زمانہ طالب علمی سے ہی حضرت والا کی ذکاوت وذہانت اور علمی رسوخ کے چرچے علماء کے حلقوں میں سنے تھے اور جوں جوں شعور بیدار ہوا تو اپنی مختصر سی زندگی میں ان کا مشاہدہ کیا، جس نے بھی حضرت مرحوم کی وفات کی خبر سنی وہ سکتے میں آگیا اور باوجود اس یقین وایمان کے کہ موت کسی کو کبھی بھی آسکتی ہے، اس خبر پر یقین کرلینا مشکل ہو رہا تھا، لیکن یہ مقررہ وقت ہی ہے کہ جب آجاتا ہے تو قضاء وقدر کا فیصلہ نافذ ہو جاتا ہے اور ساری دنیا کی طاقت اور دولت مل کر بھی اس مقررہ وقت کو آنے سے نہیں روک سکتی۔

حضرت مولانا مرحوم نے بلاشبہ قابل رشک زندگی پائی، علم دین کی خدمت میں اپنا پورا وقت شوق وجذبہ کے ساتھ گذارا، اور یہ اتنی بڑی سعادت اور فضیلت ہے کہ الفاظ کا جامہ پہنانا ممکن ہی نہیں، علوم کتاب وسنت کے خدام میں کہیں جگہ مل جانا وہ عظمت ہے جس پر دنیا کا بڑے سے بڑا منصب اور بڑے سے بڑا اعزاز قربان کیا جاسکتا ہے، اللہ تعالیٰ نے یہ سعادت آپ کو نصیب فرمائی۔

زندگی ایک سفر ہے اور انسان عالم بقاء کی طرف رواں دواں ہے، ہر سانس عمر کو کم اور ہر قدم انسان کی منزل کو قریب کر رہا ہے۔ عقلمند مسافر اپنے کام سے فراغت کے بعد اپنے گھر کی طرف واپسی کی فکر کرتے ہیں، وہ نہ پردیس میں دل لگاتے ہیں اور نہ اپنے فرائض سے بے خبر رنگینیوں میں الجھتے ہیں، کیا ہم نے نہیں سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو ہر بات وحی الٰہی کے مطابق فرماتے تھے انہوں نے فرمایا ہے: ''میری امت کے لوگوں کی اوسط عمریں ساٹھ سے ستر برس ہوں گی'' میں نے باربار استاذ مرحوم کی زبانِ مبارک سے یہ سنا ہے کہ بیٹا ہماری عمر تو اب (۶۳ سال) پوری ہوگئی ہے، اب تو جو کچھ ہے انعام باری (لبھاؤ) ہے، ایسا لگتا ہے کہ آپ کا یہ کہنا بھی سنتِ رسول کے موافق تھا۔

حضرت مرحوم اپنے شاگردوں کی تربیت عجیب وغریب ہمدردانہ طریقہ سے فرمایا کرتے تھے، اس طالب علم اور شاگرد سے بے پناہ محبت کا اظہار فرماتے جس کے بارے میں آپ کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ علم کا شوقین ہے، تربیت کا انداز یہ ہوتا ہے کہ انسان شرمسار بھی ہوتا اور اثر بھی قبول کرتا،

احقر جب بھی امروہہ سے دیوبند حضرت کی خدمت میں جاتا تو کچھ حقیر سا ہدیہ آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی سعی کرتا اور حضرت بڑی بشاشت سے اس کو قبول بھی فرماتے تھے، اور تربیت کا انداز دیکھئے کہ ایک مرتبہ میں حضرت کی خدمت میں جارہا تھا، ہاتھ میں ایک معمولی سا ہدیہ تھا، مسجد رشید کے پاس میرے خالہ زاد بھائی: عزیزم مولوی محمد اشرف سلمہ جو مجھ سے عمر میں چھوٹے تھے اور اس وقت دارالعلوم دیوبند میں سالِ ہفتم میں زیرِ تعلیم تھے، اب حضرت کے پاس جاتے ہوئے انہوں نے میرے سے کہا کہ بھائی صاحب یہ سامان میں لے لوں؟ میں نے وہ ہدیہ کا سامان ان کے ہاتھ میں دیدیا اور اسی حالت میں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوے، جیسے ہی حضرت کی نظر پڑی تو آپ کے چہرہ پر غصہ کے آثار ظاہر ہونے لگے، اور یہ کہے بغیر آپ سے رہا نہ گیا ''عبدالرزاق تم کب سے اتنے بڑے ہوگئے''، یعنی حضرت کو یہ بات انتہائی ناگوار لگی کہ کوئی آدمی کسی کام کو خود کرسکتا ہے تو پھر دوسرے کا سہارا کیوں لیا جارہا ہے۔

حضرت کا معمول یہ تھا کہ وہ اپنا کام خود کرنا ہی پسند کرتے تھے، دوسروں سے خدمت لینے کو برا جانتے تھے، اور بدنی خدمت لینے سے تو آپ کوسوں دور تھے، بدنی خدمت لیتے ہوئے ہم نے نہ تو آپ کو کبھی دیکھا ہے اور نہیں کسی نے ہم سے بتایا، بلکہ جتنے حضرات سے بھی ہم نے سنا ہے تو یہی کہتے ہوئے سنا ہے کہ حضرت مولانا علیہ الرحمہ بدنی خدمت نہ لیتے ہیں اور نہ ہی اس کو پسند کرتے ہیں۔

اکابر کے علمی ذخیرے کی اشاعت اور حفاظت کے اس قدر شوقین کہ اب سے پانچ سال پہلے حضرت مرحوم نے احقر سے فرمایا: بیٹا عبدالرزاق میری ایک خواہش ہے کہ حضرت مولانا فتح محمد صاحب تائب لکھنوی علیہ الرحمہ کی ایک قیمتی تفسیر ''خلاصۃ التفسیر'' کے نام سے ہے جو غیر محقق ہے، اس میں تحقیق و مراجعت کی ضرورت ہے، کیوں کہ یہ تفسیر اپنی اصل کے اعتبار سے ایسے رموز ونکات اور قیمتی مضامین پر مشتمل ہے جو دوسری تفاسیر میں نظر نہیں آتے، بعض مضامین پر تو ایسی بحثیں مصنف علیہ الرحمہ نے فرمائی ہیں کہ ان کا جواب نہیں، اس لئے تم اس تفسیر پر تحقیق و تعلیق کا کام کردو، احقر اولاً تو اپنی کم علمی کی وجہ سے درخواست گذار رہا کہ میں اس کا اہل نہیں ہوں، لیکن ایک دن حضرت نے یہ فرمایا کہ: ''تم اس کام کو انشاء اللہ کرلوگے''، آپ کے اس ارشاد کے بعد معذرت پیش کرنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی، احقر نے حضرت سے ہی کتاب کا قدیم نسخہ حاصل کیا، اسی طرح حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب بستوی ؒ اُستاذ دارالعلوم دیوبند سے ایک نسخہ اور حضرت نے دلوایا اور فرمایا کہ تھوڑا سا کام کرکے دکھلاؤ، حسب الحکم تقریباً ایک سو پچاس صفحات پر تحقیق و تعلیق کا کام کرکے خدمت میں پیش کیا تو آپ نے پسندیدگی اور اطمینان کا اظہار فرمایا۔

اس کام کے حوالے پانچ سال کا یہ عرصہ تو ایسا گزرا کہ بار بار آپ سے فون پر بھی مراجعت کی سعادت ہوئی اور گاہے گاہے زیارت کے لئے بھی حاضری ہوتی، سال گذشتہ ماہِ محرم ۱۴۳۸ھ میں آپ نے فرمایا کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ اس سال شعبان سے پہلے پہلے یہ کام مکمل ہوجائے، چنانچہ آپ کی توجہ کی برکت سے جمادی الاخری ۱۴۳۸ھ میں تحقیق و تعلیق کا یہ کام مکمل ہوگیا، سارا کام لے کر حضرت کی خدمت میں حاضری ہوئی تو آپ نے اس دن مولانا فہیم الدین بجنوری اور مولانا اشتیاق احمد دربھنگوی اساتذہ دارالعلوم دیوبند کو بھی بلایا اور اس کتاب کی طباعت کے متعلق ضروری مشورہ کیا، مشورہ میں یہ بھی طے پایا کہ اس کتاب کی ایک تفصیلی فہرست بھی بنادی جائے تو استفادہ زیادہ آسان ہوگا، چنانچہ احقر نے فہرست سازی کا کام شروع کردیا، تقریباً ۱۶ر پاروں کی تفصیلی فہرست تیار ہوچکی تھی کہ حضرت والا اپنے ربِ حقیقی سے جاملے، آج جب حضرت اس دارِ فانی سے رُخصت ہوکر دارِ خلد جاچکے ہیں تو ہمارا فرض بنتا ہے کہ آپ کے مشن کو پورا کریں اور آپ کو اپنی زندگی کے لئے مشعلہ راہ بنائیں۔

اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

اِنَّ اَصۡحَابَ الۡجَنَّةِ الۡيَوۡمَ فِیۡ شُغُلٍ فَاكِهُوۡنَ، هُمۡ وَاَزۡوَاجُهُمۡ فِیۡ ظِلَالٍ عَلَى الۡاَرَآئِكِ مُتَّكِـُٔوۡنَ، لَهُمۡ فِيۡهَا فَاكِهَةٌ وَّلَهُمۡ مَّا يَدَّعُوۡنَ، سَلٰمٌ قَوۡلًا مِّنۡ رَّبٍّ رَّحِيۡمٍ (یٰسین آیت ۵۵ تا ۵۸)

ترجمہ: اہل جنت بے شک اس دن اپنے مشغلوں میں خوش دل ہوں گے، وہ اور ان کی بیویاں سایوں میں مسہریوں پر تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے، ان کے لئے وہاں ہر طرح کے میوے ہوں گے، اور جو کچھ مانگیں گے ان کو ملے گا، ان کو پروردگار کی طرف سے سلام فرمایا جاوے گا۔

خداتعالیٰ کی مذکورہ نعمتوں کے وہی حقدار ہوں گے، جو دنیا میں اپنی خواہشوں کو رب ذوالجلال کے تابع کردیں گے، اور ہر زمانہ میں اللہ رب العزت کے ایسے خاص بندے رہتے ہیں جو باری تعالیٰ کی ان نعمتوں کے مستحق وحقدار بن ہی جاتے ہیں، کیوں کہ انہوں نے اپنی دنیا کی زندگی اس طرح گزاری ہوتی ہے کہ اللہ رب العالمین ان کی طرف نظرِ عنایت فرماہی دیتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کے کچھ بندے تو ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی رحلت سے ایک ویرانگی چھا جاتی ہے، استاذ الاساتذہ حضرت مولانا ریاست علی صاحب بجنوری علیہ الرحمہ ایسی ہی نابغہ روزگار شخصیت تھے، اللہ آپ کی بال بال مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے آمین یارب العالمین۔ ◻◻

حضرت مولانا ریاست علی ظفرؔ بجنوریؒ کی شاعری اور نعت گوئی

تحریر: کیپٹن مولانامحمد رحمت اللہ مہرالقاسمی ایم.اے (ناظم شیخ الاسلام اکیڈمی دارالعلوم پوکرن راجستھان)

شاعری کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی کہ اقوام عالم کی زبان وادب کی تاریخ، پھر زبان وادب نے جس قدر ترقی کی، صنف شاعری بھی اسی قدر اپنے منازل طے کرتی رہی۔ شاعری کی پہچان حدیثِ دل اور نغمہ حسن وعشق ہی سے نہیں بلکہ اس میں زندگی کے گہرے تجربے، احساس اور حیات وکائنات کے شعور کی کارفرمائی کو بھی بہت بڑا دخل ہے۔ اس میں نری رومانیت و انفعالیت ہی نہیں وہ زندگی کے حقائق، ذہنی اور سماجی تبدیلیوں کی ترجمان بھی ہے۔ ہر زبان وہر زمانے کی شاعری بڑی پہلودار اور تہ دار رہی ہے، اس میں بیک وقت دل ودماغ دونوں کو آسودہ کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ پھر جتنی عظیم شاعری ہوگی، اتنی ہی پائیدار بھی ہوگی، شاید یہی وجہ ہے کہ: ''عظیم شاعری کو صحف سماوی کی طرح لازوال کہا گیا ہے''۔ حضرت مولانا ظفرؔ بجنوریؒ کے بقول: ''علماء نے شعر وشاعری کو موسیقی اور نقاشی کی طرح فنون لطیفہ میں شمار کیا ہے۔''

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات مبارکہ میں شعرا کے کلام کو سننے کے لیے فرمائش بھی کی اور پسند بھی فرمایا اور بعض دفعہ اظہارِ پسندیدگی کے ساتھ انعام واکرام سے بھی شعرا نوازے گئے۔ آپ کی زبان مبارک پر بعض شعراء کا کلام بھی جاری ہوا اور آپ نے ان کی بیان کردہ حقیقت و واقعیت کو اظہار مسرت کے شرف سے نوازا۔

استاذِ گرامی قدر حضرت مولانا ریاست علی صاحب ظفرؔ بجنوریؒ کی شاعری اور صنف نعت گوئی کے ذکر سے پہلے اس حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ حضرت مولانا ظفرؔ کی اصل شخصیت بہت بڑے عالمِ دین کے ساتھ بہت بڑی اسلامی درسگاہ کے بہت بڑے مدرس اور منتظم کی بھی تھی اور اس وصف عظمیٰ کے ساتھ ساتھ وہ مفکر، مدبر، مصنف، ادیب اور بہت بڑے شاعر بھی تھے۔ 'نغمۂ سحر' کے نام سے مولانا ظفرؔ بجنوریؒ کا شعری مجموعہ چھپ چکا ہے، یہ الگ بات ہے کہ اپنے اسلاف کی روایات کو اپناتے ہوئے شعر وسخن کو انہوں نے مستقل مشغلہ کے طور پر کبھی اختیار نہیں فرمایا۔

مولانا ظفرؔ بجنوریؒ کی شاعری میں بلا کی گہرائی و گیرائی کے ساتھ اسلوب وانداز بیاں میں وہ تاثیر ودل کشی پائی جاتی ہے جو بہت سے نامی جدید شعراء کے یہاں مفقود ہے۔ ان کا لب ولہجہ ایسا شیریں، دلآویز اور پر ترنم ہے کہ قاری شعری سلاست و روانی میں بہتا چلا جاتا ہے۔ بلاشبہ ان کی شاعری جدید وقدیم کا حسنِ امتزاج ہے۔ دو قطعات ملاحظہ ہو:

نمودِ زندگی کی ابتدا کر   حوادث کو شریکِ التجا کر
تجھے جہدِ مسلسل کی قسم ہے   ہر اک ذرہ کو تابانی عطا کر

……………

کیا وقت ہے یہ بھی زندگی کا   ماتم ہے خودی وبے خودی کا
غرقاب ہیں لفظ کے سفینے   طوفان اٹھا ہے خامشی کا

ظفرؔ کی شاعری کا اصل میدانِ عمل غزل ہے، انہوں نے حمد، نعت، قصیدے، مرثیے اور اردو شاعری کی تقریباً ہر اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی، مگر کہیں بھی رنگِ تغزل پھیکا نہیں پڑا ہے، بقول مولانا لقمان الحق فاروقیؒ: ''ظفرؔ بجنوریؒ کے مذاق شعر وسخن کی سب سے بڑی خوبی تغزل ہے۔ انہوں نے غزل کے علاوہ مدحیہ اشعار بھی کہے ہیں اور مرثیے بھی لکھے ہیں نعت بھی کہا ہے اور عصر حاضر کے دیگر عنوانات کو بھی لیا ہے مگر تغزل کا دامن جوان کے مذاقِ سخن کی روح ہے کہیں بھی ان کے ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پایا ہے۔''

مولانا ظفرؔ کی غزلوں میں حافظؔ، جامیؔ، اقبالؔ اور اصغرؔ کی غزلوں کا رنگ پایا جاتا ہے۔ اقبالؔ اور اصغرؔ کے تو ذہنی ہی نہیں انشائی طور پر بھی وہ بہت قریب تھے۔ بعض غزلوں کو ان دونوں اور خاص کر اصغرؔ کے رنگ میں کہنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ مولانا ظفرؔ کے یہاں بلند تخیل اور فکر عمیق کی پرواز کو جس چیز نے دوچند کر دیا ہے وہ ہے تغزل میں تاثر پزیری کے ہنر کے ساتھ تمثیلات، تشبیہات، استعارات اور تعبیرات کا بڑی خوبصورتی اور بلیغ اندازِ بیاں میں استعمال۔ رمز وایما اردو شاعری کا خاصہ ہے مگر اس صنعت کا استعمال متقدمین میں غالبؔ، مومنؔ، اقبالؔ، فیضؔ، جوشؔ، فراقؔ، اصغرؔ اور جگرؔ کے یہاں جس خوبی سے ہوا ہے اس کی مثال اور جگہ کم ملتی ہے، اس سلسلہ میں مولانا ظفرؔ کی شاعری میں انہیں شعرا واساتذۂ وقت کا پرتو نظر آتا ہے:

دل مطلعِ وحدت کے سوا کچھ بھی نہیں ہے
اس جام میں حیرت کے سوا کچھ بھی نہیں ہے
تابانئ گل، نشۂ مُل، نالۂ بلبل
فیضانِ محبت کے سوا کچھ بھی نہیں ہے
اس طرح سے دل حرف وحکایات میں گم ہے
دل حرف وحکایت کے سوا کچھ بھی نہیں ہے

پُر پیچ ہیں الفاظ رضا اور قضا کے
دیدار کی لذّت کے سوا کچھ بھی نہیں ہے
اس طرح ظفرؔ حاضرِ دربارِ کرم ہے
دامن میں ندامت کے سوا کچھ بھی نہیں ہے

’ترانۂ دارالعلوم‘ میں لطف زبان اور حسن بیان سے جونکھار پیدا ہوا ہے اور ترانہ کی تخلیق میں معنوی وفکری خوبیوں، فنکارانہ بصیرت، رمزیت، اثرانگیزی اور فصاحت وبلاغت کے ساتھ ساتھ حقیقت وواقعیت کے جوجوہر چمک اٹھے ہیں اس نے مولانا ظفرؔ کو اساطین سخن کی صف میں کھڑا کردیا ہے:

یہ علم وہنر کا گہوارا، تاریخ کا وہ شہ پارہ ہے
ہر پھول یہاں اک شعلہ ہے، ہر سرو یہاں مینارہ ہے
خودساقیِ کوثر نے رکھی میخانے کی بنیاد یہاں
تاریخ مرتب کرتی ہے دیوانوں کی روداد یہاں
جو وادیِ فاراں سے اٹھی گونجی ہے وہی تکبیر یہاں
ہستی کے صنم خانوں کے لیے ہوتا ہے حرم تعمیر یہاں
برسا ہے یہاں وہ ابرِ کرم، اٹھا تھا جو سوئے یثرب سے
اس وادی کا سارا دامن سیراب ہے جوئے یثرب سے
کہسار یہاں دب جاتے ہیں،طوفان یہاں رُک جاتے ہیں
اس کاخِ فقیری کے آگے شاہوں کے محل جھک جاتے ہیں
اس وادیِ گل کا ہرغنچہ خورشیدِ جہاں کہلایا ہے
جو رند یہاں سے اٹھا ہے، وہ پیر مغاں کہلایا ہے
یہ مجلسِ مے وہ مجلس ہے خود فطرت جس کی قاسمؔ ہے
اس بزم کا ساقی کیا کہئے جوصبحِ ازل سے قائم ہے
یہ ایک صنم خانہ ہے جہاں محمودؔ بہت تیار ہوئے
اس خاک کے ذرّے ذرّے سے کس درجہ شرر بیدار ہوئے
ہے عزم حسینؔ احمد سے بپا ہنگامۂ دار وگیر یہاں
شاخوں کی لچک بنجاتی ہے باطل کے لیے شمشیر یہاں

مولانا ظفرؔ بجنوریؒ کی جہاں تک نعت گوئی کا تعلق ہے وہ اس صنف میں بھی منفرد مقام رکھتے ہے۔ جس میں شعری محاسن کے ساتھ نفسِ مضمون کی تمام تر خوبیاں جمع ہوگئی ہیں۔صنف شاعری میں نعتیہ کلام ادب اسلامی کے طور پر اپنے مقام ومرتبہ کے اعتبار سے بہت ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔نعت گوئی کا آغاز طلوع آفتاب نبوت سے ہوااورسرزمین عرب وعربی زبان اس کے آغاز وارتقا کی اولیں آماجگا ہے۔ بلاشبہ عربی زبان اپنی وسعت، آفاقیت، تعبیرات اورتشبیہات کی فراوانی، احساسات اور جذبات کی ترجمانی کی حیرت انگیز صلاحیت رکھتی ہے،عربی ادب وفنِ شاعری اورنعتیہ کلام اس کی زندہ مثال ہے۔

علامہ سہیلی کی روایت کے مطابق بچپن میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کے دادا عبدالمطلب کعبۂ مشرفہ کے اندر لے گئے اورآپ کی شان عظمت کے ذکر کے ساتھ اس طرح دعائیہ اشعار کہے:

الحمد لله الذي اعطاني	هذاالغلام الطيب الاردانِ
قدساد في المهدعلى الغلمان	اعيذه بالبيت ذى الاركانِ
حتى يكون بلغة الفتيانِ	حتى اراه بالغ البيان
اعيذه من كل ذى شنان	من حاسد مضطرب العنانِ

ان اشعار میں آپ کے دادا فرماتے ہیں: ’’تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے جس نے مجھے تمام محاسن سے متصف لڑکا عطا فرمایا، ایسا سعادت مند بچہ جس نے گود ہی میں دوسرے بچوں پر سرداری ثابت کردی۔اسے میں بیت ذی ارکان کے رب کی پناہ میں دیتا ہوں، دعا ہے کہ وہ جوانوں کا مقصود بنے، یہاں تک کے میں اسے فصیح اللسان دیکھ لوں نیز یہ بھی دعا ہے کہ ہر دشمن اور بے مقصد حاسد سے اللہ اس کی حفاظت فرمائے۔‘‘

مؤرخین نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ’’اگر یہ روایت صحیح ہے تو سب سے پہلے نعت گوئی کا شرف عبدالمطلب کو حاصل ہوا اور سب سے پہلے نعت کا زمزمہ خانہ کعبہ سے بلند ہوا‘‘

پھر حضرت شیمار، ورقہ بن نوفل، جناب ابوطالب، حضرت حسان بن ثابتؓ، حضرت فاروق اعظمؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت حمزہؓ، حضرت سودہ بن قارب، حضرت عبداللہ بن رواحہؓ اور حضرت کعب بن ظہیرؓ نے آپ کی شان میں جونعتیہ اشعار کہے وہ زمانۂ رسالت مآب،عرب،عربی ادب اورنعت گوئی کا اولیں تابناک تاریخی باب ہے۔

وقت کے ساتھ ساتھ جب اسلام عرب سے نکل کر دنیا کے دیگر ممالک میں پھیلا تو اسلام کے ساتھ ساتھ صنف نعت کا دائرہ بھی وسیع تر ہوتا گیا اور پھر عربی زبان کی تخصیص نہیں رہی اقوام عالم کی ہرزبان زمزمۂ نعت گوئی سے جگ مگا اُٹھی۔عربی کے ساتھ قریبی لسانی تعلق کی بنیاد پر فارسی وار دوز بانوں کو شاید سب سے زیادہ نعت گوئی کا شرف حاصل رہا۔اس میں علمائے کرام اورعوامی مسلم شعراء کے علاوہ نامی غیر مسلم شعراء نے بھی اردو وہندی میں نعت گوئی کا شرف حاصل کیا۔

مولانا ظفرؔ صنف نعت گوئی میں اپنے اسلاف کے نقش قدم پر گامزن نظر آتے ہیں۔اکابروعلماء دیوبند کا خاصہ ذات رسالت مآبؐ کے ساتھ غایت تعلق وعشق ومحبت رہا ہے ان کی نثرنظم سوزوگداز سے بھرپور اور حب

رسولؐ کی آئینہ دار ہوتی ہے۔خصوصاً ان حضرات کا شعری ذوق اس کی مکمل نمائندگی ونشان دہی کرتا ہے،بقول حضرت مولانا مفتی کفیل احمد صاحب نشاطؔ:

''اکابر دیوبند کی نمایاں خصوصیات میں ایک ممتاز خصوصیت رسول اللہؐ کی ذات گرامی سے والہانہ شیفتگی جس کا اظہاران کی نظم ونثر میں بکثرت ہوا ہے اور عملی زندگی بھی اس شیفتگی کے اعلیٰ مظاہر سے بھر پور ہے۔''

سیدالطائفہ حضرت حاجی امداداللہ صاحب مہاجر مکیؒ کی شیفتگی اور سرشاری سے بھر پور عارفانہ وعاشقانہ نعت گوئی اس کی مظہر جمیل ہے۔ آپ اپنے والہانہ عشق ومحبت کے مخصوص لب ولہجہ میں غرق ہوکر فرماتے ہیں:

ہوجائے مرا شوق ہی رہبر کسی صورت
جو نقش قدم جا پڑوں در پر کسی صورت
ہے بلبلِ دِل شائق گلروئے پیمبرؐ
بے دیکھے نہ ٹھہرے گا یہ مضطر کسی صورت
دیں ساقی کوثر جو مجھے بادۂ الفت
چھوٹے نہ لبوں سے مرے ساغر کسی صورت
ہوجائیں کہیں سرسبز مرا نخلِ تمنا
آجائے نظر گنبدا خضر کسی صورت
یہ مغز پریشاں میں مشک ختن کا
کھل جائے جو وہ زلف معنبر کسی صورت

اسی طرح نبی اکرم، ذات حبیب کبریا سے سرخیل علماء دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ نے عشق ومحبت میں ڈوبی جاں نثاری وجاں سپاری کے ساتھ نثر ونظم میں جو عقیدت کے موتی بکھیرے ہیں وہ حرز جاں بنانے کے لائق ہیں۔شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی نوراللہ مرقدہٗ ''الشہاب الثاقب''میں فرماتے ہیں کہ:

''حضرت نانوتویؒ کو کس قدر عقیدت ومحبت ذات پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے اور کس قدر تعظیم ان کے قلب انور میں بھری ہوئی ہے اس کا نمونہ حضرت کے عشق ومحبت میں ڈوبے ہوئے یہ اشعار ہیں:

امیدیں لاکھوں ہیں لیکن بڑی امید یہ ہے
کہ ہو سگانِ مدینہ میں میرا شمار
جیوں تو ساتھ سگانِ حرم کے تیرے پھروں
مروں تو کھائیں مدینہ کے مجھ کو مور ومار
اڑا کے باد مری مشتِ خاک کو پسِ مرگ
کرے حضورؐ کے روضہ کے آس پاس نثار
ولے یہ رتبہ کہاں مشتِ خاکِ قاسم کا
کہ جائے کوچۂ اطہر میں تیرے، بن کے غبار

عارف باللہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ اردو، فارسی وعربی ہرسہ زبانوں میں اشعار کہا کرتے تھے بیاض یعقوبی میں اس کی تفصیل دیکھی جاسکتی ہے۔نعتیہ کلام میں قصیدہ میمیہ عشق رسالت مآبؐ کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے،جس میں دوسو پینتالیس اشعار نظم ہوئے ہیں چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

جہاں میں جو کوئی اعلیٰ ہو اس سے تم اعلیٰ
مقام جو ہو بلند اس سے تم بلند مقام
وہ کیا ہی آنکھیں تھیں جن کو تھا دیدار
ہماری آنکھوں پہ حائل ہیں پردہائے خیام
تمہارے حق میں زمیں مسجد وطہور ہوئی
ہوا ہے رعب سے مفتوح روم سے تا شام
اطاعت آپ کی بالکل اطاعت حق ہے
ومن یطع میں کسی نوع کا نہیں ابہام
ہجوم فتنہ سے ہے تنگ نوبت اسلام
خدا کے واسطے اٹھئے بہت ہوا یہ منام
دھیان کیجئے کتنا زمانہ گذرا ہے
ذلیل ہوتے ہیں جو کوئی دین کے ہیں کرام
کوئی نہیں کہ بنے کوئی دستگیر آکر
خدا کے واسطے آکر کے لیجئے دین کو تھام
خدا نے کی تھی جو کچھ سعی آپ کی مشکور
رہا ہے اس میں سے باقی نہ اب کہیں جز نام
نہیں ہے نام کو ایمان کا وجد کہیں
جو رہ گئی ہے وہ باقی ہے صورت اسلام

ایک عربی نعت سے دو نعتیہ اشعار ملاحظہ ہو:

یَارَبِّ صَلِّ عَلیٰ النَّبِیِّ محمد
یٰسٓینُ وَ طٰہٰ ذِی الْمکارم اَحمدَ
اَنتَ الکریم رؤفنا ورَحِیْمُنَا
یاسیدی یاسیدی یاسیدی

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ فرماتے ہیں:

نورخورشید چمکتا ہے ہراک ذرہ میں
چشم بینا ہو تو ہر شی میں ہے جلوہ تیرا

مضمون کی تنگ دامنی تفصیل کی متحمل نہیں،تاہم اس کا اظہار ضروری

ہے کہ حضرت مولانا سید انور شاہ کشمیریؒ، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ، حضرت مولانا سید بدر عالم مہاجر مدنیؒ، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ، فقیہ الامت حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہیؒ، حضرت مولانا اسعد اللہ صاحبؒ، حضرت مولانا ظفر احمد تھانویؒ، حضرت مولانا قاری صدیق احمد ثاقبؒ، حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ، حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ، حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ اور خواجہ عزیز الحسن مجذوبؒ، وغیرھم یہ وہ سب حضرات ہیں جن کے نعتیہ کلام میں عشق رسول اور یاد مصطفیٰ سے لب ریز حب رسولؐ کی مثالیں دیکھی جا سکتی ہیں، جسے حضرت مولانا ظفر بجنوریؒ نے اپنے نعتیہ کلام میں جدید و قدیم کے حسنِ امتزاج کے ساتھ اپنا کر وہ اسی سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی ثابت ہوئے۔

حضرت مولانا ظفر بجنوری کے نعتیہ کلام میں چاہے اس کا تعلق موضوعی ہو یا انفعالی، حب نبویؐ و عشق رسولؐ اور سوز دروں کی ایک خاص کیفیت اور منفرد اسلوب بیاں پایا جاتا ہے۔ آقائے مدنی سے والہانہ محبت، جذبہ صادق، روحانی تعلق آپ کی نعتوں کی خصوصیات ہیں۔ مدح و نعت میں روح پرور منظر کشی دلوں کو سرشار کر دینے اور احساسات و جذبات پر بے خودی طاری کر دینے والی کیفیات نعت گوئی کا خاصہ ہے، اور یہ سب محاسن مولانا ظفر کی نعتوں میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ مولانا ظفر نعت گوئی میں عشق نبویؐ میں بیتاب نظر آتے ہیں، ان کا جذب دروں، حب صادق کی کیفیت اور شوق آرزو کی زبان عشق و محبت کی ترجمان نظر آتی ہے:

تیرگی کیا ہے؟ نظر کے ٹھوکریں کھانے کا نام
زندگی ہے آپ کے احساں فرمانے کا نام
صبح صادق آپ کے نورِ جبیں سے مستنیر
رات ٹھہرا کاکلِ مشکیں کو لہرانے کا نام
ساقیِ رحمت، شرابِ عشق، مینائے یقیں
کعبۂ اقدس ہے اک آبادمے خانے کا نام
آپ کی چشم کرم کا فیض ہے صہبائے عشق
مصلحت کو رکھ دیا ہے جام و پیمانے کا نام

اپنی فنائیت، آپؐ کی عنایتوں، رحمتوں، آپ کے در سے ملنے والی رفعتوں اور عظمتوں کا ذکر کس والہانہ و عاشقانہ انداز میں کرتے ہیں ملاحظہ ہو:

فنا ہوا تو ملی منزلِ سلام مجھے
کمالِ بادہ کشی ہے شکستِ جام مجھے
عنایتوں کا یہ عالم کہ زندگی ہمہ کیف
اب اور جو بھی ملے رحمتِ تمام مجھے
نمودِ صبح سعادت، نجوم در آغوش
ملا ہے مہرِ رسالت سے یہ پیام مجھے
چلا ہوں سوئے حرم اور کہکشاں بر دوش
فریب زیست نے رکھا تھا زیرِ دام مجھے
ہوا بہ نطقِ محمد کلامِ حق کا نزول
کمالِ نطقِ بشر ہے ترا کلام مجھے
بحد نعت گرامی یہی کہے گا بشر
ملا ہے آپ کے در سے مرا مقام مجھے
ہر اک بہار نے آ کر تری شہادت دی
چمن چمن سے ملا ہے ترا پیام مجھے
ظفر نہ پوچھ قیامت ہے وہ نظر جس نے
سکھا دیا ہے تمنّا کا احترام مجھے

حضرت مولانا ظفر زائرین حرم کو راہ حرم کی کیفیتوں اور اس راہ کی رفعتوں، وجدان شوق اور قدم قدم پر فیضِ دربار نبوت کی کرم فرمائیوں اور وہاں کی برکتوں کی یاد دلاتے ہوئے کس طرح بار بار مبارک باد دیتے ہیں:

مبارک ہو جبیں کو نسبتِ درگاہِ یزدانی
مبارک ہو کرم کی ابتدا بے انتہا تجھ کو
مبارک ہو شکستِ حلقۂ زنجیر امکانی
مبارک ہو چمن زارِ تجلّی کی ہوا تجھ کو
قدم راہِ محبت پر، نظر حسنِ عنایت پر
مبارک ہو کرم کا اک مرتب سلسلہ تجھ کو
مبارک ہو شریکِ زمرۂ اہلِ وفا ہونا
مبارک ہو جنوں کی آخری منزل عطا ہونا

اسی نعت میں مسافر حرم کی معرفت اپنی عرض و معروض اور سرگذشت غم کے بیان کرنے کا انداز دیکھئے:

مسافر عرض کر دینا کہ آخر ہم کہاں جائیں
ہمارا بابِ زنداں ہے نہ ایوانِ گلستاں ہے
مسافران سے کہنا کس کو جا کر زخم دکھلائیں
یہاں پر تیر اندازی مداوائے دل و جاں ہے
سیہ کاروں کی جانب قصدِ رحمت کی ضرورت ہے
کہ اس امت کو پھر چشمِ عنایت کی ضرورت ہے
مسافران کو ساری سرگذشتِ غم سنا دینا
اگر کچھ اور پوچھیں چیر کر سینہ دکھا دینا

□ □

ایک مرد دانا کی رحلت

تحریر: مفتی اشتیاق احمد قاسمی (استاذ حدیث جامعہ نور العلوم، بہرائچ)

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دیوانہ مر گیا آخر تو ویرانے پہ کیا گذری

مدارس اسلامیہ کی چہل پہل اپنی سالانہ میعاد پر پہنچ کر ختم چکی تھی، قال اللہ وقال الرسول کی صدائیں ایک محدود وقت کے لیے ٹھہر چکی تھیں، طالبان علوم کے قافلے اپنا سالانہ سفر پورا کر کے مدارس سے اپنے وطن مالوف اور اپنی منزل کی جانب روانہ ہو چکے تھے، خیر و برکت والے مہینہ کی آمد آمد تھی، ایسے میں ام المدارس ازہر الہند دارالعلوم دیوبند کا ایک قابلِ فخر سپوت، مایہ ناز فرزند، جلیل القدر محدث، صاحبِ طرز ادیب عالم فانی سے منھ موڑ کر اس عالم جاودانی کی طرف روانہ ہو گیا جہاں سے کسی کی واپسی ممکن نہیں۔

۲۳ شعبان ۱۴۳۸ھ کی صبح یہ اندوہناک خبر بڑی حسرت ویاس کے ساتھ سنی گئی کہ دارالعلوم دیوبند کے مایہ ناز استاذ اور بے نظیر ترانہ دارالعلوم دیوبند کے تخلیق کار حضرت مولانا ریاست علی بجنوری اپنے ربِ حقیقی سے جا ملے (انا للہ وانا الیہ راجعون) اس خبر نے علمی دنیا کو اور بالخصوص قاسمی برادری کو سخت افسردہ اور سوگوار کیا، موصوف ایک بلند پایہ عالم، صاحب طرز ادیب، فکرار جمند اور ذہن اخّاذ کے مالک انسان تھے، خالق کائنات کی طرف سے ان کو قلب سلیم اور دل دردمند سے وافر حصہ عطا کیا گیا تھا، وہ نہایت صائب الرائے، انتہائی منکسر المزاج، ہر دلعزیز اور باوقار شخصیت کے مالک تھے، زندگی کا بیشتر حصہ دارالعلوم اور دیوبند کی علمی وروحانی فضاؤں میں گذرا تھا، جو آدم گری اور مردم سازی کا روئے زمین پر ایک نایاب کارخانہ ہے، جہاں سے علم وفن کے ہیرے وموتی ماہرِ فنِ رجالِ کار، دعوت وارشاد اور تزکیۂ قلوب کے شیوخ اور مزکی پیدا ہوئے اور جس سرزمین کو عالم اسلام کی نابغۂ روزگار شخصیتوں اور عبقری ذوات قدسیہ کی قدم بوسی کا شرف حاصل رہا ایسے علم پرور شخصیت ساز اور کثافتوں سے پاک اور پاکیزہ ماحول میں جب ایک مبدأ فیاض کی بارگاہ سے عقل ودانش کا وافر حصہ وصول کرنے والے کی علمی پرداخت ہوگی تو ظاہر ہے کہ وہ علم وعمل کی کن بلندیوں پر فائز ہوگا اور اس کا ستارۂ اقبال کتنا بلند ہوگا؟ اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ دارالعلوم دیوبند ہی میں آپ کی پوری تعلیم ہوئی ۱۳۷۸ھ میں آپ کو دارالعلوم دیوبند سے امتیازی نمبرات سے کامیابی ملی اس کے بعد اپنے استاذ فخر المحدثین حضرت مولانا فخر الدینؒ صاحب کے درس بخاری میں بالالتزام دوبارہ شرکت فرما کر درس کو تحریراً ضبط کیا، جب کہ پہلے سال میں بھی استاذ محترم کے مکمل درس بخاری کو ضبط فرما چکے تھے، پھر بعد میں تہذیب وتبویب اور تحقیق وتفصیل کر کے ایضاح البخاری کے نام سے اس کی اشاعت شروع کی، جو اپنے بسط وجامعیت کے سبب بہت سی شروح بخاری پر بھاری ہے؛ بلکہ بعض اہل علم کی زبان میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عالمی شہرت یافتہ کتاب فتح الباری شرح بخاری کو اردو قالب میں ڈھال دیا گیا ہو اور اس میں علماء دیوبند کے افادات کا اضافہ کر دیا گیا ہو، الحمدللہ اس کی دس جلدیں منظر عام پر آ کر علماء اور اہل علم کے طبقہ میں کافی مقبولیت وداد وتحسین حاصل کر چکی ہیں اور جس کی اشاعت کا سلسلہ جاری ہے، اللہ اپنے فضل سے اس کی تکمیل کی راہ آسان فرمائے (آمین)

۱۹۷۲ء میں آپ کا دارالعلوم دیوبند میں عربی مدرس کی حیثیت سے تقرر ہوا، اپنی خداداد صلاحیت، انداز تدریس وتفہیم اور فہم وفراست سے اساتذۂ دارالعلوم میں ایک امتیازی شان پیدا کی، پھر جب ۱۴۰۲ھ میں دارالعلوم میں انقلاب آیا اور دارالعلوم ایک سخت آزمائش کے دور سے گذرا تو منصبِ تعلیمات کی عظیم ذمہ داری سپرد کی گئی، آپ نے اپنی زیرکی وعقل مندی سے نظامِ تعلیم کو فعال اور نہایت مضبوط ومستحکم کیا، امتحانات کے نظام کو نئے انداز سے درست کیا جس کے نتیجے میں تعلیمی وتربیتی ہر اعتبار سے دارالعلوم کو مرکزیت کا مقام حاصل ہوا اور ایک بار پھر اس کی علمی بہاریں لوٹ آئیں اور دارالعلوم نے قدیم طریقہ پر اپنی کوکھ سے آفتاب و ماہتاب کے روشن ستارے نکالنا شروع کر دیا۔

دارالعلوم اپنے آزمائش کے دور میں مختلف حالات سے نبرد آزما رہا؛ لیکن ان تمام میں یہ مرد آہن، میدان میں ڈٹا رہا اور دارالعلوم اور اس کے کاز کو ادنی نقصان پہنچانا گوارا نہ کیا، دارالعلوم پر کوئی نازک حالت پیش آتی یا دارالعلوم کی طرف سے کوئی محفل سجائی جاتی تو دارالعلوم کی ترجمانی کے لیے اور اس کے موقف کو رکھنے کے لیے جس موقر ذات کا انتخاب ہوتا وہ بالعموم حضرت مولانا کی ذات ہوتی، جو دارالعلوم کی اقدار وروایات کی پاسداری کرتے ہوئے، اس کی نزاکتوں کا لحاظ کرتے ہوئے ایسی متوازن گفتگو فرماتے جو دارالعلوم کی ترجمانی کے ساتھ زبان وادب کا شاہکار ہوتی اور ہر ایک سامع

سر دھننے پر مجبور ہو جاتا۔

ویسے مولانا کا اصل میدان درس وتدریس کا تھا اور وہ اس میدان کے بڑے شناور اور سرخیل لوگوں میں سے تھے، تقریر وخطابت کے لیے اسفار کم ہوتے تھے جب کسی کا زبردست اصرار ہوتا اسی وقت سفر فرماتے تھے؛ لیکن جہاں جاتے وہاں وہ اپنی علیحدہ شناخت چھوڑ کر آتے، دارالعلوم کی طرف سے منصب تعلیمات کی سپردگی کے ابتدائی دور میں آپ کا سرائے میر اعظم گڈھ کے قدیم ومعروف ادارہ بیت العلوم کے اجلاس میں شرکت کے لیے جانا ہوا، وہاں آپ کا ردّ مودودیت پر ایک فاضلانہ اور محققانہ خطاب ہوا، اجلاس میں معروف عالم دین اور خطیب شہیر مولانا ضمیر احمد صاحبؒ جلال پوری بھی موجود تھے، جو خود ایک بڑے خطیب تھے، مولانا کی تقریر سے کافی متاثر ہوئے اور لوگوں کے سامنے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ جب میں نے دارالعلوم کی طرف سے یہ فیصلہ سنا کہ مولانا ریاست علی صاحب بجنوری کو نظامت تعلیمات کا منصب سپرد کیا گیا ہے، تو اس فیصلہ پر بڑا تعجب ہوا کہ یہ دارالعلوم کا بڑا عظیم منصب ہے، اس پر تو بڑے فائق لوگ فائز ہوتے رہے ہیں، یہ منصب ان کو کیسے دے دیا گیا؛ لیکن آج ان کے بیان وخطاب سے شرحِ صدر ہو گیا کہ ''حق بہ حقدار رسید'' کے وہ مصداق ہیں، مدارس کی چہار دیواری میں علمی شغل وانہماک رکھنے والوں کے ساتھ بالعموم یہ صورت پیش آتی ہے کہ خلق خدا ان کے علمی مرتبہ وتفوق سے نابلد ہوتی ہے۔

مولانا کو تمام عربی علوم وفنون پر کامل دسترس کے ساتھ اردو ادب کا بڑا پاکیزہ ذوق ملا تھا، وہ ایک اچھے ادیب ہونے کے ساتھ بلند پایہ شاعر بھی تھے، شعر وشاعری کو انھوں نے اپنا پیشہ نہیں بنایا تھا؛ لیکن طبیعت کی موزونیت اور عشقِ رسول کی آگ جب سینہ میں شعلہ زن ہوتی تو وہ نظم کا قالب اختیار کر لیتی جو بے پناہ معنویت اور عشق وجذب کی کیفیت لیے ہوتی، اس سلسلہ میں آپ کے کلام کا ایک مجموعہ 'نغمۂ سحر' کے نام کے ساتھ شائع ہو چکا ہے، جو فنِ شاعری اور علم وادب کا بہترین مرقع ہے اور بالخصوص چند ترانے، ترانۂ دارالعلوم، ترانۂ جمعیۃ، ترانۂ معہد البنات اپنے صنف ونوع میں طاق وبے نظیر ہیں، خاص طور پر ترانۂ دارالعلوم جس کی نظیر بظاہر ممکن نہیں، جس کے ایک ایک لفظ میں اور ایک ایک سطر میں تاریخ کے تابندہ نقوش اور تاریخ کے حسین شہ پاروں کو موتی کی لڑی میں پرویا گیا ہے، جس میں تخیل کی رفعت، لفظوں کی شوکت، تشبیہ کی ندرت، بیان کی لطافت، زبان کی شستگی، بندش کی چستی، اشعار کے سانچوں میں ڈھل کر آ گئی ہیں، بڑے سے بڑا ماہر فن اس کو دیکھ کر اور سن کر یہ کہنے پر مجبور ہوتا ہے کہ اس سے بہتر ممکن نہیں، یہ دارالعلوم اور اس کے عظیم ترین اکابرین کے عشق میں ڈوب کر کہے گئے اشعار ہیں جس میں دارالعلوم کے مؤسسین واکابرین کی شوکت وعظمت اور ان کے شاندار کارناموں کی روشن تاریخ کی بہترین نقاب کشائی کی گئی ہے۔

اکرامِ ضیف:

مولانا اپنی کریم النفسی کے سبب ہر خورد وکلاں کی بڑی پذیرائی فرماتے، اس کی ہر مشکل وپریشانی دور کرنے کی کوشش کرتے، اس کو ٹھیک مشورہ دیتے۔ ان کا اپنا ایک طریقۂ عمل تھا کہ اصول شکنی سے تو گریز کیا جائے لیکن اصول پر قائم رہتے ہوئے جو توسیع ممکن ہو اس سے گریز نہ کیا جائے اور وہ اس سبب سے تھا کہ ان کے اندر انسانیت کا درد تھا، وہ دوسروں کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھتے تھے، وہ نرم ونازک زبان کے مالک تھے، شدت اور کرختگی کو ان کے خمیر میں جگہ نہیں ملی تھی، وہ بڑی سے بڑی کوتاہی وکمی کو ہلکے پھلکے زجر وتوبیخ پر اکتفا کر لیتے یا اغماض فرما لیتے، ان کی شرافت اور تواضع کے سبب اجنبی سے اجنبی انسان کے لیے ان سے ملاقات آسان تھی، اگر چہ اس سے ان کے علمی کاموں بالخصوص 'ایضاح البخاری' کی ترتیب میں بڑا خلل ہوتا، بعض احباب نے ملاقات کے لیے ایک نظام الاوقات بنانے کی رائے بھی دی، لیکن حضرت کو یہ گوارا نہ ہوا کہ کوئی ملاقاتی زحمت برداشت کر کے آئے اور اسے واپس کر دیا جائے، چنانچہ وہ تادمِ زیست اس پر گامزن رہے۔

چائے کا خصوصی ذوق:

عرب کے شیوخ میں قہوہ کا خصوصی نفیس ذوق ومزاج ہے، اسی طرح علمائے ہند میں چائے کا بڑا نفیس ذوق ومزاج رہا ہے۔ مولانا ابوالکلامؒ کی 'غبارِ خاطر' نامی کتاب چائے کے تذکرے سے لبریز ہے۔ مولانا منظور نعمانیؒ کے یہاں پاکستان کا ایک مؤقر وفد حاضر ہوا، مولانا نے حسبِ معمول ان کی خاطر مدارات کی، جناب کوثر نیازی صاحب نے چائے کا کش لیتے ہوئے فرمایا: مولویوں کی چائے بڑی نفیس ہوتی ہے۔ مولانا نعمانی نے پر مزاح انداز میں فرمایا: مولوی اس کے علاوہ کچھ پیتا بھی تو نہیں ہے۔ مولانا کو چائے کا بڑا نفیس ذوق ملا تھا۔ لپٹن گرین لیبل چائے دَم کی پسند تھی، جو مفکرِ اسلام مولانا علی میاںؒ اور دیگر ادباء کی زبان میں دماغ کو متحرک کرنے والی چائے ہے۔ مولانا اس کا خصوصی اہتمام فرماتے تھے۔ عصر کے بعد اساتذۂ دارالعلوم، طلبہ اور نو واردین کی ایک بڑی تعداد موجود ہوتی اور بلا کسی تفریق سب کی اس سے ضیافت کی جاتی۔ دارالعلوم کے بعض بڑے نفیس اور باذوق اساتذہ سے سنا کہ مولانا کے یہاں کی چائے بڑی لذیذ اور نفیس ہوتی ہے۔ میرے یہاں وہ ممکن

نہیں ہوتی ۔ پھر بعد کے زمانہ میں اس کی جگہ جیبیمین نے لے لی تھی اور تادم آخروار دین وصادرین کا ہجوم اور ضیافت کا یہ سلسلہ قائم رہا۔

غمگساری وہمدردی:

مولانا کے سینہ میں سب کے لیے ایک دردمند دل تھا، جو ہر رنجور اور غمزدہ کی کسک اپنے اندر محسوس کرتا تھا، اسی لیے مختلف حالات کے شکار لوگ اپنے درد و کرب کو سنانے کے لیے ان کے پاس حاضر ہوتے ۔ مولانا اپنے ایک عزیز کی طرح ان کے غم بانٹتے، تسلی کا سامان کرتے، سفارش وغیرہ کی ضرورت ہوتی تو اس میں بھی بخل نہ فرماتے ۔ دست تعاون دراز کرتے اگرچہ ایک وقت حالات اس کی اجازت نہیں دیتے تھے، پھر بھی اپنی سخاوت اور کشادہ دستی پر بند لگانا ان کے لیے ممکن نہ تھا۔

تواضع وانکساری:

مولانا گوناگوں صفات کے حامل انسان تھے، لیکن ان میں تواضع و انکساری کی صفت بڑی نمایاں تھی، مولانا اپنی اہلیت و صلاحیت کی بنا پر بڑی بڑی کتابیں اور بڑے بڑے مناصب حاصل کر سکتے تھے لیکن ہمیشہ اپنی طبعی تواضع ومنکسرالمزاجی کی وجہ سے معذرت ہی کر دیتے تھے۔ کبھی بھی اپنے لیے کوئی امتیاز پسند نہیں کرتے تھے اور یہ چیز ان کی ہر ہر چیز میں نمایاں تھی، رہن سہن، نشست برخاست، سفر حضر، لباس سب میں۔

ایک مرتبہ جامعہ رحمانیہ ٹانڈہ بادلی رامپور کے قیام کے زمانہ میں تکمیلِ مشکوٰۃ شریف کی دعوت دینے کے لیے دارالعلوم حاضر ہوا۔ مولانا سے درخواست کی کہ ذمہ دارانِ مدرسہ کی خواہش ہے کہ جامعہ میں تکمیلِ مشکوٰۃ شریف کرادیں ۔ میں بار بار درخواست اور گزارش کرتا رہا لیکن ہر بار یہی کہتے رہے کہ بیٹے مجھ سے یہ بات نہیں بنتی اس کے لیے ایک خاص قسم کا انسان ہونا ضروری ہے جس کا کرتا اتنا لمبا ہو، سر پر عمامہ ہو۔ بہت اصرار پر فرمایا کہ حضرت مولانا نعمت اللہ صاحب مدظلہٗ استاذ دارالعلوم سے ختم کرانے کی بات کرلو۔ میں بھی ساتھ میں آجاؤں گا اور کسی قسم کے تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔ چنانچہ حسب وعدہ ہر دو حضرات نے بس سے سفر فرمایا اور اپنے روحانی فیوض و برکات سے لوگوں کو مستفید فرمایا۔

ایک مرتبہ دیارِ پورب اعظم گڑھ وغیرہ کے سفر میں بندہ بھی ساتھ تھا۔ دیوبند رات میں واپسی ہوئی ۔ ایک رکشہ والا ملا، اس نے معمول سے کچھ زائد پیسہ مانگا۔ مولانا کا طریقہ تھا کہ وہ کسی سے مول تول کیے بغیر سواری کرلیا کرتے تھے۔ میری زبان سے نکلا کہ یہ کچھ زائد مانگ رہا ہے۔ آگے رکشہ مناسب پیسہ پر مل جائے گا، لیکن اللہ کو آزمائش مقدر تھی، اتفاق کہ رکشہ والا ملا ہی نہیں، نتیجتاً پیدل دارالعلوم افریقی منزل تک سفر کرنا پڑا۔ قدم قدم پر حسرت و افسوس دامن گیر رہا لیکن مولانا کی پیشانی پر قطعاً کوئی شکن نہیں آئی ۔ مولانا اپنے چھوٹوں کو ان کی رایوں پر چھوڑ کر ان کو اپنی رایوں سے سبق لینے کے بھی قائل تھے تاکہ ان کو سرد وگرم حالات سے تجربہ حاصل ہو۔ یہ بھی ایک سبق دینے کا بہترین ہنر ہے۔

جادۂ حق پر استقامت:

مدارس میں انجمنوں کے ذریعہ طلبہ کو تقریر وتحریر سکھلانے کا ایک نہایت مستحکم نظام ہے جس کے ذریعہ ان کی خوابیدہ صلاحیتوں کو اُجاگر کیا جاتا ہے۔ دارالعلوم میں بھی ضلعی وصوبائی انجمنوں کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ طلبہ اس کے ذریعہ اپنی تقریروں وتحریروں کو جلا بخشنے کے ساتھ سماج ومعاشرہ میں پھیلنے والی بیماریوں پر نکیر کے لیے مکالمہ وغیرہ بھی پیش کرتے رہتے ہیں تاکہ اس سے برائیوں پر نکیر کرنے کا ایک جاذب قلوب اسلوب وطریقہ حاصل ہو۔

دارالعلوم کے زمانۂ طالب علمی میں ایک وقت طلبہ میں نماز کے سلام پھیرنے کے بعد مسجد سے جانے کا رواج زیادہ ہوگیا تھا، انجمن مدنی دارالمطالعہ کے ذمہ داروں کی رائے ہوئی کہ سالانہ اجلاس کے موقع پر ایک مکالمہ نماز کے بعد دعا پر پیش کیا جائے۔ حضرت مولانا بھی اجلاس میں مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے تشریف فرما تھے۔ حسب ترتیب پروگرام ہوا اور مکالمہ بھی پیش کیا گیا۔ پروگرام میں اس وقت کے طالب علم اور موجودہ وقت میں بڑے بڑے مناصب کے حامل لوگ بھی شریک تھے۔ پروگرام پیش ہوگیا، طلبہ نے بڑے ذوق وشوق سے سنا اور مکالمہ بہت پسند کیا گیا۔ طلبہ کے پروگرام کے بعد حضرت مولانا کو دعوتِ خطاب دی گئی۔ مولانا کو یہ بات بڑی ناگوار گزری تھی کہ نماز جیسی عبادت کے سلسلہ کی کسی چیز کی مکالمہ یا ڈرامہ کے ذریعہ ترغیب دی جائے ۔ یہ نماز کے ساتھ تخفیف کا معاملہ ہے۔ مولانا نے اپنے عام اندازِ گفتگو سے ہٹ کر پرجلال لہجہ میں زجر وتوبیخ کی جس سے پروگرام کے ذمہ داروں کے ہوش اُڑ گئے۔ برادر مکرم مولانا معزالدین صاحب (ناظم امارت شرعیہ ہند) کو ذمہ داروں نے باصرار اظہارِ معذرت کے لیے آمادہ کیا اور انھوں نے نم دیدہ انداز میں اظہارِ معذرت کی ۔ یہ مولانا کے جادۂ حق پر غایت استقامت کے سبب تھا، جس سے وہ کسی طرح صلح کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ اللہ تعالیٰ اپنے کرم ورحمتوں کی بارش ان پر فرمائے۔

آسماں ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

□□

بلند پایہ محدث حضرت الاستاذ شیخ ریاست علی بجنوریؒ

تحریر: مولانا خورشید عالم داؤد قاسمی

دارالعلوم، دیوبند کے عظیم المرتبت استاذ حدیث، حضرت الاستاذ مولانا ریاست علی ظفر بجنوری رحمہ اللہ انتہائی موقر ومحترم شخصیت، بلند پایہ محدث اور اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ اللہ تعالی کا بلاوا آیا اور حضرت الاستاذ اس دار فانی سے دار جاودانی کے لیے کوچ کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ انسان کر بھی کیا سکتا ہے، جب اللہ بلائیں؛ تو جانا ہی ہوگا۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ کچھ لوگوں کی وفات کا اثر ایک محدود دائرے تک ہی رہتا اور چند دنوں کے بعد، آدمی صبر کر کے خاموش ہوجاتا ہے؛ جب کہ کچھ لوگوں کی شخصیت ہمہ جہت ہونے کی وجہ سے، ان کی وفات کا اثر دور دور تک پہنچتا ہے، ان کی یاد آتی رہتی اور ان کے انمٹ نقوش ہمیشہ کے لیے باقی رہتے ہیں۔ حضرت الاستاذ کی شخصیت بھی انھیں معدودے چند عظیم المرتبت لوگوں میں سے تھی؛ اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ شیخ بجنوری رحمہ اللہ کی وفات صرف ان کے اہل وعیال اور خاندان والوں کے لیے ہی حادثۂ فاجعہ نہیں؛ بل کہ پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ان کے ہزاروں شاگردوں کے لیے بھی عظیم علمی خسارہ کا باعث ہے۔ اللہ تعالی حضرت کی مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں جگہ عنایت فرمائے! آمین!

کڑے سفر کا تھکا مسافر، تھکا ہے ایسا کہ سوگیا ہے
خود اپنی آنکھیں تو بند کرلیں، ہر آنکھ لیکن بھگو گیا ہے

حضرت الاستاذ کا وطن اصلی موضع حبیب والا، ضلع بجنور، یوپی تھا۔ آپ ۹/مارچ ۱۹۴۰ء کو علی گڑھ کے محلّہ حکیم سرائے میں پیدا ہوئے، جہاں آپ کے والد ماجد جناب منشی فراست علی صاحبؒ بسلسلہ درس وتدریس، مع اہل وعیال مقیم تھے۔

حضرت الاستاذ نے ابتدا سے پرائمری درجہ چہارم تک کی تعلیم، اپنے وطن میں حاصل کی۔ سن ۱۹۵۱ء میں پرائمری کے درجہ چہارم کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد اپنے پھوپھا حضرت مولانا سلطان الحق ذاکر فاروقی صاحب رحمہ اللہ (متوفی: ۱۴۰۷ھ)، سابق ناظم: کتب خانہ دار العلوم، دیوبند، کے ساتھ دیوبند تشریف لائے اور ۱۹۵۱ء میں، دارالعلوم، دیوبند میں داخلہ لیا۔ آپ نے ۱۹۵۸ء میں دار العلوم، دیوبند سے فضیلت کے امتحان میں امتیازی نمبرات کے ساتھ کام یاب ہوئے۔

دار العلوم، دیوبند میں قیام کے دوران آپ نے فخر المحدثین حضرت مولانا سید فخر الدین احمد مرادآبادی (۱۳۰۷-۱۳۹۲ھ)، جامع المعقول والمنقول حضرت علامہ محمد ابراہیم صاحب بلیاوی (۱۸۸۶-۱۹۶۷ء)، حضرت مولانا بشیر احمد خان صاحب بلند شہری (وفات: ۱۹۶۶ء)، حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب قاسمی (۱۸۹۷-۱۹۸۳ء)، سابق رئیس دارالعلوم، دیوبند، ماہر معقول ومنقول، استاذ الاساتذہ حضرت علامہ محمد حسین بہاری (۱۹۰۵-۱۹۹۲ء)، حضرت مولانا جلیل احمد کیرانوی اور حضرت مولانا ظہور احمد دیوبندی رحمہم اللہ تعالیٰ جیسے اساطین علوم وفنون سے استفادہ کیا۔ فراغت کے بعد ۱۳/سال تک اپنے محترم استاذ شیخ سید فخر الدین احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کی زیر نگرانی رہ کر علمی استفادہ کرتے رہے۔ اسی دوران علی گڑھ سے ادیب کامل کا امتحان، اول پوزیشن سے پاس کیا اور سرسید میڈل سے نوازے گئے۔

استاذ محترم شیخ بجنوری کی تعلیم وتربیت میں جہاں آپ کی رات دن کی محنت، جہد مسلسل اور آپ کے اساتذہ کرام کی رہنمائی نے اہم رول ادا کیا؛ وہیں آپ کے پھوپھا حضرت مولانا سلطان الحق فاروقی رحمہ اللہ کی تربیت کا بھی بہت بڑا دخل تھا۔ آپ اپنے پھوپھا محترم کی تربیت کو سراہتے ہوئے ایضاح البخاری کا انتساب کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ”پھوپھا جان حضرت مولانا سلطان الحق ذاکر فاروقی رحمہ اللہ (المتوفی: ۱۴۰۷ھ) سابق ناظم کتب خانہ دار العلوم، دیوبند، اس دنیائے آب ورنگ میں، راقم کے لیے حقیقی مسبّب الاسباب کے بعد، سب سے بڑے مربی تھے۔ اس سلسلے میں انھیں جن جانکاہیوں کا سامنا کرنا پڑا، انھیں خدا وند قدوس بہتر جانتے ہیں۔ اس موقع پر اپنی اس متاع حقیر کو انھیں کے نام سے منسوب کرتا ہوں۔“ (ایضاح البخاری ۱/۳)

حضرت الاستاذ کا تقرر، دار العلوم، دیوبند میں، استاذ کی حیثیت سے سن ۱۹۷۲ء میں ہوا۔ آپ نے ۴۵/سال تک دار العلوم، دیوبند میں مخلصانہ خدمات انجام دی۔ آپ دار العلوم میں تدریسی ذمے داری کے ساتھ ساتھ مختلف مواقع سے چند دوسری اہم انتظامی ذمے داریاں بھی بحسن وخوبی انجام دیتے رہے۔ آپ ۱۹۸۲ء سے ۱۹۸۴ء تک ماہ نامہ ’دار العلوم‘ (اردو) کی ادارت کی ذمے داری انجام دی اور ماہ نامہ کے مدیر محترم

رہے۔۱۹۸۵ء میں آپ شعبہ تعلیمات کے ناظم کی حیثیت سے منتخب کیے گئے اور آپ نے اس مفوضہ ذمے داری کو بڑے حسن اسلوبی کے ساتھ نبھایا۔۱۹۸۸ء میں مجلس شوری نے آپ کو دارالعلوم دیوبند کے شعبہ تحقیق وتالیف اور صحافت شیخ الہند اکیڈمی کا نگراں منتخب کیا۔ آپ کی نگرانی میں، شیخ الہند اکیڈمی سے متعدد معیاری اور علمی کتابیں شائع ہوئیں۔تقرری کے وقت سے تادم واپسیں، ۴۵؍سال دارالعلوم میں رہے؛ بلکہ دارالعلوم کے ہی ہوکر رہ گئے اور مختلف ذمے داریوں کے ساتھ ساتھ، علم وفن کی اکثر کتابوں کا درس دیا۔ابھی حال میں، مشہور محدث اُبوعیسی محمد بن عیسی بن سَورۃ بن موسی بن الضحاک (متوفی:۲۷۹ھ) کی کتاب: سنن الترمذی، جلد: اول اور البلاغۃ الواضحۃ کے اسباق آپ سے متعلق تھے۔اللہ تعالی آپ کی خدمات جلیلہ کو قبول فرمائے!

اٹھائے کچھ ورق لالے نے، کچھ نرگس نے، کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی داستاں میری

حضرت الاستاذ کوئی کثیر التصانیف مصنف نہیں تھے؛ مگر جو بھی تصنیف آپ کے قلم سے نکلی، اس کی زبان بڑی سلیس، صاف ستھری اور دلکش ہے۔ آپ کی مشہور تصنیف 'شوریٰ کی شرعی حیثیت' ہے، جو اپنے موضوع پر انوکھی اور اکلوتی کتاب ہے۔اصول فقہ کے موضوع پر استاذ محترم حضرت مولانا نعمت اللہ اعظمی کے ساتھ، آپ نے مشترکہ طور پر 'تسہیل الاصول' نامی رسالہ لکھا جو دارالعلوم، دیوبند کے درجہ عربی چہارم میں داخل درس ہے۔اسی طرح آپ نے 'مقدمہ تفہیم القرآن کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ' لکھا جو شائع شدہ ہے۔آپ کو حدیث شریف سے بھی مثالی تعلق تھا؛ چناں چہ جہاں برسوں حدیث شریف کی تدریسی خدمات انجام دی، وہیں اپنے مشفق ومربی استاذ شیخ فخر الدین صاحب رحمہ اللہ کی تقریرِ بخاری بھی 'ایضاح البخاری' کے نام سے ترتیب دیا، جو ترتیب، زبان وبیان اور علمی مواد کی وجہ سے بخاری شریف کی اعلا درجے کی شرح ہے۔

استاذ محترم نے فضیلت کے سال میں شیخ الحدیث حضرت مولانا سید فخرالدین احمد کی بخاری شریف کے درسی افادات قلم بند کیے تھے۔فراغت کے اگلے سال (۱۳۷۸ھ/ ۱۹۵۹ء) دارالعلوم میں رہ کر، حضرت شیخ کے درسی افادات کو دوبارہ بہ اہتمام ضبط کیا۔سال کے خاتمہ پر اپنے بڑوں، بزرگوں اور دوستوں کے مشورے سے، ان درسی افادات کو ترتیب دے کر شائع کرنے کا ارادہ کیا؛ چناں چہ دونوں سال کے افادات کو سامنے رکھ کر، تمام متداول شروح حدیث سے مراجعت کر کے ایک محققانہ شرح تیار کی اور بہ نام ''ایضاح البخاری'' شائع کر کے، جہاں اپنے مشفق استاذ کی درسی تقریر کو محفوظ کیا؛ وہیں اساتذہ وطلبۂ حدیث کی خدمت میں، ایک اہم قیمتی سوغات بھی پیش کی۔ایضاح البخاری کی اب تک ۱۰؍جلدیں شائع ہوچکی ہیں۔اللہ تعالی حضرت الاستاذ کے اس کارعظیم کا اپنے شایانِ شان بدلہ نصیب فرمائے!

حضرت الاستاذ بلند پایہ محدث ومنتظم ہونے کے ساتھ ساتھ اردو زبان وادب کے کہنہ مشق ادیب اور صاحب دیوان شاعر بھی تھے۔ نثرنگاری ہو یا نظم نگاری، آپ لکھتے تو ادبی شہہ پارے بکھیرتے جاتے۔ شعروسخن میں آپ مفسر قرآن، مملکت شعروسخن کے خاموش تاج دار حضرت مولانا محمد عثمان کاشف الہاشمی رحمہ اللہ کے شاگردوں میں تھے۔آپ شاعری کی ہر صنف پر دسترس رکھتے تھے۔آپ نے بہت کم شعری کلام کہے؛ مگر جو کچھ بھی کہا، اسے ارباب علم وادب نے سراہا اور دادِ تحسین سے نوازا۔آپ نے دارالعلوم، دیوبند کے صد سالہ اجلاس (۱۹۸۰ء/۱۴۰۰ھ) کی مناسبت سے ترانۂ دارالعلوم، دیوبند لکھا۔اس ترانے کو جو شہرت ملی، وہ شاید ہی کسی اور ترانہ کو ملی ہوگی۔آپ کا مجموعۂ کلام 'نغمۂ سحر' کے نام سے کئی سالوں پہلے چھپا اور علماء وادباء نے اس کی بڑی پذیرائی کی۔

لطف گویائی میں تیری ہمسری ممکن نہیں
ہو تخیّل کا نہ جب تک فکر کامل ہم نشیں

شیخ بجنوری نے ۴۵؍سال تک، دارالعلوم، دیوبند میں اپنی تدریسی خدمات پیش کر کے، ہزاروں آرزومندوں وتشنگان علوم دینیہ کو سیراب کیا۔ احاطۂ دارالعلوم میں، طلبہ کے لیے شیخ بجنوری کی محبت والفت دیدنی تھی۔آپ سے کوئی طالب علم ملنے جاتا؛ تو آپ خوش طبعی اور کشادہ دلی سے ملتے۔طلبہ کے لیے شیخ کی شخصیت ایک باپ نما شفیق وکریم استاذ ومربی اور ناصح وواعظ کی تھی۔آپ کی زبان بڑی میٹھی اور پیاری تھی۔آپ طلبہ کو ہمیشہ 'بیٹے' کے لفظ سے مخاطب کرتے تھے۔آپ جب لفظ 'بیٹے' کا تلفظ کرتے تھے؛ تو یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ آپ کا دل پیار ومحبت سے معمور ہے۔ ہاں، یاد آیا کہ کلاس میں، کسی طالب علم کے نام کے ساتھ 'بھائی' بھی لگادیا کرتے تھے؛ مگر یہ لفظ ان کے معمول کا نہیں تھا؛ بل کہ مزاح فرمانے کے لیے کبھی کبھار ایسا کرتے تھے۔

سن۲۰۰۳ء میں، راقم الحروف کو حضرت والا سے معروف محدث ابن ماجہ ابوعبداللہ محمد بن یزید القزوینی رحمہ اللہ (متوفی:۲۷۳ھ) کی حدیث کی کتاب 'سنن ابن ماجہ' پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی؛ پھر ۲۰۰۴ء میں،

تکمیل ادب میں ’البلاغۃ الواضحۃ‘ پڑھنے کا شرف حاصل رہا۔ آپ تکمیل ادب کی درس گاہ میں آتے؛ تو طالب علم عبارت پڑھتا۔ پھر آپ سبق کی تشریح کرتے۔ البلاغۃ الواضحۃ میں، ہر سبق کے اختتام پر تمرین میں، طلبہ چاہتے کہ تمرین اردو زبان میں بہ عجلت کر کے سبق سے چھٹکارا حاصل کیا جائے؛ مگر حضرت کہتے کہ بیٹے ایسا نہیں، تمرین تو آپ کو عربی میں ہی کرنی ہوگی۔ اب آپ عربی زبان وادب کے طالب علم ہیں۔ بہر حال، طلبہ کو تمرین عربی میں ہی کرنی ہوتی تھی اور دوران تمرین اگر کوئی غلطی ہوتی؛ تو آپ اصلاح فرماتے۔ طلبہ کی غلطیوں پر آپ ناراض نہیں ہوتے؛ بل کہ ان غلطیوں کی اصلاح خندہ پیشانی کے ساتھ کرتے۔ دوران درس کبھی آپ کے چہرے سے ناگواری کے آثار نمایاں نہیں ہوتے۔ دوران درس آپ کا لب ولہجہ پیار ومحبت سے لبریز ہوتا اور آپ کو ہمیشہ یہ خیال رہتا کہ:

وصل کے اسباب پیدا ہوں تری تحریر سے

دیکھ! کوئی دل نہ دکھ جائے تری تقریر سے

حضرت الاستاذ اپنی عمر عزیز کی تقریبا ۷۷ر بہاریں دیکھ چکے تھے۔ ان دنوں آپ پر پیرانہ سالی کے آثار نمایاں تھے۔ آپ کی طبیعت بھی ادھر کچھ مہینوں سے ناساز تھی۔ چند مہینے قبل سوشل میڈیا پر یہ خبر نشر ہوئی تھی کہ آپ شدید بیمار ہیں۔ مگر اُس وقت اللہ تعالی نے آپ کو روبصحت کیا۔ آپ کا وقت موعود آ چکا تھا؛ چناں چہ اپنے ہزاروں شاگردوں، قدردانوں اور اہل خانہ سے منھ موڑ کر اور ان کو روتا بلکتا چھوڑ کر، بغیر کسی پیشگی اطلاع کے ۲۰ر مئی ۲۰۱۷ء کا سورج نکلنے سے پہلے غروب ہو گئے۔ آپ کی نماز جنازہ اُسی دن، بعد نماز ظہر، تقریباً ساڑھے تین بجے حضرت الاستاذ مولانا قاری سیّد محمد عثمان صاحب منصور پوری، استاذ حدیث دارالعلوم، دیوبند نے احاطۂ مولسری میں پڑھائی اور ہزاروں لوگوں نے آپ کو دیوبند کے قبرستان قاسمی میں سپرد خاک کر دیا۔ یقین ہے کہ آپ کے شاگرد، قدردان اور اولاد واحفاد آپ کے حق میں دعا اور ایصال ثواب کر کے، آپ کے رفع درجات کا ذریعہ بنیں گے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالی حضرت الاستاذ کی مغفرت فرما کر، جنت الفردوس میں جگہ عنایت فرمائے اور پس ماندگان کو صبر جمیل! آمین!

اے جہاں آباد! اے گہوارۂ علم وہنر

ہیں سراپا نالہ خاموش تیرے بام ودر

ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

تحریر: مفتی رفیع الدین حنیف قاسمی (وادی مصطفیٰ، شاہین نگر، حیدرآباد)

اس دنیا جہاں میں جو کوئی بھی آتا ہے، اس کا یہاں سے جانا بالکل طے ہے؛ لیکن بعض ایسے لوگ اس جہانی فانی سے کوچ کر جاتے ہیں، جو اپنے پیچھے اپنی یادیں اور اپنے انمٹ نقوش و کردار چھوڑ جاتے ہیں، جن کے چلے جانے سے اس جہانِ ہستی میں ایک خلا نظر آتا ہے، جو اپنے کارناموں، اپنے اخلاق و کردار سے صدیوں یاد کیے جاتے ہیں، جو تاریخ کے صفحات پر اپنے گہرے نقوش چھوڑ جاتے ہیں، وہ تو اس دنیا فانی سے کوچ کر جاتے ہیں، لیکن ان کا کام نام ان کے کارناموں اور ان کی عظیم ملی و دینی خدمات کی وجہ سے باقی و برقرار رہ جاتا ہے، انہیں ہمہ جہت اور ہمہ سمت شخصیات میں حضرت الاستاذ مولانا ریاست علی بجنوری رحمہ اللہ کی شخصیت گرامی ہے، حضرت الاستاذ نہ صرف عالم، محدث، بلکہ جمعیۃ علماء ہند کے اسٹیج سے ملت کے قائد بھی تھے، عربی زبان وادب کے شناور، اردو کے بہترین کہنہ مشق ادیب وصاحب دیوان شاعر، کئی ایک کتابوں کے مصنف، ماہنامہ دارالعلوم کے مدیر، دارالعلوم دیوبند کے ہر دلعزیز اور مشفق ومہربان استاذ، آپ کے درس وتدریس کا دل آویز اور پر مغز اور پراثر انداز طلباء کے دلوں کو چھو جاتا، دوران درس طلباء کو ترغیبی انداز میں 'بیٹے' سے خطاب کر کے درس اور سبق کے مزے کو دوبالا کر دیتے، طلباء کے ساتھ نہایت مشفقانہ لب ولہجہ استعمال فرماتے، احقر کو بھی ہفتم میں مقدمہ شیخ عبدالحق اور مشکاۃ کا ابتدائی حصہ اور دورہ حدیث میں ابن ماجہ اور تکمیل ادب عرب میں 'البلاغۃ الواضحۃ' پڑھنے کا حضرت سے شرف حاصل ہوا، طلباء کو اس قدر نرم وگداز لب ولہجہ میں خطاب فرماتے اور اس قدر ہر طالب کی طرف توجہ کامل ہوتی اور اس طرح مسکرا کر مخاطب ہوتے گویا آپ کے لبوں سے موتیے وموں نگے جھڑ رہے ہوں، طلباء ہمہ تن گوش اور پورے انہماک سے آپ کے درس کو سنتے، دارالعلوم دیوبند کے چالیس سالہ دورانیہ درس وتدریس میں نہ جانے کتنے شاگرد چھوڑے ہوں، جو آپ کے روحانی شاگردوں کی شکل میں ساری دنیا میں پھیلے ہوئے، آپ کی رحلت پر اشکبار اور غمناک ہیں۔

بارِ دنیا میں رہو غم زدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

دوران طالب علمی میں جب تکمیل ادب میں تھا تو انجمن النادی الادبی کے ایک عربی پرچے کی ذمہ داری مجھ سے متعلق تھی، اس وقت یہ واقعہ پیش آیا کہ مسجد چھتہ میں موجود انار کے درخت کو کسی نے کاٹ کر مسجد کے حمام میں اس کو گھسا دیا، تحقیق حال اور اس درخت کی تاریخ اور حقیقت سے واقفیت کے لیے میں اور میرے رفیق درس محفوظ کٹکی حضرت والا کے یہاں پہنچے کہ اگر اس کی کوئی حقیقت ہوگی تو اس کو موضوع بنا کر اس پر کوئی مضمون لکھا جائے، تو حضرت نے بتایا: ''بیٹے! یہ درخت وہی درخت ہے جہاں سے دارالعلوم کی شروعات ہوئی تھی، حقیقت سے نہیں کہا جا سکتا، جس طرح اب اس کی یہ درگت بنائی گئی شاید اس سے پہلے بھی ایسا ہو چکا ہو' یعنی یہ درخت وہی درخت ہے اس کو بالیقین نہیں کہا جاتا، ہوسکتا ہے یہ درخت بعد میں لگایا گیا ہو۔ حضرت کا یہ فرمانا تھا کہ بڑے پر جوش ہو کر درخت کی حقیقت اور اس کی تاریخ سے متعلق مضمون لکھنے کے ارادہ سے جو چلے سارا جوش کافور ہو گیا۔

۹/مارچ ۱۹۴۰ء کو علی گڈھ میں پیدا ہوئے، آپ کا آبائی وطن موضع حبیب والا ضلع بجنور ہے، ابتدائی تعلیم مکمل کر کے اپنے پھوپھا مولانا سلطان الحق بجنوری (ناظم کتب خانہ دارالعلوم دیوبند) کے ہمراہ ۱۹۵۱ء میں دارالعلوم دیوبند آئے اور داخلہ لیا، ۱۹۵۸ء میں دورہ حدیث سے فراغت حاصل کی۔

فراغت کے بعد حضرت مولانا فخرالدین مرادآبادی صدرالمدرسین دارالعلوم دیوبند کے دامن علم سے وابستہ ہو کر برسوں استفادہ کرتے رہے اور اپنے استاذ محترم کے درس بخاری کی تقریروں کو مرتب کر کے 'ایضاح البخاری' کے نام سے شائع کیا۔

۱۳۹۱ھ/۱۹۷۲ء میں دارالعلوم دیوبند میں مدرس مقرر ہوئے، کچھ برسوں تک تدریس کے ساتھ ساتھ ماہنامہ دارالعلوم کی ادارت کی ذمہ داری بھی انجام دی، ۱۴۰۵ء میں مجلس شوری نے آپ کو مجلس تعلیمی کا ناظم مقرر کیا، ۱۴۰۸ھ میں آپ کو شیخ الہند اکیڈمی کا نگراں مقرر کیا گیا۔

آپ نے ہر ذمہ داری کو نہایت خوبی اور حسن انتظام اور ہر دل عزیزی کے ساتھ انجام دیا اور اپنے اخلاق کریمانہ اور اندازِ مشفقانہ سے ہر

شعبہ کو گل وگل زار بنائے رہے، ہر جگہ اپنی یادیں اور اپنے انمٹ نقوش چھوڑے، ماہنامہ دارالعلوم کی ادارت ہو، یا تدریس کی ذمہ داری، یا ناظم مجلس تعلیمی کی حیثیت سے آپ کا انتخاب، یا شیخ الہند اکیڈمی کے انچارج اور نگران کا عہدہ، خواہ جمعیۃ کی نائب صدارت کی عظیم ذمہ دای، ہر ذمہ داری کو بحسن وخوبی اور پوری تندہی، فراست وذکاوت اور فریضہ حیات سمجھ کر انجام دیا۔ نام وری، دکھلاوا، یا اپنی شخصیت کو اونچا کرنے کا احساس بھی آپ کے پاس سے نہیں گذرا، ہر جگہ اور ہر موقع سے للّٰہیت اور اخلاص کا سرمایہ آپ کا وصف خاص رہا۔ آپ کی تصانیف میں ایک اہم تصنیف '' ایضاح البخاری'' ہے، آپ کی ایک دوسری اہم تصنیف 'شوریٰ کی شرعی حیثیت' ہے، علم وعمل میں آپ بلند مقام پر فائز ہونے کے ساتھ شعروادب میں بھی اعلی ذوق کے حامل تھے، جس کا جیتا جاگتا نمونہ اور زندہ وجاوید ثبوت '' دارالعلوم دیوبند کا شہرہ آفاق ترانہ

یہ علم وہنر کا گہوارہ تاریخ کا وہ شہہ پارہ ہے

ہر پھول یہاں اک شعلہ ہے، ہر سرو یہاں مینارہ ہے

جو ایک لازوال ادبی شہہ پارے کی حیثیت رکھتا ہے، جو زبان زد عام وخاص ہے، جس کو اسی قدر شہرت حاصل ہے جس قدر دارالعلوم دیوبند کو شہرت اور عزت حاصل ہے، اسی طرح جمعیۃ علماء ہند کا مشہور زمانہ ترانہ'' یہ اہل یقیں کی جمعیۃ'' بھی آپ کی ایجاد اور آپ ہی کے قلم دردمند کا عظیم شاہکار ہے

۔آپ کا مجموعہ کلام 'نغمۂ سحر' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ جو آپ کی شعری میدان میں آپ کی قلمی کاوشوں اور آپ کی زبان وادب پر مکمل وابستگی کا زندہ وجاوید ثبوت ہے۔

آپ نے جمعیہ علماء ہند کی نائب صدر کی حیثیت سے بھی ذمہ داری نبھائی، دارالعلوم دیوبند کے عظیم سپوت اور مایہ ناز استاذ حدیث، اور مشفق ومربی استاذ گرامی، جن کی شفقت بھری باتوں اور انداز تدریس وتخاطب سے نہ جانے کتنے ہزاروں لاکھوں طلباء نے اپنی علمی تشنگی بجھائی، یہ عظیم ہستی مورخہ ۲۳ رشعبان ۱۴۳۸ھ بروز ہفتہ بوقت سحر اپنے پسماندگان اور علمی وارثوں کو سوگوار اور غم زدہ چھوڑ کر راہِ عالم بقا ہوگئی اور جوار رحمت رب میں اپنا مستقل اور دائمی ٹھکانا بنایا۔

خدا رحمت کند این عاشقان پاک طینت را ◻◻

جس سے ملتی تھی ہدایت، آہ رخصت ہو گیا!

تحریر: مفتی محمد جاوید قاسمی (استاذ حدیث جامعہ بدر العلوم گڑھی دولت)

دنیا میں جو بھی آتا ہے، جانے ہی کے لیے آتا ہے، باقی رہنے والی ذات صرف اللہ عزوجل کی ہے، کچھ جانے والے تو وہ ہوتے ہیں کہ اُن کے آنے کا کسی کو پتہ چلتا ہے اور نہ جانے کا؛ لیکن اللہ کے کچھ مخصوص بندے ایسے بھی ہوتے ہیں کہ اُن کے دنیا میں آنے کا تو زیادہ لوگوں کو علم نہیں ہوتا؛ مگر اُن کے اِس بے ثبات و فانی دنیا سے جانے پر اپنے بھی رنج وغم کے آنسو بہاتے ہیں اور پرائے بھی، چھوٹے بھی روتے ہیں اور بڑے بھی، قریب والے بھی گریہ کناں ہوتے ہیں اور دور والے بھی، انسان بھی غم زدہ ہوتے ہیں اور شجر و حجر بھی، اُن کے جدا ہونے پر سب اپنے آپ کو یتیم و بے سہارا محسوس کرتے ہیں۔

متانت وظرافت کے جامع، قادر الکلام شاعر، صاحب طرز ادیب، بلند پایہ محدث، حسنِ اخلاق، مہمان نوازی، سیر چشمی، عالی ظرفی، بلند حوصلگی، سلیقہ شعاری، تقوی وطہارت کے پیکر جمیل، استاذ محترم حضرت مولانا ریاست علی صاحب بجنوری نور اللہ مرقدہ انہی پاکیزہ نفوس میں سے تھے، جن کی وفات کا حادثہ کسی بستی، شہر، ملک، یا کسی فرد، یا مخصوص جماعت کا نہیں ؛ بلکہ ساری دنیا اور پوری قوم وملت کا اندوہ ناک سانحہ ہے ۔آپ کی وفات سے ملت اسلامیہ کے علمی، عملی وادبی حلقوں میں جو خلا پیدا ہوا ہے اُس کی بھرپائی مشکل ہی سے ہو سکے گی۔

ولادت:

۹ ر مارچ ۱۹۴۰ء کو علی گڑھ کے محلّہ حکیم سرائے میں پیدا ہوئے ، جہاں آپ کے والد بزرگوار جناب منشی فراست علی صاحب مرحوم بسلسلۂ ملازمت مقیم تھے، آپ کا آبائی وطن موضع ''حبیب والا'' ضلع بجنور ہے جہاں عہدِ اکبری سے انصاری شیوخ آباد ہیں، آپ کا نسبی تعلق بھی انصاری شیوخ ہی سے ہے، ابھی چار سال کی عمر تھی کہ والد صاحب کا سایۂ عاطفت سر سے اٹھ گیا، اور سنتِ یتیمی آپ کے حصہ میں آ گئی ۔آپ اس زمانہ کا اپنا یہ واقعہ سنایا کرتے تھے کہ جب والد صاحب کا انتقال ہو گیا، تو ایک روز میں نے اپنی والدہ سے کہا: ''امی! اب ہم کھانا کہاں سے کھائیں گے؟''، چار سال کی عمر ہی کیا ہوتی ہے، اس عمر میں آپ کا والدہ سے یہ معصومانہ فکر انگیز سوال آپ کی غیر معمولی فطری ذہانت وذکاوت کا پتہ دیتا ہے۔

تعلیم:

تعلیم کا آغاز آپ نے اپنے وطن موضع حبیب والا ہی سے کیا، ۱۹۵۱ء میں جب کہ آپ کی عمر گیارہ سال تھی، ابتدائی تعلیم کی تکمیل اور پرائمری درجہ چہارم کا امتحان پاس کر کے، اپنے پھوپھا مولانا سلطان الحق بجنوریؒ (جو تقریباً پچاس سال دار العلوم دیوبند کے ناظمِ کتب خانہ رہے) کے ہم راہ دار العلوم دیوبند آ کر داخلہ لیا، مولانا سلطان الحق صاحب کو اللہ تعالی نے یتیموں کی کفالت وتربیت کے خاص جذبہ وذوق سے نوازا تھا، خود حضرت مولانا کے بقول جن یتیموں کی انھوں نے جزوی کفالت کی ان کی تعداد ہزار سے متجاوز ہے اور جن کی انھوں نے کلی کفالت کی ان کی تعداد بھی سینکڑوں سے کم نہیں ہو گی، اسی مبارک اور قابل تقلید جذبہ کے تحت مولانا سلطان الحق صاحب آپ کو اپنے ہم راہ دیوبند لے آئے، اور آپ کی مکمل کفالت وتربیت فرمائی۔ ۱۹۵۸ء میں آپ نے دورۂ حدیث سے فراغت حاصل کی، دار العلوم کی تاریخ میں آپ کا یہ سنہرا ریکارڈ درج ہے کہ دورۂ حدیث کے سالانہ امتحان میں آپ نے جو امتیازی نمبرات حاصل کیے ہیں دار العلوم دیوبند میں آپ کے بعد آج تک کوئی دورہ کا طالب علم اُن سے زیادہ نمبرات حاصل نہیں کر سکا۔ فراغت کے بعد بھی اپنے خاص استاذ حضرت مولانا فخر الدین احمد مراد آبادی صدر المدرسین وشیخ الحدیث دار العلوم دیوبند کے دامنِ علم سے وابستہ رہ کر برسوں استفادہ کرتے رہے اور اپنے استاذ محترم کے درسِ بخاری کی تقریروں کو (محققانہ شرح کے انداز میں) مرتب کر کے 'ایضاح البخاری' کے نام سے شائع کرنا شروع کیا جس کی اب تک دس ضخیم جلدیں شائع ہو چکی ہیں اور مزید ترتیب کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ اسی دوران آپ نے علی گڑھ سے ادیب کامل کے امتحان میں اول پوزیشن سے کامیابی حاصل کی اور 'سرسید میڈل' سے سرفراز ہوئے۔

علمی خدمات:

فراغت کے بعد کچھ عرصہ جمعیۃ علماء ہند کے دفتر میں رہے، اور دیوبند میں رہ کر کسبِ معاش کے لیے کتابت وخوش خطی سیکھ کر اسے بھی کچھ عرصہ تک

ذریعۂ معاش کے طور پر اپنایا؛ لیکن آپ کی اعلیٰ درجہ کی علمی صلاحیت و قابلیت اس بات کی متقاضی تھی کہ آپ کسی بڑے ادارہ میں رہ کر تدریسِ علوم وفنون کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائیں اور طالبانِ علوم نبوت کو نفع پہنچائیں، چناں چہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا یہ غیبی انتظام ہوا کہ فراغت کے ۱۴ر سال بعد ۱۳۹۱ھ مطابق ۱۹۷۲ء میں دارالعلوم دیوبند میں بحیثیت مدرس آپ کا تقرر ہوگیا اور تادمِ آخر تقریباً سینتالیس سال کے طویل عرصہ تک آپ دارالعلوم میں نہایت کامیابی کے ساتھ درس دیتے رہے، آپ کا درس نہایت مقبول، مربوط، عام فہم اور سبک رفتار ہوتا تھا، 'سنن ابن ماجہ' اور 'جامع ترمذی' وغیرہ اہم کتابیں آپ کے زیر درس رہیں۔ بندہ عاجز نے بھی ۲۰۰۳ء میں آپ سے 'سنن ابن ماجہ' پڑھنے کا شرف حاصل کیا۔

آپ کو اللہ تعالیٰ نے علمی وتدریسی صلاحیت کے ساتھ، انشاء ومضمون نگاری کی بھی اعلیٰ قابلیت سے نوازا تھا، اسی لیے اربابِ انتظام کی طرف سے درس وتدریس کے ساتھ ساتھ ماہ نامہ 'دارالعلوم' کی ادارت کی ذمہ داری بھی آپ کے سپرد کی گئی جس کو آپ نے برسوں بحسن وخوبی انجام دیا۔

۱۴۰۵ھ مطابق ۱۹۸۵ء میں مجلس شوریٰ نے آپ کو مزید ترقیات سے نوازتے ہوئے مجلس تعلیمی کا ناظم مقرر کیا، شعبۂ تعلیمات سے منسلک ہوکر آپ نے اس میں پائی جانے والی خامیوں کو دور کرنے کے ساتھ، متعدد ایسی قابل قدر اصلاحات کیں جن سے شعبۂ تعلیمات کو انفرادیت اور استحکام نصیب ہوا، آپ کا دورِ نظامت مثالی تھا، نازک حالات میں دارالعلوم کے تعلیمی نظام کو سنبھالا دینا اور اسے ترقی کی بلندیوں پر پہنچانا آپ کا تاریخی کارنامہ ہے۔

۱۴۰۸ھ مطابق ۱۹۸۸ء میں آپ کو شیخ الہند اکیڈمی کا ڈائریکٹر مقرر کیا گیا، آپ کی فعال قیادت نے وہاں بھی اپنا رنگ دکھایا اور چند ہی سال میں شیخ الہند اکیڈمی سے آپ کی زیر نگرانی متعدد معیاری کتابوں نے زیور طبع سے آراستہ ہوکر دادِ تحسین حاصل کی۔ آپ بارہا عارضی طور پر نیابتِ اہتمام کی اہم ذمہ داری بھی انجام دیتے رہے، ۱۴۱۲ھ میں مجلس شوریٰ نے باقاعدہ آپ کو نائب مہتمم مقرر کرنے کی تجویز بھی پاس کی؛ مگر آپ نے اسے قبول کرنے سے معذرت کردی۔

تصانیف:

اللہ تعالیٰ نے آپ کو تصنیف وتالیف کا بھی عمدہ ذوق عطا فرمایا تھا، آپ کی تصانیف میں 'ایضاح البخاری' آپ کے علمی وادبی ذوق کا شاہ کار اور بخاری کی اردو شروح میں ممتاز حیثیت رکھتی ہے، 'شوریٰ کی شرعی حیثیت' اور 'مقدمۂ تفہیم القرآن کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ' بھی آپ کی اہم تصانیف میں شمار ہوتی ہیں، نیز اصول فقہ میں محدث کبیر حضرت مولانا نعمت اللہ صاحب اعظمی دامت برکاتہم کے ساتھ مشترکہ طور پر 'تسہیل الاصول' لکھی جو دارالعلوم دیوبند اور اس کے نہج پر چلنے والے مدارس اسلامیہ میں سال چہارم میں داخلِ درس ہے۔ اخیر زمانے میں علامہ قاضی محمد اعلیٰ تھانوی (متوفی ۱۱۹۱ھ) کی مشہور کتاب 'کشاف اصطلاحات الفنون والعلوم' پر تحقیقی کام بھی کیا جو پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا ہے اور عنقریب شائع ہونے والا ہے۔ علم وعمل میں بلند مقام پر فائز ہونے کے ساتھ ساتھ شعروادب میں بھی اعلیٰ ذوق کے حامل تھے، جس کا زندہ ثبوت آپ کا تخلیق کردہ دارالعلوم دیوبند کا شہرہ آفاق ترانہ ہے جو ایک لازوال ادبی شہ پارہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ کا مجموعۂ کلام نغمۂ سحر کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

اوصاف و کمالات:

اتباعِ سنت وشریعت، تواضع وفروتنی اور عجز وانکساری آپ کی ذاتِ عالی میں کچھ اس طرح رچی بسی ہوئی تھی جیسے آپ کا خمیر ہی تواضع واتباع سنت سے اٹھا ہو، ایک ایک چیز میں سنتِ نبوی کی تلاش وجستجو، اس کی کامل پیروی، اپنے اور پرائے کا فرق کیے بغیر ہر ملنے والے کے ساتھ حسنِ اخلاق، رافت ورحمت اور نرمی کا برتاؤ، انتہائی درجہ کی تواضع، عاجزی وانکساری آپ کا خاص وصف تھا؛ تقوی و پرہیزگاری، صدق ودیانت، اخلاص وللّٰہیت اور علم وعمل میں اسلاف کا نمونہ تھے، تکبر، بڑائی، امتیاز اور خود پسندی سے آپ کو اللہ واسطے کا بیر تھا، کبھی کسی مجلس، جلسہ اور پروگرام کی صدارت قبول فرماتے اور نہ امتیازی جگہ بیٹھتے؛ بلکہ کسی بھی پروگرام میں شرکت کے لیے آپ کی بنیادی اور اولین شرط یہی ہوتی تھی کہ صدارت کی ذمہ داری سے آپ کو بری رکھا جائے گا۔

آپ اس کو بھی پسند نہیں فرماتے تھے کہ ترجمان یا کوئی طالب علم آپ کو سبق کے لیے درس گاہ میں لے جانے کے لیے آئے، ترجمان سے شروع ہی میں کہہ دیا کرتے تھے کہ مجھے لینے کے لیے آنے کی ضرورت نہیں، وقت ہونے پر میں خود ہی آجایا کروں گا، ہاں! فون کرکے معلوم کرسکتے ہو کہ سبق ہوگا یا نہیں؟ اپنا کام ہمیشہ خود کرنے کی عادت تھی، کسی سے خدمت لینا پسند نہ فرماتے، جسمانی خدمت سے تو آپ کو نفرت تھی۔

آپ کی ذہانت وفطانت ضرب المثل تھی، اصابتِ رائے، دوراندیشی، معاملہ فہمی اور نتیجہ خیزی میں دور دور تک آپ کی نظیر نہیں تھی؛ یہی وجہ تھی کہ دارالعلوم دیوبند، جمعیۃ علماء ہند یا دیگر اداروں اور تنظیموں کے اربابِ انتظام وذمہ داران اگر کسی معاملہ میں الجھن اور تردد کا شکار ہوتے اور اس کا کوئی حل نکلتا ہوا نظر آتا، تو آپ ہی کی طرف رجوع کرتے تھے، اور آپ منٹوں میں اس کا ایسا حل نکال دیا کرتے تھے کہ جس سے ساری الجھن ختم ہوجاتی اور سکون

واطمینان حاصل ہوجاتا۔فکروعمل کی ہمہ گیری اور کتب بینی ومطالعہ کی گہرائی و گیرائی کا یہ عالم تھا کہ مادرِعلمی کے بڑے بڑے اساتذہ، وقت کے محدثین و فقہاء دقیق اور پیچیدہ مسائل میں آپ سے مشورہ کیا کرتے تھے۔

احساسِ ذمہ داری، درس کی بے مثال پابندی اور مفوضہ کام کی اس کے وقت پر انجام دہی آپ کی طبیعت ثانیہ بن گئی تھی، دار العلوم کی انتظامیہ کی طرف سے جو بھی کام آپ کو دیا جاتا، یہ دیکھے بغیر کہ کام چھوٹا ہے یا بڑا، معمولی ہے یا غیر معمولی، اس کو انجام دینا اپنا فرض منصبی سمجھتے تھے، آپ کے اسی وصفِ احساس ذمہ داری اور آپ کی ہمہ گیر صلاحیت کو سراہتے ہوئے نواسۂ شیخ الہند حضرت مولانا محمد عثمان صاحب رحمہ اللہ نائب مہتمم دار العلوم دیوبند فرمایا کرتے تھے کہ:

’’ریاست ایسا پرزہ ہے کہ اسے جہاں چاہو فٹ کردو وہیں کام کرنے لگتا ہے۔‘‘ انتہائی ضعف اور علالت کے باوجود آخر تک پابندی سے سبق پڑھاتے رہے؛ بلکہ وفات سے دو روز پہلے تک امتحان گاہ میں بھی نگرانی کے لیے التزام کے ساتھ تشریف لاتے رہے، جب حضرت مہتمم صاحب اور حضرت الاستاذ مولانا عبد اللہ صاحب معروفی ناظم امتحان نے آپ کی غیر معمولی کمزوری اور پیرانہ سالی کو دیکھتے ہوئے یہ عرض کیا کہ: حضرت! آپ کو تکلیف ہوتی ہے، آپ اس کمزوری میں امتحان گاہ میں نہ آیا کریں، گھر رہ کر دعا فرماتے رہیں‘‘ تو آپ نے یہ مشورہ قبول کرنے سے یہ کہہ کر انکار فرمادیا کہ: ’’شرعاً اس کی گنجائش نہیں ہے۔‘‘

سفرِ آخرت:

۲۳؍شعبان ۱۴۳۸ھ مطابق ۲۰؍مئی ۲۰۱۷ء سنیچر کی شب میں تہجد کے لیے اٹھے، تہجد پڑھ کر فارغ ہی ہوئے تھے کہ طبیعت بگڑ گئی، اور حرکتِ قلب بند ہوجانے کے سبب، ۷۶؍سال دو ماہ گیارہ دن اپنی مقررہ عمرِ طبعی پوری کرکے کلمہ طیبہ پڑھتے ہوئے ہمیشہ کے لیے وہاں چلے گئے جہاں سب کو جانا ہے۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون) اسی دن ظہر کی نماز کے بعد احاطہ مولسری میں حضرت مولانا قاری سید محمد عثمان صاحب منصور پوری استاذ حدیث دار العلوم دیوبند نے ہزاروں علماء، صلحاء، مشائخ اور طلبہ کے مجمع میں نمازِ جنازہ پڑھائی، اور دیوبند کے مشہور قبرستان مزارِ قاسمی میں تدفین عمل میں آئی۔ اللہ تعالیٰ حضرت استاذ محترم کی مغفرتِ اولیٰ بلا حساب فرمائے، درجات بلند فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے۔ (آمین) ◻◻

گو خاک کی آغوش میں وہ مہر مبیں ہے

تحریر: مفتی امانت علی قاسمی (استاذ دارالعلوم حیدرآباد)

۲۳ رشوال ۱۴۳۸ھ مطابق ۲۰ رمئی ۲۰۱۷ء سالانہ چھٹی میں اپنے وطن پہنچا تو اسی دن ایک صاحب نے خبر دی کہ دارالعلوم دیوبند کے استاذ حدیث حضرت مولانا ریاست علی بجنوری کا انتقال ہوگیا ہے، خبر چونکہ توقع کے بالکل خلاف تھی اس لئے جلدی یقین نہیں آیا، سفر میں ہونے کی وجہ سے واٹس ایپ بند تھا، خبر سن کر واٹس ایپ کھولا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ہر گروپ میں یہ خبر جنگل میں آگ کی طرح پھیل رہی ہے، فون پر بعض احباب سے معلوم کیا تو پتہ چلا کہ معمولی علالت کے بعد آپ اس دنیائے آب و گل سے رخصت ہوگئے اور پوری قاسمی فضا کو مغموم کرگئے، دارالعلوم، دیوبند اور اس سے منسلک تمام اداروں پر غم کا سناٹا چھا گیا، آپ کے چلے جانے سے نہ صرف دارالعلوم کے بام و در سکتے میں تھے؛ بلکہ امت کا بہت بڑا طبقہ ماتم کناں تھا، لیکن کیا کیجئے قضاء وقدر پر کس کی اجارہ داری ہے اور موت سے کس کو رستگاری ہے ہر ایک کو مٹی کی چادر تان کر ملک بقا کا سفر کرنا ہے۔

اجل نے نہ کسریٰ ہی چھوڑا نہ دارا
اسی سے سکندر سا فاتح بھی ہارا

واقعہ یہ ہے کہ جانے والا اپنی طبعی عمر پوری کر کے سفر آخرت کی طرف کوچ کر جاتا ہے لیکن جانے والے میں بہت سے ایسے ہوتے ہیں جن کی یادیں بار بار آتی ہیں؛ بلکہ ستاتی اور رلاتی ہیں، جن کی روشن زندگی ان کے تاریک کوٹھری میں چلے جانے کے بعد بھی روشنی بکھیرتی ہے، ستاروں کے مانند ان کی حیات مستعار ان کے رحلت کر جانے کے بعد بھی منزل کا پتہ دیتی ہے، جن کے کردار و عمل کی بلند حوصلگی ان کے روپوش ہو جانے کے بعد بھی عزم و استقامت کی تعلیم دیتی ہے، جن کی زبان کی لطافت و شیرینی اور شفقت و پیار کی حلاوت برسوں تک شیرہ کا کام کرتی ہے، اور احساسات کو تازگی و فکر و عمل کو تابندگی عطا کرتی ہے، جن کا اخلاص و تقوی اور زہد و استغناء جینے کا قرینہ سکھلاتا ہے، انہی خلوص و وفا اور کردار و عمل کے ایک مجسم کا نام مولانا ریاست علی بجنوریؒ ہے۔

گلستانِ دارالعلوم میں جن پھولوں سے ہر طرف خوشبو پھیل رہی ہے ان ہی پھولوں میں سے ایک پھول آپ تھے؛ بلکہ گل سر سبد تھے، دارالعلوم کے بام و در کو جن قمقموں کی روشنی نے پرنور بنا رکھا ہے اور مناسب اور معتدل روشنی سے فکر و اعتدال کی جو شمع روشن ہے اس کے جھومر آپ تھے، تحریک دارالعلوم کی موجودہ عمارت جن ستونوں پہ قائم ہے اس کے ایک ستون آپ تھے، اس لئے اگر کہا جائے کہ آپ کے چلے جانے سے برقی قمقموں کی روشنی ماند پڑگئی ہے، باغیچے کے پھول مرجھا گئے ہیں، ایک مضبوط ستون کے گر جانے سے ایک خلا سا پیدا ہوگیا ہے تو شاید کوئی مبالغہ نہیں ہے، یہ اور سی بات ہے کہ اللہ تعالی چمنستان قاسمی کی آبیاری فرماتا رہے گا، اور عمدہ سے عمدہ پھول اس گلستاں کو سدا بہار رکھیں گے، اسلام کے فکر و اعتدال کا یہ کوہ ہمالہ قیامت تک کے لئے ہے، علم و فن کا یہ مضبوط قلعہ ہر دور میں اقبال کا مرد مومن اور اسلام کی علمی و فکری سرحد کا مرد مجاہد پیدا کرتا رہے گا، لیکن جانے والے کی یاد تو ضرور آئے گی، ان کی شفقت، رس گھولتی اور دل کو چھولیتی ان کی باتیں، تکلف و تصنع سے خالی ان ادائیں، ان کی مسکراہٹیں ان کے چاہنے والوں کو غم کے کچو کے دیتی رہے گی:

روشن شب حیات کے مہتاب کی طرح
آتی ہے ان کی یاد حسیں خواب کی طرح
ممکن نہیں ہے ان سے زمانہ ہو بے نیاز
وہ تھے جہاں میں گوہر نایاب کی طرح

مولانا ریاست علی ظفر بجنوریؒ علم و فن کے آفتاب عالم تاب تھے، فن حدیث کے روشن مینار تھے، ریاست علم و ادب کے تاجدار تھے، وہ ہمہ گیر و ہمہ جہت صلاحیت کے مالک تھے، ان کی فکر میں اعتدال کے ساتھ آفاقیت تھی، اللہ تعالیٰ نے علم و ادب کے قیمتی گوہر سے مالا مال کیا تھا اور مختلف علوم و فنون میں ملکہ عطا فرمایا تھا؛ لیکن انہوں نے حدیث کی خدمت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا تھا اور حدیث کا درس دیتے اور حدیث کی شرح لکھتے ان کی روح قفسِ عنصری کو پرواز ہوئی یہ یقیناً خاتمہ بالخیر کی طرف اشارہ ہے علامہ شبلی نعمانی نے اپنے تعلق سے ایک شعر لکھا تھا جو یہاں موزوں معلوم ہوتا ہے:

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی
مجھے چندے مقیم آستان غیر ہونا ہے
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرت پیغمبر خاتم
خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا ہے

ربع صدی سے زائد عرصے تک انہوں نے حدیث کا درس دنیا، ہزاروں تلامذہ پوری دنیا میں ان کی روشن تعلیمات کی روشنی بکھیر رہے ہیں جو ان کے

لئے بہترین صدقہ جاریہ ہے،آپ مولانا فخر الدینؒ صاحب سابق شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند کے شاگرد خاص تھےاورحدیث میں انہی کے رنگ وآہنگ کی پیروی کرتے تھے،'ایضاح البخاریؒ' کےنام سے آپ بخاری کی شرح لکھ رہے تھے جو کہ مولانا فخر الدین کے افادات کا مجموعہ ہے یہ شرح بخاری کی اردو میں سب سے جامع اور مبسوط شرح ہے اس کی دس جلدیں طبع ہو کر قارئین کی آنکھوں کا سرمہ بن چکی ہیں، خدا کرے کہ باقی جلدوں کے منظر عام پر آنے کا سامان پیدا ہو۔

مولانا موصوفؒ کی زندگی پر ایک نظر ڈالئے جو چیز سب سے زیادہ ان کی زندگی میں نمایاں اورا بھر کر سامنے آتی ہے وہ ہے ان کی متواضعانہ طرز زندگی ، ہر جگہ دیکھئے ، بڑوں کے ساتھ، چھوٹوں کے ساتھ، اپنوں کے ساتھ ، پرایوں کے ساتھ، نجی محفل میں یا پھر سیمینار اور کانفرنس میں ہر جگہ تواضع و خاکساری آپ کا خاص وصف دکھائی دیتا ہے، آپ طلبہ کے ہجوم میں بھی اس طرح چلتے جیسے کوئی طالب علم جارہا ہو، غیر شناسا شخص آپ کے حلیے سے کبھی آپ کو نہیں پہچان سکتا تھا، احقر نے فراغت کے بعد گھر پر بھی آپ سے ملاقات کی تو آپ کا یہی وصف نوٹ کر پایا اور دو مرتبہ جمعیۃ علماء ہند کے زیر اہتمام ہونے والے مباحث فقہیہ کے پروگرام میں آپ سے ملاقات کی تو آپ کی یہی صفت دل کو دستک دیتی ہوئی نظر آئی۔ مباحث فقہیہ کا گیارہواں اجلاس دارالعلوم حیدرآباد میں ہوا تھا اور تیرہواں اجلاس مدراس کے حج ہاؤس میں ہر جگہ آپ کی تقریر ہوتی تھی، لیکن حیرت ہے ہر جگہ آپ نے اپنے خطاب میں یہی کہا کہ میں یہاں کچھ سیکھنے، آپ کو سننے اور آپ لوگوں سے ملاقات کے لئے آتا ہوں۔ اندازا لگایئے کہ دارالعلوم کی مسند پر چار دہائی تک درس دینے والا، دارالعلوم کا موقر اور ممتاز استاذ کس سادگی سے کہتا ہے کہ میں تو آپ لوگوں کو سننے آتا ہوں واقعہ یہ ہے کہ اسی تواضع وخاکساری کی صفت نے آپ کو بلندی کے اس عظیم منصب تک پہنچا دیا کہ آپ کے ملک عدم چلے جانے کے بعد آپ کا ہر شناسا آپ کا ذکر جمیل کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ آپ کی اس سادگی اور متواضعانہ زندگی کو دیکھ کر من تواضع للہ رفعہ اللہ کی عملی تفسیر سامنے آجاتی ہے۔

مولانا موصوف بلند اخلاق وصفات کے حامل تھے، طلبہ کے ساتھ شفقت و پیار ان کا خاص وصف تھا، طبیعت میں سادگی اور نرمی تھی، ورع وتقویٰ، خلوص وللّٰہیت، خوف وخشیت انابت الی اللہ، زہد واستغناء آپ کا امتیاز تھا، غم خواری و دلداری اور غربا پروری، آپ کی زندگی کا لازمہ تھا، آپ سادگی کے پیکر مجسم تھے، اور یہ سادگی آپ کے لباس، چال ڈھال، طرز زندگی اور رسم معاشرت سے ہویدا تھی، سخاوت وفیاضی اور مہمان نوازی میں آپ معروف تھے، سچ پوچھئے تو آپ خلیق وملنسار اور بڑے نرم گفتار تھے، اسی لئے اساتذہ، طلبہ اور ملنے والوں کا آپ کے مے خانے میں ہجوم لگا رہتا تھا۔

ہجوم کیوں ہے زیادہ شراب خانہ میں
فقط یہ بات کہ پیر مغاں ہے مرد خلیق

آپ کا شمار دارالعلوم کے موقر اساتذہ میں ہوتا تھا، آپ دارالعلوم کے مختلف موقر عہدوں کی زینت بن چکے تھے، نائب مہتمم، ناظم تعلیمات، نگراں شیخ الہند اکیڈمی، کے علاوہ آپ جمعیۃ علماء ہند کے نائب صدر تھے، آپ اپنی متوازن اور پختہ رائے کے لئے جانے جاتے تھے، دارالعلوم میں آپ کی رائے اور فکر کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی اور اہم میٹنگوں میں آپ کی شرکت لازمی ہوا کرتی تھی، آپ کی فکر میں اعتدال تھا اور اس اعتدال پر تصلب سے قائم رہتے تھے۔ ۲۰۱۰ھ کی بات ہے دارالعلوم وقف میں فقہ اکیڈمی کا سیمینار ہورہا تھا عنوان تھا 'مدارس اسلامیہ میں فقہ کی تدریس- منہج اور طریقہ کار' لیکن اس میں بہت سے شرکاء تبدیلی نصاب پر بحث کررہے تھے، یہ وہ عنوان ہے جس میں ہندوستان کے بہت سے اہل علم مفکرین کی علیحدہ علیحدہ رائے ہے خود دیوبند میں بھی ایسے ارباب فکر ہیں جو تبدیلی نصاب کے قائل ہی نہیں ؛ بلکہ محرک ہیں اس لئے گرما گرم بحث جاری تھی کہ موجودہ حالات میں نصاب کی تبدیلی ناگزیر ہے، اسی دوران حضرت الاستاذ کا نام پیش ہوگیا آپ تشریف لائے اور بڑے ہی سنجیدہ انداز میں گفتگو کا آغاز فرمایا جس کا حاصل یہ تھا ''کہ بھائی نصاب میں جزوی تبدیلی تو ہوتی رہتی ہے دارالعلوم میں پہلے بہت سی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں اب وہ نہیں پڑھائی جاتی ہے، جہاں تک مسئلہ ہے کلی تبدیلی کا یا عصری علوم کو شامل کرنے کا تو جب تک اس کا تجربہ نہ ہوجائے اس کے مفید یا مضر ہونے کا فیصلہ کیسے کیا جاسکتا ہے اس لئے جو لوگ تبدیلی کی بات کرتے ہیں وہ کوئی ادارہ قائم کرکے اس میں نئے نصاب کا تجربہ کرلیں اگر مفید ثابت ہوا تو ہم بھی قبول کرلیں گے۔''

آپ کا یہ تجزیہ اگر چہ الزامی تھا؛ لیکن اس وقت کے لئے یہی ضروری تھا آپ نے اپنی گفتگو میں اپنا اور دارالعلوم کا موقف پیش کردیا کہ جو نصاب ہے اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی ہے اور جو لوگ تبدیلی کی بات کرتے ہیں پہلے وہ نیا نصاب لائیں اور اس کا تجربہ پیش کریں، آپ کی اس تقریر کے بعد مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ حضرات ہمارا یہ پروگرام نصاب کی تبدیلی سے متعلق ہے ہی نہیں اس لئے موضوع کو دوسرے رخ کی طرف نہ لے جائیں اس طرح بات ختم ہوگئی۔

حضرت کی معتدل فکر اور پختہ رائے کا اندازا ایک اور واقعے سے لگایئے، دیوبند میں جمعیۃ علماء کا پروگرام ہورہا تھا، آپ کو مائک پر مدعو کیا گیا آپ نے مختصر خطاب کیا جس میں آپ نے فرمایا کہ ''اسلام امن واعتدال کا مذہب ہے اور دیوبندیت امن واعتدال کا مسلک ہے۔'' جملہ بہت مختصر ہے؛ لیکن اس میں دیوبندیت کی بھرپور ترجمانی ہے آپ نے اس مختصر جملہ میں اس کی وضاحت فرمادی کہ قرآن نے اسلام کو امت وسط یعنی معتدل دین قرار دیا ہے اور دیوبندیت اسی راہ اعتدال پر گامزن فکر ونظر کا نام ہے۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو زبان وبیان اور قرطاس وقلم ہر دو کا تاجدار بنایا تھا، بولتے تو چھوٹے چھوٹے جملوں کے ذریعہ سامعین پر سحر کر جاتے اور لکھتے تو قارئین پر وجد سا طاری ہوجاتا، آپ دو سال تک ماہنامہ دارالعلوم کے مدیر رہے، اس عرصے میں آپ نے متعدد مضامین لکھے، اس کے علاوہ بھی آپ کے قلم ژرف نگار سے متعدد تحقیقی وتخلیقی مضامین تاریخ کی زینت بن چکے ہیں، آپ اردو کے انشا پرداز ادیب تھے'شوریٰ کی شرعی حیثیت' اور'ایضاح البخاری' کتابی شکل میں آپ کی تصنیفی خدمات میں دو عظیم شاہ کار ہیں، اس کے ساتھ آپ بلند پایہ شاعر تھے، آپ نے شاعری کو اپنا مشغلہ نہیں بنایا تھا اس کے باوجود آپ کا شعری مجموعہ 'نغمۂ سحر' کے نام سے طبع ہوکر قبولیت حاصل کرچکا ہے، یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جس نے آپ کی شاعری کو عروج بخشا اور شاعر کی حیثیت سے آپ کو پوری دنیا میں متعارف کرایا وہ دارالعلوم کا ترانہ ہے، یہ ترانہ آپ کی فنی مہارت کا عملی نمونہ ہے، جب میں دارالعلوم آنے سے پہلے مدرسہ ریاض العلوم میں زیر تعلیم تھا تو وہاں اپنے ایک ساتھی کے پاس 'دارالعلوم کا پی' دیکھی جس کی پشت پہ یہ ترانہ ثبت تھا، سچ پوچھئے آپ کے دیدار سے پہلے اسی ترانہ کے ذریعہ آپ تک رسائی حاصل ہوئی اور اسی ترانہ نے آپ سے ملنے اور آپ کو دیکھنے کا شوق پیدا کیا، ترانہ کیا ہے اردو ادب کا ابلتا دریا ہے، جس کی تہ میں آپ کو لعل وگہر ہی ملیں گے، ترانہ پڑھیے تو ایسا لگتا ہے کہ شاعر تاریخ کی سیر کرا رہا ہے، دیوبندیت کی تشریح کررہا ہے، دارالعلوم کی خدمات کا تذکرہ کررہا ہے، اکابر دیوبند سے روشناس کرا رہا ہے، دارالعلوم کے کردار کی منظر کشی کررہا ہے اور یہ سب کچھ الفاظ وتعبیرات اور نظم وقوافی کے بلند معیار پر اتر کر ہو رہا ہے، جب ذکر ترانہ کا آہی گیا ہے تو چند اشعار پڑھ کر آپ بھی اپنے لب ودہن کو تازگی دیجئے اور اشعار کی چاشنی کا لطف اٹھایئے:

مہتاب یہاں کے ذروں کو ہر روز منانے آتا ہے
خورشید یہاں کے غنچوں کو ہر صبح جگانے آتا ہے
جو وادی فاراں سے اٹھی گونجی ہی وہی تکبیر یہاں
ہستی کے صنم خانوں کے لئے ہوتا ہے حرم تعمیر یہاں
کہسار یہاں دب جاتے ہیں طوفان یہاں رک جاتے ہیں
اس کاخ فقیری کے آگے شاہوں کے محل جھک جاتے ہیں

حضرت الاستاذ گونا گوں صفات کے حامل تھے، فکر ونظر کے بہت سے چشمے آپ سے ابلتے تھے، علم وادب کے بہت سے سوتے آپ سے نکلتے تھے، شعر وشاعری ہو کہ قرطاس وقلم کی رفاقت، زبان وبیان ہو یا فن حدیث کی مہارت ہر جگہ آپ کی ایک الگ ہی شان تھی یہ حقیر تو ہزاروں کی بھیڑ میں معمولی سا طالب تھا، جس کی ان کے فضل وکمال تک کیا رسائی ہوسکتی تھی؟ اور اس سب پر مستزاد یہ کہ میرے قلم میں وہ طاقت کہاں ہے جو ان کے حالات کی مکمل ترجمانی کرسکے:

یہ رمزی بے بصیرت ہے تیرے اوصاف کیا جانے
جو ہم رتبہ ہو تیرا وہ تیرے اوصاف پہچانے

اس لئے اپنی اس تحریر کو دارالعلوم دیوبند کے ایک مؤقر استاذ، ماہنامہ دارالعلوم کے مدیر حضرت مولانا سلمان صاحب بجنوری کے ایک اقتباس پر ختم کرتا ہوں جو مولانا موصوف کی علمی وفکری زندگی سے اچھی طرح واقف ہیں اور انہوں نے جو لکھا ہے الفاظ کی ذمہ داری کے ساتھ لکھا ہے وہ لکھتے ہیں:

''حضرت مولانا ریاست علی صاحب نوراللہ مرقدہ کی وفات دیوبند میں ایک عہد کا خاتمہ ہے، ان کی ذات میں اللہ تعالیٰ نے ایسے گوناگوں اوصاف جمع کردئے تھے جو کسی ایک فرد میں کم ہی جمع ہوتے ہیں جس سے ان کی شخصیت میں جامعیت کی شان پیدا ہوگئی تھی، اگر آپ رسوخ فی العلم، قوت استنباط، دقت نظر، سلاست بیان، فکر وتدبر، اصابت رائے، سلامتی فکر، صبر وقناعت، زہد واستغناء، تقوی وپاک دامنی، جود وسخا، غریب پروری ومہمان نوازی، ادائے حقوق، عالی حوصلگی وسیر چشمی، خوش گفتاری ونرم خوئی، شفقت ومحبت واحساس ذمہ داری، ذہانت وظرافت بھرپور خود اعتمادی کے ساتھ کامل تواضع، قوت فیصلہ دور بینی، دیانت وامانت، اعلی تدریس وخطابتیں، بے مثال نظم ونثر پر مثالی قدرت، سلیقۂ زندگی، آداب مجلس کی رعایت اور سادگی وبے تکلفی کا مجسمہ نمونہ دیکھنا چاہیں تو وہ حضرت مولانا کی شخصیت تھی اور یقین فرمائیں کہ ان اوصاف میں کسی کا تذکرہ بھرتی کے لئے نہیں کیا گیا؛ بلکہ ان کی شخصیت کے طویل مطالعہ پر مبنی ہے۔'' (ماہنامہ دارالعلوم شوال ۱۴۳۸ھ)

اللہ تعالیٰ مولانا کی خدمات کو قبول فرمائے ان کے نقش پا کی پیروی نصیب فرمائے اور ان کے مشن، تحریک، فکر اور ان کے ادھورے خوابوں کو تکمیل تک پہنچائے۔

گو خاک کی آغوش میں وہ مہر مبیں ہے
مومن کے لئے موت مگر موت نہیں ہے (نغمۂ سحر ص:۱۳۰) □□

علم وادب کا شگفتہ ترجمان مولانا ریاست علی صاحب بجنوریؒ

تحریر: ڈاکٹر مفتی سید احمد اللہ بختیاری (سابق استاذ حدیث وتفسیر وادب عربی دار العلوم حیدر آباد)

انسان دنیا میں آتا ہے جانے ہی کے لیے، جانے کا وقت رحم مادر ہی میں مقدر ہو چکا ہوتا ہے، جس کا ظہور اپنے وقت مقرر پر ہوتا ہے، دنیا میں انبیاء علیہم السلام آئے اور چلے گئے، بادشاہوں کے دربار سجے اور پھر وقت موعود پر ویران ہوگئے، صوفیائے صافیہ کی خانقاہیں آباد تھیں اور ان میں اصلاح وہدایت کے کام، تصفیۂ قلوب کے اشغال، تزکیۂ نفوس کے اعمال ہوا کرتے تھے، مگر وہ سب کے سب قصہ ہائے پارینہ بن گئے ہیں، تاریخ کے صفحات پر تو ہیں مگر وجودِ حسّی اور مشاہدات سے اوجھل ہوگئے !! تمام کے تمام اور سب کے سب آئے اور چلتے بنے، ایسے رخصت ہوگئے کہ بجز نام اور کارناموں کے کچھ اور باقی نہیں رہا؟! انبیاء علیہم السلام کے بارے میں ارشاد خداوندی ہے: وَمَا جَعَلْنَاهُمْ جَسَداً لَّا يَأْكُلُونَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوا خَالِدِيْنَ. (الانبیاء:۸)

مگر وہ حضرات اپنے جانشین چھوڑ گئے تھے، ان کے کارہائے دینی اور دینی مشن بہرحال وقت مقررہ تک جاری رہے، یہاں پر کوئی بھی ہمیشہ ہمیشہ رہنے کے لیے نہیں آیا ہے، اور نہ ہمیشہ رہنے کے لیے آیا تھا، خواجہ محبوب الٰہی نظام الدین اولیاءؒ کی اصلاحی مجلسیں کہاں چلی گئیں؟ سراج الامت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ محدث کے درسِ حدیث کا غلغلہ کہاں چلا گیا؟ اگر علیؓ کی ریاست ایک قول کے مطابق خلافتِ راشدہ پر ختم ہوگئی تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ کوئی تعجب خیز واقعہ تو نہیں ہے؟ لہٰذا حضرت مولانا ریاست علی صاحب بجنوری شارح حدیث صاحب 'ایضاح البخاری' رحمۃ اللہ علیہ، خادم حدیث دار العلوم دیوبند اگر ہم سے جدا ہو گئے تو یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ سب تقدیرات ہیں، تاہم جدائیگی کا صدمہ صدمہ ہے، اب دیکھنا یہ ہے کہ جانے والے نے ہم سبھوں کے لیے کیا پیغام چھوڑا ہے؟ ہم اپنی زندگیوں میں وہ کونسے اعمال تھے جو مرحوم کیا کرتے تھے مشعلِ راہ بنا سکتے ہیں، اس طرح ہم علماء کے معاشرہ میں خیر کے پھیلانے کی کوشش کررہے ہیں، اور کرتے رہیں گے۔

بندہ کا دار العلوم دیوبند میں ۱۹۶۵ء میں پہلا سال تھا جہاں میرے بڑے بھائی مرحوم سید حماد اللہ بختیاریؒ کا دوسرا سال تھا، بندہ ان کی نگرانی میں رہتا تھا، ایک دن بڑے بھائی نے کہا یہاں ایک صاحب رہتے ہیں جن کا نام مولانا ریاست علی بجنوریؒ ہے، وہ ہمارے والد مولانا صبغۃ اللہ بختیاری صاحبؒ کے متعلقین میں سے ہیں، چوں کہ مولانا ریاست علی صاحبؒ کے پھوپھا، خسر حضرت مولانا سلطان الحق صاحب فاروقیؒ سابق ناظم کتب خانہ دار العلوم دیوبند والد کے ساتھیوں میں سے تھے؛ لہٰذا حضرت بجنوریؒ فرماتے ہیں کہ گو مجھ پر بھی وہ، میرے خسر جیسی شفقت فرماتے ہیں، چلو ان سے مل لیں، چناں چہ میں اور بڑے بھائی مولانا مرحوم سے ملنے ان کے مکان واقع لال مسجد کے قریب جو اونچائی پر واقع تھا، گئے، دس گیارہ بجے کا وقت تھا، مولانا بڑے ہی پرتپاک طریقہ سے ملے، مصافحہ ومعانقہ ہوا، اور بیٹھ گئے، مولانا ریاست علی بجنوری صاحبؒ والد صاحب کا تذکرہ کرنے لگے اور پھر چند منٹ بعد اندر گئے اور قدیم مغلیہ طرز کی چائے لے آئے کہ جس میں دودھ، ڈکاشن اور شکر الگ الگ ہوتے ہیں، حسبِ خواہش چائے تیار کرلی جاتی ہے، اور پھر اپنے دستِ مبارک سے چائے بنا بنا کر ہم دو طالب علموں کو پیش فرماتے گئے، اس طرح یہ دلچسپ چائے کی مجلس اور اکابر کے تذکروں پر رہی، اس کے بعد مسلسل کئی ملاقاتیں ہوتی رہیں، بارہا مولانا کے کتب خانہ 'مکتبہ رحمت' جانا ہوتا رہا، تقریباً ہر مرتبہ مولانا محنت سے پڑھنے کی نصیحتیں فرماتے، اور اکابر کے واقعات سناتے تھے، بندہ کا خیال تھا کہ ''مجالسِ ریاست'' نام سے مضمون لکھوں، مگر ان شاء اللہ پھر کبھی لکھا جائے گا۔

مولانا دار العلوم بلائے جاتے ہیں:

مولانا سلطان الحق صاحب مرحوم کی یہ خواہش تھی کہ ان کے داماد دار العلوم میں استاذ بن جائیں، جیسا کہ مشفق استاذ مولانا سید فخر الدین احمد صاحب مرادآبادی شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند (تلمیذ شیخ الہند) ناظم تعلیمات دار العلوم دیوبند کی بھی یہی خواہش تھی، ان حضرات کی خواہشات کو اللہ نے پوری کیں کہ ایک مرتبہ مجلس شوریٰ نے آپ کا تذکرہ اور ایضاح البخاری پر علمی تبصرہ کے بعد طے کیا کہ تدریسی خدمات کی دعوت دی جائے، جس میں 'ایضاح البخاری' کی تعریف تھی اور پھر مولانا ریاست علی صاحب بجنوریؒ سے کہلا بھیجا کہ تم تدریسی خدمات کے لیے درخواست دیدو، چناں چہ دیدی گئی، اور ایک دن انٹرویو کا مقرر ہوگیا، چناں چہ مولانا مرحوم مہمان

خانہ پہنچے اور پھر سب سے ملاقاتیں ہوئیں، جس میں 'ایضاح البخاری' کا تذکرہ رہا، اور پھر مولانا سعید احمد اکبرآبادی صاحب صدر شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ تلمیذ خاص علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے فرمایا کہ کتب خانہ سے چند کتابیں منگوالی جائیں اور ہم آپ کا امتحان لیں گے، چناں چہ ہدایہ اولین اور آخرین اور مشکوٰۃ شریف، بیضاوی شریف، میبذی وغیرہ وغیرہ کتابیں منگوالی گئیں، اور پھر مولانا سعید اکبرآبادی صاحبؒ نے پہلے ہدایہ کھولی اور کتاب الصلوٰۃ نکالا، فرمایا کہ پڑھو، مولانا پڑھنے لگے ایسے جیسے تلاوت کلام پاک روانی سے ہوتی ہے، دوڈھائی صفحہ پڑھ ڈالا، پھر سعید صاحب نے فرمایا، بس، بس، ہم دیکھ چکے، پھر مولانا سید عبدالقادر صاحب فاضل دیوبند مالیگاؤں کے ممبر شوریٰ دارالعلوم نے ہدایہ آخرین اٹھائی اور مولانا کے سامنے پیش کردی، کہا کہ جہاں سے چاہیں پڑھیں اور شرح ومطلب بیان کردیں، چنانچہ مولانا نے کتاب کھولی جس کے ساتھ ہی چند صفحات الٹ گئے اور صفحہ کے شروع ہی سے عبارت خوانی شروع فرمادی، جس میں بیع سلم کی بحث تھی، مولانا مرحوم نے انتہائی روانی کے ساتھ تلاوت قرآن کی طرح سرسر عبارت صحت کے ساتھ پڑھ دی، اور پھر شرح شروع کی جس میں بغیر کتاب کو دیکھے پہلے زبانی شرح کی، نگاہ ممبروں کی طرف تھی! اور کہا کہ یہاں بیع سلم کی بحث ہے، جس کی سات شرطیں ہیں، جنھیں انگلیوں پر گناتے چلے گئے، اور فرمایا کہ ایک شرط میں امام صاحب اور صاحبین کا اختلاف ہے، اس تقریر سے پہلے تمہیدی طور پر اقسام بیع پر مختصر روشنی ڈالی تھی، جس میں بیع کے اقسام کا اختصاراً احاطہ کیا گیا تھا، تاکہ بیع سلم کی تعریف کی جاسکے، اور پھر مولانا بجنوری مرحوم نے نہایت عمدہ اور شگفتہ ترجمہ کردیا، جس سے سامعین متاثر ہوئے، چنانچہ مولانا زین العابدین سجاد میرٹھیؒ تلمیذ علامہ انور شاہ کشمیریؒ پروفیسر شعبۂ عربی جامعہ ملیہ نے فرمایا آپ نے ہماری امیدوں کو پورا کردیا۔

اس انٹرویو کے وقت حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب قاسمیؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند اپنے دفتر اہتمام میں بیٹھے ہوئے تھے جنھیں شوریٰ نے بلا بھیجا اور وہ آ گئے، تمام انٹرویو میں بحیثیت سرپرست بیٹھے رہے، اور خوش ہوتے رہے کہ ہمارے ایک شاگرد کامیاب ہیں پھر اس کے بعد شوریٰ کی طرف سے رپورٹ تیار ہوئی جس میں یہ عبارت تھی کہ موصوف درس نظامی کی ہر کتاب پڑھا سکتے ہیں، اور ہر فن کی کتاب دی جاسکتی ہے، جس پر تمام شوریٰ کے ارکان کی دستخطیں ثبت تھیں۔ (مولانا بجنوری صاحبؒ سے سنی ہوئی روایت) مولانا مرحوم نے اپنے ذوق ادب کی وجہ سے جامعہ اردو علی گڑھ یونی ورسٹی کا امتحان 'ادیب کامل' دیا تھا جس میں تمام یوپی کے سینٹرس میں نہ صرف یہ کہ اعلیٰ نشانات حاصل کئے تھے بلکہ (گول مڈل) کے بھی مستحق ٹھہرائے گئے تھے، لہٰذا شگفتہ ترجمہ کرنا ہی قرین قیاس تھا۔

بندہ اپنی ضرورت سے اکثر و بیشتر دہلی جایا کرتا تھا، وہاں سے کوشش کر کے ضرور دیوبند جاتا تھا، تقریباً کئی دفعہ دیوبند جانا ہوا اور ہر مرتبہ مولانا بجنوری صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے مختصر یا طویل ملاقاتیں رہتی تھیں، اور تقریباً ہر ملاقات میں کھانے پر دوپہر یا رات کے لیے ضرور مدعو کرتے، کھانے کے بہانے علمی اصلاحی مجلس ہوتی تھی، بہت ساری تاریخی باتوں کا علم مولانا مرحوم کی زبانی ہمیں ہوا ہے، یہاں پر دو باتیں پیش ہیں:

ایک مرتبہ فرمایا کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ قانونی مزاج رکھتے تھے، مگر حقیقتاً وہ ایک رحم دل متواضع انسان تھے، اصول پسندی کو لوگوں نے سختی کا نام دے رکھا ہے، پھر فرمایا، خانقاہ تھانہ بھون کا ماہانہ خرچ تین سو روپئے تھا، مخصوص معتقدین کہ جنھیں اجازت تھی کہ وہ پیسے بذریعہ منی آرڈر بھجا سکتے ہیں، چناں چہ صرف تین سو روپیوں پر ہی دستخط فرماتے تھے، اور پھر بقیہ منی آرڈریں واپس بھیج دی جاتی تھیں۔

اور فرمایا: حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے ہدایہ آخرین پڑھی تھی، پھر تو کیا تھا کہ فقیہ الامت بن گئے، ایک فقیہ نے دوسرے کو فقیہ بناڈالا، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی فقہی خدمات ہمارے سامنے ہیں۔

یوں تو تمام ہی اکابر رحمہم اللہ کے تذکروں سے مجلس جمی رہتی تھی مگر خصوصیت کے ساتھ مولانا سید حسین احمد مدنی علیہ الرحمۃ کا ذکر خیر ہوتا تھا، جس میں قابل تقلید نمونوں کو پیش فرماتے تھے، جوان کے چشم دید واقعات ہوتے تھے۔

مولانا بجنوری رحمۃ اللہ علیہ شعر وشاعری کا بہترین ذوق رکھتے تھے، ظفؔر تخلص فرماتے تھے، مولانا کا مجموعہ کلام بھی 'نغمۂ سحر' چھپ چکا ہے، ویسے دارالعلوم دیوبند کا ترانہ مولانا ظفؔر بجنوری کا شاہکار ہے، جس میں دارالعلوم کے اسلاف کے نام اور کارناموں کا بیان ہے، اختصار کے ساتھ تعارف بھی! مولانا ظفؔر بجنوری کے مجموعہ کلام کو (اسلامی اور اصلاحی شاعری) کا لقب دیا جاسکتا ہے اور ادب اسلامی میں شمار بھی کیا جاسکتا ہے جس میں روانی، تعبیری قوت، لفظی ومعنوی صحت سب کچھ ہیں، جن پر تفصیلی ادبی کلام کیا جاسکتا ہے۔ □□

آتی ہی رہے گی تیرے انفاس کی خوشبو

تحریر: مفتی محمد نعیمی مظاہری (دارالافتاء جامعہ اسلامیہ ریڑھی تاجپورہ)

ذہانت و فطانت، فصاحت و بلاغت، تصنیف و تدریس، شعر و ادب اور متانت وظرافت کی جامعیت کے حامل، اخلاق و عادات، مہمان نوازی، سیرچشمی، علمی وعملی پختگی، حق گوئی، بلندحوصلگی، سلیقہ شعاری اور تواضع کے پیکرِ جمیل، علمی ذوق، اصلاحی مزاج، فکروعمل اور مطالعہ کی گہرائی و گیرائی کے سبب از ہرِ ہند دارالعلوم دیوبند کے معدودے چند اساطینِ علم وفضل میں شمار— یہ تھے استاذ العلماء، شارحِ حدیث نبوی حضرت مولانا ریاست علی ظفر بجنوری رحمۃ اللہ علیہ۔

مولانا مرحوم ۹/مارچ ۱۹۴۰ء کو علی گڑھ کے محلّہ حکیم سرائے میں متولد ہوئے، جہاں آپ کے والد بزرگوار جناب منشی فراست علی مرحوم بسلسلہ درس وتدریس مقیم تھے۔ آبائی وطن آپ کا موضع حبیب والا ضلع بجنور تھا، جہاں عہدِ اکبری سے شیوخِ انصار آباد ہیں۔ اپنی تعلیم کا آغاز بھی آپ نے یہیں سے کیا اور آٹھ نو سال کی عمر میں سایۂ پدری سے محروم ہوگئے۔ ۱۹۵۱ء میں پرائمری درجہ چہارم کا امتحان پاس کرکے اپنے پھوپھاجان مولانا سلطان الحق (سابق ناظم کتب خانہ دارالعلوم دیوبند) کے ہمراہ دیوبند تشریف لائے اور دارالعلوم میں داخلہ لے کر اپنے پھوپھا جان کے زیرتربیت رہ کر ۱۹۵۸ء میں دورۂ حدیث شریف میں اعلیٰ نمبرات سے سرفرازی حاصل کی۔ دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد اپنے مشفق وکرم فرما استاذ حضرت مولانا فخر الدین احمد مرادآبادیؒ کے دامنِ علم سے وابستہ ہوکر مسلسل تیرہ سال تک استفادہ کرتے رہے اور اسی دوران علی گڑھ سے ادیب کامل کے امتحان میں اوّل پوزیشن سے کامیابی حاصل کی اور سرسیّد میڈل سے سرفراز ہوئے اور اسی دور میں استاذِ محترم مولانا مرادآبادیؒ کے 'امالی درس' کو جنھیں دورۂ حدیث کے سال میں ضبط کیا تھا 'ایضاح البخاریؒ' کے نام سے باقاعدہ شرح کے طور پر تحقیق وتربیت کے ساتھ شائع کرنا شروع کیا۔

۱۳۹۱ھ مطابق ۱۹۷۲ء میں دارالعلوم دیوبند کے لیے بحیثیت مدرس تقرر عمل میں آیا۔ حضرت والا کی علمی و تدریسی صلاحیتوں کی وجہ سے درس وتدریس کے ساتھ ماہنامہ 'دارالعلوم' (اُردو) کی ادارت کی ذمہ داری بھی آپ کے سپرد کردی گئی، جس کو بحسن وخوبی انجام دیا۔

۱۴۰۵ھ میں آپ کو مجلس تعلیمی کا ناظم مقرر کیا گیا اور ۱۴۰۸ھ میں مجلسِ شوریٰ نے آپ کو شیخ الہند اکیڈمی کا نگراں مقرر کیا، آپ کی فعال و خداداد فہم وفراست اور قابلیت نے وہاں بھی اپنا رنگ دِکھایا، آپ بارہا عارضی طور پر نیابتِ اہتمام کی ذمہ داری بھی ادا کرتے رہے۔ ۱۴۱۲ھ میں مجلسِ شوریٰ نے باقاعدہ آپ کو نائب مہتمم مقرر کرنے کی تجویز بھی پاس کی، مگر آپ نے اس کو قبول کرنے سے معذرت کردی۔

حضرت والا علم وعمل کے مقام بلند پر فائز ہونے کے ساتھ ساتھ شعروادب کی وادی کے امام بھی تھے، جس کا ایک ثبوت دارالعلوم کا شہرۂ آفاق ترانہ بھی ہے، جو ایک لاثانی ادبی شہ پارہ اور شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے، اسی کے ساتھ آپ کے کلام کا مجموعہ 'نغمۂ سحر' اساتذۂ فن کی صف میں آپ کے ممتاز کلام کا ضامن ہے۔ ان تمام اوصاف و کمالات کے باوجود تواضع وعاجزی اور بےنفسی کا یہ عالم تھا کہ ہر کوئی پہلی ہی ملاقات میں اس کو بھانپ لیتا اور حضرتؒ کا گرویدہ ہوئے بغیر نہ رہتا تھا۔

بہرحال آپ نے ایک طویل زمانہ تک دارالعلوم دیوبند کی مسند حدیث کو زینت بخشتے ہوئے قال اللہ و قال الرسول کے منور ومعتبر زمزموں کو تازہ رکھا، اور جمعیۃ علماء ہند کی نیابتِ صدارت کی عظیم ذمہ داری بھی آپ کے کندھوں پر رہی، جس کے پرچم تلے آپ نے مختلف رفاہی وفلاحی اموراورقولی وملّی خدمات کے دائرۂ کار کو وسیع سے وسیع تر فرمایا اور گویا یہ کہہ گئے:

ڈھونڈوگے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تعبیر ہے جس کی حسرت وغم اے ہم نفسو وہ خواب ہیں ہم

مولائے کریم حضرت والا کو اپنا جوارِ رحمت نصیب فرمائے اور ہمیں حضرت کے نقوشِ مبارکہ کو اپنانے کی توفیق ارزانی نصیب فرمائے، آمین:

آتی ہی رہے گی ہردم میرے انفاس کی خوشبو
گلشن تیری یادوں کا مہکتا ہی رہے گا

حضرت مولانا ریاست علی ظفرؔ بجنوریؒ — چند امتیازی اوصاف

تحریر: مولوی محمد سلمان الخیری نعیمی قاسمی (استاذ دار العلوم شاہ بہلول سہار نپور)

تیرے دربار میں جو جاں نثار بیٹھے ہیں — بہت اُداس بہت سوگوار بیٹھے ہیں
تیری جدائی سے ٹوٹا ہے ان پہ غم کا پہاڑ — تڑپ رہے ہیں بہت دل فگار بیٹھے ہیں

امتِ محمدیہ کی ایک بڑی امتیازی خاصیت یہ بھی رہی ہے کہ ہر دَور میں وارثینِ انبیاء کی ایک بڑی جماعت اس امت میں لازمی طور پر موجود رہی ہے جس نے حفاظتِ دین کے ساتھ اشاعتِ دینِ متین میں بھی جہدِ مسلسل کے بیشمار نقوش چھوڑے ہیں۔ تاریخِ دعوت وعزیمت کے اس طویل وعریض سفر کے مسافرینِ حق میں بہت سے وہ حضرات تھے، جو تعلیماتِ نبویؐ کے جامع اور اسوۂ حسنہ کے مجسم نمونہ اور مسلّم سپوت تھے، جنھوں نے مقصدِ نبوت، تلاوتِ قرآن، تعلیمِ قرآن نیز تزکیۂ نفوس اور حکمتِ عملی کو مکمل بصیرت وبصارت اور کمال فہم وفراستِ ایمانی سے پیش کیا، جن کی علمی پختگی قابلِ رشک، عملی تشنگی لائقِ دید اور جرأتِ ایمانی بظاہر نا قابلِ تقلید، جن میں عالمانہ شان، محدثانہ مزاج، محققانہ ذوق، فقیہانہ اجتہاد واعتماد نیز صوفیانہ مجاہدہ اور سوز وگداز کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر موجزن تھا۔ اِنہیں قدسی صفات با کمال حضرات میں سے استاذِ محترم، دار العلوم دیوبند کے مایۂ ناز محدث وادیب، جمعیۃ علماء ہند کے نائب صدر، ترانۂ دار العلوم دیوبند وجمعیۃ علماء ہند کے تخلیق کار، عارف باللہ حضرت مولانا ریاست علی ظفرؔ بجنوریؒ کی ذاتِ گرامی تھی۔ سبحان اللہ! قدرے چھوٹا قد، روشن چہرہ، آنکھوں پر چشمہ، ہاتھوں میں عصا، راہ چلتے ہوئے چپ و راست سے بالکل بے پرواہ، نگاہیں بھی قدم کے ساتھ ہی بڑھتیں، سرِ راہ کوئی سلام کرتا تو جواب دیتے، ہلکی مسکراہٹ بکھیرتے، ہونٹوں پر معمولی سی بھنبھناہٹ وحرکت کے ساتھ رواں دواں رہتے، چال چلن ایسا متواضع کہ گویا تواضع خود چل رہی ہے، میرے دل ودماغ میں حضرت الاستاذؒ کی یہی تصویر ہے۔

حضرتؒ سے پہلی بار باقاعدہ دید وشنید کا موقع تب ملا جب وہ احقر کے دورۂ حدیث شریف کے سال ترمذی شریف اوّل کا درس دینے کے لیے دار الحدیث تشریف لائے۔ سمٹے سمٹائے پُر لطف وجود کے ساتھ مسندِ تدریس پر جلوہ گر ہوئے۔ باقاعدہ کتاب کے افتتاح سے قبل بیش بہا اور 'اثمن من الذہب والفضۃ' نصیحتیں ارشاد فرمائیں۔ پھر درس کی بسم اللہ ہوئی، وہ ایسے کہنہ مشق اور لائق وفائق استاذ تھے کہ ان سے حدیث پاک پڑھتے ہوئے لگتا کہ واقعی درسِ حدیث اپنی شان سے ہو رہا ہے۔ وہ حدیث کی تشریح حدیث اور شرّاحِ حدیث کے تناظر میں کرتے۔ مشکل الفاظِ حدیث کی توضیح نہایت عمدہ، آسان، زود فہم اور سہل المنال اسلوب میں کرتے تھے، احادیث کے مابین تعارض دفع کرنے یا ان میں تطابق پیدا کرنے کا بھی ان کا اپنا عمدہ انداز اور بے مثال ملکہ تھا، وہ جب دورانِ درس کسی ایسے مسئلے یا ترجمۃ الباب پر پہنچتے کہ جو ائمہ کے ہاں مختلف الآرا یا مجتہد فیہ ہے، تو عجیب وغریب دل نشیں انداز میں ائمہ فقہ وحدیث کی آراء واقوال اور پھر ترجیح الراجح مع الوجوہ بیان فرماتے۔

حضرت الاستاذؒ اخلاقی زندگی میں نہایت ہی متواضع اور سادہ انسان تھے، مگر فکر ونظر کے باب میں انتہائی پختہ، وہ ہر اس بات اور خیال وفکر پر برملا تنقید کرتے، جس سے وہ متفق نہ ہوتے۔ البتہ ان کا اندازِ تنقید تلخ اور مخاطب پر گراں گزرنے والا نہ ہوتا۔ تنقید میں بھی خلوص اور بیان وبلاغت کی چاشنی پائی جاتی، کئی مجلسوں اور علمی محفلوں میں انھیں کھل کر کسی نظریے سے اختلاف کرتے ہوئے دیکھا اور سنا، مگر ان کا اسلوب بیان ایسا ہمدردانہ اور مخلصانہ ہوتا کہ وہ شخص بھی جس پر تنقید ہو رہی ہوتی، یا تو ان کی باتوں کا قائل ہو جاتا یا کم از کم خاموش تو ہو ہی جاتا۔ حضرتؒ کا طرزِ کلام بڑا دلچسپ ہوتا تھا۔ مخاطب کو قائل کرنے کی بھرپور خوبی ان کے اندر پائی جاتی تھی۔ مادرِ علمی دار العلوم دیوبند کے احاطے میں ان کی عقل وتدبر اور فہم وفراست کے بھی بڑے چرچے تھے، عمومی اصطلاح میں انھیں 'رجل داہیۃ' سمجھا جاتا، جو غالبًا احادیث میں حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کے بارے میں منقول ہے۔

حضرت الاستاذؒ نے کم وبیش چالیس سالہ خدمات کے دوران مادرِ علمی دار العلوم میں مختلف اہم عہدوں پر کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ استاذی تو ان کا مستقل عہدہ تھا، مگر اس کے علاوہ انھوں نے مختلف زمانوں میں نظامتِ تعلیمات سے لے کر ماہنامہ 'دار العلوم' کی ادارت اور دیگر کئی اہم ذمہ داریوں کو بھی بخوبی نبھایا۔ اپنے خاص الخواص استاذ، دار العلوم دیوبند کے سابق شیخ الحدیث مولانا فخر الدین مراد آبادیؒ کے درسی افادات کو 'ایضاح البخاری' کے نام سے مرتب کر کے شائع کرنا بھی ان کا اہم علمی کارنامہ ہے۔

حضرت والاؒ کی ذات میں ایک اور شخص ظفرؔ نامی بھی بستا تھا، جو گلستانِ ادب وشعر کا گلچیں تھا۔ انھوں نے اگرچہ علم حدیث سے خصوصی شغف وشغل کی وجہ سے باقاعدگی کے ساتھ اس شخص کو کھلنے کا موقع نہیں دیا اور بہت زیادہ شاعری نہیں کی، مگر جو کچھ بھی کی وہ لاجواب ہے، بے مثال ہے، اپنی معنویت اور فکر وخیال کی ندرت وپختگی کے اعتبار سے استاذ شاعروں کے ہم پلّہ ہے، ان کا ایک شعری مجموعہ بہ نام 'نغمۂ سحر' بھی ہے، جو آپ کی استاذانہ شان کا ضامن ہے۔ ان کا ایک اور زبردست شعری کارنامہ 'ترانۂ دار العلوم دیوبند'

اور 'ترانۂ جمعیۃ علماء ہند' ہے۔ اوّل الذکر ترانہ تو ایسا ہے کہ اسے پڑھتے اور سنتے ہوئے ایک عجیب وغریب کیف وسرور طاری ہو جاتا ہے، ایسا لگتا ہے کہ اس کے الفاظ الہام کی مانند ہماری سماعت اور ذہن ودل پر نازل ہو رہے ہیں۔ حضرتؒ نے اس ترانے کی بحر، وزن اور قافیہ بندی تک میں ایسی ہنروری اور دیدہ ریزی سے کام لیا ہے کہ ہر مصرح اور مصرع کا ہر لفظ نہایت چست، درست اور معنویت کی کائنات بسائے ہوئے ہے۔ شعری استعارات و کنایات کو اس خوبی سے برتا ہے کہ دل جھوم اُٹھتا ہے:

آسماں اُن کی لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

بالآخر موت بہر حال ایک حقیقت ہے اور اس حقیقت سے ہر ذی نفس کو دوچار ہونا ہے، البتہ بعد از مرگ ایسے انسان کا ذکر خیر اور یادیں ضرور باقی رہ جاتی ہیں، جس نے اپنی صلاحیتوں، علم وفکر اور ادب وتخلیق کے ذریعہ فیض رسانی کا فریضہ انجام دیا ہو، اور اس معنی میں حضرت والا استاذ مولانا ریاست علی ظفؔر بجنوریؒ یقیناً ہمارے دلوں میں ہمیشہ زندہ وتابندہ رہیں گے۔ اور ان کے اپنے اعمالِ خیر کے علاوہ ہزار ہا شاگردوں کی شکل میں دنیا بھر میں پھیلی ہوئی ان کی علمی کمائی بھی یقیناً ان کے لیے ذخیرۂ آخرت ثابت ہوگی:

روتے ہو تم فضول میاں ایسی موت پر
صدقے ہزار زندگیاں ایسی موت پر

□□

مولانا بجنوریؒ - ایک مجموعۂ کمالات شخصیت

تحریر: مولوی محمد عثمان جامعی (مبلغ جامعہ اسلامیہ ریڑھی تاجپورہ)

خالقِ کائنات نے دستِ اجل کو جو کام سونپا تھا، اس پر سو فیصد عمل کے نمونے آئے دن دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ہنستی کھیلتی مسکراتی بستیاں سکڑتی سمٹتی اور اُجڑتی نظر آتی ہیں۔ کل تک جن گھر اور گھرانوں میں چراغاں تھا، انسانیت کا بول بالا تھا، آج وہاں حیوانیت کا منظر نظر آتا ہے، کل تک جن گلوں سے خوشبو کا احساس ہوتا تھا آج وہاں نہ ہی گل ہیں نہ خوشبو، بس خار ہی خار نظر آتے ہیں اور اب خاروں سے اُلجھ کر خوار ہونا ہمارا مقدر بن چکا ہے۔ کل تک ہم جن ہستیوں کو اپنا متاعِ گراں مایہ تصور کرتے تھے آہ کہ آج وہی ہستیاں کئی من مٹی کے نیچے محوِ خواب ہیں۔

موت العالِم موت العالَم، یقیناً ایک عالم ربانی کی موت سے عالمِ پست وبالا متاثر ہوتا ہے، استاذ العلماء، دارالعلوم دیوبند کے مایۂ ناز محدث و ادیب حضرت مولانا ریاست علی ظفؔر بجنوریؒ بھی اسی مقدس گروہ کے ایک فردِ فرید تھے، جن کو مالکِ دوجہاں نے ظاہری وباطنی بے شمار علوم ومعارف اور محامد ومحاسن سے نوازا تھا، جن کی ذاتِ بابرکت کو دیکھ کر اللہ یاد آتا تھا، ان کی زندگی اسوۂ حسنہ کی جیتی جاگتی تصویر تھی۔ آپ خاموش طبع، فکر صالح کے حامل، خلوت پسند انسان تھے، اکثر اوقات کتب بینی اور درس وتدریس میں ہی صرف فرماتے تھے، اپنے قیمتی اوقات کو لایعنی اعمال واشغال میں لگانا آپ کا مزاج نہ تھا۔ اپنے اکابر واساتذہ اور اسلاف کے پیروکار، ذہانت و فطانت کے امین، تواضع و عاجزی کے پیکر، تقویٰ وطہارت کا مجسمہ، نظافت ونجابت کا آئینہ، اوقات کے پابند، ذکر وشغل اور تلاوتِ قرآن کریم کے باعث ہونٹوں پر ہلکی سی بھنبھناہٹ، خوش پوشاک اور سادہ لوح بزرگ تھے۔ وہ منظر بھی لفظوں میں بیان سے باہر ہے کہ جب آپ گھر سے دارالحدیث کے لیے تشریف لاتے، اللہ اکبر! عاجزی وانکساری سے سرخم، نہ ہٹو بچو کا شور، تن تنہا عصا ہاتھوں میں لے کر، بلا آہٹ خراماں خراماں دارالحدیث کی طرف بڑھتے ہوئے مسندِ درسِ حدیث پر جلوہ گر ہو جاتے۔ حدیث پاک کی عبارت خوانی کو کامل توجہ اور مکمل ادب سے سماعت فرمانے کے بعد کچھ اس طرح گویا ہوتے کہ جمیع حاضرین ہمہ تن مشغول ہو جاتے اور ایک عجیب سا منور سما قال اللہ وقال الرسول کے پر کیف زمزموں سے بندھ جایا کرتا تھا۔ اندازِ درس، افہام وتفہیم اتنا سہل الحصول ہوتا کہ غبی سے غبی طالب علم کے بھی اقرب الی الفہم ہوئے بغیر نہ رہتا۔

چمن میں تخت پر جس دم شہِ گل کا تجمل تھا
ہزاروں بلبلیں تھیں باغ میں ایک شور تھا غل تھا
کھلی جب آنکھ نرگس کی نہ تھا جز خار کچھ باقی
بتا تا باغباں رو رو یہاں غنچہ یہاں گل تھا

آج اگر چہ حضرت والا ہمارے درمیان نہیں رہے مگر آپ کے کمالات واوصاف، اخلاق وکردار اور راہنماز رّیں نقوش کا ایک ایسا تسلسل ہے کہ اگر ہم ان کو اپنا لائحۂ عمل بنالیں تو ہم بھی دارین کی سعادت کے حصول کے ساتھ قافلۂ حق میں شمار ہو سکتے ہیں:

وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی نظریں اب تک سما رہے ہیں
یہ چل رہے ہیں وہ پھر رہے ہیں یہ آرہے ہیں وہ جا رہے ہیں
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را
کہ آں رسمے نہاں کردند بخاک وخون غلطیدن

□□

حضرتؒ ایک بے مثال مربی تھے

تحریر: مولانا جلیس احمد قاسمی (نائب صدر جمعیۃ علماء اتراکھنڈ)

حضرت الاستاذ مرحوم حضرت مولانا ریاست علی ظفرؔ بجنوریؒ سابق ناظم تعلیمات دارالعلوم دیوبند کے انتقال سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ آسانی سے پُر نہ ہوسکے گا۔ حضرتؒ کی شخصیت تمام کمالات سے بھرپور تھی۔ جہاں حضرت والاؒ ایک بہترین استاذ تھے وہیں ایک محسن اور اچھے مربی بھی تھے۔طلباء کے ساتھ انتہائی شفقت ومحبت کا معاملہ فرماتے تھے۔ ہمارے ایک استاذ مرحوم حضرت مولانا اشرف علی مہتمم مدرسہ درسگاہ عالیہ قصبہ شریف نگر، ضلع مرادآباد، یوپی حضرتؒ کے قریبی درسی ساتھیوں میں تھے۔ وہ مجھے داخلہ کے لیے جب دارالعلوم دیوبند لے کر گئے اُس سال ہمارا داخلہ امتحان تقریری ہوا تھا۔ پہلے سے ہم سنتے تھے کہ دارالعلوم میں داخلہ امتحان بڑا سخت ہوا کرتا ہے۔ جب پہلی مرتبہ دارالعلوم دیوبند پہنچے وہاں بھی طلباء میں معلوم ہوا بڑی گھبراہٹ تھی کہ خدا جانے کیا ہوگا۔ خیر فارم نکال کر ملازم نے پکارا جن کی آواز سن کر اچھے اچھوں کا پسینہ چھوٹ جائے۔ وہ ملازم مجھے لے کر سیدھے حضرتؒ کے پاس پہنچے تو کچھ اطمینان ہوا۔ چونکہ حضرتؒ کے بارے میں مشہور تھا کہ بہت نرم طبیعت ہیں اور طلباء پر بڑے مہربان رہتے ہیں۔ کچھ دل میں دل آیا، نتیجتاً امتحان کی کارروائی شروع ہوئی۔ دوتین جگہ سے حضرتؒ نے عبارت پڑھوائی، ہفتم مطلوب تھا، عبارت اور کچھ معلومات کے بعد مسکرا کر بولے کہ داخلہ امدادی کردوں یا غیرامدادی۔ میں کیا بولوں، سہمے سہمے انداز میں کہا کہ حضرتؒ امدادی ہوجائے تو میری مشکل آسان ہوجائے۔ میرے کچھ معصومانہ چہرہ کو دیکھ کر بولے ٹھیک ہے جاؤ لیکن فکر تو تھی کہ اللہ میرا اب کیا ہوگا۔ خیر دن گزرا، اگلے دن تعلیمات پر جب کامیاب طلباء کی فہرست لگی تو ساتھیوں نے بتلایا کہ تیرا نام آ گیا، جاکر دیکھا تو واقعی نام کامیاب طلباء کی لسٹ میں شامل تھا۔ بڑی خوشی ہوئی اور خدا کا شکر ادا کیا۔ تو یہ تھا حضرتؒ کا طلباء کے ساتھ حسنِ معاملہ اور شفقت ومحبت جس کے لیے حضرتؒ جانے جاتے تھے۔تعلیمی سلسلہ شروع ہوا، حضرت والاؒ سے خاصا تعلق ہوگیا تھا اس لیے اکثر وبیشتر کتاب لے کر کچھ پوچھنے کے لیے مکان پر چلا جاتا تھا۔

ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ میرے والد مرحوم کی طبیعت زیادہ ناساز تھی، رخصت لے کر گھر آ گیا۔ دارالعلوم پہنچنے میں کچھ تاخیر ہوگئی۔ جب واپس آیا تو تعلیمات پر غیرحاضری کرنے والوں کی فہرست لگی تھی جس میں ایسے طلباء کا کھانا ایک ہفتہ کے لیے بند کردیا گیا۔ بڑی فکر ہوئی اب کیا ہوگا۔ ایک دو وقت تو جیسے تیسے گزارے، اس کے بعد ایک ترکیب سوچی کہ کیوں نہ حضرتؒ کے مکان پر پہنچ کر معافی تلافی کرلی جائے۔ چنانچہ موقع غنیمت دیکھ کر چھٹی ہوتے ہی حضرتؒ سے پہلے حضرتؒ کے دروازہ پر جا کر کھڑا ہوگیا کہ جب حضرت والاؒ گھر تشریف لائیں گے تو دروازہ پر کھڑا دیکھ کر ضرور پوچھیں گے۔ نتیجتاً ایسا ہی ہوا۔ جب حضرتؒ تشریف لائے تو میں نے چہرہ کچھ اور معصومانہ بنالیا۔ حضرتؒ نے آتے ہی معلوم کیا کہ کیسے کھڑے ہو؟ ڈرتے ڈرتے ہلکی آواز میں کہا کہ حضرتؒ والد مرحوم کی بیماری میں گھر گیا تھا، آنے میں تاخیر کی وجہ سے کھانا ایک ہفتہ کے لیے بند ہوگیا۔ بڑی پریشانی ہورہی ہے۔ حضرتؒ نے کچھ دیر توقف فرمایا اور بغیر کسی زجروتوبیخ کے فرمایا کہ چلو اب تو میرے ساتھ کھانا کھالو، کل صبح کو تعلیمات میں کھانا کھلنے کی درخواست دے دینا۔ اگلے دن صبح ہوتے ہی تعلیمات میں حضرت مرحوم مولانا منشی عزیز نوراللہ مرقدہٗ کو درخواست دی۔ انھوں نے حضرتؒ کو درخواست پیش کرکے کھانا جاری کرنے کی اجازت کرادی۔ پھر کبھی ایسی غلطی نہیں کی۔ یہ تھا حضرتؒ کا طلباء کے ساتھ حسن تعلق۔ دارالعلوم دیوبند کی انتظامیہ میں حضرتؒ کی رائے بڑی اہمیت کی حامل ہوتی تھی۔ اسی طرح جمعیۃ علماء ہند کے نائب صدر کے عہدہ پر رہتے ہوئے بھی بڑی خدمات انجام دیں۔ قائد جمعیۃ علماء ہند حضرت مولانا سیّد محمود اسعد مدنی مدظلہٗ اور امیر الہند وصدر جمعیۃ علماء ہند حضرت مولانا قاری سیّد محمد عثمان مدظلہٗ دونوں حضرات حضرتؒ کی رائے کو بڑی اور فیصلہ کن مانتے تھے۔ حضرتؒ کے ایسے وقت میں انتقال کرنے سے مادرِعلمی دارالعلوم دیوبند اور ہندوستان کے مسلمانوں کی مؤقر جماعت جمعیۃ علماء ہند کا ناقابلِ تلافی نقصان ہوا ہے جس کی بھرپائی ناممکن ہے۔ اللہ تعالیٰ دارالعلوم دیوبند اور جمعیۃ علماء ہند کو اس کا بہترین نعم البدل عطا کرے اور ترقی درجات کرکے جنت الفردوس میں جگہ عطا کرے، آمین ثم آمین۔ ◻◻

آہ! دادائے محترم حضرت مولانا ریاست علی بجنوری نور اللہ مرقدہٗ

تحریر: عبد اللہ حمدان دیوبندی

انسانی زندگی میں کچھ لمحات ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا زندگی میں آنا ضروری ہوتا ہے، لیکن وہی لمحات انسان کو ایسے زخم دے جاتے ہیں جو پوری زندگی رِستے رہتے ہیں۔ ایسی چوٹ پہنچاتے ہیں جس سے اُٹھنے والی ٹیس انسان کو آخری سانس تک بے چین رکھتی ہے، اگر قدرت نے انسان کو بھول کی نعمت نہ دی ہوتی تو یقیناً یہ زندگی انسان پر بڑی دشوار اور شاق گزرتی۔ ۲۳ رشعبان المعظم ۱۴۳۸ھ مطابق ۲۰ رمئی ۲۰۱۷ء کا دن میری زندگی کا ایک ایسا ہی دن تھا۔ یہ دن دادائے محترم کے مجھ سے اور ہم گھر والوں سے بچھڑنے کا تھا۔ اس دن ایک بے مثال دادا کی شفقتیں، ایک مربی کی توجہات اور ایک استاذ کی عنایتیں ہم سے جدا ہوگئیں۔ صبح تقریباً پونے چار بجے کا وقت ہوگا کہ میری ہمشیرہ کمرے میں آئیں اور کہنے لگیں کہ ابّا کی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ میں جلدی سے کمرے میں پہنچا تو وہ اپنے تخت پر بیٹھے تھے اور سینے میں گھٹن تھی۔ دل کے دورے کی کیفیت محسوس ہو رہی تھی۔ سانس لینے میں پریشانی تھی۔ پیشانی پر پسینہ تھا اور ساتھ ہی لا الٰہ الا اللہ کا ذکر بھی کر رہے تھے۔ میرے وہاں پہنچنے کے بعد والد محترم مولانا محمد سفیان صاحب قاسمی جو پہلے سے وہاں موجود تھے ڈاکٹر کو بلانے چلے گئے۔ سینے کی گھٹن لگاتار بڑھتی جا رہی تھی۔ بے چینی کی کیفیت میں کبھی بیٹھ جاتے اور کبھی لیٹ جاتے، بھاگلپوری چادر مصلے کے طور پر بچھی ہوئی تھی، جس سے اندازہ ہوا کہ تہجد کی نماز سے فارغ ہو چکے تھے، چونکہ دل کے دورے کی کیفیت تھی اس لیے میں نے کھانسنے کے لیے اصرار کیا، اصرار پر انھوں نے کھانسنے کی کوشش تو کی لیکن سینے کی گھٹن اور سانس کی بے ترتیبی کی وجہ سے کھانس نہ سکے۔ البتہ لا الٰہ الا اللہ کا ورد زبان پر لگاتار جاری رہا۔ بے چینی کی کیفیت دیکھ کر میں نے کمر کو سہلانا شروع کر دیا۔ اسی درمیان مجھے پیشانی پر آنے والے پسینے میں کمی کا احساس ہوا تو پوچھا کہ کیا سینے کی گھٹن کم ہوئی؟ انھوں نے سر ہلا کر انکار کر دیا اور اس کے معاً بعد میرے ہاتھوں سے پھسل کر تقریباً گرنے کے انداز میں بستر پر لیٹ گئے اور نزع شروع ہوگیا۔ اس وقت میری والدہ، ہمشیرہ، چھوٹے بھائی محمد شیبان سلّمہٗ اور میں چاروں موجود تھے۔ ہم نے اوّلاً لا الٰہ الا اللہ کا ورد کیا پھر میں نے سورۂ یٰسین پڑھنی شروع کر دی۔ ابھی تقریباً ایک صفحہ ہی پڑھا ہوگا کہ روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ (رحمۃ اللہ رحمۃً واسعۃً) نزع کے دوران سوائے بائیں پیر کو ہلانے کے اور کوئی حرکت نہ کی۔ نزع کا دورانیہ چار منٹ پر محیط رہا۔ انتقال کے چند منٹ بعد فجر کی اذان شروع ہوئی۔

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے:

ایک خاص بات جو اس وقت محسوس ہوئی وہ یہ کہ ان کو سانس کی وجہ سے بے چینی ضرور تھی، نیز لگاتار لا الٰہ الا اللہ کا ورد کرنا اس بات کو بتلاتا ہے کہ وہ یہ سمجھ چکے تھے کہ یہ دنیا سے جانے کا وقت ہے لیکن اس کے باوجود ان کے چہرے پر گھبراہٹ کے بجائے سکون تھا، اور گھبراہٹ ہوتی بھی کیسے کیونکہ ان پر کسی کا حق تھا نہ کسی کا قرض، نہ کسی کی کوئی چیز ان کے ذمہ تھی، وہ غالباً سامان باندھ کر بیٹھنے والے مسافر کی طرح تیار بیٹھے تھے۔ اخلاص کا سرمایہ اور عملِ صالح کا توشہ ان کے پاس تھا جیسے ہی فرشتۂ اجل آیا وہ اُٹھے اور بغیر کسی فکر و تردّد کے چلے گئے۔

آرزو دے کے تیری خاک تربت پہ آؤں گا
اب دعائے نیم شبی میں کس کو میں یاد آؤں گا

ہمہ جہت شخصیت:

دادائے محترم ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے، گویا ان کی ذات میں بے شمار لوگ بستے تھے، جن میں بے مثال محدث، دیدہ ور فقیہ، متبحر عالم، قادر الکلام شاعر، مقبول مدرس، جادو بیاں خطیب، ماہر منتظم، بلند حوصلہ قائد، عظیم دانشور، عمدہ انشاپرداز اور صاحبِ طرز ادیب شامل ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ نہ معلوم کتنے بے سہارا لوگوں کے سرپرست، مسیحا اور کتنے متعلقین و متوسلین کے ابو تھے، وہ ایک ایسی شمع تھے جو خود کو پگھلا کر دوسروں کو روشنی دیتی ہے۔ ایک ایسا درخت تھے جو لو کے تھپیڑوں اور سورج کی تپش کو اپنے اوپر لے کر دوسروں کو سایہ اور پھل فراہم کیا کرتا ہے۔ اپنا ہو کہ پرایا، امیر ہو کہ غریب، چھوٹا ہو کہ بڑا سب اپنے اپنے مسائل لاتے اور حل لے کر چلے جاتے، نیز کسی کو آنے کے لیے وقت کی بھی کوئی تحدید نہ تھی، فجر کے بعد سے لے کر عشاء کے بعد تک جس کے پاس جو وقت خالی ہوتا بے تکلف چلا آتا، دادا کے ایک قریبی عزیز مفتی عامر چاندپوری صاحب نے جب وقت کی تحدید کے لیے زیادہ اصرار کیا تو فرمانے لگے، ایسا کیا تو جا سکتا ہے، لیکن اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لوگ جس وقت چاہتے اپنی اپنی ضرورتیں لے کر چلے آتے اور آپ نے ان کے لیے کوئی وقت متعین نہیں فرمایا:

تیرے ظلِ عاطفت میں سب کو ملتا تھا سکوں
اب تری تربت پہ سایہ ظلِ رحمانی کرے

نیز مولانا عثمان کاشف الہاشمیؒ کی ادبی مجلسوں نے ان کے اندر سے ایک ظفؔر نامی شاعر کو بھی برآمد کیا تھا جس کی شاعری اگر چہ انتظام وانصرام کی مصروفیتوں نیز درس و تدریس کی مشغولیتوں کی وجہ سے زیادہ تو نہ ہوسکی لیکن جتنی بھی ہے وہ لاجواب ہے، بے مثال ہے، اس میں عقابِ تخیل کی بلند پروازی، معطر مضامین کی خوشبو غرض کہ سب کچھ شامل ہے:

ناز تھا جس کے تکلم پر لبِ اعجاز کو
کون اب رحلت پہ اس کی مرثیہ خوانی کرے

سوانحی خاکہ:

دادائے محترم کی پیدائش ۹؍مارچ ۱۹۴۰ء مطابق ۲۸؍محرم ۱۳۵۹ھ کو علی گڑھ کے محلّہ حکیم سرائے میں ہوئی۔ آبائی وطن بجنور شہر کا موضع حبیب والا ہے۔ ابھی شعور کی منزل میں قدم نہ رکھا تھا کہ یتیمی کا زخم سہنا پڑا، اور والد محترم منشی فراست علی (متوفی ۱۹۴۴ء مطابق ۱۳۶۳ھ) رحلت فرما گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

تعلیم و تربیت:

آپ نے اوّلاً اپنی ممانی عقیلہ خاتون زوجہ حسام الدین صاحب سے ناظرہ قرآن کریم پڑھا، پھر ۱۹۵۱ء میں پرائمری اسکول سے درجہ چہارم کا امتحان پاس کیا، اس کے بعد مولانا سلطان الحق صاحبؒ ناظم کتب خانہ دارالعلوم دیوبند کے ہمراہ دیوبند تشریف لے آئے، مولانا سلطان الحق صاحب سے ویسے تو کوئی خاندانی رشتہ نہ تھا لیکن اس کے باوجود انھوں نے کبھی یتیمی کا احساس تک نہ ہونے دیا۔ تعلیم وتربیت کے تمام امور اپنے ذمہ لے لیے۔

ابتداءً شعبۂ فارسی میں داخل ہوئے۔ حمد باری، کریما، پندنامہ، گلستاں، بوستاں، انوارِ سہیلی، رقعاتِ عالمگیری، اکبرنامہ وغیرہ پڑھیں۔ فارسی کے اساتذہ میں حضرت مولانا شمیم احمد صاحب دیوبندی، حضرت مولانا ظہیر احمد صاحب علوی جھنجھانوی، حضرت مولانا شفیع حسین صاحب دیوبندی شامل ہیں۔ شعبۂ فارسی سے فراغت کے بعد ابتدائی کتابیں خارج میں مختلف مدرسین سے پڑھیں، چنانچہ میزان، نحومیر، پنج گنج، علم الصیغہ، ہدایت النحو، کافیہ وغیرہ مولانا قاری اصغر علی صاحب (خلیفہ شیخ الاسلامؒ) نے پڑھائیں۔ مولانا سلطان الحق صاحبؒ نے آموختہ یاد کرانے کے لیے مولانا اکمل صاحب برادر اصغر مولانا اصلح الحسینی صاحب کو مقرر کیا۔ اس زمانے کے رفقائے درس میں مولانا لقمان الحق صاحب فاروقی، مولانا مسعود احمد بنارسی اور مولانا مقبول احمد بنارسی شامل ہیں۔

۱۹۵۴ء میں آپ کے برادر اکبر وراثت علی بن فراست علی نے اٹھارہ سال کی عمر میں دھامپور سے ہائی اسکول کا امتحان فرسٹ ڈویژن سے پاس کیا لیکن یہ خوشخبری سننے سے پہلے ہی وہ ۸؍اپریل کو آبائی وطن حبیب والا میں انتقال فرما گئے اور وہیں ان کی تدفین عمل میں آئی۔

مادرِ علمی کے آغوش میں:

۱۸؍شوال ۱۳۷۲ھ مطابق ۱۵؍مئی ۱۹۵۴ء کو دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے اور مختلف اصحاب فنون سے مختلف کتابیں پڑھیں۔ مثلاً 'کنزالدقائق' حضرت مولانا عبدالاحد صاحب سے پڑھی، 'خیالی' حضرت مولانا سیّد حسن صاحب سے پڑھی، 'سلم العلوم' حضرت مولانا محمد نعیم صاحب سے پڑھی، 'شرح جامی' حضرت مولانا نصیر احمد خاں صاحب سے پڑھی، 'قطبی' حضرت مولانا محمد حسین صاحب ملا بہاری سے پڑھی، 'ملاحسن' حضرت مولانا فیض علی شاہ کشمیری سے پڑھی اور 'شرح وقایہ' حضرت مولانا عبدالاحد صاحب اور حضرت مولانا اکمل صاحب سے مشترکہ طور پر پڑھی، 'ہدایہ اوّلین' حضرت مولانا اختر حسین میاں صاحب سے پڑھی، 'ہدایہ آخرین' حضرت مولانا معراج الحق صاحب سے پڑھی، 'تفسیر جلالین' حضرت مولانا نصیر احمد خاں سے اور 'مشکوٰۃ المصابیح' حضرت مولانا جلیل احمد صاحب علوی کیرانوی سے پڑھی۔

دورۂ حدیث کا سال:

۱۳۷۸ھ مطابق ۱۹۵۸ء کا سال ان کا دورۂ حدیث کا سال ہے۔ اس سال بخاری شریف مکمل فخر المحدثین حضرت مولانا سیّد فخر الدین مرادآبادیؒ سے پڑھی۔ مسلم شریف اور ترمذی شریف مکمل حضرت مولانا ابراہیم صاحب بلیاویؒ سے پڑھی، ابوداؤد شریف حضرت مولانا سیّد فخر الحسن صاحب مرادآبادیؒ سے پڑھی، نسائی شریف اور ابن ماجہ شریف حضرت مولانا شبیر احمد خاں صاحب بلند شہریؒ سے پڑھی، طحاوی شریف حضرت مولانا ظہور احمد صاحب عثمانی دیوبندی سے پڑھی، مؤطا امام محمد حضرت مولانا جلیل احمد صاحب علوی کیرانوی اور حضرت مولانا سیّد حسن صاحب سے مشترکہ طور پر پڑھی، مؤطا امام مالک حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیبؒ سے پڑھی، شمائل ترمذی حضرت مولانا سیّد حسن صاحبؒ سے پڑھی۔

حضرت والا علم، ذہانت، فطانت اور حاضر جوابی کا پیکر جمیل تھے۔ ہمیشہ اپنی جماعت میں ممتاز رہے اور ۱۹۵۸ء کے دورۂ حدیث کے امتحان میں اوّل پوزیشن حاصل کی، اس وقت دارالعلوم کے امتحان میں آخری نمبرات ۵۰ ہوا کرتے تھے، اس اعتبار سے کل نمبرات ۵۰۰ ہوئے مگر انہیں ۵۲۹ نمبرات ملے جو کہ دارالعلوم دیوبند کی ڈیڑھ سو سالہ تاریخ میں ریکارڈ ہے۔

فراغت کے بعد علی گڑھ سے ادیب کامل کا امتحان دیا، اس میں بھی اوّل پوزیشن حاصل کی اور سرسیّد میڈل سے سرفراز ہوئے۔

ادبِ عربی کا فطری ذوق:

دورِ طالب علمی ہی سے ادبِ عربی کا طبعی ذوق تھا۔ دوپہر کے کھانے

سے فراغت کے بعد جب سب لوگ قیلولہ کے لیے لیٹ جاتے تھے تو دادائے محترم، مولانا لقمان الحق فاروقی اور مولانا عبدالجلیل راغبی کسی درسگاہ میں جمع ہوکر عربی کی مشق وتمرین شروع کردیتے، گفتگو کرتے، مضامین لکھتے، ایک دوسرے کو ٹوکتے اور ایک دوسرے کی اصلاح کرتے۔ غرض کہ ہر ایک استاذ بھی تھا اور شاگرد بھی۔ اس وقت دورۂ حدیث کے ایک طالب علم حضرت مولانا وحیدالزماں کیرانوی 'الصوت' کے نام سے عربی میں ایک قلمی دیواری پرچہ نکالتے تھے۔ 'الصوت' کی کشش نے تینوں کو مولانا وحیدالزماں کی طرف کھینچ لیا، بس پھر کیا تھا، سبزۂ خوابیدہ لہلہانے لگا، فطرت کی ساکن ہواؤں میں روانی آگئی، پرسکون دریا طغیانی سے ہمکنار ہوا۔ 'الھیئۃ العربیۃ' کے نام سے عربی انجمن کی بنیاد ڈالی گئی۔ حضرت شیخ الاسلامؒ کی صدارت میں پہلا سالانہ جلسہ ہوا، اس جلسے نے دارالعلوم دیوبند کی چاردیواری ادبِ عربی کی ایک لہر دوڑادی:

چمن پر نور برساتا گزر جا — ہر اِک ذرّے کو چمکاتا گزر جا
تری منزل ورائے عرشِ اعظم — ہر اِک منزل ٹھکراتا گزر جا

فراغت کے بعد اپنے استاذِ گرامی فخرالمحدثین حضرت مولانا فخرالدین صاحبؒ شیخ الحدیث وصدرالمدرسین دارالعلوم دیوبند وصدر جمعیۃ علماء ہند کے دامن سے وابستہ ہوگئے۔ ان کی خدمت کرتے، سردی ہو یا گرمی، بہار ہو کہ خزاں روزانہ صبح کے وقت ناشتہ تیار کرکے ان کی خدمت میں لے جاتے، کیسی عجیب محبت تھی! کتنی عقیدت تھی! ایک بار بخاری کے درس کے دوران زلزلہ آگیا، سب طلباء اپنی اپنی جان بچاکر گھبراہٹ کے عالم میں باہر نکل گئے، لیکن وہ اُٹھے اور بے اختیارانہ انداز میں اپنے استاذِ محترم کو حصار میں لے لیا، استاذ کا دامن ملا تو اسی سے چمٹ گئے۔ عقیدتوں کی یہ وابستگی تیرہ سال پر محیط ہوگئی۔ فراغت کے اگلے سال استاذِ محترم کے درسی افادات کو دوبارہ دورۂ حدیث میں سماعت کرکے قلم بند کیا اور 'ایضاح البخاری' کے نام سے ترتیب دے کر شائع کرنا شروع کردیا۔ اس کا طریقۂ کار یہ تھا کہ دونوں سالوں کی تقاریر کو سامنے رکھ کر نیز شروحات وغیرہ کا جائزہ لے کر ایک مقالہ مرتب کیا جاتا، پھر حضرت مولانا لقمان الحق صاحب فاروقیؒ اس کی مراجعت کرتے، اس کے بعد یہ مقالہ حضرت فخرالمحدثین کے سامنے رکھ دیا جاتا۔ حضرت پورا مقالہ خود سماعت فرما کر اس کی اصلاح فرماتے۔ اس طرح تقریباً ۱۳۰۰ صفحات خود حضرت فخرالمحدثین کے تصحیح شدہ ہیں۔ اس کے بعد دادائے محترم اور حضرت مولانا لقمان الحق صاحب فاروقیؒ مل کر 'ایضاح البخاری' کی ترتیب ومراجعت وغیرہ کو انجام دینے لگے۔ پھر حضرت مولانا مولانا لقمان الحق صاحب فاروقیؒ (متوفی ۱۴۰۷ھ) کے بعد یہ تمام کام دادائے محترم کے ذمہ آگئے، لیکن 'ایضاح البخاری' کے علمی سفر کا یہ تیسرا دور انتظامی امور کی نذر ہوگیا، اور جب اس سے فرصت ملی تو پھر 'ایضاح البخاری' کی طرف متوجہ ہوگئے اور سابقہ مطبوعہ قسطوں کی نئے سرے سے کتابت و طباعت کے علاوہ دو تین جلدیں مزید مرتب فرمائیں لیکن پھر عوارض و امراض کی کثرت بالخصوص شوگر کے اثرات کی وجہ سے اس میں تسلسل قائم نہ رہ سکا، اس لیے حضرت مولانا فہیم الدین صاحب بجنوری استاذ دارالعلوم دیوبند کو اپنا شریکِ کار بنالیا، چنانچہ مولانا فہیم الدین صاحب بجنوری ترتیب ومراجعت کرکے دادائے محترم کے پاس لاتے اور ان کے سامنے پڑھتے اور دادائے محترم اس کی اصلاح کرتے۔ اس طرح دس جلدیں مکمل ہوگئیں۔ اللہ باقی ماندہ کام کو بھی جلد از جلد مکمل کرائے اور اس کو استاذ، شاگرد، مولانا لقمان الحق صاحب فاروقی، مولانا فہیم الدین صاحب بجنوری اور جو بھی اس کے اندر کسی طرح کا حصہ لے سب کے لیے صدقۂ جاریہ بنائے۔

خصوصیاتِ ایضاح البخاری:

'ایضاح البخاری' چونکہ فتح الباری، عمدۃ القاری، خطابی، ابن بطال، قسطلانی، لامع الدراری، الابواب والتراجم اور دیگر علمائے دیوبند کے دروس کا جائزہ لے کر نیز حضرت فخرالمحدثین کو زمین بناکر مرتب کی جاتی ہے اس لیے 'ایضاح البخاری' حدیث کا ایسا گلستان بن گئی جس میں ہر کلی کی مہک اور ہر پھول کی خوشبو شامل ہے۔ جو اس کا مطالعہ کرنے والے ہیں وہ یہ خوب جانتے ہیں کہ اس کا مطالعہ بلا مبالغہ انسان کو دوسری تمام شروعات سے بے نیاز کردیتا ہے۔ 'ایضاح البخاری' کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ امام بخاریؒ نے جو احناف پر اعتراض کیے ہیں 'ایضاح البخاری' ان کا بھرپور اور مسکت جواب دیتی ہے، نیز اختلافِ ائمہ کے باب میں احناف کی مکمل اور مدلل ترجمانی کرتی ہے۔ اس کی تیسری امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ تراجم بخاری کی گہرائی میں اتر کر جائزہ لیتی ہے اور تراجم بخاری کے اصل مطالب تک پہنچ کر ان کو واشگاف کرتی ہے اور اصل حقیقت ومراد کو واضح کرتی ہے نیز اس میں اقوالِ اکابر کا احاطہ کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے، اس لیے 'ایضاح البخاری' اس نظریہ سے افاداتِ اکابر کا مجموعہ بھی معلوم ہوتی ہے۔

فراغت کے بعد تلاشِ معاش:

معاش کے لیے اوّلاً خوشخطی سیکھی۔ دارالعلوم دیوبند کے شعبۂ خوشخطی کے صدر مولانا اشتیاق احمد دیوبندی آپ کے استاذ تھے۔ آپ نے اپنی ذاتی کوشش اور جہدِ پیہم سے عربی و اُردو رسم الخط میں فنی حسن اور نفاست پیدا کی اور 'ایضاح البخاری' کو قسط وار کتابت کرکے شائع کرنا شروع کردیا۔ اسی طرح مختلف کتابوں کی کتابت کی جن میں 'مظاہرِ حق جدید' کی ابتدائی دو جلدیں شامل ہیں۔

شادی:

۱۹۵۴ء میں شادی ہوئی۔ احقر کی دادی مولانا سلطان الحق صاحب فاروقی

کی صاحبزادی تھیں۔ نکاح مدنی مسجد میں حضرت مولانا جلیل احمد صاحب علوی کیرانوی نے پڑھایا۔ اولاد میں تین صاحبزادگان ہیں: مولانا محمد سفیان صاحب عرشی قاسمی، مولانا قاری محمد عدنان سعدی صاحب قاسمی اور مولانا مفتی محمد سعدان جامی صاحب قاسمی۔ احقر کے والد ماجد مولانا محمد سفیان صاحب قاسمی دادائے محترم کے قائم کیے ہوئے ادارہ کاشانۂ قاسم کے منیجر ہیں۔ انھوں نے دادائے محترم کی بہت خدمت کی۔ ان کی فراغت دارالعلوم دیوبند سے ۱۴۰۷ھ مطابق ۱۹۸۷ء میں اعلیٰ نمبرات کے ساتھ ہوئی لیکن اس وقت دادائے محترم کی معاشی تنگی، مہمانوں کی کثرت اور محدود ذرائع کو دیکھ کر جیدالاستعداد ہونے کے باوجود تدریسی خدمت کے بجائے طلبِ معاش میں لگ گئے اور اس طرح دادائے محترم کا سہارا بنے۔ دوسرے صاحبزادے اور احقر کے بڑے چچا مولانا قاری محمد عدان سعدی ہیں، انھوں نے بھی دادائے محترم کی ہر طرح خدمت کی۔ جب دادا پر قرض کا بوجھ بہت زیادہ ہوگیا اور اُترنے کی کوئی سبیل نظر نہ آئی تو یہ کوشش کر کے امریکہ تشریف لے گئے۔ پہلے قرض کے بوجھ سے آزاد کیا، جس میں کئی سال لگے، پھر تینوں بھائیوں کے لیے مکان تعمیر کر کے دادائے محترم کو ایک اور فکر سے آزادی دلائی۔ تیسرے صاحبزادے جناب مفتی سعدان صاحب قاسمی ہیں۔ یہ جامعہ امام انور شاہ میں استاذ ہیں۔ دادائے محترم کو ڈاکٹر کے یہاں لے جانا ہو یا کوئی اور خدمت، ہر قدم پر یہ والد محترم کے ساتھ کھڑے نظر آئے۔ اللہ سب کو اپنی شانِ کریمی سے بہترین بدلہ عطا فرمائے۔ اولاد کے بارے میں دادائے محترم کا ایک قول یاد آتا ہے جو احقر نے استاذ الاساتذہ مولانا نور عالم صاحب سے سنا تھا۔ وہ فرمارہے تھے کہ ''مجھے اپنی اولاد پر فخر ہے، یہ جو بھی کماتے ہیں میرے حوالے کر دیتے ہیں، پھر اگر دس روپے کی بھی ضرورت ہو تو مجھ ہی سے لیتے ہیں۔''

ان کے علاوہ دیگر متعلقین، رشتہ دار، اعزہ، اقرباء جنھوں نے ہر طرح سے دادائے محترم کا ہاتھ بٹایا، جب جس طرح کی مدد کی ضرورت ہوئی سامنے آ کر اپنی خدمات پیش کیں، جن میں خاص طور پر مولانا برہان الحق صاحب فاروقی استاذ دارالعلوم دیوبند اور حضرت مولانا سلمان صاحب بجنوری نقشبندی استاذ دارالعلوم دیوبند شامل ہیں۔ اللہ سب کو اپنی شانِ کریمی کے مطابق بہترین بدلہ عطا فرمائے۔

مدرسہ اصغریہ میں:

۱۹۶۵ء میں وہ مدرسہ اصغریہ کے مدرس مقرر ہوئے۔ ان کے استاذِ گرامی مولانا عثمان کاشف الہاشمی اس وقت وہاں کے ناظم تعلیمات تھے، دوسال تک وہاں مدرس رہے، ابتدائی درجات کی کتابیں ان کے متعلق تھیں۔ ۱۰/اکتوبر ۱۹۶۶ء کو آپ کی والدہ ماجدہ جمیلہ خاتون دیوبند میں رحلت فرما گئیں اور دیوبند کے قبرستانِ قاسمیہ میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔ ۱۹۶۷ء میں وہ تلاشِ معاش کے لیے دلی روانہ ہوگئے اور تین یا ساڑھے تین سال وہاں رہے، تقریباً ڈیڑھ سال تک الجمعیۃ پریس، گلی قاسم جان کے منیجر رہے اور باقی ماندہ تین یا ساڑھے تین سال وہاں رہ کر دیوبند واپس تشریف لے آئے اور کاشانۂ رحمت، مکتبۂ مجلسِ قاسم المعارف کے نام سے ادارے قائم کیے اور تین جلدوں میں مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی کی کتاب 'تاریخ اسلام' اور تین ہی جلدوں میں قاضی محمد سلیمان منصور پوری کی کتاب 'رحمۃ للعالمین' شائع کی۔ اس طرح حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی کتاب 'الانتباہات المفیدہ فی الاشتباہاتِ الجدیدہ' اور خود دادائے محترم کی کتاب 'نغمۂ سحر' بھی انہی اداروں سے شائع شدہ ہیں۔

خدماتِ دارالعلوم:

۱۳۹۱ھ مطابق ۱۹۷۱ء کو دفتر اہتمام دارالعلوم دیوبند کی جانب سے مدرسین کی ضرورت کے لیے اعلان جاری کیا گیا۔ دادائے محترم نے بھی درخواست پیش کی، حضرت فخر المحدثین مولانا فخر الدین احمد مرادآبادیؒ، حضرت مولانا منّت اللہ رحمانیؒ اور حضرت مولانا منظور نعمانیؒ نے انٹرویو لیا۔ ان حضرات کی رپورٹ پر ابتدائی درجہ میں تقرر ہوا۔ چند مہینے گزرنے کے بعد رجب ۱۳۹۲ھ کو استقلال منظور کرلیا گیا۔ اس سال نحو میر، شرح مأۃ عامل، علم الصرف، انشائے عربی، نفحۃ العرب، روضۃ الادب اور مشکوۃ الآثار ان کے متعلق رہیں اور استقلال کے چند مہینے بعد ۱۶/اپریل ۱۹۷۲ء کو آپ کے سب سے قریبی استاذ فخر المحدثین حضرت مولانا فخر الدین احمد مرادآبادیؒ دارِ فانی سے دارِ بقا کی جانب کوچ کر گئے اور مرادآباد میں تدفین عمل میں آئی۔

۷۳-۱۹۷۲ء میں شرح وقایہ، مختارات، کافیہ، ہدایۃ النحو، صف ابتدائی (برائے تدریس عربی) اور صف ثانوی کے اسباق پڑھائے۔ ۷۴-۱۹۷۳ء اور ۷۵-۱۹۷۴ء میں مقاماتِ حریری، نورالانوار، ملاحسن، تمرین عربی اور الفیۃ الحدیث کی کتابیں آپ کے متعلق رہیں۔ ۷۶-۱۹۷۵ء میں آپ کو وسطیٰ میں ترقی دے دی گئی۔ اس ترقی کے لیے دادائے محترم نے از خود کوئی درخواست نہ دی بلکہ مولانا محمد میاں صاحب دیوبندیؒ نے آپ کو بلا کر درخواست لکھوائی جس کی بنا پر آپ کو ترقی دے دی گئی۔ اس سال البلاغۃ الواضحہ، ہدایہ ثانی، الاشتباہ والنظائر، حسامی، تمرین النحو اور کتاب النحو آپ کے زیر درس رہیں، نیز النحو الواضح کے ساتھ دیگر تمام کتابیں اگلے سال یعنی ۷۷-۱۹۷۶ء مطابق ۹۷-۱۳۹۶ء میں بھی آپ ہی سے متعلق رہیں۔

۷۷-۱۹۷۶ء میں ملاحسن، حسامی، اصول الشاشی، نورالانوار، ہدایہ اوّل اور البلاغۃ الواضحہ آپ کے زیر درس رہیں۔ ۷۸-۱۹۷۷ء میں تفسیر ابن کثیر، شرح عقائد، ہدایہ ثانی، البلاغۃ الواضحہ، ہدایہ ثانی، دیوانِ متنبّی آپ

نے پڑھائیں۔ ۷۹-۱۹۷۸ء میں تفسیر ابن کثیر، شرح عقائد، ہدایہ ثانی، البلاغۃ الواضحہ آپ کے زیر درس رہیں۔۷۹-۱۹۸۰ء میں مشکوٰۃ شریف، نخبۃ الفکر، البلاغۃ الواضحہ، دیوان حماسہ اور سبعہ معلقہ کے اسباق آپ کے زیر درس رہے۔ نیز اسی سال ۲۱-۲۲-۲۳/ مارچ ۱۹۸۰ء کو دارالعلوم دیوبند میں صدسالہ کا اجلاس ہوا جس کی افتتاحی نشست میں پہلی بار آپ کا لکھا ہوا ترانہ 'یہ علم وہنر کا گہوارہ' پڑھا گیا۔ حلاوت و چاشنی سے بھرپور، زبان، افکار و خیالات کا بہاؤ، اشعار کے سانچوں میں تاریخ کا احاطہ، فکر دیوبند کی مکمل ترجمانی، اکابر کے برمحل تذکرے، منفرد لب و لہجے و اسلوب اور استعارات و کنایات کی ندرت اس کی خوبیاں تھیں جنھوں نے سامعین پر وجد کی کیفیت طاری کردی اور وہیں سے اس کو وہ قبولیت عامہ ملی جس کی نظیر نہیں ملتی۔ یہ ترانہ دادائے محترم کے ایک بہت ہی قریبی عزیز حضرت مولانا جمیل الرحمٰن قاسمی پرتاپ گڑھی کے اصرار پر لکھا گیا۔ صد سالہ سے پہلے نیز اسی سال آپ کو کسی درخواست یا سفارش کے بغیر وسطیٰ الف میں ترقی دے دی گئی۔

۸۱-۱۹۸۰ء میں مشکوٰۃ شریف، نخبۃ الفکر، البلاغۃ الواضحہ، دیوان حماسہ، ابن ماجہ شریف اور ہدایہ ثانی آپ کے متعلق رہیں۔ ۸۱-۱۹۸۲ء میں ابن ماجہ شریف، مشکوٰۃ شریف، نخبۃ الفکر اور البلاغۃ الواضحہ آپ کے زیر درس رہیں۔ ۸۳-۱۹۸۲ء میں مذکورہ بالا کتابیں آپ نے پڑھائیں اور اسی سال آپ کو رسالہ 'دارالعلوم' کا مدیر مسئول مقرر کیا گیا۔ لفظی تنوع، فکری قدرت اور معنوی زرخیزی ان کے مضامین کی خوبیاں تھیں۔ شگفتہ اور منفرد اسلوب، نپے تلے جملے، جاندار محاورے ان کا وہ تحریری حسن تھا جو قاری کے دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچ لیا کرتا تھا۔

مولانا عبدالجلیل راغبی 'کتاب واردات' کے پیش لفظ میں صفحہ ۸ پر لکھتے ہیں:

''ابھی تک بھائی جلیل کی شاعری کا نونہال دیوبند کی ادبی سرزمین کے علاوہ کسی کا ممنونِ کرم نہیں تھا کہ اچانک مولانا لقمان الحق فاروقی نے ایک دن کہا، جلیل! تمہیں شعروسخن کا ذوق ہے، چلو تمھیں ایک باکمال شاعر سے ملادیں، یہ شاعر تھے حضرت کاشف الہاشمی نکھرا ہوا رنگ، بلند پیشانی، سنہرے چشمے کے احسانات سے گرانبار بڑی بڑی آنکھیں، نکلتا ہوا قد، ذہانت کا پیکرِ جمیل، بیٹھیں تو کوہِ گراں کی نشست، چلیں تو ڈھال سے اُترتے ہوئے محسوس ہوں، یہی تھے مملکتِ شعروسخن کے فراموش تاجدار۔ اس فن میں کسی سے تلمذ نہیں، مگر ذرّوں کو ہاتھ لگادیں تو وہ ستارے بن کر چمکنے لگیں، ان کو ترتیب سے رکھ دیں تو کہکشاں کی تصویر اُبھر آئے، مضامین ان کے سامنے خود گرفتاری کی پیش کشی کریں اور الفاظ موتیوں کی لڑی بن کر ان کے قلم سے بکھرنے میں فخر محسوس کریں۔''

علمی مشغولیت اور ساتھ ہی تعلیمات کی بھاری ذمہ داری کے سبب رسالہ 'دارالعلوم' کی ادارت زیادہ نہ چل سکی اور دوسال بعد ہی آپ نے ذمہ داری سے معذرت کردی۔

۸۳-۱۹۸۴ء میں مذکورہ بالا کتب کے علاوہ حجۃ اللہ البالغہ بھی آپ کے متعلق رہی۔ نیز اسی سال آپ کو معذرت اور انکار کے باوجود درجۂ علیا میں ترقی دے دی گئی اور اسی کے ساتھ ساتھ آپ کو مجلس تعلیمی کا نائب ناظم بھی مقرر کیا گیا۔ ۸۴-۱۹۸۵ء میں مشکوٰۃ شریف، نخبۃ الفکر اور ابن ماجہ شریف کے اسباق آپ کے متعلق رہے، اور اس کے ساتھ ساتھ اسی سال حضرت مولانا وحید الزماں قاسمی کیرانویؒ کو مجلس شوریٰ نے معاون مہتمم منتخب کیا تو آپ کو ان کی جگہ مجلس تعلیمی کا ناظم مقرر کردیا گیا۔ اس وقت ان کے نائب کے طور پر حضرت مولانا سیّد ارشد مدنی اور حضرت مولانا قمرالدین صاحب گورکھپوری تھے اور جناب منشی عزیز احمد صدیقی صاحب دفتر تعلیمات میں اس وقت منشی کے عہدے پر فائز تھے۔

دادائے محترم کی نظامت تعلیمات کا دور دارالعلوم کے ہنگامی حالات کا دور تھا۔ انتظامیہ کے سامنے ایک ساتھ کئی چیلنج منہ کھولے کھڑے تھے۔ جا بجا ہونے والے طلباء کے ہنگاموں کو سرد کرنا بھی تھا، اور نئی انتظامیہ پر اعتماد بحال کرنا بھی، نیز دارالعلوم کو از سر نو منظّم کرکے دوبارہ ترقی کی شاہراہ پر لانا بھی۔ نتیجتاً ان کو محنت و مشقت کے شدید مراحل سے گزرنا پڑا۔ ایک ایک دن میں لگا تار ۲۲-۲۲ گھنٹے کام بھی کرنا پڑا۔ بارہا ایسا بھی ہوا کہ وہ تعلیمات کے لیے نکلتے اور پندرہ دن بعد گھر واپس آتے۔ گھر سے صرف ان کا کھانا بھجوا دیا جاتا، اس وقت جبکہ انتظامیہ اور دفاتر پر حملے کا خطرہ ہر آن رہتا تھا تو وہ اپنی جان کی پرواہ نہ کرکے تعلیمات کی حفاظت اور اس کے کام کی خاطر دفتر ہی میں سو جاتے تھے۔ شاید اسی جہدِ پیہم اور بے مثال کوششوں کا نتیجہ تھا کہ ان کا دور بحیثیت نائب ناظم تعلیمات و ناظم تعلیمات اصلاحات کا دور سمجھا گیا اور اس زمانے میں بہت سی اصلاحات ہوئیں:

(۱) ایک اصلاح جدید داخلوں کے نظام پر کی گئی۔ پہلے امتحانِ داخلہ تقریری ہوتا تھا، جس میں کثرت کی وجہ سے کارروائی تاخیر سے ہو پاتی تھی، جس کی وجہ سے امتحانِ داخلہ کو تحریری کردیا گیا اور پرچوں کی جانچ کا طریقہ یہ اختیار کیا گیا کہ تمام کاپیاں نام کی جگہ کوڈ نمبر ڈال کر ایک جگہ رکھ دی جاتیں، تمام ممتحن ایک ساتھ بیٹھ کر کاپیاں جانچتے، اس لیے کوئی نہیں بتا سکتا کہ کون سا پرچہ کس کے پاس جائے گا۔

(۲) دوسری اصلاح یہ ہوئی کہ پہلے سالانہ کے علاوہ دو اور امتحان ہوتے تھے۔ سہ ماہی اور شش ماہی امتحانات کی تیاری اور اس کے بعد تعطیل میں کافی

وقت صرف ہوجاتا، لہٰذا سہ ماہی ختم کرکے وسط مدتی امتحان کردیا نیز ششماہی کو بالکل سالانہ کی طرح تحریری اور پروقار بنایا۔

(۳) سالانہ امتحان کی جانچ کو محتاط بنانے کے لیے کوڈ نمبر کا طریقہ اپنایا، سرورق جس پر طالب علم کا نام ہے، پھاڑ کر الگ کرلیا جاتا، جس کی وجہ سے تکمیلات کے شعبوں میں جید الاستعداد طلباء کے آنے کی وجہ سے ان کی افادیت بہت بڑھ گئی۔

(۴) نصاب کی تکمیل پر توجہ دی گئی، اچھے باصلاحیت اساتذہ کا تقرر کیا گیا، نیز تقسیم اسباق میں متعلقہ فن سے مناسبت کا بھی لحاظ رکھا گیا۔

(۵) شعبۂ تجوید میں اچھے قراء کا تقرر کیا گیا جس کی وجہ سے پورے ملک میں شعبہ کے وقار میں اضافہ ہوا۔

(۶) شعبۂ تحفیظ القرآن کی کارکردگی بہتر بنانے کی کوشش کی گئی، اساتذہ کو مختلف اصول وضوابط کا پابند بنایا گیا، اس طرح اس شعبے کی کارکردگی بہتر ہوگئی۔

(۷) پہلے فارسی اور دینیات الگ الگ شعبے تھے، فارسی کا نصاب چھ سال اور دینیات کا چار سال تھا۔ اس طرح مبادیات میں دس سال صرف ہوجاتے تھے اس لیے ان دونوں کو ضم کرکے پانچ سالہ نصاب بنادیا گیا۔

(۸) تعلیم کے مراحل میں ابتدائی درجات استعداد سازی کی بنا ہوتے ہیں، اس لیے درجہ چہارم تک کی تعلیم کو مدرسہ ثانویہ کے علاحدہ کیا گیا تاکہ خصوصی توجہ دی جاسکے۔

(۹) پہلے تکمیل افتاء، تکمیل ادب، تکمیل تفسیر، تکمیل دینیات یہ چار شعبے تھے، تکمیل دینیات کی جگہ تکمیل علوم کے نام سے ایک جامع نصاب تیار کیا گیا۔

(۱۰) اکابر کی خصوصی فکر سے واقف کرانے کے لیے دراستہ المعارف کے نام سے ایک تکمیل کے شعبہ کا قیام عمل میں آیا۔

(۱۱) پہلے سالِ ہفتم، سالِ ششم اور سال سوم کی دو دو جماعتیں تھیں، طلباء کی تعداد کے پیشِ نظر ان تینوں کی تین تین جماعتیں بنادی گئیں۔

(۱۲) چار شعبوں میں سلسلۂ تدریب (ٹریننگ) قائم کیا گیا۔

(الف) دورۂ حدیث یا تکمیلات میں امتیازی نمبرات لانے والے دو طلباء کو ہر سال تدریس کی تربیت کے لیے منتخب کیا جاتا ہے، اس کے لیے تعلیمی اور اخلاقی ریکارڈ دیکھا جاتا ہے۔ (بعد میں انٹرویو شروع ہوگیا) اور ان کو وظیفہ بھی دیا جاتا ہے، یہ انتخاب دو سال کے لیے ہوتا ہے۔

(ب) افتاء میں تدریب: فتاویٰ نویسی کی تمرین اور اس موضوع پر خصوصی تربیت کے لیے دارالافتاء کے دو ممتاز طلباء کو اس شعبے میں داخلہ دلایا جاتا ہے، اس کی مدت بھی دو سال ہے۔

(ج) اسی طرح شعبۂ تجوید میں معین التجوید کی حیثیت سے داخلہ دلایا جاتا تھا، نیز وظیفہ بھی دیا جاتا تھا۔

(د) شعبۂ کتابت میں معینِ کاتب کی حیثیت سے رکھا جاتا تھا، نیز وظیفہ بھی دیا جاتا تھا۔ (بحوالہ: 'دارالعلوم دیوبند کا شاندار ماضی، تابناک حال، روشن مستقبل'۔ یہ رپورٹ پندرہ سال کی ہے جن میں دادائے محترم کا زمانہ دس سال ہے، باقی سال علامہ قمرالدین گورکھپوری اور مولانا وحید الزماں کیرانوی کا ہے)

۸۵-۱۹۸۶ء میں مشکوٰۃ شریف، نخبۃ الفکر اور ابن ماجہ شریف آپ کے متعلق رہیں۔ ۸۶-۱۹۸۷ء سے ۹۱-۱۹۹۰ء تک مشکوٰۃ شریف، نخبۃ الفکر، البلاغۃ الواضحہ اور ابن ماجہ شریف آپ سے متعلق رہیں۔

۱۹۸۸ء میں انھیں شیخ الہند اکیڈمی کا نگراں مقرر کیا گیا، یہ ادارہ ۸۳-۱۹۸۲ء میں اکابر علمائے دیوبند کے علوم ومعارف کی اشاعت کی غرض سے وجود میں لایا گیا، اس کے پہلے نگراں حضرت مولانا سعید احمد اکبرآبادیؒ تھے۔ نیز یہ ادارہ مادرِ علمی کی تصنیفی وصحافتی زندگی کا علمبردار بھی ہے۔ دادائے محترم کے زمانے میں اس سے کئی کتابیں وجود میں آئیں:

(۱) **شوریٰ کی شرعی حیثیت**:

دارالعلوم دیوبند کے ہنگامی حالات کے دوران جب یہاں کا ماحول ناسازگار بلکہ انتشار کی کیفیت سے دوچار تھا، اس وقت مسیح الامت حضرت مولانا مسیح اللہ خاںؒ جلال آبادی کی طرف سے 'رسالۂ اہتمام وشوریٰ' نامی ایک تحریر منظرِ عام پر آئی، جس میں انھوں نے مشورے کو مستحسن قرار دینے کے باوجود شوریٰ کی بالادستی کو غیر ضروری قرار دیا اور مہتمم کو اصل مان کر دارالعلوم کے دستورِ اساسی کو غیر شرعی قرار دیا، چونکہ حضرت والا حضرت تھانویؒ کے خلیفہ تھے اور علم ومعرفت کے حوالے سے ایک خصوصی شان کے حامل تھے اس لیے ان کی تنقید کو باوزن گردانا گیا، صورتِ حال کی نزاکت کے پس منظر اکابر علمائے کرام نے بشمول حضرت مولانا معراج الحق صاحبؒ، حضرت فدائے ملتؒ، حضرت مہتمم صاحبؒ، حضرت مولانا وحید الزماں قاسمی کیرانویؒ نے موضوع کی تنقیح کے لیے دادائے محترم کا انتخاب کیا، پھر آپ نے قرآن وحدیث کا مطالعہ، صحابۂ کرام کے اقوال نیز اکابرین علمائے دیوبند کی تحریرات کو یکجا کرکے اس کا نچوڑ اس کتاب میں پیش کیا، پھر پورا مسودہ حضرت مفتی محمود صاحب گنگوہیؒ کو سنایا۔ آپ نے کچھ مشورے دیئے، کچھ اضافے فرمائے اور دعاؤں سے نوازا۔ اس پر تقریظ بھی لکھی، اس کے علاوہ حضرت مولانا معراج الحق صاحبؒ، حضرت مولانا شیخ نصیر احمد خاں صاحبؒ، حضرت مولانا قاضی اطہر مبارکپوری صاحبؒ نے بھی اس پر تصدیق وتقریظ ثبت کی۔ مقدمہ حضرت

مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب بجنوریؒ نے لکھا اور مولانا وحید الزماں قاسمی کیرانویؒ نے اس کا نام 'شوریٰ کی شرعی حیثیت' تجویز کیا۔

یہ کتاب اُردو زبان میں اپنے موضوع کی اکیلی اور منفرد کتاب ہے جو مصنف میں فکر ونظر کی پختگی، شعور واحساس کی بلندی، وسعتِ مطالعہ، تحقیق و تدقیق، سرعتِ قلم اور استنباطی طبیعت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

(۲) اجودھیا کے اسلامی آثار:

یہ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی دامت برکاتہم کی کتاب ہے۔اس کتاب کے عرض ناشر میں خود دادائے محترم لکھتے ہیں:

''اجودھیا کے اسلامی آثار میں تقریباً ۲۷ مشاہیر اہلِ علم اور مشائخ تصوف کا تذکرہ ہے جنھوں نے اجودھیا کی سرزمین میں توحید کا چراغ روشن کیا، انہی حضرات کی متعدد خانقاہوں کا ذکرِجمیل ہے جہاں ذکرِالٰہی کی مجلسیں قائم رہیں، کتنے ہی ایسے مقابر ومزارات کی تفصیلات ہیں جن میں علم ومعرفت اور شریعت وطریقت کے خزانے مدفون ہیں۔متعدد اہم ترین مسجدوں کے تفصیلی تذکرے ہیں جن سے اسلامی تاریخ وابستہ ہے اور انھیں مسجدوں میں ایک بابری مسجد بھی ہے جس کے سلسلے میں یومِ تاسیس سے لے کر آج تک کی صحیح، مفصل اور مستند سرگزشت سپردِ قلم کی گئی ہے۔

(۳) ادلۂ کاملہ (۲) ایضاحِ الادلہ:

یہ دونوں کتابیں حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ کی ہیں جن کو شیخ الہند اکیڈمی نے استاذ الاساتذہ حضرت اقدس مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری اور حضرت مولانا مفتی محمد امین صاحب پالن پوری دامت برکاتہم کی تصحیح وتسہیل کے بعد شائع کیا گیا۔حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ کی حیاتِ مبارکہ میں وکیلِ اہلِ حدیث مولانا محمد حسین بٹالوی نے احناف کے دس مسائل بشمول تقلید، رفع یدین، آمین بالجہر، قرأت خلف الامام کو لے کر علمائے احناف کو چیلنج کیا کہ کوئی حدیثِ صحیح قطعی الدلالہ پیش کی جائے، نیز اس پر انعام کا بھی اعلان کردیا۔چونکہ اس سے مسلکی آگ کے پھیلنے کا اندیشہ تھا اس لیے حضرت شیخ الہندؒ نے اپنے استاذ حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ کے مشورہ سے ان اشکالات کے بھرپور اور مسکت جواب 'ادلۂ کاملۂ کے نام سے دیئے۔حضرت میاں صاحب اصغر حسینؒ فرماتے ہیں: ''ہر اعتراض کا بظاہر ایک الزامی جواب تھا، لیکن اسی کے ضمن میں ایک اور بعض جگہ دو دو تحقیقی جواب بھی موجود تھے۔''

حضرت شیخ الہندؒ کی یہ کتاب مشہور ہوگئی تو غیر مقلدین کے ایک محمد احسن امروہوی نام کے شخص نے (جو بعد میں قادیانی ہوگیا) 'مصباح الادلۃ لدفع الادلۃ الاذلۃ' کے نام سے اس کا جواب لکھا، جس پر حضرت شیخ الہندؒ نے 'ایضاح الادلۂ لکھ کر 'مصباح الادلۂ میں پیش کیے ہوئے شبہات کو رد کیا، اور اس طرح اس فتنے کا کلی طور پر سدباب ہوا۔

'ایضاح الادلۂ میں کتابت کی ایک افسوسناک غلطی درآئی تھی اس لیے مجلسِ شوریٰ نے یہ طے کیا کہ اس کو دوبارہ چھاپا جائے، اور چونکہ 'ایضاح الادلۂ کا سمجھنا 'ادلۂ کاملۂ کے سمجھنے پر موقوف تھا لہٰذا ان دونوں کتابوں کو تصحیح وتسہیل کے ساتھ شیخ الہند اکیڈمی سے شائع کیا گیا۔

(۵) تفہیم القرآن کا علمی و تحقیقی جائزہ:

تفہیم القرآن کے اندر مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ سے اجتہادی غلطیاں در آئی ہیں، ان کا جائزہ لے کر مودودی صاحب کی گمراہی کو واضح کیا گیا ہے، خلاصہ یہ کہ دادائے محترم نے اس کے مقدمے میں حضرت فخر المحدثین کے حوالے سے اہلِ سنت والجماعت اور غیر اہلِ سنت والجماعت کو پرکھنے کی ایک کسوٹی متعین فرمائی ہے، فرماتے ہیں کہ جو شخص اصولِ تفسیر، اصولِ حدیث، اصولِ فقہ، اجماع، علم کلام اور تصوف میں جمہور کی راہ سے الگ چلتا ہے وہ اہلِ سنت والجماعت سے خارج شمار کیا جائے گا اور ظاہر ہے کہ مولانا مودودی صاحب تفسیر بالرائے کے قائل ہیں، لہٰذا ان کا اہلِ سنت والجماعت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

۹۲-۱۹۹۱ء اور ۹۳-۱۹۹۲ء میں مشکوٰۃ شریف، نخبۃ الفکر، البلاغۃ الواضحہ، ابن ماجہ شریف، دیوان حماسہ اور سبعہ معلقہ کے اسباق آپ سے متعلق رہے۔

۹۴-۱۹۹۳ء اور ۹۵-۱۹۹۴ء میں مشکوٰۃ شریف، نخبۃ الفکر، البلاغۃ الواضحہ، ابن ماجہ شریف اور مواقف المسترشدین آپ سے متعلق رہیں۔

۹۶-۱۹۹۵ء سے ۲۰۰۸ء تک مشکوٰۃ شریف، نخبۃ الفکر، البلاغۃ الواضحہ اور ابن ماجہ شریف آپ کے زیر درس رہیں۔

۲۰۰۹ء سے ۲۰۱۷ء تک ترمذی شریف جلد اوّل اور البلاغۃ الواضحہ کے اسباق آپ سے متعلق رہے:

کون پھونکے گا یہاں کردار کا پڑھ کر فسوں
ڈھونڈتا ہوں صاحبِ دل، سوزشِ خیر القرون
اُٹھ گئی صحنِ چمن سے عزتِ اہلِ جنوں
موت! بتلا دے کہ آخر کس طرح ماتم کروں

مختلف تحریری خدمات:

زندگی کے آخری سالوں میں وہ کئی کتابوں کی تحقیق وترتیب میں لگے رہے جن میں 'کشاف اصطلاحات الفنون' شامل ہے۔یہ کتاب قاضی محمد اعلیٰ تھانوی (المتوفی ۱۱۵۸ھ) کا لکھا ہوا فنِ اصطلاحات کا ایک ایسا انسائیکلوپیڈیا ہے جس میں ساڑھے تین ہزار سے زائد اصطلاحات کا استیعاب اور سینکڑوں

کتابوں سے استفادہ کرکے ان کی باحوالہ تعریف وتشریح شامل ہے۔اس کتاب کو اپنے عہد تالیف تک اصطلاحات کے باب میں سب سے عمدہ اور جامع کتاب قرار دیا گیا۔اس کا قدیم اڈیشن ۱۸۵۳ء سے ۱۸۶۲ء کے درمیان کلکتہ سے قسط وار شائع ہوا۔ پھر اس کو مستشرق لوئس اسپرنگر کی مساعی سے تصحیح اور اضافے کے بعد دو ضخیم جلدوں میں شائع کیا گیا اور پھر اس کا عکس حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی ہدایت پر سہیل اکیڈمی لاہور کی طرف سے ۱۹۹۳ء میں طبع کیا گیا۔اس میں کئی باتیں اصلاح طلب تھیں:

(۱) یہ کتاب لوہے کے حروف سے ٹائپ شدہ تھی جس کا پڑھنا دشوار تھا، ضرورت تھی کہ اسے کتابت کراکے چھاپا جائے۔

(۲) مصنف نے اصطلاحات کی ترتیب میں الف، بائی ترتیب ملحوظ نہیں رکھی جو کہ آج کل متداول ہے، بلکہ انھوں نے پہلے حرف کو باب اور تیسرے کو فصل قرار دیا تھا، یعنی کہ لفظ ادب باب الالف، فصل الدال میں نہیں بلکہ باب الالف فصل البا میں ملتا تھا۔

(۳) تیسرے یہ کہ اس میں جگہ جگہ فارسی عبارتیں تھیں جن کا عربی ترجمہ نہیں تھا۔

(۴) چوتھے یہ کہ اس میں علاماتِ ترقیم کا لحاظ نہیں کیا گیا تھا، نیز اس میں آیات واحادیث کی تخریج کی بھی ضرورت تھی۔

لہٰذا دادائے محترم نے کچھ عرصہ مولانا عارف جمیل صاحب مبارکپوری دامت برکاتہم اور کچھ عرصہ مولانا اشرف عباس صاحب سعادتی قاسمی دامت برکاتہم کے ساتھ مذکورہ بالا اصلاحات کیں۔

خلاصۃ التفاسیر:

دوسری اہم کتاب جس کی تدوین وتحقیق کی گئی ہے وہ ہے خلاصۃ التفاسیر، یہ کتاب اسم با مسمّٰی ہے۔اس میں احکام کے باب میں مشہور ومقبول روایتیں لی گئی ہیں، ترغیب وترہیب میں بھی کتب معتبرہ کا لحاظ کیا گیا ہے، مسائل فقہیہ میں احناف کی قابلِ اعتماد کتابوں کا لحاظ کیا گیا۔ چونکہ یہ کتاب نایاب ہوچکی تھی، البتہ دارالعلوم دیوبند کے کتب خانے میں اس کا ایک نسخہ موجود تھا، اس لیے دادائے محترم نے حضرت مولانا عبدالرزاق صاحب امروہوی کے ساتھ اس کی ازسرِ نو تدوین وتحقیق کی، چنانچہ آنے والے تمام احادیث اور اقوالِ صحابہ کا کتب معتبرہ سے حوالہ دیا گیا، نیز احادیث کے نمبر، کتاب، باب اور مطبع کو بھی بتلایا گیا، جو حوالے مصنف نے دیئے تھے ان کی مراجعت کرکے نئے انداز سے پیش کیا گیا، ضروری عناوین کا اضافہ کیا گیا، رموزِ املاء کا لحاظ کیا گیا اور اس کے علاوہ بھی دیگر کئی کام کیے گئے۔

تیسری کتاب جس کو مرتب کیا گیا وہ ہے 'کلیاتِ کاشف'۔ یہ دادائے محترم کے دبستانِ شعروشاعری کے راہبر اور استاذ اور گلستانِ قال اللہ وقال الرسول کے ہم قدم وہم درس حضرت مولانا عثمان کاشف الہاشمیؒ کی کلیات کا مجموعہ ہے، یہ عجیب وغریب صلاحیتوں کے پیکرِ جمیل تھے، علم کی بلندی پر متمکن تھے، لیکن تواضع اور اخلاقِ حسنہ کا تراشیدہ ہیرا بھی، فطری ادیب تھے، لیکن اسلوبِ علمی، اسلوبِ خطابی کے شاہکار بھی، انداز اتنا اثر انگیز کہ ترنم کا آبشار گرتا معلوم ہوتا۔غزل سناتے تو سامعین کو اپنی ہی سرگزشت معلوم ہوتی۔نظم سناتے تو الفاظ ومعانی کے سمندروں میں غرق کردیتے، ان کا مرتبہ آنکھوں کو موتی لٹانے پر مجبور کردیتا اور دامنِ دل کو بے اختیار کھینچ لیتا اس کے لیے ان کو نہ ماحول کی ضرورت تھی نہ وقت کی۔اِدھر توجہ کرتے اور اُدھر فکر وسخن کے شاہکارے ڈھلنا شروع ہوجاتے۔

کلیاتِ کاشف کی ترتیب کا کام دادائے محترم کی نگرانی میں حضرت مولانا اشتیاق صاحب دربھنگوی نے کیا۔دادائے محترم کے پاس دو کاپیاں تھیں، نیز مولانا حسیب صدیقی، مولانا سفیان صاحب ولد مولانا کاشف الہاشمی، مولانا عبدالحفیظ رحمانی اور قاری شبیر احمد صاحب دربھنگوی سے مواد حاصل کیا گیا، پھر اصناف کے اعتبار سے ترتیب دی گئی، یعنی پہلے حمد، پھر نعت، نظم، غزل، رباعیات اور سب سے آخر میں قطعات رکھے گئے۔نیز دادائے محترم نے بعض جگہ اشعار میں ترمیم وتنسیخ اس طور پر کی کہ معانی نہ بدلیں، اور اس کی وجہ وہ یہ بتلاتے تھے کہ 'میرے اور بھائی کاشف کے درمیان عجیب تعلق تھا، وہ میرے اشعار میں بلا اجازت ترمیم کرتے اور میں ان کے اشعار میں، اور کسی کو کسی پر اعتراض نہ ہوتا تھا۔اسی طرح ایک کام یہ بھی ہوا کہ نظموں میں شانِ ورود کو واضح کرنے کے لیے کچھ نوٹس بڑھائے گئے جس کو دادائے محترم نے املا کرایا۔اس کے علاوہ آخر میں فرہنگ کا اضافہ کیا گیا جس سے شاعر کے مرادی معنی کی تعیین بھی ہوگئی۔

انتقال:

بالآخر ۲۳؍شعبان المعظم ۱۴۳۸ھ مطابق ۳۰؍مئی ۲۰۱۷ء کو اپنی علمی، حدیثی، فقہی، تدریسی، انتظامی اور ادبی شعاؤں سے عالم کو منور کرنے والا یہ آفتاب دیوبند کی سرزمین میں ہمیشہ کے لیے غروب ہوگیا، اس دن بعد نماز ظہر نمازِ جنازہ قاری سیّد محمد عثمان منصورپوری دامت برکاتہم نے احاطہ مولسری میں ادا کرائی، اور دیوبند کے قاسمی قبرستان میں آپ کی تدفین عمل میں آئی۔ اللہ قبر وحشر کی منزلوں میں اپنی رحمتوں کا حصار عطافرمائے، آمین۔

دم بخود ہیں موت پر تیری روایاتِ لطف
کون اقدارِ سلف کی اب نگہبانی کرے

□□

شمع خاموش ہوئی ہے پروانے کی رحلت ہے

تحریر: مولانا ندیم احمد انصاری (ڈائریکٹر الفلاح اسلامک فاؤنڈیشن، انڈیا)

اس دارِ فانی میں جو بھی آیا ہے ہر ایک کو جانا ہے، موت ایک ایسی حقیقت ہے جس کا کوئی منکر نہیں، لیکن ظاہر ہے کہ با کمال شخصیات کا اس دنیا سے چلے جانا باقی رہنے والوں کے لیے غم و اندوہ اور آزمائش کا سبب ہوا کرتا ہے۔ دارالعلوم دیوبند جو کہ بھارت کے مسلمانوں کی مرکزی دینی درس گاہ ہے اور جس سے منسلک اکابرین کو دنیا بھر میں بزرگی حاصل ہے، گذشتہ چند مہینوں میں اس پر متعدد اہم شخصیات کی جدائی کے غم کے پہاڑ ٹوٹے ہیں، جن میں درجِ ذیل حضرات خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں:

- حضرت مولانا عبدالحق صاحب اعظمیؒ (نائب شیخ الحدیث، متوفی: ۳۱ر دسمبر ۲۰۱۶ء)
- حضرت مولانا کفیل احمد علویؒ (ناظم شیخ الہند اکیڈمی، متوفی: ۱۲ر مارچ ۲۰۱۷ء)
- حضرت مولانا ازہر رانچویؒ (رکن مجلسِ شوریٰ، متوفی: ۱۳ر مئی ۲۰۱۷ء)
- حضرت مولانا قاری سید فخر الدینؒ (ناظم شعبۂ تنظیم وترقی، ۱۶ر مئی ۲۰۱۷ء)

ابھی انھی غموں میں دارالعلوم اشک بار تھا کہ ۲۳ر شعبان المعظم ۱۴۳۸ھ یعنی ۲۰ر مئی ۲۰۱۷ء کی صبح سے سوشل میڈیا پر ایک اندوہ ناک خبر گردش کرنے لگی کہ دارالعلوم دیوبند کے ایک اور قدیم استاذِ حدیث حضرت مولانا ریاست علی صاحب بجنوریؒ ربِ حقیقی سے جا ملے۔ اللہ تعالیٰ حضرت موصوف کو غریقِ رحمت کرے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت موصوف ایک شفیق استاذ، محقق عالمِ دین، یادگارِ سلف اور عمدہ شاعر تھے۔ بحیثیت استاذ ان کی شان جاننی ہو تو ان ہزارہا قاسمیوں سے پوچھئے جنھوں نے موصوف کے سامنے زانوے تلمذ طے کیا، ان کی شانِ علمی کا کچھ اندازہ کرنا ہو تو ان کی تحریریں و تصانیف کا مطالعہ کیجیے اور ان کے شاعرانہ انداز سے محظوظ ہونا ہو تو ان کے اشعار پر نظر ڈالیے۔ آپ کے ایک شاگرد نے درست لکھا ہے کہ یوں تو اردو زبان روزِ اوّل ہی سے اپنی گونا گوں خصوصیات کی بنا پر لوگوں کی منظورِ نظر رہی ہے اور آج اپنی بوقلمونی سے لوگوں کے ذہن و دماغ کو مسخر کر رہی ہے۔ اس زبان کے ارتقائی سفر میں جہاں ادبا کا کردار انتہائی روشن رہا، وہیں اس زبان کو اوجِ ثریا پر پہنچانے میں شعرا کا بھی اہم رول رہا ہے، بلکہ شاعری کو تو اردو ادب کی جان کہا گیا ہے۔ دبستانِ اردو کے انھیں متنوع پھولوں میں سے ایک خوبصورت نام "مولانا ریاست علی ظفر صاحب" کا بھی ہے، آپ جہاں ایک ذی استعداد عالمِ دین، مقبول مدرس، ماہر منتظم اور صاحبِ طرز ادیب ہیں، وہیں آپ کے ذوقِ سخن کی رفعت اور شاعرانہ عظمت لوگوں کے دلوں پر حکمرانی کرتی ہوئی نظر آ رہی ہے۔

راقم الحروف کو حضرت موصوف سے تلمذ کا شرف حاصل نہیں، البتہ اپنی تصانیف کے مسودے حضرت کی خدمت میں پیش کرنے کا موقع ملا اور اکثر فون پر رابطہ رہا کرتا تھا، حضرتِ والا پیرانہ سالی کے عذر کے باوجود ہمیشہ اپنی نیک دعاؤں سے نوازتے رہتے۔ حضرت موصوف کی مقبولیت کا اندازہ اس سے بھی ہوگا کہ اس مطلبی دنیا میں آج جہاں دیکھیے ان کی رحلت کے غم کا چرچہ ہے، آخر کیوں نہ ہو کہ علم و ہدایت و شفقت کا بادل جوارِ رحمت میں جا کر آنکھوں سے اوجھل ہو گیا:

ہر بوند ہے جس کی امرت جل، یہ بادل ایسا بادل ہے

حضرت موصوف کا نام ریاست علی، تخلص ظفرؔ، والدِ گرامی کا نام منشی علی اور جائے پیدائش محلّہ حکیم سرائے، علی گڑھ تھا۔ ۹ر مارچ ۱۹۴۰ء کو ولادت ہوئی، ۱۹۵۱ء تک پرائمری چہارم اور علی گڑھ سے ادیب کامل کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۹۵۸ء میں دارالعلوم دیوبند سے دورۂ حدیث سے فراغت حاصل کی اور ۱۹۷۲ء میں دارالعلوم دیوبند میں بحیثیت استاذ تقرر عمل میں آیا۔ آپ کی تصانیف میں 'ایضاح البخاری' شرح اردو صحیح البخاری اور شعری مجموعہ 'نغمۂ سحر' خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

آپ نے دارالعلوم دیوبند میں تدریس کے ساتھ ساتھ دیگر ذمہ داریاں بھی سنبھالی، من جملہ ان کے آپ ۱۴۰۲ھ تا ۱۴۰۴ھ دارالعلوم کے موقر رسالے ماہ نامہ 'دارالعلوم' کے مدیر رہے، ۱۴۰۵ھ میں آپ کو مجلسِ شوریٰ نے ناظم مجلسِ تعلیمی بنایا اور ۱۴۰۸ھ میں آپ کو شیخ الہند اکیڈمی کا نگراں مقرر کیا گیا۔ اس طرح دارالعلوم میں تقرر سے لے کر تا دمِ آخر آپ نے اپنی پوری زندگی حدیثِ نبوی کے پڑھنے پڑھانے اور چمن قاسمی کو سرسبز و شاداب کرنے میں گزار دی اور جس وقت یہ مضمون سپردِ قلم کیا جا رہا ہے اس وقت اس مردِ مومن کی نمازِ جنازہ کی صفیں بنائی جا رہی ہوں گی۔ قابلِ رشک ہے آپ کی زندگی کہ آپ نے شہرت کے تمام موقعوں کے باوجود نہایت شریفانہ انداز

میں سادگی کے ساتھ زندگی بسر کی اور یہ پیغام دیا:

یوں سینۂ گیتی پر روشن اسلاف کا یہ کردار رہے
آنکھوں میں رہیں انوارحرم، سینے میں دل بیدار رہے

حضرت موصوف نے اپنی زندگی اسلاف کے طرز پر اس شان سے گذاری کہ اس پر جتنا رشک کیا جائے کم ہے۔آپ گول مول باتیں کرنے کے عادی نہ تھے، جس پر آپ کی تحریریں بین دلیل ہیں۔آپ کا ویژن بھی بہت صاف تھا، تعلیم اور نصابِ تعلیم کے متعلق جو سوالات اٹھائے جاتے رہتے ہیں اس میں بھی آپ بہت واضح نظریہ رکھتے تھے، ایک موقع پر اس سوال کے جواب میں کہ عصرِ حاضر میں اگر نصابِ تعلیم میں کسی قسم کی تبدیلی ہو، تو اُس کا اصول کیا ہوگا؟ آپ نے دوٹوک الفاظ میں ارشاد فرمایا تھا کہ جس نصاب کو پڑھ کر حضرت مولانا نانوتویؒ اِس لائق ہوئے کہ جنھیں آج معیار قرار دیا جارہا ہے اور آپ حضرات بھی اسی نصاب سے لائق و فائق ہوئے، اس میں کسی طرح کی ایسی ترمیم جو ہمارے اکابر کے نقشِ قدم سے ہٹ کر ہوگی، قبول نہیں کی جائے گی۔ (ماہنامہ دار العلوم: ۴؍۲۰۰۴ء، ص ۴۵)

اس وقت اس سے زائد لکھنا تو ممکن نہیں، آپ کی شان میں لکھے گئے ایک مرثیے کو سپردِ قلم کر کے بات کو ختم کرتا ہوں:

فراست کی جہاں بانی کے فرزانے کی رحلت ہے
حریم ناز عنقا ہے صنم خانے کی رحلت ہے

سبکساری سے سینوں میں یہ کیسی آہ طغیانی — اچانک کیسے برپا ہے یہاں اشکوں کی سیلانی
بہاروں کی چراگاہ میں خزاں کی آہ رنجانی — سبھی غنچے ہیں پژمردہ لٹی ہے دل کی سلطانی
سجی تھی جس سے محفل اس زنخدانے کی رحلت ہے

وہ عاشق قولِ نبوی کا وہ عارف رازِ فطرت کا — وہ مصدر علم وحکمت کا وہ دلبر اہلِ حکمت کا
وہ شارح دل کی دنیا کا وہ مخزن شانِ وحدت کا — وہ شہپر باغِ قاسم کا وہ محور قلبی چاہت کا
خدا کے اک پیارے پیارے مستانے کی رحلت ہے

زباں کی چاشنی سے رس جہاں کانوں میں گھلتے تھے — جہاں پر راز تقدیسِ وفا کے خوب کھلتے تھے
تخیل کی عجب پرواز تھی بن پَر کے اڑتے تھے — جہاں پر زمزمہ خیزی کے نغمے خوب سنتے تھے
شمع خاموش ہوتی ہے کہ پروانے کی رحلت ہے

نسیم بادیہ کی اشک افشانی کا چرچا ہے — صدائے آہ وہو سے اک انوکھا شور برپا ہے
ہتھیلی پر کلیجے ہیں دلوں میں کیف عنقا ہے — نشیمن زد میں آیا ہے عجب صرصر کا غوغا ہے
ہے صحراؤں پہ سناٹا کہ دیوانے کی رحلت ہے

ریاست وہ ریاست علم وفن کی جو جوارش تھے — سلف کی یادِ برحق تھے زمانے کی وہ تابش تھے
ہراک خورد وکلاں پر مہربانی کی نگارش تھے — مصنف تھے محدث تھے خطابت کی وہ نازش تھے
کہ ان سارے خصائل کے ہی کاشانے کی رحلت ہے

خدایا مغفرت کردے چمن کی زیب وزینت کی — فصاحت اور بلاغت کی دوامی پیاری نکہت کی
ذہانت اور ذکاوت کی حقیقی شان وشوکت کی — سراپا علم وحکمت یعنی مولانا ریاست کی
جہاں پیتے تھے ہم طاہر اب اس میخانے کی رحلت ہے

□□

یادگارِ رونق محفل تھی پروانے کی خاک

تحریر: مولانا محمد قاسمی پرتاپ گڑھی (مدرس فیض العلوم نیرل، بمبئی)

قارئین کرام کو یہ اطلاع ہوچکی ہوگی کہ دارالعلوم دیوبند کے مایۂ ناز استاذ حدیث استاذ الاساتذہ حضرت مولانا ریاست علی صاحب بجنوری رحمۃ اللہ علیہ ۲۳؍شعبان المعظم ۱۴۳۸ھ بمطابق ۲۰؍مئی ۲۰۱۷ء بروز سنیچر کو مختصر علالت کے بعد انتقال کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ حضرت الاستاذ کے انتقال سے تمام ہی علمی حلقے عموماً اور فضلائے دارالعلوم دیوبند خصوصاً جس صدمہ اور رنج وغم سے دوچار ہوئے، اس کے بیان کے لئے الفاظ ناکافی معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے جنازہ کے ساتھ روایات اکابر، ذوق اسلاف، علم وادب، انشاء اور شعر وسخن کا عمدہ مذاق اور بھی بہت کچھ رخصت ہوگیا۔

تا سحر وہ بھی نہ چھوڑی تو نے اے بادِ صبا!
یادگارِ رونقِ محفل تھی پروانے کی خاک

دارالعلوم دیوبند کو فیاضِ ازل نے ایسے علمائے روزگار اور فضلائے دہر عنایت کیے جو علم وعمل کے پہاڑ، زہد وتقویٰ اور تواضع وانکساری کے حسین پیکر، حسن اخلاق واعلیٰ کردار میں یکتا اور حق گوئی وبے باکی میں اپنی نظیر آپ تھے۔ ان بزرگوں کے زیر تربیت رہ کر علم ودانش، حسن اخلاق، بلند اقدار اور اعلیٰ کردار کا جن لوگوں نے سبق لیا، اور پھر انہیں کی مسند پر جلوہ آرائے درس ہوئے، ان میں ایک نمایاں نام حضرت الاستاذ مولانا ریاست علی صاحب بجنوری کا تھا، حضرت کے نام کے ساتھ آج مدظلہ العالی اور دامت برکاتہم العالیہ جیسے محبت بھرے دعائیہ جملوں کے بجائے رحمۃ اللہ علیہ اور نور اللہ مرقدہ جیسے کلمات لکھتے ہوئے طبیعت عجیب سے ہو رہی ہے۔ اللہ ان کے درجات کو بلند فرمائے اور جنت الفردوس میں عالی مقام عنایت فرمائے۔ آمین!

آپ فخر المحدثین حضرت مولانا فخر الدین مرادآبادیؒ کے ارشد تلامذہ اور فخر روزگار شاگردوں میں تھے۔ آپ نے حضرت الاستاذ کے گنجینۂ علوم ومعارف کو نہ صرف سمیٹا، بلکہ عالم آشکارا کرنے کی سعادت بھی حاصل کی۔ اردو زبان کے بے نظیر ادیب مفسر قرآن حضرت مولانا عثمان کاشف الہاشمی کے زیر تربیت رہ کر شعر وسخن اور ادبی ذوق کو جلا بخشا۔ حضرت مولانا سلطان الحق صاحب سابق ناظم کتب خانہ دارالعلوم دیوبند آپ کے پھوپھا اور خاص مربی تھے، جن کے متعلق حضرت مولانا انظر شاہ کشمیری 'لالہ وگل' میں لکھتے ہیں: ''بزرگوں کے بزرگ، اور دوستوں کے محبّ، محفل کی جان، مجلس کا عطر، روایات اکابر کا محافظ، اسلاف کی داستان کے محاسب یعنی مولانا سلطان الحق صاحب قاسمی سابق ناظم کتب خانہ دارالعلوم دیوبند'' اس تلمذ، تربیت اور پرداخت کا اثر یہ ہوا حضرت الاستاذ میں یہ تمام اوصاف وکمالات یکجا طور پر جمع ہوگئے تھے، چنانچہ آپ بیک وقت محدث اور شارح حدیث، نکتہ شناس عالم دین، شگفتہ نگار، سنجیدہ اور طباع صاحب قلم، یگانہ روزگار ادیب، قادر الکلام شاعر، باکمال استاذ اور شفیق مربی تھے، ساتھ ہی تقویٰ وطہارت، دیانت وامانت، رأفت ورحمت، ذکاوت وذہانت، قناعت وصبر، اخلاق کی عمدگی اور تواضع میں اپنی مثال آپ تھے۔ اکابر علمائے دیوبند کے ٹھیٹھ مزاج ومسلک کو نہ صرف سمجھا بلکہ اسی رنگ وآہنگ میں سے برتا بھی۔

آفاقہا گردیدہ ام مہر بتاں ورزیدہ ام
بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگرے

ان کی حیثیت دارالعلوم دیوبند اور جمعیۃ علماء ہند دونوں کے لیے ایک منجھے ہوئے مدبر، اعلیٰ دانش منداور فہم وفراست سے لبریز مشیر کار کی تھی، خواہ وہ کسی عہدے اور منصب پر ہوتے یا نہ ہوتے، مشکل احوال میں دارالعلوم کے لئے اٹھائے جانے ہر قدم میں پیش پیش ہوتے۔ انتظامی امور ہوتے یا سیاسی معاملات چٹکیوں میں حل کرنے کا گر جانتے تھے۔ طلبہ، اساتذہ، ملازمین اور کارکنان دارالعلوم سب سے یکساں تعلقات رکھتے اور ہر ایک کی دلجوئی فرماتے، اور تکلیف ومصیبت کے وقت حیثیت کے مطابق بڑھ چڑھ کر ان کا تعاون بھی فرماتے۔ دارالعلوم دیوبند آنے والے علماء، فضلاء اور علمی شخصیات کو اپنے دسترخوان پر مدعو کرتے اور ضیافت کا اہتمام کرتے۔

مَنْ لِلْمَحَافِلِ وَالْجَحَافِلِ وَالسُّرى
فَقَدَتْ بِفَقْدِكَ نَيِّرًا لَا يَطْلُعُ

(اب محفلوں اور مجلسوں کی دستگیری کون کرے گا؟ آپ کی وفات سے ایسا ستارہ گم ہوا ہے جو کبھی طلوع نہیں ہوگا)

یہ تو یاد نہیں پڑتا کہ حضرت الاستاذ کے نام سے کان کب آشنا ہوئے، تاہم اتنا یقینی ہے کہ بچپن سے ہی جن علماء وبزرگانِ دین کی زیارت کا شوق تھا، ان میں سے ایک اہم ترین نام حضرت الاستاذ کا بھی تھا، چنانچہ دارالعلوم دیوبند پہنچنے کے بعد نظریں ان کی دید کی جویاں رہتیں، مگر بوئے گل کی مانند حضرت کا نام اور تذکرہ تو ہر مجلس ومحفل میں آتا، البتہ دِکھنے میں کم ہی نظر آتے۔ بہرکیف وہ مبارک ساعت بھی آئی کہ حضرت کا نہ صرف دیدار ہوا، بلکہ تلمذ کا شرف بھی حاصل ہوا۔ برادر حقیقی حضرت مولانا محمد صغیر صاحب پرتاپ گڑھی استاذ حدیث جامعہ امام انور دیوبند کا حضرت الاستاذ کے یہاں آنا جانا تھا، حضرت کے چھوٹے صاحبزادے مولانا سعدان صاحب بھی اسی ادارہ سے وابستہ ہیں، علاوہ استاذی وشاگردی کے تعلق کے اس وجہ سے بھی حضرت والا کی عنایتیں حاصل تھیں۔

اہل اللہ اور بزرگا دین کا یہ خاص وصف رہا ہے کہ انھوں نے کسر نفسی، فروتنی اور خاکساری کی وجہ سے بہت کچھ ہونے کے باوجود، اپنے کو کبھی کچھ نہیں سمجھا۔ یہ ادا حضرت الاستاذ میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، وہ تواضع وانکساری

کے پتلے تھے، ان کی پوری زندگی سادگی اور وضع داری سے عبارت تھی، بناوٹ اور تکلف سے کوسوں دور، کبھی نہیں چاہا کہ ان کے آگے پیچھے لوگ چلیں یا ان کی آؤ بھگت کریں۔ ایک مرتبہ ایک شاگرد نے ان کی جوتی سیدھی کردی تو یہ بات حضرت الاستاذ کو اس قدر گراں گزری کہ سرزنش اور ناگواری کے اظہار کے لئے آپ نے اس شاگرد کی جوتی سیدھی کی، کہ آئندہ وہ ایسے عمل سے باز رہے۔

اسی طرح یاد پڑتا ہے کہ حضرت والا جب ہمارے گھر اوگی پور پرتاپ گڑھ تشریف لے گئے تھے، تو وہاں جو کچھ بھی روکھی سوکھی تواضع وضیافت ہوئی، اس سے تو بہت خوش تھے، مگر جب ایک بڑی شخصیت کے یہاں لے جایا گیا، جہاں ان کی شان کے مطابق پر تکلف دعوت کا نظم تھا، تو چہرے پر ناگواری کے آثار نمایاں تھے۔ خشیتِ الٰہی، تقویٰ اور خوفِ آخرت اتنا کہ دارالعلوم دیوبند کی انتظامیہ نے آپ کو نیابتِ اہتمام کی پیشکش کی تو آپ نے اسے قبول کرنے سے یہ کہتے ہوئے معذرت کرلی کہ یہ بڑی ذمہ داری کا کام ہے، اس ذمہ داری سے عہدہ برآں ہونا مشکل ہے، اللہ کے یہاں اس کی جواب دہی کون کرے گا؟

دورانِ درس وہ چند جملوں میں بڑے بڑے معرکۃ الآراء مسائل حل فرما دیتے، بہت زیادہ تفصیلی گفتگو کی عادت نہ تھی۔ ہم نے حضرت سے مشکوٰۃ المصابیح بھی پڑھی ہے، جب کتاب الجنائز کے ابواب شروع ہوئے، تو مقدار سبق کم اور تشریح وتفصیل زیادہ ہونے لگی، دیکھا کہ جب تک یہ ابواب چلتے رہے برابر آنکھوں سے آنسوں جاری ہوتے۔ ایک دن خود ہی فرمانے لگے: بچو! اس باب میں موت، قبر اور احوال برزخ کا ذکر ہے، اسے تھوڑا تھوڑا پڑھو، اس سے دل میں نرمی پیدا ہوتی ہے۔

آپ کا درس سبک رفتار ہوتا، اندازِ تکلم اور طرزِ گفتار موسم بہار کا منظر پیش کرتی، علمی وسعت، فنی مہارت اور قوتِ استنباط کے جلو میں زبان کی لطافت اور ظرافت کی حلاوت بھی ہوتی، طلبہ سنتے جاتے اور سیر نہ ہوتے۔ یاد پڑتا ہے کہ ایک مرتبہ دوران درس ’مشکوٰۃ المصابیح‘ میں ’’مَبْـرَکُ الْاِبِـلِ‘‘ سے متعلق گفتگو چل رہی تھے، بات آئی کہ اونٹ بیٹھتے وقت آگے کے پیر پہلے رکھتا ہے یا پیچھے کے، پھر حضرت نے میری جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: یہ پرتاپ گڑھ کا ہے، وہاں میں نے اونٹ دیکھے ہیں، یہ بتائے گا کہ اونٹ بیٹھتے وقت آگے کے پیر پہلے رکھتا ہے یا پیچھے کے۔ میں نے جلد بازی میں بات غلط کہہ دی۔ حضرت نے اپنی تقریر ختم کی اور درس ختم ہوگیا۔ بعد میں مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا، دوسرے دن حضرت کے درسگاہ میں داخل ہونے سے پہلے میں نے قریب جا کر عرض کیا کہ حضرت! کل میں نے بات غلط کہہ دی تھی، اصل بات وہی ہے جس کی جانب آپ کا رجحان تھا۔ فرمایا: منا! کوئی بات نہیں۔ پھر مسند پر جلوہ افروز ہوئے اور تقریر شروع کی تو فرمانے لگے: بھائی! مولوی صاحب آج اپنی بات سے سجدہ سہو فرما رہے ہیں۔

اپنے شاگردوں اور نیاز مندوں کی دلجوئی، ہمت افزائی اور حوصلہ افزائی سے دریغ نہ کرتے، درمے، دامے، سخنے ہر طرح سے تعاون اور مدد کو اپنا فریضہ سمجھتے۔ کبھی کبھی ایسی حوصلہ افزا بات کہہ دیتے کہ طالب علم سمجھتا کہ واقعی میں نے کوئی کارہائے نمایاں انجام دیدیا ہے، ابتدا میں میں نے ایک کتاب لکھی تو اس پر تقریظ لکھی۔ بعد میں دوسری کتاب ’معیارحق عقل ونقل کی روشنی‘ میں لے کر حاضر خدمت ہوا تو فرمانے لگے: تمہارے ذہن میں بیٹا! یہ موضوع آیا کیسے؟ تم نے بڑا کام کردیا ہے، میں بھی استفادہ کروں گا!

البتہ دلجوئی اور حوا صلہ افزائی کی رو میں نصیحت اور خیرخواہی بھی ہاتھ سے نہ جانے دیتے، اگر کوئی غلط بات ہوتی تو ایسے انداز سے اس پر متنبہ فرماتے کہ شرمندگی اور سبکی کا احساس تک نہ ہوتا۔ دارالعلوم دیوبند میں اب تو مجموعی نمبر ۱۰۰ ہوگئے ہیں، پہلے یہ پچاس تھے، ۴۴ یا اس سے زائد اوسطا لانے والے طلبہ کو وہاں بہت سی مراعات حاصل ہوتی ہیں۔ ایک مرتبہ مجھے شوق چرایا کہ ایک سیٹ کا کمرہ لوں، جس میں تنہا رہا کروں۔ (حالانکہ بعض مرتبہ تنہائی نوعمروں کے لئے مضر ثابت ہوتی) چنانچہ شفارش کے لئے حضرت الاستاذ کی خدمت میں پہنچ گیا۔ حضرت نے درخواست پر اپنی سفارش رقم فرمادی، اس کے بعد فرمایا: بیٹا! تم تو شریف گھرانے کے بچے ہو، تمہیں ایک سیٹ کے کمرے میں رہنے کا شوق پیدا کیسے ہوگیا؟ ایک سیٹ کے کمرے میں اچھے بچے نہیں رہتے۔ دیکھو! میں نے سفارش لکھ دی ہے، مگر اس درخواست کو نہ تو جمع کرنا اور نہ ایک سیٹ کا کمرہ ہی لینا۔

ڈھونڈوگے ہمیں ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تعبیر ہے جس کی حسرت وغم اے ہم نفسو وہ خواب ہیں ہم

آپ کی پیدائش ۹؍مارچ ۱۹۴۰ء کو علی گڑھ میں ہوئی، آپ کا آبائی وطن موضع حبیب والا ضلع بجنور ہے۔ ابتدائی تعلیم مکمل کرکے اپنے پھوپھا مولانا سلطان الحق صاحب کے ہمراہ ۱۹۵۱ء میں دارالعلوم دیوبند آئے اور داخلہ لیا۔ ۱۹۵۸ء میں دورۂ حدیث سے فراغت حاصل کی۔ آپ کو شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی، حضرت علامہ ابراہیم بلیاوی، شیخ الادب حضرت مولا اعزاز علی امروہوی رحمہم اللہ سبھی بزرگوں کی عنایتیں اور قرب حاصل تھا، البتہ دورۂ حدیث شریف میں بخاری پڑھنے کی سعادت آپ کو فخرالمحدثین حضرت مولانا فخرالدین رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل ہوئی، اور استاذ پر ایسے فدا ہوئے کہ فراغت کے بعد بھی برسوں آپ ان کے دامن تربیت سے وابستہ رہ کر نہ صرف استفادہ کرتے رہے بلکہ ان کے درسی افادات کو جمع کیا، اور ’ایضاح البخاری‘ کی شکل میں علمی موتی اور جواہر پاروں سے لبریز ایک لافانی تحفہ امت کے حوالہ کیا۔ ۲۳۰۸ھ/۱۹۷۲ء میں دارالعلوم دیوبند میں مدرس مقرر ہوئے، دارالعلوم دیوبند کا لازوال ترانہ لکھا۔ ’شوریٰ کی شرعی حیثیت‘ نامی انوکھی کتاب لکھی۔ شعروسخن کا بھی پاکیزہ ذوق تھا، چنانچہ آپ کا مجموعہ کلام ’نغمۂ سحر‘ کے نام سے شائع ہوکر ماہرین سے دادتحسین حاصل کرچکا ہے۔

اللہ تعالی حضرت الاستاذ کی بال بال مغفرت فرمائے، اور پسماندگان کو صبر جمل عطافرمائے۔ اوران کے اٹھنے سے دارالعلوم میں جوخلا پیدا ہوا ہے، اس کی بھرپائی کی سبیل پیدا فرمائے، آمین □□

ایک کامل ومکمّل زندگی

تحریر: مولانا محمد صفوان دیوبندی (متعلّم تکمیل ادب عربی دارالعلوم دیوبند)

دنیا میں مختلف میدانوں کے بہت سے ماہرین موجود ہیں، جو سب کے سب اپنے میدان کے شہسوار اور اپنے فن میں طاق ہیں۔ اس کی باریکیوں اور نزاکتوں کو سمجھتے اور ان پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ کوئی شاعر ہے، کوئی ادیب، کوئی دانشور، کوئی واعظ ومقرر، کوئی استاذ ہے، کوئی مصلح ہے، کوئی راہنما، کسی کا فن وکالت ہے، کسی کا ڈاکٹری، کسی کا خطاطی وکتابت، وغیرہ وغیرہ، بہرحال زندگی کے ان متنوع شعبوں کے بہت سے اہلِ کمال آپ کی نظر میں ہوں گے، لیکن کیا ایسے شخص سے بھی آپ واقف ہیں جن کا فن زندگی ہو! ابّا ایسے ہی تھے، بہت سے فنون میں آپ کی مہارت تو الگ رہی کہ آپ کو علم شعروشاعری، خطاطی تقریر وتحریر وغیرہ میں غیر معمولی مہارت تھی، لیکن زندگی کیسے گزاری جائے یہ اگر دیکھنا ہو تو ابّا کی زندگی اس کی بہترین مثال ہے:

زندگی ایسے گزاری کہ سبک سر نہ ہوئے
یعنی اس دور میں جینے کا ہنر ہو گئے ہم

بڑی خوددار، باوقار، دوسروں کے کام آنے والی اور بہت سلیقے کی زندگی گزاری ہے، سلیقے کا مطلب خوش حالی ہرگز نہیں، اس لیے کہ یہ بات تو ابّا کی زندگی میں بہت آخر میں ہوئی اور وہ بھی اس معنی میں کہ مصارف کے لیے قرض نہ لینا پڑے، اور مصارف ہی کیا تھے؟ گھر کے خرچ کے علاوہ، مہمان نوازی اور ضرورت مندوں کی مدد ایک اچھا خاصا مستقل مصرف تھا، 'ایضاح البخاری' کی طباعت میں ہمیشہ قرض لینا پڑا، تو سلیقے سے کچھ اور نہیں بلکہ سلیقہ ہی مراد ہے۔

اگر دو لفظوں میں ابّا کی شخصیت کا تعارف کرایا جائے تو کہا جائے گا کہ آپ مثالی عالم ودانشور اور بے مثال انسان تھے، علم پختہ اور ٹھوس تھا، ساتھ ہی اسلاف کی رائے اور فہم پر اعتماد وتصلب تھا۔ ابّا بار بار کہا کرتے تھے کہ عافیت جمہور کے ساتھ رہنے میں ہے۔ مسلک احناف پر سو فیصد اطمینان تھا، اسباق میں احناف کی مضبوط ترجمانی کیا کرتے تھے، بعض اہلِ علم جو کہیں احناف کے مسلک کو مرجوح قرار دیتے ہیں، تو ابّا کہا کرتے تھے کہ یہ غیر جانبداری کا شوق ہے، کیا آپ ابن ہُمام سے بڑھ کر ایمان دار ہو جائیں گے؟

سبق کے لیے ہمیشہ مطالعے کا اہتمام کیا کرتے تھے، ساتھ ہی تحقیق کا بھی بڑا اہتمام تھا۔ غیر معتبر بات نہ لکھتے نہ نقل کرتے، مزاج یہ تھا کہ اگر کوئی بات کہیں سے نقل کی ہے تو حوالہ ضرور دیا جائے، یہ ایک تو دیانتاً ضروری ہے، دوسرے اس کا فائدہ یہ ہے کہ حوالہ دینے کے بعد ناقل اصل ذمہ داری سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ کبھی اگر یہ ذکر ہوا کہ اس حدیث کی تشریح بعض اہلِ علم اس طرح کر رہے ہیں، تو ابّا کہتے تھے کہ جب جمہور نے ایک بات نہیں کہی تو آپ محض اپنے ذوق سے کیوں کہہ رہے ہیں؟ اسی طرح کہا کرتے تھے کہ سلف نے جس طریقے سے کسی بات کو سمجھا اور پھر جس طرح پیش کیا، دونوں کی اتباع ضروری ہے۔

صاحبِ تحفۃ الاحوذی کے بارے میں کہتے تھے کہ دیانت داری کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔ کہتے تھے اگر کسی مسئلے میں بظاہر کچھ کمزوری ہے تو کلام کرنا سمجھ میں آتا ہے۔ لیکن وہ تو انتہائی واضح مسئلے میں بھی یہی کرتے ہیں، انھوں نے ایک نظریہ بنا رکھا ہے، اب وہ ان کو ثابت کرنا ہے۔ مثلاً قرأت خلف الامام کا مسئلہ، اس میں ایک حدیث بھی ایسی نہیں ملے گی کہ جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مقتدی سے کہا ہو کہ بھئی قرأت کرلیا کر! یہ تو ملے گا کہ آپؐ نے ناگواری سے پوچھا کہ کون پڑھ رہا تھا، لیکن یہ نہیں ملے گا کہ خود قرأت کرنے کو کہا ہو۔ امام بخاری نے بھی یہاں یہی کیا کہ ایک انتہائی عام باب قائم کیا **باب وجوب القراة للامام والماموم فی الصلوات کلھا فی الحضر والسفر وما یجھر فیھا وما یخافت** ! ارے بھئی **باب قرأة الماموم خلف الامام** قائم کیجیے۔ پھر حدیث لائیے مگر چونکہ حدیث ہے نہیں، تو وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے ہیں۔

لکھنے کا عجیب ملکہ حاصل تھا، موقع محل کے اعتبار سے لکھتے، تعبیر کی درستگی اور صحت وثقاہت کا خیال رکھتے۔ اگر کسی علمی وفکری موضوع پر قلم اٹھانا ہوتا تو تعبیر اُس کے اعتبار سے واضح اور درست ہوتی، اجزائے مضمون کے باہم ربط کا لحاظ رکھتے، عبارت، تعقید اور غیر ضروری الفاظ کی بھرمار یا ثقیل جملوں سے پاک رہتی۔ پھر جو بھی لکھتے، تحقیق وتجزیہ کرکے مدلل لکھتے، آپ کی کتاب 'شوریٰ کی شرعی حیثیت' اس کی آئینہ دار ہے، اس کتاب کی نبیرۂ حضرت گنگوہیؒ حکیم نھو میاں علیہ الرحمۃ نے بھی تعریف کی تھی، فرمایا تھا کہ کتاب سے مصنف کی ذہانت کا اندازہ ہوتا ہے۔ آپ کی ذہانت غیر معمولی تھی، پڑھنے لکھنے میں تو ذہانت کا کیا کہنا۔ ہم عمروں کے ساتھ اگر کوئی کھیل ہوتا تو اس میں بھی بازی لے جاتے۔ دارالعلوم میں دورۂ حدیث شریف میں اوّل پوزیشن سے کامیابی حاصل کی اور مقررہ کل ۵۰۰ نمبرات میں سے ۵۲۹ نمبرات حاصل کیے، یہ ایک غیر معمولی بات ہے، اور اس کی نظیر شاید نہ ہو۔

دوسری اہم کتاب 'ایضاح البخاری' ہے، جو اکابر کی تحقیقات کا عطر ہے، اس کی زمین حضرت مولانا فخر الدین صاحب مرادآبادی علیہ الرحمۃ کی تقریر ہے، جو ابّا نے دو مرتبہ آپ کے درس میں شرکت کرکے لکھی تھی، اس میں خاص بحثیں جو دیکھنے کی ہیں، جن سے 'ایضاح البخاری' کی خصوصیت کا اندازہ ہو جائے گا، وہ یہ ہیں:

جلداوّل: ایمان کی بحث، باب تول النبی صلی اللہ علیہ وسلم: انا اعلمکم باللّٰہ!(حدیث نمبر۲)

جلددوم: کتاب الوضو کے پہلے باب کی شرح۔

جلدسوم: باب وقت العصر، باب من ادرک من الفجر رکعۃ!

جلدچہارم: باب اِذا أقیمت الصلاۃ، فلاصلاۃ اِلا المکتوبۃ! رفع یدین کی بحث، قرأت خلف الامام کی بحث۔

جلدپنجم: جمعہ فی القری کی بحث، باب من جاء والامام یخطب، صلی رکعتین خفیفتین، باب سوال الناس الامام کے الاستسقاء کے تحت توسل کی بحث۔

جلدنہم میں البیعان بالخیار کی بحث، اور

جلددہم میں شہادۃ القاذف کی بحث۔

شعروشاعری میں کمال تھا، غزل ہو یا نظم دونوں پر یکساں قدرت تھی، 'نغمۂ سحر' کے نام سے مجموعۂ کلام منظرِ عام پر آچکا ہے، اس میں تقریباً سبھی کلام ۱۹۷۲ء سے پہلے کا ہے، میرے نانا (حضرت مولانا لقمان الحق فاروقی علیہ الرحمۃ سابق استاذ دارالعلوم، متوفی ۱۹۸۷ء) اس کے مقدمے میں لکھتے ہیں: ''جہاں تک راقم کومعلوم ہے کہ موصوف (ظفر بجنوری) نے گزشتہ چارسال کے عرصے میں صرف دونظمیں کہیں ہیں، ایک اپنے استاذ محترم حضرت مولانا سیّد فخر الدین علیہ الرحمۃ کا مرثیہ ہے اور دوسرا دارالعلوم دیوبند کا ترانہ، یہ دونوں اس مجموعے میں شریکِ اشاعت ہیں۔'' یہ مقدمہ لکھا جارہا ہے نومبر ۱۹۷۶ء میں۔ جب دوبارہ 'نغمۂ سحر' کی اشاعت ہوئی تو اس میں جو اضافہ ہوا ہے وہ ایک تو ترانۂ جمعیۃ ہے، دوسرے ترانۂ مدرسۃ البنات۔ 'نغمۂ سحر' پر اتر پردیش اکیڈمی سے ایوارڈ بھی ملا تھا۔

خط بڑا پاکیزہ تھا۔ فراغت (۱۹۵۸ء) سے پہلے ہی مولانا اشتیاق صاحبؒ (۱۹۷۵ء) سے کتابت سیکھی تھی اور اس عمر میں بھی احساس ذمہ داری اتنا تھا کہ کتابت سے حاصل ہونے والی آمدنی اپنی والدہ کو وطن بھیجنی شروع کردی۔ سن ۱۹۴۴ء میں جب ابّا ۴ سال کے تھے تو والد کا انتقال ہوگیا تھا۔ یہاں قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ابّا نے کتابت محض چند دنوں میں سیکھ لی تھی۔ یہ آپ کا خاص وصف تھا کہ کسی بھی چیز کو سیکھنے یا سمجھنے میں آپ کو دیر ہرگز نہیں لگتی تھی۔

اصابتِ رائے بے پناہ تھی، یہ صفت معمولی معمولی چیزوں سے لے کر بڑی بڑی باتوں، سب میں نمایاں تھی گویا:

بات جو کہہ دی وہ قسمت ہوگئی

لیکن اس کے باوجود اپنی رائے پر اصرار ہرگز نہ تھا۔

طبیعت میں دیانت بے حد تھی، تقویٰ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، مشتبہات سے بچنے کا اہتمام تھا۔ اور زہد تو آپ کا خاصہ تھا۔ ایک دفعہ عدنان ماموں (مولانا عدنان سعدی صاحب مدظلہٗ مقیم حال امریکہ، فراغت ۱۹۹۲ء) نے زمینوں کے کاروبار میں کچھ پیسہ لگا کر تجارت کی اجازت چاہی، تو ابّا نے منع کردیا، اور کہا کہ: بیٹے دنیا بقدر ضرورت ہی ٹھیک ہے۔

بیٹھک میں ایئر کنڈیشن لگوانے پر بمشکل راضی ہوئے، اور جب لگ گیا تو ان نمبروں پہ چلتا تھا۔ ۲۸-۲۹-۳۰۔ آخر میں نئے کپڑے بنوانے ہی چھوڑ دیئے کہ اب میں کیا کروں گا۔ وفات سے چند ماہ قبل آنکھ کا آپریشن ہوا، تو اس کے بارے میں بھی شروع میں کہا تھا کہ ویسے اب آپریشن کی کیا ضرورت ہے! ایک آنکھ سے ہی کام چلالیں گے۔

آخر سال میں کمزوری کی وجہ سے رکشے سے پڑھانے آتے تھے، شروع سال میں ایک طالب علم نے آکے کہا کہ حضرت میرے پاس کار ہے، اس سے چلا کیجیے، مگر اسے منع کردیا۔ اسی طرح جو رکشے والا تھا اس کے پاس شروع میں پینڈل رکشا تھا، اس سے آتے رہے، اس نے کچھ دنوں بعد ای رکشا لے لیا، اس میں جب بیٹھ کے آئے تو کہا کہ بھئی یہ تو بڑا شاندار ہے! پرانا والا (پینڈل رکشا) ہی ٹھیک تھا۔ یہ جملہ مختلف اوقات میں ایک سے زائد بار کہا۔

طلبہ کو اپنے پیچھے ہرگز نہ چلنے دیتے، کہتے تھے کہ اپنی رفتار سے آؤ! آگے بڑھ جاؤ انتہا یہ ہے کہ جس سال (۱۴۳۵ھ) حمدان بھائی (مولانا عبداللہ حمدان صاحب، استاذ جامعۃ الشیخ حسین احمد مدنی، ابّا کے پوتے، اور ابّا کے بڑے صاحبزادے مولانا سفیان عرشی صاحب مدظلہٗ کے لڑکے) دورے میں تھے، تو انھوں نے سبق کے لیے ساتھ آنا چاہا، مگر ان کو بھی منع کردیا، کہتے تھے کہ تم آگے نکل جاؤ، میں آرہا ہوں۔ رکشے میں پڑھانے آتے ہوئے بھی بہت تکلف ہوتا تھا، بار ہا کہتے کہ یہ تو تماشا سا لگتا ہے۔ دراصل اپنے لیے ذرا بھی امتیاز کو پسند نہ کرتے، مجلس میں بھی بیٹھنے کی جگہ متعین نہیں تھی، اپنا اخفا و تواضع بہت تھی۔ لیکن ساتھ ہی بلند حوصلگی، حق بات کہنے کی جرأت، کسی بڑی سے بڑی شخصیت سے مرعوب نہ ہونا، یہ سب باتیں بھی بدرجۂ کمال موجود تھیں۔

وہ جو حضرت تھانوی کے مرثیے میں مجذوب صاحب نے کہا ہے:

تکلف سے گھبرا کے سادہ بزرگی
طلب میں ہے کس بے عبا بے قبا کی

ابّا کے یہاں یہی کیفیت تھی۔

سلیقہ آپ کا امتیاز تھا، مشورے کا اہتمام کرتے تھے، بلکہ پہلے یہ سوچتے تھے کہ اس سلسلے میں مشورہ کس سے کرنا ہے، ایک اور چیز جو بہت محسوس ہوئی، وہ ہے جواب دینے میں حالِ سائل کی رعایت۔ مخاطب کے حال کی رعایت جواب دینے میں بہر حال کرتے۔ مسائل کو حل کرتے تھے، بلکہ منٹوں میں حل کرتے، مگر یہ بھی پیشِ نظر رہتا کہ مسائل حل تو ہوں مگر اس انداز سے کہ کوئی نیا مسئلہ کھڑا نہ ہو۔ اخلاق ومروّت، رحم دلی، سب کی خیر خواہی، رشتہ داروں کے حقوق کی ادائیگی اور عیادت کا اہتمام کرتے تھے:

شکوہ کسی کو تھا، نہ شکایت کسی سے تھی
اِک ایسا درمیان سے انساں چلا گیا

ضرورت مندوں کی مدد، سخاوت، مہمان نوازی، خوش مزاجی وظرافت، مشکل سے مشکل حالات میں بھی بشاشت اور چہرے پر شکن نہ آنا، حق بات کہنے کی جرأت، مگر درست انداز میں کہنے کا سلیقہ، یہ سب اوصاف آپ کے اندر بدرجہ کمال موجود تھے، وقت کی بڑی قدر کرتے، کبھی خالی نہ بیٹھتے، یہ تو تھا کہ آرام کا وقت ہے تو آرام کریں، لیکن بس یونہی وقت گزاری کر رہے ہوں، ایسا کبھی نہ ہوتا۔ تلاوت وتہجد کی پابندی کرتے، کبھی نماز یا روزہ قضا نہیں ہوا۔ ابّا حقیقی معنوں میں ایک کامیاب اور بھرپور زندگی جی کر گئے ہیں:

شجاعؔ موت سے پہلے ضرور جی لینا
یہ کام بھول نہ جانا بُرا ضروری ہے

یہ کام ابّا نے پوری طرح کیا ہے۔

بہت سی صفات جن کا اوپر ذکر آیا اور بھی لوگوں میں مل جاتی ہیں، مگر کیفیت کا فرق ہوتا ہے۔ کسی میں بھرپور کسی میں ذرا اس سے کم درجے میں پائی جاتی ہیں، مگر یہ سب ابّا میں بھرپور انداز میں موجود تھیں، بہت ساری عمدہ صفات کے جامع بہت سے لوگ ہوتے ہیں، لیکن ابّا کا معاملہ عجیب تھا، ایک تو اتنے سارے اوصاف بہ کمال موجود تھے۔ دوسرے یہ کہ ابّا کچھ متضاد سی صفات کے حامل تھے، مثلاً مکمل تواضع کے ساتھ بھرپور خود اعتمادی، اخفاء ونفیِ ذات کے باوجود حق بات درست انداز میں کہیں بھی کہہ دینے کی جرأت، انتہائی اخلاف ومروّت کے ساتھ کسی سے مرعوب نہ ہونا، بے انتہا تدبر واصابت رائے کے ساتھ مشوروں کا اہتمام، اور یہ دیکھنا کہ اس مسئلے میں مشورہ کون دے گا۔ اوقات کی پابندی کرنا، مگر وقت بے وقت ملنے آنے والوں کو ہمیشہ وقت دینا، بے حد تدبر کے باوجود مزاج کی سلامتی، ظرافت وخوش مزاجی کے باوجود وقار وحلم و بردباری، اسی طرح ظرافت کے ساتھ ساتھ ثقاہت:

ہیں اس قامت سوا بھی کتنے قامت
پر اِک حالت ہے جو اس کے سوا نہیں

اس سال (۱۴۳۸ھ) میں چونکہ ہم (میں اور مجھ سے چھوٹا بھائی محمد ذکوان) دورے میں تھے، تو ہمیں ابّا سے ترمذی اوّل تا کتاب النکاح پڑھنے کا شرف حاصل ہوا، جو یقیناً ہماری خوش قسمتی ہے، پھر چونکہ اس سال کمزور بھی ہو گئے تھے، تو ہمیں سبق کے لیے لینے آنے کی اجازت دے دی تھی، مگر بمشکل اور گھر والوں کے بڑے اصرار کے بعد۔ راستے میں بھی ہم سوالات کرتے رہتے تھے، یہاں ابّا کو کچھ قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا، جس کا فائدہ محسوس ہوتا ہے، لیکن:

پھر بھی کم تھا گرچہ تیری ذات سے پایا بہت
تو ہوا رخصت تو دل کو یہ خیال آیا بہت

سبق کے بارے میں کیا عرض کروں، ذکوان نے لکھ ہی دیا ہے۔

سال کے آخر میں ایک دو دفعہ ابّا نے کہا بھی کہ اب تو ہم جانے والے ہیں، ہمیں کیا پتہ تھا کہ اتنی جلدی چلے جائیں گے، مگر چلے گئے، وفات کے کافی دنوں بعد تک یہ کیفیت رہی کہ:

مگر تری موت کا جانے والے مجھے ابھی تک یقیں نہیں ہے

اپنے آپ کو یقین دلانا پڑتا ہے، اب بھی کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک لمحے کو خیال آتا ہے یہ بات تو ابّا سے پوچھ لیں گے، پھر تنبہ ہوتا ہے:

یہی سب کچھ تھا جس دم وہ یہاں تھا
چلے جانے پہ اس کے جانے کیا نہیں

۲۳؍شعبان ۱۴۳۸ھ کی صبح ایک عجیب صبح تھی، ایک آفتاب نکلنے والا تھا اور ایک آفتاب غروب ہو رہا تھا، وہ ایسی صبح تھی کہ کاش نہ ہوتی، وہ اِک نہایت غمزدہ صبح تھی۔ کیونکہ وہ اِک ایسی خبر لے کے آئی تھی بقول متنبّی:

طوی الجزیرۃ حق جاء نی خبر
فزعت فیہ بآمالی اِلی الکذب

دو شعر پہلے سنے تھے، جو اچھے تو لگے تھے، مگر عجیب سے لگے:

سورج مثال شخص کل شام مٹّی کے سپرد کردیا ہے
زیرِ زمیں بھی روشنی ہو مٹّی میں اِک چراغ رکھ دیا ہے

لیکن اب جبکہ ابّا زیرِ زمیں محوِ آرام ہیں (انشاءاللہ) تو یہ شعر سمجھ میں آ رہے ہیں۔

دو ہی طرح کے تو حقوق انسان کے ذمّے ہیں، ایک اللہ کے دوسرے بندوں کے۔ اللہ کے حقوق کا معاملہ یہ ہے کہ آپ کی کبھی نماز قضا نہیں ہوئی، کبھی روزہ قضا نہیں ہوا، حج آپ نے کرلیا، تہجد وتلاوت کے پابند تھے، انسانوں کے حقوق کی ادائیگی کا بے حد اہتمام تھا، ہمیشہ حق سے بڑھ کر کرتے۔ آپ کی وفات کے بعد لوگ **اَنتم شہداء اللہ فی الاَرض** کی تصویر بن کر آپ کی تعریف میں رطب اللسان تھے، پوری زندگی محنت کی، بامقصد، کامیاب اور **النصحۃ للّٰہ ولرسولہ و للمؤمنین** کی تصویرِ مجسم بن کر گزاری ہے، تو ایسی حالت میں ہم اللہ سے اُمید رکھتے ہیں اور دعا گو بھی ہیں کہ اللہ آپ کی حسنات کو قبول فرمائے۔ سیئات سے درگزر فرمائے، درجات کو بلند فرمائے اور جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے:

جو سینہ سپر عرصۂ ہستی میں ہیں دانش
دشوار نہیں ان کے لیے راہِ عدم بھی

اب لکھنا واقعی مشکل ہو رہا ہے، بس آخر میں وہ شعر پڑھ لیجیے، جو بہت مشہور بھی ہے اور اچھا بھی:

جان کر من جملۂ خاصان مے خانہ مجھے

اس شعر کا سارا لطف ایسا لگتا ہے کہ لفظ ’من جملۂ‘ میں ہے، جس کی وجہ سے شعر مبالغے سے پاک اور حقیقت کے قریب ہو گیا ہے اور کسی بھی بڑی شخصیت پر بالکل منطبق ہو جاتا ہے۔ تو ابّا کے حوالے سے یہ شعر پھر پڑھ لیجیے:

جان کر من جملۂ خاصان مے خانہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

❑❑

ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

تحریر: محمد حسان دیو بندی (متعلّم عربی دوم دارالعلوم دیوبند)

موت تو کائنات کی فطرت میں داخل ہے، ذاتِ باری تعالیٰ کے علاوہ ذرّے ذرّے کو ایک دن ختم ہو جانا ہے، مگر زمانے میں ایسی شخصیات کم ہی پیدا ہوتی ہیں، جن کے نقوش دائمی ہوتے ہیں، جن کی یادیں نوکِ زبان پر رہتی ہیں، جن کو بطورِ مثال پیش کیا جاتا ہے، جن کی زندگی کو نمونہ بنا کر اپنا مستقبل سنوارا جاتا ہے، جن کے سامنے سورج کی چمک دمک ماند پڑ جاتی ہے اور سورج کا غرور احساسِ کمتری کی نذر ہو جاتا ہے، وہ زمانے کے پیچھے نہیں بلکہ زمانہ ان کے پیچھے چلتا ہے، وہ اس راستے کی مانند ہوتے ہیں جس کی منزل بہشت ہوتی ہے؟ کیونکہ وہ اتباعِ سنت کا عملی نمونہ ہوتے ہیں، ان میں سے بعض تو ایسے ہوتے ہیں جن کے اندر اخلاص وللّٰہیت کی وجہ سے اپنے آپ کو مٹانے کی خواہش ہوتی ہے، حالانکہ وہ اپنے اپنے فن میں یکتائے زمانہ ہوتے ہیں، کوئی محدث ہوتا ہے تو کوئی مفسر، کوئی فقیہ ہوتا ہے تو کوئی فلسفی، کوئی مفکر ہوتا ہے تو کوئی مجدد، کوئی ادیب ہوتا ہے تو کوئی شاعر، کوئی دانشور ہوتا ہے تو کوئی خطّاط وغیرہ وغیرہ۔

اگر ان لوگوں کو ڈھونڈا جائے جو ان تمام علوم کے جامع بھی ہوں اور اخلاص وللّٰہیت کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو چھپاتے بھی ہوں تو ایسے لوگ انتہائی قلیل مقدار میں خال خال ہی نظر آتے ہیں، سوچنے کی بات ہے کہ اگر یہ دُرِّ نایاب ہمیشہ ہی کے لیے نایاب ہو جائیں تو کس قدر خسارہ ہے، علمی اعتبار سے بھی عملی اعتبار سے، فکری اعتبار سے بھی، نظری اعتبار سے بھی، جن کے جانے سے ایسا خلا ہو جاتا ہے جس کا پُر ہونا انتہائی مشکل ہوتا ہے، انہی نابغہ روزگار شخصیتوں میں سے ایک ممتاز شخصیت اسلاف کے علوم و معارف کے امین، استاذ الاساتذہ حضرت مولانا ریاست علی صاحب ظفر بجنوری نوراللہ مرقدہٗ کی ذاتِ گرامی بھی ہے:

شورشِ میخانۂ انسان سے بالاتر ہے تو
زینتِ بزمِ فلک ہو جس سے وہ ساغر ہے تو

آپ ۲۳/شعبان المعظم ۱۴۳۸ھ مطابق ۲۰/مئی ۲۰۱۷ء بروز سنیچر جوارِ رحمت میں منتقل ہو گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ صبح صادق کے وقت آپ کے سانس میں گھٹن ہونے لگی تھی، آپ کے بڑے صاحبزادے مولانا محمد سفیان صاحب قاسمی ڈاکٹر کو بلانے گئے تھے اور آپ کے پوتے مولانا مفتی حمدان صاحب نے سورۂ یٰسین کی تلاوت شروع کر دی تھی مگر سانس میں گھٹن بتدریج بڑھتی چلی گئی اور ابھی مولانا سفیان صاحب ڈاکٹر کو بلا کر لائے بھی نہ تھے کہ آپ کلمہ طیبہ کا وِرد کرتے ہوئے اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ مدتوں سے شوگر کے مریض تھے، کچھ دنوں پہلے آنکھ کا آپریشن بھی ہوا تھا، زندگی کے آخری ایام میں کمزوری حد درجہ تھی، ذرا سی دور چلنے میں ہی سانس پھول جاتی تھی، مگر ان سب باتوں کے باوجود یہ اُمید ہرگز نہ تھی کہ وہ ہم تشنہ لبوں کو اسی تشنگی کے ساتھ چھوڑ کر چلے جائیں گے:

ہائے کس کی یاد رہ رہ کے ستاتی ہے ہمیں
ناتواں دل پر گری جاتی ہے بجلی بار بار

نمازِ جنازہ احاطہ مولسری میں حضرت مولانا قاری سیّد محمد عثمان صاحب مدظلہٗ العالی نے پڑھائی، اگرچہ سالانہ امتحان کی تعطیل کی وجہ سے طلبہ کی اکثریت اپنے وطن لوٹ چکی تھی، مگر جنازے میں ایک بڑی تعداد نے شرکت کی اور قاسمی قبرستان میں سپردِ خاک ہوئے۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

آپ کی ولادت ۲۸/محرم ۱۳۵۹ھ مطابق ۹/مارچ ۱۹۴۰ء کو علی گڑھ میں ہوئی، جہاں آپ کے والد منشی فراست علی صاحب تدریس کی خدمت انجام دے رہے تھے۔ ۱۹۴۴ء میں جبکہ آپ صرف چار سال کے تھے والد ماجد کا سایۂ عاطفت سر سے اُٹھ گیا۔

آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے آبائی وطن 'حبیب والا' ہی میں حاصل کی اور ۱۹۵۱ء میں پرائمری اسکول حبیب والا سے درجۂ چہارم کا امتحان پاس کیا، اس کے بعد اپنے پھوپھا مولانا سلطان الحق صاحبؒ ناظم کتب خانہ دارالعلوم دیوبند کے ساتھ حصولِ علم کی غرض سے دیوبند آ گئے۔

فارسی کی کتابیں اپنے پھوپھا ہی کے زیرِ تربیت پڑھیں، پھر ۱۵ر مئی ۱۹۵۴ء کو دارالعلوم میں داخلہ لیا اور ۱۹۵۸ء میں فراغت حاصل کی۔ ذہانت و فطانت کی بنا پر ہمیشہ اپنی جماعت میں ممتاز رہتے تھے۔ دورۂ حدیث شریف میں بھی اوّل پوزیشن حاصل کی، قابلِ ذکر ہے کہ دارالعلوم میں اس وقت پچاس نمبرات آخری ہوا کرتے تھے، اس طرح دورۂ حدیث کی دس کتابوں کے مجموعی نمبرات ۵۰۰ ہوں گے، لیکن وہ ۵۰۰ میں سے ۵۲۹ نمبرات سے کامیاب ہوئے۔

آپ نے فراغت کے بعد مسلسل تیرہ برس کے طویل عرصے تک اپنے استاذ فخر المحدثین حضرت مولانا فخر الدین احمد صاحب مراد آبادیؒ کی بے مثال خدمت کی، اسی عرصے میں 'ادیب کامل' علی گڑھ کا امتحان دیا اور اس میں بھی اوّل پوزیشن سے کامیاب ہوکر 'سرسیّد گولڈ میڈل' حاصل کیا:

مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

۱۹۶۴ء میں مولانا سلطان الحق صاحبؒ کی دُختر سے آپ کا نکاح ہوا، جن سے تین صاحبزادے — حضرت مولانا سفیان صاحب قاسمی، حضرت مولانا قاری عدنان صاحب قاسمی اور حضرت مولانا مفتی سعدان صاحب قاسمی ہیں۔ الحمد اللہ تمام صاحبزادوں نے اپنے والد ماجد کی ہر ممکن طریقے سے خدمت کی، اللہ تعالیٰ سب کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

۱۹۶۵ء میں مدرسہ اصغریہ دیوبند میں مدرس ہوئے اور دو سال تک تدریسی خدمت انجام دی۔ ۱۹۶۷ء میں تلاشِ روزگار کے لیے دہلی گئے اور جمعیۃ علماء ہند کے مطبع اور مکتب میں تقریباً تین سال منیجر کی حیثیت سے خدمت انجام دی۔

۱۳۹۱ھ مطابق ۱۹۷۱ء کو دارالعلوم میں ابتدائی مدرس ہونے کی حیثیت سے آپ کا تقررِ عمل میں آیا اور تاحیات دارالعلوم میں مدرس رہے۔ آپ کا دورِ تدریس تقریباً ۴۷ سالوں پر محیط ہے، اس دوران ہزاروں تشنگانِ علوم آپ کے علم سے سیراب ہوئے:

تو ہمیشہ رہروؤں کو راہ دکھلاتا رہا
آفتابِ علم نورِ علم برساتا رہا

جس طرح آپ تدریس میں بے مثال تھے اسی طرح انتظامی صلاحیت وقابلیت میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتے تھے، یہی وجہ تھی کہ آپ کو ہمیشہ اہم ذمے داریوں پر مامور کیا گیا۔ دارالعلوم کی نشاۃِ ثانیہ کے بعد آپ کی حیثیت دارالعلوم کے ایک مضبوط ستون کے مثل تھی۔

آپ نے دو سال تک ماہنامہ 'دارالعلوم' کی ادارت کے فرائض انجام دیئے نیز آپ کو مجلسِ تعلیمی کا ناظم بھی بنا گیا۔ آپ کی نظامت تعلیمات کا دور باوجودیکہ ہنگامی حالات کا دور تھا، بے شمار مسائل صف در صف ایستادہ تھے اور دارالعلوم ایک نازک دور سے گزر رہا تھا، مگر آپ کے فہم وفراست کی وجہ سے حسن وخوبی سے گزرا اور اس دور کو نئی نئی اور گراں قدر اصلاحات کا دور سمجھا گیا۔ اس کے علاوہ آپ شیخ الہند اکیڈمی کے نگراں بھی رہے اور چند سالوں میں ہی متعدد علمی ومعیاری کتابیں شائع کیں۔ آپ بار بار عارضی طور پر قائم مقام مہتمم بھی رہے، پھر جب آپ کی صحت سابقہ مصروفیات کی وجہ سے کمزوری کا شکوہ کرنے لگی تو آپ نے تمام انتظامی اُمور سے یکسوئی اختیار کرلی۔

اگر ان لوگوں کو ڈھونڈا جائے جو ان تمام علوم کے جامع بھی ہوں اور اخلاص وللھیت کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو چھپاتے بھی ہوں تو ایسے لوگ انتہائی قلیل مقدار میں خال خال ھی نظر آتے ھیں، سوچنے کی بات ھے کہ اگر یہ دُرّ نایاب ھمیشہ ھی کیلئے نایاب ھوجائیں تو کس قدر خسارہ ھے، جن کے جانے سے ایسا خلا ھوجاتا ھے جس کا پُر ھونا انتہائی مشکل ھوتا ھے، انھی نابغہ روزگار شخصیتوں میں سے ایک ممتاز شخصیت حضرت مولانا ریاست علی صاحب ظفر بجنوریؒ کی ذاتِ گرامی بھی ھے۔

آپ علمی صلاحیت، گہرائی وگیرائی کے باوجود کثرتِ مسائلِ زندگی کی وجہ سے تصنیف وتالیف کی طرف کماحقہ توجہ نہ دے سکے، لیکن جو تصنیفی وتالیفی کام آپ نے کیے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔

اِیضاح البخاری:

یہ آپؒ کے استاذ حضرت مولانا فخر الدین احمد صاحبؒ کی درسی تقریر ہے، جس کو آپ نے دورانِ درس اور فراغت کے بعد بھی دو سال تک ضبط فرمایا تھا، طریقۂ تالیف یہ تھا کہ اس درسی تقریر کو سامنے رکھ کر

دیگر شروحات بخاری کا باقاعدہ مطالعہ کرتے اور پھر ان سب کا جونچوڑ ہوتا اس کو درج کردیتے اور وہی آج 'ایضاح البخاری' کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ یہ تمام شروحاتِ بخاری کا حسین مرقع ہے جو اپنی گوناگوں خصوصیات کی بنا پر تمام اُردو شروحاتِ بخاری پر فائق ہے، اس کی اب تک دس جلدیں آچکی ہیں، درمیان میں ایک لمبے عرصے تک کے لیے یہ کام موقوف ہوگیا تھا، پانچ جلدوں تک کا کام آپ ہی نے کیا اور جب امراض کی کثرت اور کمزوری نے آگھیرا تو اس کام میں معاونت کے لیے حضرت مولانا فہیم الدین صاحب بجنوری استاذ دارالعلوم دیوبند کو اپنے ساتھ لگالیا۔ دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ جلد از جلد اس کام کو مکمل فرمائے۔

شوریٰ کی شرعی حیثیت:

اس کتاب میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ شریعت کی نظر میں شوریٰ کی کیا حیثیت ہے۔ نہایت مدلل، محقق اور بصیرت افروز ہونے کی بنا پر اس کتاب نے علمی حلقوں میں بے پناہ پذیرائی حاصل کی۔

نغمۂ سحر:

یہ آپ کا بے مثال ادبی شاہکار ہے جو غزلوں، نظموں اور رُباعیات کا دل آویز مجموعہ ہے۔ اس کتاب کا مفصل اور محققانہ مقدمہ ہمارے حقیقی نانا حضرت مولانا لقمان الحق صاحب فاروقی رحمہ اللہ استاذ دارالعلوم دیوبند نے رقم فرمایا تھا جس میں آپ کی شاعری کے ایک ایک گوشے کو اُجاگر کیا گیا ہے۔

اسی زمانے میں آپ کے گہر بار قلم سے دارالعلوم دیوبند کا وہ شاہکار ترانہ معرضِ وجود میں آیا جس کی نظیر آج تک کوئی پیش نہیں کرسکا۔ اس ترانے میں اکابرین دارالعلوم، دارالعلوم کی تاریخ، نیز خدمات و کارناموں کو تغزّل کے نکھرے ہوئے اُسلوب میں بیان کیا گیا ہے، گویا کہ یہ ترانہ دارالعلوم کی ایک مستقل تاریخ بن گیا۔ ۱۳۹۶ھ مطابق ۱۹۷۶ء میں یہ کتاب پہلی مرتبہ شائع ہوئی پھر کچھ اضافے کے ساتھ ۱۴۲۲ھ مطابق ۲۰۰۱ء میں دوسری مرتبہ شائع ہوئی۔

زندگی کے آخری ایام میں دو کتابیں 'کشاف اصطلاحات الفنون' اور 'خلاصۃ التفاسیر' کی اپنے بعض تلامذہ کے ساتھ مل کر تحقیق و تنقیح کی۔ ایک تیسری کتاب 'کلیاتِ کاشف' جو آپ کے شاعری کے استاذ حضرت مولانا عثمان صاحب کاشف الہاشمی کے کلام بے مثال کا مجموعہ ہے اس کو آپ کی نگرانی میں حضرت مولانا اشتیاق احمد صاحب قاسمی استاذ دارالعلوم دیوبند نے مرتب کیا۔

اوصاف:

آپ بیک وقت گوناگوں خصوصیات کے حامل تھے بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ آپ ہمہ صفت موصوف تھے۔ آپ بلند پایہ محدث بھی تھے اور باکمال فقیہ بھی۔ جب آپ درس دیتے تو آپ کی علمی جلالت، گہرائی و گیرائی کا اندازہ ہوتا۔ اس کے ساتھ آپ کہنہ مشق ادیب بھی تھے اور بے مثال شاعر بھی۔ آپ برجستہ اشعار کہنے پر کامل قدرت رکھتے تھے 'نغمۂ سحر' پڑھ کر اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ:

دریا میں قطرہ قطرہ ہے آبِ گہر کہیں
ہے میّر موجزن ترے ہر اِک سخن میں آب

آپ بہت اچھے خوش نویس بھی تھے۔ ایک زمانے میں آپ کا ذریعۂ معاش کتابت بھی تھا۔ اس کے علاوہ آپ متواضع، خوش اخلاق، شفیق، مہمان نواز، ملنسار، سادہ اور معتدل مزاج، امانت دار، ہر کسی کے لیے شجرِ سایہ دار، متحمل، بردبار، اعلیٰ درجے کے صاف الرائے، باہمت، کسی سے مرعوب نہ ہونے والے تھے۔ ان کی شخصیت اس بدرِ منیر کی مانند تھی جو رات کی ظلمتوں سے برسرپیکار رہتا ہے یہاں تک کہ فتحیاب ہوکر نوید صبحِ نو سناتا ہے:

قلم اٹھایا تھا اوصاف اس کے لکھنے کے لیے
کہ لفظ ہوگئے ساکت ہوئی عقل تمام

آپ کے متعلقین رشتہ داروں میں سے آپ کے برادر نسبتی حضرت مولانا برہان الحق صاحب مدظلہٗ استاذ دارالعلوم دیوبند اور میرے والد محترم حضرت مولانا محمد سلمان صاحب بجنوری استاذ دارالعلوم دیوبند کے نام قابلِ ذکر ہیں کہ جنھوں نے ہر قدم پر آپ کا ساتھ دیا اور ہمیشہ آپ سے وابستہ رہے۔

وفات ہی کے سال میرے دو بڑے بھائی مولانا محمد صفوان اور مولانا محمد ذکوان نے آپ سے ترمذی شریف پڑھی مگر مجھے اس بات کا ہمیشہ قلق رہے گا کہ میں آپ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ نہ کرپایا۔ اللہ تعالیٰ آپ کی مغفرت فرماکر اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین:

گو خاک کی آغوش میں وہ مہر مبیں ہے
مومن کے لیے موت مگر موت نہیں ہے

□□

حضرت مولانا ریاست علی صاحب بجنوریؒ
ایک باکمال عالم اور بے مثال استاذ

تحریر: محمد ذکوان دیو بندی (متعلّم شعبۂ ادب عربی، دارالعلوم دیوبند)

اس گلشنِ ہستی اور دنیائے آب وگل میں بسنے والے ہر انسان کو ایک نہ ایک دن راہیِ ملکِ بقا ہونا ہے، یہ قدرت کا ازلی دستور اور لابدی فیصلہ ہے، جس کو ٹالنا ممکن نہیں، ارشادِ ربانی ہے: کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْت. دوسری جگہ ارشاد فرمایا: کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَان. لیکن کچھ شخصیات وہ ہوا کرتی ہیں جن کے اس کائناتِ رنگ وبو سے جدا ہو جانے پر ہر شخص کی آنکھیں اشک بار ہو جاتی ہیں کہ عالمِ انسانیت کے اس جوہرِ آبدار کو اب کہاں تلاش کریں۔ قلب مضطرب اور عقل حیران ہو جاتی ہے کہ گلشنِ بشری کے اس گلِ رعنا کو اب کہاں سے ڈھونڈ نکالا جائے۔ یہ ہستیاں لوگوں کے کے دلوں پر ایسے انمٹ نقوش ثبت کر جاتی ہیں جن کو بھلا پانا ممکن نہیں ہوتا، یہی وجہ ہے کہ ان کی یادیں ہمیشہ ہر ایک کے ذہن و دماغ کو معطر اور منور کیے رکھتی ہیں۔ وہ اپنے پیچھے ایسے نشاناتِ قدم چھوڑ جاتی ہیں جو زندگی کی شاہراہ پر کامیابی کا سفر طے کرنے کے لیے ہر بعد میں آنے والے کے لیے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اسلاف کے علوم و معارف اور اکابر کی بہت سی گراں قدر وراثتوں کے امین، مسلکِ اہلِ سنت اور فکرِ دیو بندیت کے پاسبان، محدثِ نکتہ شناس، شارحِ بخاری، ہمارے نانا (والدہ کے پھوپھا) اور نہایت مشفق و مربی استاذِ محترم حضرت مولانا ریاست علی صاحب ظفرؔ بجنوری رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ انہی عبقری اور نابغۂ روزگار ہستیوں میں سے تھے، جن کی شخصیت کا ہر پہلو اپنے اندر ایک کمال اور امتیاز لیے ہوئے تھا۔ ربّ ذوالجلال نے انھیں مختلف اور متنوع قسم کے اوصاف وکمالات سے نوازا تھا۔ صاحبِ کمال ہونا یقیناً فخر کی بات ہے، لیکن کسی ایک شخصیت میں بے شمار کمالات و اوصافِ حمیدہ کا جاگزیں ہو جانا یہ خدائے ذوالجلال کا خاص عطیہ ہی ہوا کرتا ہے۔ حضرتؒ کی شخصیت کچھ اسی قسم کی تھی، چنانچہ اگر وہ ایک طرف تبحرِ علمی، وسعتِ مطالعہ، اصابتِ رائے، مسلکی تصلّب، بے مثال ذہانت و فطانت اور سنجیدگی و متانت جیسے اوصاف سے متصف تھے، تو دوسری طرف معاملہ فہمی، بذلہ سنجی و مزاح اور خود اعتمادی کے ساتھ ساتھ حقیقی تواضع و انکساری کے پیکر تھے، وہ ایک متبحر، وسیع المطالعہ اور صاحبِ بصیرت عالمِ دین بھی تھے اور نکتہ شناس محدث بھی۔ بے مثال اور کامیاب مدرس بھی تھے اور باصلاحیت منتظم و مربی بھی۔ زبان وادب کی مملکت کے خاموش تاجدار بھی تھے اور اقلیمِ شعروسخن کے بے تاج بادشاہ بھی۔ غرض یہ کہ اباؒ ایک ہمہ جہت اور جامع الصفات شخصیت کے مالک تھے، ان کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کو اس مختصر مضمون میں سمیٹنا ناممکن ہے، اسی لیے راقم نے اپنے اس مضمون میں اُن کا ایک ادنیٰ شاگرد ہونے کے ناطے ان کی زندگی کے تدریسی پہلو اور درسی خصوصیات و امتیازات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔

بفضلہٖ تعالیٰ راقم کو اپنے بڑے بھائی مولوی محمد صفوان سلّمہٗ کی رفاقت میں ابا کی زندگی کے آخری تدریسی سال (شوال ۱۴۳۷ھ تا شعبان ۱۴۳۸ھ) میں نہ صرف یہ کہ ان سے ترمذی شریف (از ابتدا تا ختم ابواب الجنائز) کے پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی، بلکہ چونکہ اباؒ ہمارے نانا (والدہ کے پھوپھا) بھی تھے، اس لیے کافی قربت بھی رہی، چنانچہ پورے سال بحمداللہ مکمل پابندی کے ساتھ ہم دونوں کا معمول یہ رہا کہ دوسرے گھنٹے کے بعد اباؒ کے گھر جاتے اور ساتھ سبق میں آتے اور گھنٹے کے بعد تکمیل ادب کی درسگاہ تک ساتھ جاتے جہاں حضرت چوتھے گھنٹے میں 'البلاغۃ الواضحۃ' کا درس دیا کرتے تھے۔ اگر چہ اباؒ کی طبیعت اس بات کو قطعاً گوارا نہیں کرتی تھی کہ کوئی طالب علم اُن کو سبق کے لیے لینے آئے یا واپسی میں اُن کے پیچھے پیچھے چلے، اس لیے وہ اپنی طبعی انکساری اور تواضع کی بنا پر اپنے لیے کسی قسم کا امتیاز پسند نہیں کرتے تھے، لیکن مذکورہ رشتے اور طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے گھر والوں کے اصرار پر ہم دونوں کو یہ اجازت مل گئی تھی، یہی وجہ ہے کہ ہمیں اُن کو قریب سے دیکھنے، ان کی شخصیت کو سمجھنے اور کسی درجے میں کچھ نہ کچھ سیکھنے کا موقع ملا:

پھر بھی کم تھا گر چہ تیری ذات سے پایا بہت
تو ہوا رخصت تو دل کو یہ خیال آیا بہت

راقم اباؒ کا ایک ادنیٰ شاگرد ہونے کی حیثیت سے اپنا فریضہ سمجھتا ہے کہ ابا کے درس کی خصوصیات کو قلم بند کرے، اسی جذبے کے پیشِ نظر ذیل کی سطور میں ابا کے درس کی چند خصوصیات کو سپردِ قرطاس کر رہا ہوں۔

(۱) **ایجاز و جامعیت:** اباؒ کے درس کا ایک نمایاں ترین وصف اس کا ایجاز اور جامعیت ہے۔ طویل سے طویل ابحاث کو نہایت مختصر، جامع اور تشفی بخش انداز میں پیش کر دینا ان کے لیے بہت آسان کام تھا، بلکہ بعض اوقات تو پورے مسئلے کا حل اور خلاصہ چند ایسے جملوں میں پیش کر دیا کرتے تھے، جو فی الواقع 'دریا بکوزہ' کا مصداق ہوتے۔ ابا کا سبق نہ تو اتنا طویل ہوا کرتا تھا کہ طلبہ کے

لیے مسائل وابحاث کا حفظ واستحضار دشوار ہو جائے اور نہ اتنا مختصر کہ اصل مسئلہ ہی حل نہ ہو اور اہم نکات بھی آنے سے رہ جائیں۔

(۲) مسئلے کی تحقیق کا اہتمام اور غیر معتبر بات نقل نہ کرنا: جن حضرات کو ابّاؒ کی شاگردی کا شرف نصیب ہوا ہے وہ اس بات کی تائید فرمائیں گے کہ ان کے درس میں (باوجودیکہ درس علمی ابحاث اور دقیق نکتوں سے بھر پور ہوا کرتا تھا) اس بات کی مجال نہیں تھی کہ کوئی غیر محقق یا ایسی بات دَر آئے جو اہلِ علم کے نزدیک غیر معتبر ہو۔ ہمیشہ وہ بات نقل کیا کرتے جو محقق، مدلل اور جمہور کی اختیار کردہ ہوتی۔

(۳) مسلکی تصلب اور پختگی: ابّاؒ کی شخصیت کو دوسروں سے ممتاز کر دینے والا ایک وصف ان کا مسلکی تصلب اور جماؤ تھا، جس کا پورا پورا رنگ ان کے درس میں نظر آتا، چنانچہ دورانِ درس اگر کوئی حدیث بظاہر مسلکِ احناف کے خلاف نظر آتی تو اس کی ایسی دل نشیں اور مدلل تشریح اور توجیہ کرتے کہ حنفیت نہایت راجح اور مضبوط محسوس ہوتی اور عقلی ونقلی دونوں اعتبار سے دوسرے مذاہب پر نہایت فائق و برتر نظر آتی، یہی وجہ ہے کہ ابّاؒ کو طلبہ کے درمیان 'بیرسٹرِ احناف' کے لقب سے جانا جاتا تھا۔

(۴) الفاظ سے ہم آہنگ معنی خیز ترجمہ: ایک کامیاب مدرس کی نشانی یہ ہوتی ہے کہ وہ متعلقہ کتاب کے مضامین پر مکمل دسترس اور عبور رکھنے کے ساتھ ساتھ الفاظ کی رعایت کرتے ہوئے معنی خیز ترجمے پر قدرت رکھتا ہو جو معنی ومفہوم کی پوری عکاسی کر سکے۔ ابّاؒ کے درس میں ہم نے اس خصوصیت کو بھی نہایت ممتاز پایا، وہ نہایت سلیس اور مطلب خیز ترجمہ کرایا کرتے تھے، چنانچہ جامع ترمذی کے درس کے دوران ایک عبارت آئی: "إن من الجفاء أن تبول و أنت قائم" ابّاؒ نے اس کا ترجمہ کرایا" بلاشبہ ناشائستگی کی بات ہے کہ تم کھڑے ہو کر پیشاب کرو" کبھی کبھی ترجمے کے دوران چند ایسے الفاظ کا اضافہ کردیا کرتے کہ مطلب بیان کرنے کی ضرورت ہی نہ رہتی، مثلاً ترمذی شریف کی ایک عبارت ہے:"إنما الأمر علی وجھه" ابّاؒ نے اس کا ترجمہ کرایا"حکم شرعی وجود میں لایا جاتا ہے اس کی مقررہ صورت کو عمل میں لا کر" یہ اور اس طرح کی بہت سی مثالیں ہیں جن میں سے بعض کو راقم نے دورانِ درس اپنی ترمذی شریف کے حاشیے پر بھی قلم بند کردیا تھا۔

(۵) سہل اور شگفتہ تعبیر درس: ابّاؒ کے درس کی زبان نہایت سہل، سلیس، شگفتہ اور شستہ ہوا کرتی تھی جس کی وجہ سے اصل مفہوم تک رسائی نہایت آسانی سے ہوجایا کرتی تھی۔ تعبیر کے سلسلے میں ابّاؒ کی ایک اور خصوصیت یہ بھی تھی کہ کبھی کوئی ناشائستہ یا کھلی ہوئی تعبیر استعمال نہ کرتے، جو مہذب لوگوں کی زبان پر نہیں آتی۔

(۶) نصاب پر قابو اور گرفت: سال گزشتہ (جو ابّاؒ کی تدریسی زندگی کا آخری سال رہا) ابّاؒ کافی بیمار رہے، بلکہ عید الاضحیٰ (۱۴۳۷ھ) کی تعطیل تک تو صرف دو ایک دن ہی سبق ہوسکا، لیکن اس کے باوجود نہایت اطمینان کے ساتھ وقت سے پہلے ہی اپنے سے متعلقہ دونوں کتابوں (ترمذی شریف اور البلاغۃ الواضحۃ) کی تکمیل کرادی، دورانِ سال بلکہ آخرِ سال میں بھی (جبکہ عموماً اساتذہ کے سبق کی رفتار بڑھ جایا کرتی ہے) کبھی ایسا محسوس نہیں ہوا کہ کتاب کے پڑھانے کی رفتار تیز ہوئی ہو اور کوئی بحث نامکمل رہ گئی ہو۔

(۷) مطالعے کا اہتمام: اپنی بے پناہ فطری ذہانت، خداداد صلاحیت اور وسیع مطالعے کی بنیاد پر اُن کو ان مضامین پر مکمل عبور حاصل تھا جن کو وہ پڑھایا کرتے تھے اور ان کے لیے ممکن تھا کہ بغیر مطالعے کے یا سرسری مطالعہ سے ہی سبق پڑھا دیں، لیکن اس کے باوجود کبھی سابقہ تیاری اور مطالعہ کیے بغیر درس میں تشریف نہ لاتے، بارہا ایسا ہوا کہ دوسرے گھنٹے سے جلدی فارغ ہو کر ہر گھر پہنچے تو ان کو پوری یکسوئی کے ساتھ مطالعے میں مشغول پایا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے لیے دقیق سے دقیق مسئلے کو بھی سمجھانا کوئی دشوار نہ تھا، چند جملے بولتے اور پورا مسئلہ واضح ہو کر طلبہ کے سامنے آجاتا۔

(۸) درس کے دوران ظرافتِ طبع: ابّاؒ فطرتاً ہی نہایت ظریف الطبع واقع ہوئے تھے، ان کی یہ ظرافتِ طبع سبق کے دوران بھی پوری طرح کارفرما نظر آتی۔ چنانچہ وہ درمیان میں ایسے پر کیف، ظریفانہ جملے بولتے رہتے جن سے طلبہ کے ذہن ودماغ میں نشاط وسرور کی کیفیت پیدا ہوجاتی بلکہ بعض اوقات تو ہنسی ضبط کرنا بھی دشوار ہوجاتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے سبق میں طلبہ کا بہت جی لگتا تھا۔

(۹) سنجیدگی ووقار: ظریفانہ طبع رکھنے کے باوجود ابّاؒ نہایت سنجیدہ اور پروقار شخصیت کے مالک تھے۔ بادی النظر میں ان دونوں اوصاف میں تضاد سا محسوس ہوتا ہے لیکن حقیقت میں ان کے درمیان تضاد نہیں، جس کی دلیل خود ابّاؒ کی شخصیت تھی، جو ان دونوں صفات سے بیک وقت متصف تھے، چنانچہ دورانِ درس بھی یہ ممکن نہیں تھا کہ سنجیدگی اور متانت کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جائے، کبھی ایسی بات نہ کرتے، جس سے ان کی متانت اور سنجیدگی میں کمی آسکے۔

(۱۰) بشاشت ونشاط: زندہ دلی، بشاشت اور نشاط ابّاؒ کی زندگی کے وہ مخصوص اوصاف ہیں جن سے ان کا ہر جاننے والا واقف ہے، دورانِ درس یہ اوصاف مزید کھل کر سامنے آتے، بیماری اور بڑھاپے کے باوجود ان کی یہ خوبیاں کبھی متاثر نہیں ہوئیں، کبھی درس کے دوران ایسا محسوس نہیں ہوا کہ ان پر سبق پڑھانا دشوار ہو رہا ہو یا گراں گزر رہا ہو بلکہ ہمیشہ پوری چستی اور بشاشت کے ساتھ مکمل سبق پڑھاتے۔

یہ ابّاؒ کے درس کی چند خصوصیات اور امتیازات ہیں جن کو راقم نے مختصراً ذکر کیا۔ ابّاؒ کی وفات سے ہم نے دراصل وہ کڑی کھودی ہے جو ہمیں ان اساتذہ و مشائخ دارالعلوم سے مربوط کرتی ہے جو علم وفضل کے آفتاب و ماہتاب، ورع وتقویٰ کے پیکر، سادگی وقناعت، انکساری وتواضع اور پاک نفسی وپاک دامنی کا نمونہ تھے:

آفتابِ علم ہے اور خاک کی آغوش ہے
آہ اقدارِ سلف کا پاسباں خاموش ہے

□□

فراست کی جہاں بانی کے فرزانے کی رحلت ہے

تحریر: محمد شیبان ظفر (متعلّم عربی اوّل دارالعلوم دیوبند)

اس دنیا میں ربّ العالمین کے وجود کے بعد موت سے زیادہ سچی اور ناقابلِ انکار حقیقت کوئی نہیں ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ وہ خدا فراموش دہریے جو اللہ کے وجود کا بھی انکار کر دیتے ہیں موت کا انکار نہیں کر پاتے اور یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ انھیں اور ہر جاندار کو ایک نہ ایک دن موت کا شکار ہونا ہے۔ ۲۰ رمئی ۲۰۱۷ء بروز ہفتہ سحر کے وقت موذنین مسجدوں میں اذان دینے کے لیے اُٹھ چکے تھے۔ اسی دوران ہمارے دادا حضرت مولانا ریاست علی ظفؔر بجنوریؒ ہمیشہ کے لیے اس دارِ فانی کو چھوڑ کر اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ حضرت مولانا تو اس دنیا سے رخصت ہو گئے، اب ماضی کے اوراق الٹتے رہیں گے اور اس شخصیت کی یاد تازہ کراتے رہیں گے۔ اب اشکہائے مسلسل ہوں یا حسرت وافسوس کے بے پناہ جذبات، کوئی چیز حضرت والا کو اس دنیا میں واپس نہ لا سکے گی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ حضرت کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے، آمین ثم آمین۔

حضرت والا حلم، تواضع، انکساری، شرافت، شفقت ومحبت، شعر وشاعری، عزتِ نفس، علم وعمل، دیانت وتقویٰ اور انتھک محنت میں اپنی مثال آپ تھے۔ انھوں نے اپنی عمر کا اکثر حصہ دارالعلوم دیوبند کی نذر کر دیا۔ حضرت والا کی دارالعلوم سے محبت کا اندازہ حضرت والا کے شاہکار 'ترانۂ دارالعلوم' سے لگایا جا سکتا ہے:

بہت لگتا تھا جی صحبت میں اُن کی
وہ اپنی ذات میں اِک انجمن تھے

حضرت والاؒ راقم کے حقیقی دادا تھے، جب بھی حضرت والاؒ کی یاد آتی ہے تو آنکھ سے آنسو بے ساختہ اُمنڈنے لگتے ہیں۔ اس کیفیت کی ترجمانی فیض احمد فیضؔ کے اس شعر سے ہو سکتی ہے:

کبھی آہ لب پہ مچل گئی، کبھی آنکھ سے آنسو نکل گئے
یہ تمہارے غم کے چراغ تھے، کبھی بجھ گئے کبھی جل گئے

یا پھر:

آئی جو اُن کی یاد تو آتی چلی گئی
ہر نقش ماسوا کو مٹاتی چلی گئی

اور پھر ہمارے لیے تو وہ شفقتوں، عنایتوں، محبتوں اور چاہتوں سے سیرابی کا سرچشمہ تھے۔ آج چار ماہ گزرنے کے بعد جب وہی دن اور وہی وقت آیا تو بے ساختہ دل پکار اُٹھا:

یہی وہ وقت تھا جب راہبر نے ساتھ چھوڑا تھا
یہی وہ دن تھا جس دن لٹ گیا تھا کارواں اپنا

حضرت والاؒ کے سانحۂ رحلت سے محسوس ہوا کہ علم وادب کا ایک روشن چراغ گل ہو گیا، ایک ایسا پاکیزہ چراغ جس سے علم وعمل کی بہت سی بستیاں روشن تھیں اور اس کی حرارت آمیز کرنوں سے بے شمار قلوب جگمگا رہے تھے۔ حضرت والاؒ کی زندگی کے شب وروز بالکل اسی آئینے کی مانند تھے جہاں صرف گفتار ہی نہیں کردار کے بھی سکے ڈھلتے نظر آتے تھے۔ حضرت والاؒ کی خلوت وجلوت میں جمالِ محمدیؐ کا عکس جھلکتا تھا۔ وہ 'درکف جامِ شریعت درکفِ سندانِ عشق' کی حقیقی تصویر دکھائی دیتے تھے۔

وہ جو بادہ کش تھے پرانے وہ اُٹھتے جاتے ہیں

ویسے تو انسان کی آمد ورفت کا سلسلہ گردشِ شام وسحر سے جاری ہے۔ معلوم نہیں آنِ واحد میں کتنے نفوس اس عالمِ رنگ وبو میں اپنی مقررہ ساعتیں گزار کر اس طرح رخصت ہو جاتے ہیں کہ کسی کو خبر تک نہیں اور نہ ہی ان کے جانے کا کسی کو صدمہ اور احساس ہوتا ہے، لیکن بعض شخصیات اپنی روشن خدمات اور قابلِ رشک خوبیوں کی وجہ سے محبوبیت ومقبولیت کا ایک ایسا روپ دھار لیتی ہیں کہ اگر وہ ہم سے اچانک روٹھ جائیں تو ان کی جدائی کا احساس بے پناہ شدت کے ساتھ محسوس ہوتا ہے۔ لوگ بلک بلک کر رہ جاتے ہیں اور زمانہ انھیں یاد کرتا رہتا ہے۔ آج اگر ہم اپنے اس محسن کے سانحۂ رحلت پر اشکبار ہیں تو صرف اس لیے کہ ایسی نورانی و دلنواز عبقری ہستیاں اس دورِ قحط الرجال میں اگر نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں:

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تعبیر ہو جس کی حسرت وغم اے ہم نفسو! وہ خواب ہیں ہم

حضرت والاؒ نے تمام زندگی میرا حد درجہ خیال رکھا۔ کوئی بھی چیز ہو سب سے پہلے مجھ سے کہتے کہ تو لے لے بیٹے۔ اگر کسی دن مدرسہ سے آنے میں مجھے تاخیر ہو جاتی تو گھر میں اندر آ جاتے اور پوچھتے کیا بات شیبان نہیں آیا اب تک؟ استاذ کو فون کروں اس کے؟ حتیٰ کہ کوئی اگر قلم دے جاتا تو کہتے یہ تو شیبان لے لے گا۔ وہ مجھے اپنے کمرے میں ہی سلاتے تھے تاکہ فجر میں اٹھنے میں آسانی ہو۔ وفات سے چند دن قبل مجھے بوستاں پڑھانے کے لیے ایک استاذ سے بات بھی کر لی تھی اور انتقال سے دو رات قبل میں اپنے استاذ کے ساتھ چلا گیا اور گھر پر نہیں تھا، اندر آئے، پوچھا شیبان کہاں ہے۔ والدہ نے کہا معلوم نہیں تو بہت پریشان ہوئے، کئی بار فون ملایا، جب میں گھر دیر سے آیا تو مجھے ڈانٹا۔ پھر جب والدہ نے بتایا کہ یہ اپنے استاذ کے ساتھ کام سے گیا تھا تو مجھے بلایا اور کہا مجھے معلوم نہیں تھا بیٹے، میں نے تمھیں خواہ مخواہ ڈانٹ دیا۔ تمھیں برا لگا؟ مجھے تمام زندگی

بس ایک ہی نصیحت کی کہ بیٹا محنت سے پڑھنا اور نماز مت چھوڑنا۔ آخری رات میں بھی حضرت والاؒ کے پاس سویا تھا، صبح جب سانحہ گزرا تو اوّل دل نے چاہا کہ انکار کردے لیکن عقل نے سمجھایا انکار کردینے سے حقیقتیں تبدیل نہیں ہوجاتیں اور پھر بہرحال اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہی بنی کہ وہ علم و ہنر، شعر وسخن، صدق وصفا، دیانت وامانت، سادگی وقناعت، زہد وعبادت کا پیکر ہمیں چھوڑ کر چلا گیا ہے۔

حضرت کو غسل دینے میں مولانا محمد نسیم صاحب بارہ بنکوی مدظلہٗ استاذ دارالعلوم دیوبند، جناب قاری فوزان استاذ حفظ دارالعلوم دیوبند اور جناب قاری وامق صاحب شریک تھے۔ نمازِ جنازہ احاطۂ مولسری میں بعد نماز ظہر جناب قاری عثمان صاحب صدر جمعیۃ علماء ہند نے پڑھائی اور قاسمی قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت والا کو اپنی بارگاہ میں شرفِ قبولیت عطا کرے اور ان کو اپنی شان کے مطابق اجر جزیل سے نوازے اور ان کی قبر کو روضۂ من ریاض الجنۃ کا مصداق بنائے، آمین ثم آمین۔

دل میں یادِ غم بیکراں رہ گئی
جانے والا کہاں گیا داستاں رہ گئی

□□

وہ فراست کی ریاست کے رہے ہیں تاجدار

نتیجۂ فکر: ولی اللہ ولیؔ قاسمی بستوی

وہ فراست کی ریاست کے رہے ہیں تاجدار
علم وفن کی سلطنت کے وہ رہے ہیں شہریار
مجلسِ علمی میں سلجھاتے تھے علمی گتھیاں
کتنے نکتے علم وفن کے تھے زباں سے آشکار
عالمانِ عہدِ حاضر میں رہے اعلیٰ مقام
اور استاذوں کی صف میں تھے بڑے ہی نیک نام
تھی صدائے حق زباں پر اور قال اللہ بھی
نغمۂ قال النبیؐ لب پر رہا ہے صبح و شام
حضرتِ مرحوم تھے نازِ درِ دارالعلوم
اُن کی شخصیت تھی زیبِ گلشنِ دارالعلوم
اُن کے رہنے سے شگفتہ رو رہے ہیں بام و در
اور وہ تھے در حقیقت رونقِ دارالعلوم
گفتگو میں ہوتی تھی اُن کی بلا کی چاشنی
نغمۂ توحید کی تھی اُن کے لب پر راگنی
مجلسوں میں وہ ہوا کرتے رہے ہیں شہ نشیں
مسندِ تدریس پر تھی ذات اُن کی دیدنی
دامنِ قرطاس پر اُن کا قلم تھا زرنگار
عہدِ حاضر کے بڑے لوگوں میں تھا اُن کا شمار
جان کی بازی لگانے کے لئے تیار تھے
مادرِ علمی کی حرمت پر رہے ہیں وہ نثار
مادرِ علمی کا جو لکھا ترانہ شاندار
ہے ترانوں کے جہاں میں وہ ترانہ شاہکار
اُس کا ہر ہر شعر ہے علم و ادب کا گلستاں
لوگ پڑھتے ہیں مزے لے لے کے اُس کو بار بار
ان کی ہستی پر رہا ہے مادرِ علمی کو ناز
آشکارا خوب فرماتے تھے فکر و فن کا راز
تھا نمایاں درس اُن کا نکتہ سنجی بے مثال
اور علم و فضل میں حاصل تھا اُن کو امتیاز
گلستانِ دیوبندی کے رہے خوش رنگ پھول
علم وفن کے آئینہ سے صاف کرتے تھے وہ دھول
نامۂ اعمال سے مٹ جائیں ساری سیّئات
ہے دعا کہ پیش رب ہوں نیکیاں ساری قبول
اُن کے جانے سے ہوا ویران علمی میکدہ
ہر کسی شاگرد کا سینہ ہوا ہے غم کدہ
ہیں درو دیوار سونے ، پتہ پتہ سوگوار
ازبرِ ہندوستاں اب بن گیا ماتم کدہ
جس گھڑی پوری ہوئی اُن کی حیاتِ مستعار
چھوڑ کر دنیا گئے وہ جانبِ دار قرار
اُن کی تربت میں بہاریں رحمتوں کی ہوں مدام
جنت الفردوس دے اُن کو خدائے روزگار
یا الٰہی ہو ریاست پر ترا فیضِ عمیم
حشر میں حاصل انھیں ہو سایۂ عرشِ عظیم

ہے دعائے دل ولیؔ کی بس یہی شام وسحر
مغفرت مرحوم کی فرما دے اے رب حلیم